خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

مئی 2018

خواتین ڈائجسٹ

بانیِ و مدیرِ اعلیٰ ـــــ محمود ریاض

مدیرہ ـــــ شادرہ خاتون
مدیر ـــــ آذر ریاض
نائب مدیرہ ـــــ رضیہ جمیل
مدیرہ خصوصی ـــــ امت الصبور
بلقیس بھٹی
نفسیات ـــــ عدنان
اشتہارات ـــــ خالدہ جیلانی
قانونی مشیر نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

BAKE PARLOR
BAKE PARLOR
consumers@bakeparlor.com , www.bakeparlor.com , f bakeparlor

کہنی سنی، مدیر 14
کرن کرن روشنی، ادارہ 15
ہمارے نام، نادرہ خاتون 270

بیادِ محمود ریاض

آئینہ صفت، سمیرا حمید 24
روشنی کا سفر، عطیہ خالد 26

آپ سے کیا پردہ

حکیم بقل بطورا، انشا جی 20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور 268

مجھ سے ملئے

باتیں فیضانِ شیخ سے، شاہین رشید 33

انٹرویو

نائلہ جعفری شاہین رشید 28

ناول

حالم، تمرہ احمد 208
دشتِ جنوں، آمنہ ریاض 36

مکمل ناول

ٹیولپ، سمیرا حمید 148
محبت ہو گئی ہے، افشین نعیم 106

ناولٹ

ٹین کی چھت ثریا انجم 74
آئینہ ہوں، رابعہ افتخار 244

افسانے

دھنک کے رنگ عفت سحر طاہر 199
اک چراغ روشن، نیّر فہیم خان 67
بڑی بی، ایمل رضا 142
جسے دل کہیں، امت العزیز شہزاد 99
تشنہ دل، تمثیلہ زاہد 259

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

نظمیں غزلیں

غزل، ندا فاضلی 263
نظم، غزالہ نگار اورکزئی 263
غزل، سید کامی شاہ 262
غزل، علی کونین 262

رنگا رنگ پھول

رنگارنگ سلسلہ، شگفتہ حیاہ 264
خبریں وبریں، واصفہ سہیل 278

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے، خالدہ جیلانی 267

پکوان

موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 285
آپ کا باورچی خانہ، مدیحہ اقبال 283

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبور 290

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان 287

مئی 2018
جلد 46 شمارہ 1
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مُدیر

کہی سُنی

مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رمضان المبارک مقدس اور با برکت مہینہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ رمضان المبارک کو نیکیوں کا موسم بہار کہتے ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو رمضان المبارک کا مہینہ پائیں اور اپنی نیکیوں میں اضافہ کرکے اپنی بخشش کرائیں۔

قارئین کو ماہِ رمضان مبارک۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مقدس مہینے کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی سعادت عطا فرمائے۔ آمین۔

محمود ریاض صاحب

کچھ لوگ دُنیا سے چلے جائیں تب بھی ایسے چراغ روشن کر جاتے ہیں کہ ان کے بعد بھی روشنی کا سفر جاری رہتا ہے۔

محمود ریاض صاحب کا شمار ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے۔

آج دُنیا سے چلے جانے کے بعد ان کے روشن کیے چراغ ایک جہان کو منوّر کر رہے ہیں۔ ان کے الفاظ آج بھی سکھانے کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سینکڑوں دلوں کو سکون مہیا کر رہے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ شعاع اور کرن کی صورت انہوں نے جو کونپل لگائی تھی، وہ آج ایک تن آور درخت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جس سے لاکھوں لوگ ثمر پا رہے ہیں۔ بہت سارے لوگ ان کے لیے دُعائے خیر کرتے ہیں۔ ان کی مہربانیوں، ان کے کاموں کو یاد کرتے ہیں۔

ریاض صاحب نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ زندگی کے تمام اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ بہت ساری خوشیاں پائیں تو دل شکن آزمائشوں سے بھی گزرے لیکن اس کے باوجود ان کی وضع داری اور ہمت و حوصلے میں فرق نہیں آیا۔ انہوں نے تمام رشتوں، ہر تعلق کو خوش دلی سے نبھایا۔

10 مئی سن 2001ء کو ریاض صاحب دُنیا سے رخصت ہوگئے لیکن ان کا نام اور کام ادب کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین۔

قارئین سے بھی دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

عید سروے

جون کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ حسبِ روایت عید نمبر میں قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1. عید کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں اور آپ کا بجٹ کتنا متاثر ہوتا ہے؟
2. عید کا دن کیسے گزارتی ہیں؟ مہمان بن کر، میزبان بن کر یا سو کر؟

ان سوالات کے جواب اس طرح لکھیں کہ ہمیں 25 مئی تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں

- سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ یوٹرن، ، افشین نعیم کا مکمل ناول۔ محبت ہو گئی ہے تم سے،
- ثریا انجم اور رابعہ افتخار کے ناولٹ، ، آمنہ ریاض اور نمرہ احمد کے ناول،
- نبیرہ کہیم نمان، امت العزیز شہزاد، ایمل رضا، عفت سحر طاہر اور تمثیلہ ناہید کے افسانے،
- باتیں کلیفان شیخ سے، ، معروف فنکارہ نائلہ جعفری سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

زیادہ سے زیادہ نیکیاں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے۔ اور رمضان میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبریل علیہ السلام آکر ملتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ سخی ہو جاتے تھے اور جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا دور کرتے تھے۔ پس یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جب جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے، بھلائی (مال و دولت وغیرہ) میں تیز ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں رمضان المبارک میں دو کاموں کے کثرت اور اہتمام سے کرنے کا بیان ہے۔ ایک فیاضی و سخاوت کا مظاہرہ، تاکہ لوگ اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ عبادت کے لیے وقت نکال سکیں اور اپنے دنیاوی مشغلوں میں کمی کرلیں۔

2۔ دوسرے قرآن کریم کا دور اور مدراستہ، یعنی ایک دوسرے کو قرآن کی منزل سنانا، جیسے قرآن کریم کے دو حافظ ایک دوسرے کو اپنا آموختہ سناتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم اور رمضان المبارک کا باہم نہایت گہرا تعلق ہے۔

آخری عشرہ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جب (رمضان کا آخری) عشرہ شروع ہو جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب بیداری فرماتے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرتے اور (عبادت کے لیے) کمر کس لیتے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

ویسے تو پورا رمضان ہی نیکیوں کا موسم بہار اور عبادت و طاعت کا خصوصی مہینہ ہے لیکن اس کا

آخری عشرہ تو اس موسم عبادت کا نقطہ عروج ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ان دس دنوں اور راتوں میں تو بالخصوص خوب محنت اور جدوجہد کرکے اپنے رب کو راضی کرنے کی اور اسی طرح لیلتہ القدر کی فضیلت حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ اسی لیے ان دس دنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کرنے کا بھی خصوصی اہتمام فرماتے تھے اس پر بھی عمل کرنا چاہیے۔

روزہ نہ رکھے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم میں سے کوئی شخص رمضان سے ایک روز یا دو روز پہلے روزہ نہ رکھے۔ ہاں مگر وہ شخص جو پہلے ہی سے ان دونوں کا روزہ رکھتا ہو تو وہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ پہلے سے ہی ان دنوں کا روزہ رکھتا ہو، کا مطلب ہے کہ مثلاً سوموار اور جمعرات کو روزہ رکھنا کسی کا معمول ہو یا ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن چھوڑنا اس کا معمول ہو تو اس معمول کی صورت میں وہ ایک دو روز قبل بھی روزہ رکھ سکتا ہے، کیونکہ اس کا روزہ استقبال رمضان کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے مستقل معمول کا ایک حصہ ہے۔

2۔ بعض نے ایک دو روز قبل سے مراد شعبان کے نصف ثانی کے پہلے ایک دو روز مراد لیے ہیں کیونکہ روایات میں نصف شعبان کے بعد بھی روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ اس اعتبار سے شعبان کی 17,16 تاریخ کو بھی روزہ رکھنا صحیح نہیں، الا یہ کہ کسی کے معمول میں آجائے۔

رمضان سے پہلے

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''رمضان سے پہلے روزہ مت رکھو، چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھنا چھوڑو۔ اگر ــــــ بادل حائل ہوجائے (اور چاند نظر نہ آئے) تو تیس دن پورے کرو۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل

1۔ رمضان سے قبل سے مراد شعبان کا دوسرا نصف ہے، یعنی 15 شعبان کے بعد نفلی روزے نہیں رکھنے چاہئیں۔ تاکہ رمضان کے فرضی روزوں کے لیے اس کی قوت و توانائی برقرار رہے جس کا آغاز چند دن بعد ہی ہونے والا ہے۔

2۔ اگر چاند، مطلع ابرآلود ہونے کی وجہ سے نظر نہ آئے تو شعبان کے 30 دن پورے کرکے روزے شروع کیے جائیں۔ اسی طرح شوال کا چاند نظر نہ آئے تو 30 روزے پورے کرکے عید الفطر منائی جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب شعبان کا آدھا مہینہ باقی رہ جائے تو تم روزے نہ رکھو۔'' (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا یہ۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

شک کا روزہ

حضرت ابو یقظان عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

''جس نے شک والے دن روزہ رکھا، اس نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی۔'' (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ ''مشکوک (شک والے) دن سے مراد 30 شعبان کا دن ہے۔ یعنی بادلوں کی وجہ سے 29 ویں دن کو چاند نظر نہیں آیا تو کوئی شخص یہ سمجھ کر روزہ رکھ لے کہ پتا نہیں یہ شعبان کا تیسواں دن ہے یا رمضان کا پہلا دن۔ کہیں یہ یکم رمضان ہی نہ ہو۔ اس طرح شک والے دن میں روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ گنتی پوری کی جائے۔

چاند دیکھتے وقت کی دعا

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب چاند دیکھتے تو فرماتے۔

''اے اللہ! اس کو ہم پر امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کے ساتھ نکال۔ اے چاند! میرا اور تیرا ربط اللہ ہے۔ اے اللہ! یہ چاند ہدایت اور بھلائی کا چاند ہو۔''

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔)

فائدہ، چاند دیکھ کر مسنون دعائیں پڑھنی چاہئیں، جن میں سے ایک یہ دعا بھی ہے۔ جو اوپر مذکور ہوئی۔

سحری کی تاکید

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا۔

سحری کھایا کرو! اس لیے کہ سحری کھانے میں یقیناً برکت ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ، اس سے معلوم ہوا کہ سحری کے وقت اٹھ کر سحری کھانا مسنون ہے، چاہے تھوڑا ہی کھالے کیونکہ اس کھانے میں برکت ہے، اس وقت کھانے پینے سے سارا دن اس کی قوت و توانائی برقرار رہے گی۔ اس کے برعکس جو شخص رات ہی کو کھاپی کر سوجائے تاکہ سحری کے لیے نہ اٹھنا پڑے یا سحری بہت جلد کھالے، اس کے آخری وقت میں نہ کھائے تو اسے جلد ہی بھوک پیاس ستانے لگ جائے گی کیونکہ ان دونوں صورتوں میں بھوکا پیاسا رہنے کا وقفہ بڑھ جائے گا۔ جس سے یقیناً روزے دار کو تکلیف ہوگی۔ سبحان اللہ! اسلام کی تعلیمات میں کس طرح انسان کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

سحری کا وقت

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی، پھر ہم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان سے پوچھا گیا، سحری کے خاتمے اور نماز کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ انہوں نے فرمایا پچاس آیات (پڑھنے) کی مقدار'' بخاری و مسلم)

فائدہ اس سے معلوم ہوا کہ سحری بالکل آخری وقت میں کھائی جائے۔ یہی مسنون طریقہ ہے، تاہم صبح صادق سے پہلے پہلے کھائی جائے۔ اور یہ وقفہ بقدر پچاس آیات اندازاً دس منٹ ہو۔

اہل کتاب

حضرت عمر بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق سحری کا کھانا ہے۔'' (مسلم)

گویا سحری کھانا امت مسلمہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے جس سے اللہ نے اس امت کو نوازا ہے۔

افطار میں جلدی کی فضیلت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''لوگ برابر بھلائی میں رہیں گے جب تک وہ روزہ کھولنے میں جلدی کریں گے۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ:۔

بھلائی سے مراد دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ روزہ جلدی کھولنے کا مطلب، غروب شمس سے پہلے روزہ کھولنا نہیں بلکہ غروب شمس کے بعد بلاتاخیر روزہ کھولنا ہے۔

محض اس بنا پر تاخیر نہ کی جائے کہ روزے میں جو مشقت ہے اس کو مزید بڑھایا جائے۔ ان سختیوں میں برکت نہیں ہے بلکہ اصل برکت اتباع سنت میں ہے۔ اسی لیے جلدی افطار کرنے میں بھی اس اتباع سنت کی وجہ سے دین و دنیا کی بھلائی مسلمانوں کے حصے میں آئے گی۔

اللہ عزوجل نے فرمایا ہے۔ ”مجھے میرے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہیں جو ان میں سے افطار میں جلدی کرنے والے ہیں۔“ (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے)

سنت

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے قبل چند تازہ کھجوروں سے روزہ کھولتے تھے۔ اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو چند چھواروں سے (روزہ افطار کرتے) اور اگر وہ بھی نہ ہوتے تو پانی کے چند گھونٹ بھر لیتے۔ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ:۔

روزہ کھولتے وقت اس ترتیب کو سامنے رکھا جائے تو بہتر ہے تاکہ سنت کا ثواب بھی مل جائے اور طبی طور پر بھی یہی مفید ہے کیونکہ معدہ خالی ہونے کی وجہ سے گرم اور کمزور ہوتا ہے، اس لیے مرغن چیزیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ (ارواء الغلیل، حدیث 922)

زبان اور اعضا کی حفاظت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب تم میں سے کسی کا روزے کا دن ہو تو نہ دل لگی کی باتیں کرے اور نہ شور و غل کرے۔ چنانچہ اگر کوئی اس کو گالی گلوچ کرے یا اس سے لڑے تو کہہ دے کہ میں تو روزے دار ہوں۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

اس سے معلوم ہوا کہ روزے دار کے لیے جس طرح کھانا پینا اور بیوی سے قربت منع ہے۔ اسی طرح روزے کی حالت میں اپنی زبان اور اپنے دیگر اعضا کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی اشتعال دلائے بھی تو مشتعل نہ ہو بلکہ یہ یاد رکھے کہ میں روزے دار ہوں، مجھے ان چیزوں سے اجتناب کرنا ہے اور جہاں تک ہو سکے اپنی زبان کو اللہ کے ذکر اور تلاوت قرآن میں مشغول رکھے۔

جھوٹ بولنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل

اس میں بھی اسی کی تاکید ہے کہ روزے کی حالت میں روزے کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے۔ ایک طرف اللہ کی رضا کے لیے روزہ رکھنے کا بھی اہتمام ہو اور دوسری طرف اللہ کے خوف سے یہ بے نیازی ہو کہ نہ جھوٹ سے اجتناب ہو اور نہ دھوکا وفریب دہی اور دیگر ناجائز کاموں سے بچنے کا جذبہ۔ حدیث میں ایسے شخص کے لیے جن الفاظ میں وعید بیان ہوئی اس سے اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں کا روزہ بے کار جائے اور وہ ثواب سے محروم رہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے لوگ روزے کی حالت میں کھانا پینا شروع کر دیں بلکہ اصل مقصود اس تنبیہ سے یہ ہے کہ ہر قسم کی معصیت سے اپنے آپ کو بچائیں تاکہ ثواب کے مستحق بھی بن سکیں۔

بھول چوک

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب تم میں سے کوئی شخص بھول کر کھا پی لے تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ اللہ نے اسے کھلایا اور پلایا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ:۔

اس میں بھی اسلام کی ایک شفقت و سہولت کا بیان ہے کہ روزے کی حالت میں اگر بھول کر کوئی ایسا کام کر لیا ہے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، جیسا کہ کھانا، پینا وغیرہ تو نسیان کی وجہ سے اس کا روزہ برقرار رہے گا۔ بشرطیکہ یاد آتے ہی فوراً اس کام کو چھوڑ دے۔ ایسے روزے کی قضا ہے نہ کفارہ۔

وضو

حضرت نقیط بن صبرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے وضو کی بابت بتلائیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کامل طریقے سے وضو کرو، انگلیوں کے درمیان خلال کرو اور ناک میں پانی ڈالنے کا خوب اہتمام کرو (جیسے زور سے خوشبو سونگھی جاتی ہے) مگر یہ کہ تم روزے دار ہو۔“ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح)

فائدہ:۔

عام حالات میں کامل وضو کے لیے یہ بھی ضروری اور فرض ہے کہ ناک میں پانی اچھی طرح ڈالا جائے، اسی طرح خوب کلی کی جائے۔ لیکن روزے کی حالت میں احتیاط ضروری ہے تاکہ پانی ناک یا منہ کے ذریعے اندر نہ جائے۔ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

فوائد و مسائل

1۔ اعتکاف والے کو بلاضرورت مسجد سے نکلنا منع ہے۔

2۔ قضائے حاجت کے لیے مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے۔

3۔ اگر مسجد کے ساتھ بیت الخلا کا انتظام نہ ہو تو اعتکاف والا اس غرض کے لیے گھر جا سکتا ہے۔

4۔ مریض کی بیمار پرسی کے لیے اعتکاف سے نکلنا درست نہیں، لیکن اگر کسی جائز سبب سے باہر نکلا ہو اور راستے میں مریض مل جائے تو اس سے حال پوچھنا جائز ہے، تاہم اس کے پاس بات چیت کے لیے رک جانا درست نہیں۔

معتکف کا بیوی سے ملنا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مسجد میں تشریف لے گئیں۔ جبکہ آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے میں مسجد میں معتکف تھے۔ وہ عشا کے وقت کچھ دیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرتی رہیں۔ پھر اٹھ کر واپس چل دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں (مسجد کے دروازے تک) چھوڑنے کے لیے ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب مسجد کے اس دروازے تک پہنچیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے کے قریب تھا تو پاس سے دو انصاری گزرے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اور چل دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا۔

”ٹھہرو...... یہ صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں۔“

انہوں نے کہا۔

سبحان اللہ! اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہم آپ پر کس طرح شک کر سکتے ہیں؟

☆

حکیم بقل بطُورا

انشاؔجی

آج صبح ہم نے اخبار کھولا تو اس میں کئی خوشی کی خبریں نظر آئیں۔ ایک تو یہ کہ کراچی کے اسپتالوں کو کتے کے کاٹے سے بچاؤ کی دوا یعنی سیرم نومبر سے ملنے لگے گی۔ دوسری یہ کہ کراچی کارپوریشن نے پبلک کے پُرزور اصرار پر وسط ستمبر سے شہر کی صفائی کی مہم شروع کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ کیونکہ اکتوبر میں دس سالہ ترقیات کے جشن منائے جانے ہیں۔

ایک اخبار میں کے ڈی اے کی سرگرمیوں کے متعلق چار صفحے کا ضمیمہ بھی دیکھا، جس میں کے ڈی اے کے محکمہ پانی کے انجینئر کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اس میں پہلی بار یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ شہر کی شادابی کے لیے پانی ازبس ضروری چیز ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ خود کتوں سے کٹوانا چاہتے ہیں۔ وہ نومبر تک انتظار کرلیں۔ اس کے بعد اپنا شوق جتنا جی چاہے پورا کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس اعلان کی نقلیں کتوں میں بھی تقسیم کردی گئی ہوں گی۔ تاکہ اپنا منہ بند رکھیں۔ دہن سگ بہ اعلان دوختہ بدر

کورنگی سے ایک صاحب کتوں کے لیے ''کتا گزٹ'' نکالنا چاہتے تھے اورا اس کی کثیر الاشاعتی کے بارے میں بڑی امیدیں رکھتے تھے، اگر وہ نکل آیا ہو تو یہ اعلان جلی حروف میں اس میں چھاپ دینا چاہیے، ورنہ ہم اہل شہر کو مشورہ دیں گے کہ آج کا اخبار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کریں۔ جوں ہی کوئی کتا ان کی طرف لپکے اسے ڈانٹ دیں۔

کہ در در موئے۔ یہ دیکھ اعلان آگیا ہے کہ نومبر تک کاٹنا منع ہے۔ کیونکہ ابھی دوا نہیں بنی ہے۔ ٹیلی ویژن پر بھی اس کی تشہیر ضروری ہے۔ کیونکہ بڑے گھروں کے تو کتے بھی باقاعدگی سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔

اب رہی کراچی کارپوریشن کی صفائی کی مہم کارپوریشن والے سیدھی انگلی یہ اعتراف کیوں نہیں کرلیتے کہ انہیں اس کا خیال ہمارا کالم پڑھ کر آیا ہے اور عشرۂ ترقیات محض بہانا ہے۔ ہم نے لاہور کا ذکر کیا تھا کہ وہاں جابجا کوڑے کے ڈھیروں میں بانس کھڑے کرکے بینر پھیلا دیے گئے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے۔

تفصیلات پڑھنے پر معلوم ہوا کہ اس مبارک اور ضروری مہم کے لیے کارپوریشن کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ، انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ اور باغبانی ڈپارٹمنٹ کو بھی نیند سے جگا کر کہا جائے گا۔

''ہاں تو صاحبو! دکھاؤ ذرا اپنے جوہر' ہیلتھ ڈپارٹمنٹ اس سلسلے میں کیا کرے گا۔ اس کا کچھ اشارہ بھی اس اعلان میں ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو نوٹس دے گا کہ اپنے اپنے گھروں پر سفیدیاں کراؤ، جو نہیں کرائے گا اس کے...... وغیرہ وغیرہ۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے محکمے بھی نوٹس دیں گے۔ لیکن کس بات کے، اس بارے میں ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہمیں ڈر ہوگیا ہے کہ ہم نے سواری نیچے کے لیے مانگی تھی۔ کہیں اوپر کے لیے نہ مل جائے۔ ہم نماز بخشوانے کی فکر میں ہیں۔ کارپوریشن روزے ہمارے گلے میں ڈالنے کا سوچ رہی ہے۔ ہم نے پوری خبر کو دوبارہ پڑھا۔ اس میں کہیں اس بات کا اشارہ نہیں کہ لوگ بھی چاہیں تو کارپوریشن کو نوٹس دے سکتے ہیں کہ اٹھواؤ کوڑے کے ڈھیر کرو صاف نالیاں شہر کی۔ ایک صاحب نے تو ابھی سے یہ فال بدزبان سے نکال دی ہے کہ دیکھنا یہ کارپوریشن شہر والوں کو بھنگی بنا کے چھوڑے گی۔

پچھلے دنوں اخبار میں اس قسم کی خبر بھی دیکھی کہ آئندہ ڈاکٹروں اور انجینئروں کو بلدیہ کا چیئرمین مقرر کیا جایا کرے گا۔ ہرچند اس خبر میں یہ ذکر نہیں کہ موجودہ چیئرمین اور وائس چیئرمین وغیرہ کسی

بہنوں کا
شعاع
اپنا ماہنامہ

مئی 2018
کے شمارے کی ایک جھلک

مئی 2018
کا شمارہ شائع ہوگیا

- ''تو مکیں شہر جمال کا'' فرزانہ کھرل کا مکمل ناول،
- ''شب تاب'' مہوش افتخار کا مکمل ناول،
- ''نمرہ اور ثمرہ'' مسکان قریشی کا مکمل ناول،
- ''سنہری دھوپ'' سلویٰ علی بٹ کے ناول کی آخری قسط،
- ''شہرزاد'' صائمہ اکرم کا ناول،
- ''خواب شیشے کا'' عفت سحر طاہر کا ناول،
- ''سلیقہ مند'' سائرہ رضا کا ناولٹ،
- افشین نعیم، قرۃ العین سکندر، قرۃ العین خرم ہاشمی اور سویرا فلک کے افسانے،
- ''بندھن'' ہما کاشف آواز کی دنیا کا معتبر نام،
- آنکھوں کے امراض کے ماہر ''ڈاکٹر اسد جاوید'' سے ملاقات،
- ''دستک'' معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- ''کتاب کہانی'' سمیرا حمید کا سلسلہ،
- ''پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں'' اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے
ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع مئی 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

اسپتال میں ڈاکٹر لگادیے جائیں گے۔ تاہم اس تجویز کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ آخر اتنے سارے ڈاکٹر کس مرض کی دوا ہیں۔ ان سے کچھ کام تو لینا ہی چاہیے۔ ہمارے ذہن میں کچھ اس قسم کا منظر آتا ہے کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر ایم بی ایس خان (محمد باقر بن سلطان خان) بلدیہ کے دفتر میں چیئرمین بنے بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سننے کے لیے اسٹیتھسکوپ ہے اور دوسرے میں تھرما میٹر۔ جس سے اپنا کان کھجا رہے ہیں، اتنے میں ایک اہلکار فائل بغل میں دابے داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش خلقی سے چپڑاسی کو آرڈر دیتے ہیں کہ دو کپ کونین مکسچر کے بنا کے لاؤ۔

وہ صاحب عذر کرتے ہیں کہ میں ابھی پی کے آیا ہوں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ”ایک اور میں کیا حرج ہے۔ مکسچر ہی تو ہے چائے تو نہیں کہ نقصان کرے۔ آپ کو کونین مکسچر پسند نہیں تو فلو مکسچر بھی ہے' اچھا تو کیا بات ہے؟“

”جناب پرائمری اسکول چاہیے رنچھوڑ لائن میں۔ اس کے لیے پیسے منظور کیے جائیں۔“

”کیا علامات ہیں؟“

”جناب بچے نا تعلیم یافتہ ہیں۔“

”ایکسرے کرایا؟“

”جی کس چیز کا؟“

”کس چیز کا؟ اسکول کے بچوں کا۔“

”جی وہ تو نہیں کرایا، کرالیں گے۔“

”دیکھیے صاحب۔“ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ”اسکول کے لیے تو ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ فی الحال سارے بچوں کو جمع کر کے ایک ایک ٹیکہ ہیضے کا لگا دیجیے۔ بہت دوا ہے ہمارے پاس اور اسکول جہاں بنانا مقصود ہے وہاں فی الحال ڈی ڈی ٹی چھڑک دیجیے۔“

وہ صاحب دوسری فائل آگے بڑھاتے ہیں۔ ”ابدالی روڈ کی حالت بہت خراب ہے۔ لوگ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ بعضوں کی تو ٹانگ بھی ٹوٹ جاتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ”ہاں ابدالی روڈ کی حالت واقعی خراب ہے۔ فریکچر ہے۔ اس کا بھی ایکسرے کرانا ضروری ہے۔ فی الحال تو پولٹس کی تہہ جما کر پٹی باندھی دی جائے۔“

”جی سڑک کے؟“

”ارے نہیں، زخمی ہونے والوں کے۔“

اس مسند پر ڈاکٹروں کا حق ثابت ہے تو حکیموں کا کیوں نہیں۔ ہمارے مہربان فاضل طب حکیم بقل بطورا صاحب بھی اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ دفتر میں مسند بچھی ہے۔ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔

جو شخص فائل لے کر اندر آتا ہے، پہلے اس کی نبض دیکھتے ہیں۔ اسے جوشاندے کا پیالہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد احوال سنتے ہیں۔

اہلکار یہاں بھی وہی بات دہراتا ہے کہ پرائمری اسکول چاہیے اور سڑک مرمّت طلب ہے۔

حکیم صاحب فکرمند ہو کر فرماتے ہیں۔

”جی ہاں، میں نے بلدیہ کے مسائل کا قارورہ دیکھا ہے۔ واقعی بڑی خراب حالت ہے۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ سارے عملے کو جلاب دینا پڑے گا۔

اب رہا پانی، تو گویا ریسرچ اور تحقیقات کے بعد کے ڈی اے کے انجینئروں نے بھی یہ راز پالیا ہے کہ شہر کی شادابی سے پانی کا قریبی تعلق ہے۔ یہ بات ہم نے بھی کہی تھی لیکن ہم ٹیکنیکل آدمی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اس دعوے کے لیے ثبوت میں شواہد اور دلیلیں نہیں تھیں۔

بہرحال اس اہم انکشاف کے بعد کیا ہم توقع کریں کہ ہماری ٹنکی میں پانی آیا کرے گا۔ اور علامہ اقبال ٹاؤن کے پارک کی طرف توجہ کی جائے گی۔ جس میں کتے لوٹتے ہیں بلکہ اب تو وہ بھی لوٹتے لوٹتے تنگ آ گئے ہیں۔

(1968 میں لکھا گیا)

بیادِ محمود ریاض

اب وہ آئینہ صفت لوگ کہاں سے لائیں
سلسلے ختم ہوئے انجمن آرائی کے

آئینہ صفت

سمیرا احمد

بڑے لوگ زمانوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں پھر بڑے زمانوں کے بعد ان کے بڑا ہونے کا— احساس ہوتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ اس شخص کا موجود ہونا کسی نعمت کے مستقل ہونے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کچھ اہم ہونا طے پایا تھا تب ہی تو۔ کچھ شروع ہو کر تکمیل تک لے جانا مقصود ٹھہرا ہے، اس لیے تو یہ انسان دنیا میں لایا گیا ہے۔

وہ انسان جو علم و ادب کی کسی بھی چیز سے منسلک ہو کر بڑا بنا ہو، وہ صرف بڑا نہیں عظیم ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کامیاب ہو کر ایک مکمل ادارہ بن کر سامنے آئے ہوں۔ ایسے ادارے جو کئی سو، ہزاروں، بلکہ لاکھوں لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے سوچنے سمجھنے کے انداز کو بدل دیتے ہیں۔ انہیں نئی سوچ اور افق دیتے ہیں۔ مستقبل کی معماری کے لیے کچھ گُر سکھاتے ہیں۔ ایسے افراد نایاب ہوتے ہیں جو نئی تاریخیں رقم کرتے ہیں۔ اپنی سوجھ بوجھ، لگن اور جنون سے وہ کر گزرتے ہیں جو پہلے کسی کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

زہر کا پیالہ پینے کے بعد سقراط نے کہا تھا کہ

”صرف جسم مر رہا ہے۔ سقراط زندہ ہے۔“

محمود ریاض جیسے لوگ بھی ایسے ہی زندہ ہیں۔ ہر چیز کو فنا ہے، لیکن علم قیامت تک رہنے والی چیز ہے۔ دانش مندی کی باتیں، حکمت کے راز کسی زہر سے مرنے والے نہیں ہیں۔ آپ دانش مند ہیں تو زندگی جسم کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ دانش بانٹ دی ہے تو آپ نے اپنی زندگی تقسیم کر دی ہے۔ آپ زندہ ہیں کسی کتاب میں، سوچ میں، حکمت و تدبر میں۔ ہاں جسم کا سفر رک جاتا ہے، لیکن کوشش کا سفر جاری رہتا ہے۔ جس انسان نے اپنی زندگی کی سانسوں کو زمین تیار کرنے، اس میں بیج بونے اور ہل جوتنے میں لگایا ہو، اور وہ بیج پودے سے درخت بن کر چھاؤں دینے لگا ہو، وہ انسان اپنی ایک سانس کا حق ادا کر چکا ہوتا ہے۔

اشفاق احمد کہتے ہیں کہ ”انسان ہل چلا سکتا ہے۔ زمین تیار کر سکتا ہے۔ پانی دے سکتا ہے۔ بوائی کر سکتا ہے لیکن بیج کو پھاڑ کر اس میں سے بوٹا پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ علم، علیم مطلق کے پاس ہے اگر اس نے چاہا اور پسند فرمایا تو یہ بوٹا پیدا کرنے کا علم بھی انسان کو عطا کر دے گا۔

یقین جانیں اللہ کو بندے کی کوشش بہت پسند ہے۔ اس کی کوشش، محنت، لگن۔ وہ ایسے بیج پر بوٹا ضرور لگاتا ہے، جس کے پھل پر کسی ایک کا قبضہ نہ ہو۔ جس پر سب کا حق ہو۔ جس کی موجودگی سے سب کو سکھ ملے۔ ٹھنڈی ہوا چلے تو لو کی گرمی کو پچھاڑ دے۔

خواتین ڈائجسٹ کا بیج، محمود ریاض صاحب نے نیک نیتی کی زمین تیار کر کے، کوشش کا ہل چلا کر، خوش امیدی کا پانی دے کر لگایا تھا، اسے اللہ نے تناور درخت بنا دیا ہے۔ اس کی چھاؤں میں آپ، ہم اور سب بیٹھے ہیں۔ ہمارے اُردو ادب کو ہر طرز کی، ہر صنف کی کہانیاں مل رہی ہیں۔ ادیب پھل پھول رہے ہیں۔ قارئین ان لکھاریوں کی کاوشوں پر نازاں ہیں۔

ہم ایسے انسان کے شکر گزار ہیں جو معمار بنے تعمیرِ نو کے۔

☆

روشنی کا سفر

عطیہ خالد

یہ دنیا بے شمار فنون اور ان کے ماہرین کے قصوں سے بھری پڑی ہے۔ کوئی فن مصوری میں نام کما گیا تو کوئی فن خطاطی میں۔ کسی نے عمارتوں میں مینا کاری کے جوہر دکھلائے تو کوئی فن تیشہ گری کا ماہر ٹھہرا۔ کسی نے رقص کو اوج کمال تک پہنچایا تو کوئی موسیقار اپنی تانوں سے بارش برسانے کا کمال دکھا گیا۔ غرض ہر فن میں ایسے ایسے ماہرین پیدا ہوتے رہے جو اپنے اپنے فن کو جاودانی بخشتے رہے۔

اردو ادب کی دنیا بھی فنون کی دنیا میں سے ایک ہے جہاں برصغیر کے نامور ادیبوں اور مصنفین نے نام کمایا ہے۔ اس کی خوب صورتی اور رنگینی کے کیا کہنے۔ ہر ادیب ایک نئے رنگ اور اسلوب کے جہاں کا در وا کرتا ہے، ایک نئی دنیا سے متعارف کرواتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ ان ناموروں کے تذکروں سے بھرے پڑی ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد اس جہت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

گھروں کی چار دیواری میں رہنے والی خواتین کے لیے پرچوں کا اجرا ہوا۔ خواتین، شعاع اور کرن۔ جن کی داغ بیل محمود ریاض صاحب نے ڈالی۔ یہ ڈائجسٹ کیا تھے، خوب صورت اذہان میں پلتی نت نئی کہانیوں کے لیے ایک پلیٹ فارم۔ اب تک چھپے ہوئے بند دریچوں کے پیچھے پنپتے ہوئے خیالات کی بارش۔

یہ ایک عہد سازی کی داستان ہے، ایک نئے دور کی کہانی جو عورتوں کی زندگی میں در آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مصنفات کی ایک بڑی تعداد سامنے آگئی اور پھر سال بہ سال اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور اس کا سہرا سجتا ہے محمود ریاض صاحب کے سر پر۔ جنہوں نے اس عظیم کام کا آغاز کیا پھر اسے اپنے لہو سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ ان کے دست راست ان کے دونوں بیٹے محمود بابر فیصل اور محمود خاور اس سفر میں انہیں بہت جلد تنہا کر گئے۔ آہ! بوڑھے باپ کے جوان بیٹوں کو اجل اچک کر لے گئی اور وہ تنہا رہ گئے۔ لیکن انہوں نے اپنا مشن نہیں چھوڑا۔ ڈائجسٹ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید نکھرتے گئے اور نئی نئی مصنفات منظر عام پر آتی چلی گئیں۔

بحیثیت قاری میرا تعارف ریاض صاحب سے قریباً تیس سال پرانا ہے۔ اور بطور مصنفہ میں ان کے اس دنیا سے جانے کے سولہ سترہ سال بعد ان سے متعارف ہوئی ہوں۔ ان کی کاوشوں کو جانا ہے۔ ادارے کی بنیادوں میں ان کی انتھک محنت کو محسوس کیا ہے۔ ان کی لگن سے، ان کی نئے جہانوں کی دریافت اور جستجو کے فن سے آشنا ہوئی ہوں اور اس پر بے ساختہ دل سے داد و تحسین نکلتی ہے کہ واہ کام ہو تو ایسا! لگن ہو تو ایسی!

میں سوچتی ہوں اگر ان کی زندگی میں میری تحریریں ادارے تک پہنچتیں تو ان کی کیا رائے ہوتی۔ اگر ان سے میری ملاقات ہوتی تو مجھے کتنی خوشی ہوتی۔ میرا تخیل مجھے اڑائے اڑائے اس سادہ سے دفتر میں پہنچاتا ہے جو ایک مکمل مستند درس گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں محمود ریاض صاحب اپنی میز کرسی پر موجود ہیں۔ میز پر کاغذوں کے انبار ہیں۔ یہی کاغذ ہیں جنہیں روپہلے پیراہن اوڑھا کر خواتین، شعاع اور کرن کے روپ میں قارئین تک پہنچایا جاتا ہے۔ دوسری طرف امتل کی میز دھری ہے۔ لطیف گفتگو جاری ہے۔ کہانیوں پر تبصرے ہیں۔ مصنفات کے اسلوب بیان کو زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ کہیں امتل کو اختلاف ہے کہیں ریاض صاحب انہیں سمجھا رہے ہیں۔ دو تین کہنہ مشق مصنفات بھی صوفے پر بیٹھی شریک گفتگو ہیں۔ ایسا ماحول ہو اور چائے نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لذیذ خوشبودار چائے کے ختم ہونے تک سب ایک رائے پر متفق ہیں۔ امتل بھی مسکرا رہی ہیں۔ مصنفات بھی خوش ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ریاض صاحب کی آنکھوں کی مسکراہٹ اور چمک بتا رہی ہے کہ انہوں نے سب ہی کو قائل کر لیا ہے۔

یہ ایک جھلک ہے اس داستان کی جس نے گزشتہ کئی دہائیوں سے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ایک نئے دور، نئی جہت کی بنیاد ڈال کر اس کی آبیاری کی ہے اس کو رنگا رنگ پھولوں سے مزین، مضبوط اور توانا شجر کی شکل دی ہے۔ ان جریدوں میں شائع ہونے والی تحاریر نے ان گنت بچیوں، لڑکیوں کی درست سمتیں متعین کیں، اُجڑتے گھروں کو بسایا، خواتین کو سلیقہ مند بنایا، کچے ذہنوں کو مثبت تخیل کی اُڑان بخشی، بلاشبہ ان جریدوں نے ایک دنیا سنوار دی۔ یہ سب ہوا لیکن اس خوب صورت تعبیر کا خواب ریاض صاحب نے دیکھا۔ ایسی شخصیتیں جو پیچھے رہ کر ایسے عظیم کار ہائے نمایاں انجام دیتی ہیں۔ دعائے خیر کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے اہل و عیال کو اپنے رحم سے نوازے۔ آمین

زمیں کے اندر بھی روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

معروف فنکارہ

نائلہ جعفری سے ملاقات

شاہین رشید

کینسر کا نام ہی بہت خوفناک ہے کسی کے بارے میں پتا چلے کہ اسے کینسر ہے تو کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود دل ہول جاتا ہے تو سوچیے کہ جسے یہ مرض ہو اور اسے پتا بھی ہو کہ مجھے یہ بیماری ہے تو اس کی اپنی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ مگر اللہ اگر پریشانی دیتا ہے تو سہنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے...... اور بیماری سے لڑنے کی ہمت بھی۔

نائلہ جعفری کو کون نہیں جانتا۔ بہترین پرفارمر، بہترین انسان، جب پردہ اسکرین سے غائب ہوئیں تو سوچا کہ شاید اپنے کام کے لیے زیادہ ہی محتاط ہوگئی ہوں گی۔ اپنی مرضی کا کردار نہیں ملا ہوگا تو نہیں کیا ہوگا...... مگر کھوج لگانے پر پتا چلا کہ نائلہ بیمار ہے اور وہ بھی کینسر کے مرض میں۔ خیر جو دل پر گزری۔ وہ آپ سمجھ سکتے ہیں...... بس دل ہی دل میں اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگتی رہی...... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ نے اسے صحت دی اور اب وہ پھر فیلڈ کی طرف لوٹ آئی ہے۔ نائلہ جعفری نے بیماری کے یہ دن کیسے کاٹے‘ کیا کیا سہا اور کس طرح سہا۔ آیئے، آپ کو بھی بتائیں۔

☆ ”کیسی ہیں نائلہ...... زندگی کی طرف لوٹنا مبارک ہو؟“

○ ”بہت شکریہ...... اور الحمدللہ اب میں کافی بہتر ہوں۔“

☆ ”اللہ آپ کو ہمیشہ صحت وتندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔ یہ بتائیں ”نائلہ“ کہ آپ کا علاج چل رہا ہے یا مکمل ہوگیا ہے؟“

○ ”جی...... میرا علاج ابھی چل رہا ہے۔ میجر سرجری کی ڈاکٹرز نے مگر اس کے بعد پیچیدگیاں ہوگئی تھیں۔ لیکن الحمدللہ اب میں بہت بہتر ہوں اور ہر روز بہتری کی طرف ہی جارہی ہوں۔ کچھ آپریشن اور سرجری کا ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں اور اللہ نے چاہا تو وہ بھی ٹھیک ہوجائیں گی اور علاج کے بعد میں بہت اچھا محسوس کررہی ہوں۔ زندگی کی طرف واپس آنا بہت اچھا لگا۔ بالکل ایک نیا تجربہ ہے اور جس طرح ایک بچے کو کچھ پا کے خوشی ہوتی ہے‘ اسی طرح مجھے۔ نئی زندگی پا کے خوشی ہورہی ہے۔ ہر چیز مجھے نئی لگ رہی ہے اور ہر چیز مجھے خوشی دیتی ہے۔ جب میں چلتی ہوں جب میں کوئی کام کرتی ہوں، جب میں کچھ کھاتی ہوں تو مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے کہ اچھا میں یہ بھی کھا سکتی ہوں۔ یہ بھی پی سکتی ہوں۔ میں اپنی خوشی کو لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔“

☆ ”تو کب تک چلے گا علاج؟“

○ ”جی علاج ابھی چلے گا کہ جب ایک بار کینسر ہوجائے تو ایک تو اس کا علاج لمبا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی ڈر لگتا ہے کہ دوبارہ نہ ہوجائے تو بہت خیال اور بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ لائف اسٹائل بدل جاتا ہے۔ جس طرح ہم پہلے ایک لاپروا زندگی گزار رہے ہوتے‘ اس طرح اب زندگی نہیں گزار سکتے اور نہ ہی گزارنی چاہیے۔“

☆ ”زندگی کی طرف لوٹنے میں کتنا عرصہ لگا اور بیماری کے دوران کون قریب رہا، کون دور ہوا؟“

○ ”بیماری کا جو بھی عرصہ تھا‘ وہ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ لیکن یہ دور میرے لیے ایک اثاثے کی حیثیت بھی رکھتا ہے کیونکہ اس بیماری کے دوران مجھے لوگوں سے بہت زیادہ پیار ملا۔

دنیا بھر میں میرے لیے دعائیں کی گئیں۔ پانچوں وقت کی نمازوں میں‘ رات کی نمازوں میں‘ جمعہ کے خطبوں میں اور آپ دیکھیے کہ اس کے کرم سے مسجدوں میں تو دعائیں ہوئیں ہی لیکن میرے لیے مندروں میں‘ کلیساؤں میں (چرچ) دعائیں ہوئیں اور مسلسل لوگ دعائیں کراتے رہے۔ لوگوں نے میرے نام کے عمرے کیے۔ میرے نام کے طواف کیے‘ خانہ کعبہ میں ان دعاؤں نے اور لوگوں کی محبت نے مجھے دوبارہ زندہ کیا۔

میرے اردگرد میرے بھائیوں نے، میری ماں نے، میری بہنوں نے‘ بہنوں کے بچوں نے میری بہت خدمت کی۔ سب بہن بھائیوں نے میری تیمارداری کے لیے ڈیوٹیاں لگالیں۔ اسپتال لے جانا، لانا، کیموتھراپی کے وقت سر پر کھڑے رہنا۔ آپریشن کے بعد میری بہن نے میری بہت خدمت خاطر کی۔ اس نے اپنا گھر تقریباً چھوڑ دیا کچھ عرصے کے لیے۔ اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ اس وقت میری بہن کو میری بہت ضرورت ہے لہٰذا کچھ عرصہ گھر کو آپ سنبھالیں۔

میری ماں تو ہر وقت میرے ساتھ رہیں اور ان کی دعا سے بڑھ کر بھلا کس کی دعا ہوگی اور ماں کی دعا کا ساتھ ہونا بڑے نصیب کی بات ہوتی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے میرے لیے دعائیں کیں ان کی میں بہت احسان مند ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم دے کہ ان ہی کی دعاؤں کی وجہ سے مجھے زندگی ملی ہے۔‘

☆ ”اس بیماری کے دوران بہت سے نئے تجربات سے گزریں اور کیا آپ نے ہمت ہاری؟“

○ ”مشاہدات جو بیماری میں ہوئے اس نے میرے لیے ایک نئی دنیا کھولی ہے۔ تجربات سے بہت کچھ سیکھا اور اس بیماری نے مجھے سوچنے کے نئے انداز دیے ہیں۔ ”کینسر“ کا نام ہی بہت خوف زدہ کردینے والا ہوتا ہے اور جب مجھے پتا چلا تو بظاہر تو میرا کوئی ری ایکشن نہیں تھا لیکن اندر سے جیسے سن ہوگئی تھی اور سوچا کہ کیا یہ میرا اختتام ہے اور اگر اختتام ہے تو میں نے کیا کیا ہے؟ کیا زندگی میں کوئی ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے ایسا ہوا...... حالانکہ زندگی بھر تو انسانیت کے ہی کام کیے ہیں۔ پھر احساس ہوا کہ کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ تب سوچا کہ اگر زندگی مل گئی تو اور زیادہ اچھے کام کرنے کی کوشش کروں گی۔

اب ان شاءاللہ پہلا مرحلہ تو غریب بستی میں غریب بچوں کے لیے اسکول کھولنا ہے اور وہاں انہیں کھانا بھی دیا جائے گا اور تعلیم بھی...... اور اس کے بعد ماحولیات پر کام کرنا ہے۔ کیونکہ ماحولیات اچھی ہو اور آپ کی خوراک اچھی ہو تو بیماریاں آپ کے قریب نہیں آتیں۔ اور اگر آ بھی جائیں مقابلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

میں نے بیماری کے دوران یہ بات نوٹ کی کہ جب لوگ میری عیادت کو آتے تھے تو یہ جملہ ضرور بولتے تھے کہ ”آپ ہمارے لیے دعا کریں“ تو میں بہت حیران و پریشان ہوجاتی تھی کہ بیمار تو میں ہوں‘

ضرورت ہے۔ یہ لوگ مجھ سے یوں کہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے دعا کریں۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ لیکن پھر مجھے کسی نے بتایا کہ اس کے پیچھے کیا وجہ ہے۔ بیمار کی دعا جلد قبول ہوتی ہے اور جب وجہ پتا چلی تو مجھے یہ بات صحیح لگی ...... اور یہ کوئی کہنے کی بات نہیں تھی۔ دعا تو میں ہمیشہ ہی سب کے لیے کرتی تھی۔ اور اب دعا کی کیا اہمیت ہے؟ مجھ پر زیادہ اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کیونکہ دعاؤں کے ذریعے ہی مجھے دوبارہ زندگی ملی ہے اور ابھی بھی جہاں کہیں مجھے کوئی ملتا ہے' خاص طور پر یہی بات کہتا ہے کہ آپ کے لیے دعا کی تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ خانہ کعبہ میں آپ کا طواف کیا تو میں نے جزاک اللہ کہا تو کہنے لگے ''ارے آپ یقین کریں آپ کی شکل ہمارے سامنے آجاتی تھی جب ہم طواف کرنے لگتے تھے۔ تو اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے۔''

☆ ''جو لوگ یا جو خواتین کینسر میں مبتلا ہیں ان کے لیے آپ کیا کہیں گی۔ کس طرح طرح تسلی دیں گی کہ ان میں جینے کی امنگ پیدا ہو؟''

○ ''جو لوگ کینسر جیسے مرض میں مبتلا ہیں' ان کے لیے میں اپنے تجربے سے بات کروں گی۔ اللہ پر ایمان، بھروسا اور یقین ہونا بہت ضروری ہے۔ ایسے موقع پر ایمان اور یقین معجزاتی طور پر کام کرتا ہے۔ ہمارا مذہب کہتا ہے کہ مایوس نہیں ہونا کیونکہ مایوسی گناہ ہے۔ تو امید کا دامن کبھی نہ چھوڑیں۔ بی پوزیٹو کہ اللہ نے ضرور اپنا کرم کرنا ہے اور وہ کرے گا اور جب آپ کا یقین پختہ ہوتا ہے تو پھر آپ کا رب بھی آپ پر کرم کرتا ہے اور یہ حوصلہ اور یہ یقین اکیلے بیمار بندے کو اپنے اوپر نہیں آسکتا کیونکہ وہ اندر سے کمزور ہو چکا ہوتا ہے۔ اس سے فیصلے نہیں ہو رہے ہوتے۔ اس سے ہلا جلا بھی نہیں جا رہا ہوتا۔ اسے تو بیماری اندر ہی اندر کھا رہی ہوتی ہے۔ لیکن اردگرد کے لوگوں کا پیار' ان کی سپورٹ اس کو حوصلہ دیتی ہے' اردگرد کے لوگوں کا تعاون بہت ضروری ہوتا ہے۔ میں نے کئی گھرانے تو ایسے دیکھے ہیں کہ جہاں عورتوں کو برا بھلا کہا جا رہا ہوتا ہے کہ تمہاری بیماری پہ ہمارا پیسہ خرچ ہو رہا ہے تو بس یقین اور سوشل سپورٹ بہت ضروری ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ معجزاتی طور سے اپنا کرم کر دیتا ہے۔''

☆ ''جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کو کینسر ہے تو آپ کا فوری ری ایکشن کیا تھا۔ زندگی سے نفرت ہوئی یا محبت؟''

○ ''پہلی بار جب یہ کنفرم ہوا کہ مجھے کینسر ہے اور پھر ایک دم سے کہہ دیا گیا کہ آپ کا کینسر اسٹیج تھری پر ہے اور ہم آپ کو نہیں لے سکتے تو یہ سن کر فوری طور پر میرے چہرے پر مسکراہٹ آگئی اور میں مسکرا مسکرا کر اپنے بھائیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''او مائی گاڈ'' اچھا یہ اسٹیج ہے۔ ''اب کیا ہوگا'' یہ جملے میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے اور فوری طور پر یہ خیالات آئے پھر میں خوف سے گر گئی۔ پھر کیا ہوا۔ یہ بعد کی کہانی ہے اور خوف سے زیادہ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں جو ہر وقت کام کی عادی تھی جسے فضول میں گھر میں بیٹھنا نہیں آتا تھا وہ ''دو سال'' بیڈ پر رہی تو یہ بے بسی مجھے بہت پریشان کرتی تھی موت کا خوف نہیں تھا۔ بس بے بسی پر رونا آتا تھا۔''

☆ ''اللہ کے نزدیک ہوئیں یا دور؟''

○ ''بہت نزدیک ہو گئی ہوں بہت زیادہ' اب تو کوئی شکوہ رہا ہی نہیں ہے۔''

☆ ''کیا سوچتی تھیں، زندگی سے مایوس ہو گئی تھیں یا اسے گزارنے کے طریقے سوچتی تھیں؟''

○ ''جب علاج سے بھی زیادہ افاقہ نہ ہوا اور جسم کی تکالیف بھی بڑھ گئیں تو مایوسی نے گھیرا تنگ کیا اور بیماری میں تو مایوسی بار بار ہوتی ہے۔ لیکن انسان کو اپنی طاقت لگا کر اس بیماری اور مایوسی سے نکلنا ہوتا ہے اور اللہ کے بھروسے کو مضبوط کرنا ہوتا ہے کہ یقیناً اللہ بہتر کرے گا اور ہمیں ان تکالیف سے نجات دلائے گا۔ تو طبیعت میں چڑچڑا پن آگیا۔ کسی کا پوچھنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کوئی بار بار پوچھے کہ آپ کیسی ہیں تو اس کو جواب دیتے دیتے بھی بندہ تنگ آجاتا ہے۔ بہرحال مشکل وقت تھا۔''

☆ ''آپ ——— کافی ڈراموں میں کام کر رہی تھیں۔ لیکن جب بیماری کا پتا چلا تو اپنا کام مکمل کروایا یا چھوڑ دیا فوری طور پر؟''

○ ''جب میں بیمار ہوئی تو آن سیٹ ایک ''سوپ'' تھا، ایک سیریل ختم ہو رہی تھی اور دو سیریلز اسٹارٹ ہو رہی تھیں۔ جو سیریل ختم ہو رہی تھی اس کا کام تو میں نے مکمل کروالیا اور جو دو شروع ہونی تھیں ان میں ایک تو یوں سمجھیے کہ شروع ہو چکی تھی یعنی اسٹارٹ ہی تھا تو میں نے پروڈکشن والوں کو اپنی تکالیف کا بتایا اس وقت کینسر کا انکشاف نہیں ہوا تھا اور ان سے معذرت کرلی اگرچہ ان کا خاصا نقصان بھی ہوا۔

جس سیریل میں میرا بہت اسٹرانگ رول تھا ان سے میں چار ماہ ریکویسٹ کرتی رہی کہ آپ میرے کردار کی ڈیتھ کرادیں تاکہ میں اپنا آپریشن کرواسکوں۔ مگر وہ چار مہینے اس کردار کو چلاتے رہے۔ مجھ سے کام کرواتے رہے اس دوران کینسر اتنا پھیل گیا تھا کہ آخری سین جو میری ڈیتھ کا تھا وہ مجھ سے ہو ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سین کوئی بھی دیکھے تو یہی کہے گا کہ یہ تو پہلے ہی مر رہی ہے' اسے مزید مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ خیر شکر کہ وہ کام ختم ہوا اور اس کے بعد بھرپور طریقے سے میں نے اپنا علاج شروع کروایا۔''

☆ ''صحت یاب ہونے کے بعد کوئی ڈراما سائن کیا۔ کوئی ڈرامہ انڈر پروڈکشن ہے؟''

''میرا کوئی ڈراما آن ایر یا انڈر پروڈکشن نہیں ہے۔ میں دو سال سے بستر پر ہوں۔ میں دس منٹ سے زیادہ ابھی بھی کھڑی نہیں ہو سکتی اور ابھی دو میجر سرجری ہونی ہیں میری۔ ہاں ڈرامہ سیریل ''کتنی گرہیں باقی ہیں'' کی انجیلن ملک نے مجھ سے رابطہ کیا تھا کہ دو دن کی شوٹ ہے تو آپ کریں۔ تو شکریہ انجیلن ملک کا کہ اس نے مجھے اس درد میں احساس دلایا کہ میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ اس نے کہا کہ دو دن کا کام ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ کر کر سکتی ہیں اور میرے خیال میں پاکستان کی تاریخ میں شاید میں وہ واحد آرٹسٹ ہوں گی جو کینسر کے اسٹیج تھری کی مریضہ تھی اور ڈاکٹرز نے تقریباً مایوس کر دیا تھا اور اس وقت میرے سر پر ایک بال بھی نہیں تھا۔ مگر چونکہ وہ کردار اسکارف لے کر کرنے والا تھا تو میں نے آسانی سے کرلیا اور لوگوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ میرے سر پر بال نہیں ہیں اور میں کینسر کی مریضہ ہوں۔ ابھی کوئی کام نہیں کر رہی اور نہ ہی فی الحال ایسا کوئی ارادہ ہے۔ اب اگر کچھ کروں گی بھی تو انسانیت کے لیے کچھ کروں گی۔ ان شاءاللہ۔''

☆ ''نائلہ! اگر آپ کام نہیں کریں گی تو گزر اوقات کیسے ہوگی اور کیا آپ کو یہ گوارا ہوگا کہ آپ دوسروں پر خواہ اپنے بہن بھائی اور ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں انحصار کریں؟''

○ ''یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک کام کرنے والا خواہ وہ مرد ہو یا عورت' گھر میں آرام سے بیٹھ جائے۔ جس کو خود عزت کے ساتھ کمانے کی عادت

[illegible] ہے اور اپنے [illegible] کرنے کی عادت ہوتی ہے وہ کبھی ہاتھ پاؤں چھوڑ کر آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔ میرے ذہن میں کچھ ایسے کام ہیں جو شوبز سے ہٹ کر ہیں اور جو میں کرنا چاہوں گی خاص طور پر آرگینگ چیزوں کے حوالے سے (Organic) آرگینگ چیزیں خواہ وہ کھانے پینے کی ہوں یا کچھ اور ہوں خالص نہیں ملتیں۔

بیماری کے دوران جن مسائل سے میں گزری اس میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ مجھے اچھا صاف ستھرا اور خالص کھانا میسر نہیں تھا۔ لاہور میں تو پھر فوڈ اتھارٹی کچھ کام کرتی ہے اور اس سلسلے میں ہزاروں من گوشت بھی تلف کر چکی ہے۔ جبکہ ہمارے کراچی میں تو گدھے، گھوڑے اور کتے سب کھائے چلے جا رہے ہیں کوئی احتساب نہیں۔ کوئی کارروائی نہیں، تو بیماری کے دوران خالص غذا کے لیے بہت پریشانی ہوتی تھی تب ہی میں نے سوچا تھا کہ زندگی نے موقعہ دیا تو اس سلسلے کے لیے ضرور کوئی کام کروں گی اور کام وہی اچھا ہے جس میں انسانیت کے لیے کچھ بھلائی ہو۔"

☆"اپنی نجی زندگی کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟"

o "ہاں...... کیوں نہیں...... میری زندگی تو کھلی کتاب کی طرح ہے۔ کچھ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے...... اور میں نگیٹو سائیڈ کی طرف جانا ہی نہیں چاہتی اور جو کچھ ہوتا ہے قدرت کی طرف سے ہوتا ہے اس میں کسی کا قصور نہیں ہوتا۔ شوہر سے الگ ہوں تو عزت واحترام کے ساتھ ہوں کیونکہ اللہ نے آپ کو حق دیا ہے اس چیز کا اور جو قرآن نے کہا ہے اسے پورا کریں۔ میاں کے ساتھ نہ رہنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آٹھ نو سال کے شادی کے عرصے میں وہ وہ میرے لیے کچھ نہیں کر پائے تھے۔ مطلب مرد کا جو فرض ہوتا ہے کہ وہ بیوی کا "نان نفقہ" پورا کرے وہ نہیں کر پاتے تھے تو میں نے خلع لے لی اور میں بہت مطمئن ہوں۔ بہت خوش ہوں اور میرے سابق شوہر کی اب امریکن بیوی ہے۔ وہ ان سے عمر میں بڑی بھی ہے اور سمجھ دار بھی ہے اور اس نے بہت اچھے طریقے سے ہینڈل کیا ہے علی (سابقہ شوہر) کو۔ میں بہت خوش ہوں، اگر کسی کی زندگی بنتی ہے —— تو خوش ہونا چاہیے اور دعا دینی چاہیے اور میں بھی اپنی لائف میں بہت خوش ہوں۔ میرے بہن بھائی کے بچے میرے اردگرد ہیں۔ میری ماں حیات ہے۔ اس لحاظ سے میری ایک مکمل فیملی ہے جو میرا خیال رکھتی ہے مجھ سے پیار کرتی ہے اور تکلیف میں اگر کوئی ساتھ چھوڑتا ہے یا ہاتھ اٹھا لیتا ہے تو وہ شوہر کا ہوتا ہے ہمدردی کا، محبت کا اور خیال رکھنے کا' سپورٹ کا اور ایسے موقع پر مریض کا سروائیو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میری اس تکلیف میں میرے اردگرد کے جو لوگ تھے۔ وہ بہت مضبوط تھے یا تو اولاد کی مضبوطی ہوتی ہے یا بہن بھائیوں کی، تو اولاد تو میری تھی نہیں' تو مجھے اس قدرت کی طرف سے عطا کیے رشتوں سے بہت سکون ملا ہے۔ بہت پیار محبت ملی ہے اور بہت سپورٹ ملا ہے جس کی وجہ سے آج میں پھر سے اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔"

☆"اور کچھ اس انٹرویو کے ذریعے سے کہنا چاہیں گی؟"

o "ہاں میں اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہوں گی کہ میں بہت جلد اپنی ویب پیج متعارف کرا رہی ہوں۔ اور اس ویب پیج کے ذریعے سے میں دو گھنٹے فون پر کالرز کے سوالات کے جوابات بھی دوں گی جو مجھے اپنی پرابلمز بتائیں گے۔ جو کینسر سے متعلق سوال کریں گے اور میں اپنا تجربہ شیئر کروں گی تو اس طرح ایک "فورم" بن جائے گا اور اس "فورم" میں ہم سب پیشنٹ جو کینسر میں مبتلا ہیں اور جو دوسرے اگر رہنمائی لینا چاہیں تو وہ بھی ہم سب سے مل کر بات کر سکتے ہیں۔ اور اس کا دائرہ وسیع کریں گے۔ بس اللہ میرا ساتھ دے (آمین)

☆"اس کے ساتھ ہی ہم نے نائلہ جعفری سے اجازت چاہی کہ طبیعت کی ناسازی میں بھی انہوں نے ہمیں انٹرویو دیا...... بہت شکریہ نائلہ جعفری۔

باتیں فیضان شیخ سے

شاہین رشید

☆"اصلی نام؟"

o۔ فیضان شیخ

☆ پیار کا نام؟

o۔ فیضی

☆ تاریخ پیدائش / شہر؟

o۔ 5 ستمبر 1986 / کراچی۔

☆ قد / ستارہ؟

o۔ 5 فٹ 9 انچ اور ستارہ Virgo (سنبلہ) ہے۔

☆ بہن بھائی آپ کا نمبر؟

o۔ ہم تین بھائی ہیں اور ایک بہن ایک بھائی اور بہن مجھ سے چھوٹے ہیں اور ایک بھائی بڑا ۔ جبکہ میرا نمبر دوسرا ہے۔

☆ تعلیم؟

o۔ گریجویٹ ہوں، میڈیا سائنسز اور ڈائریکٹر۔

☆ شادی؟

o ان شاء اللہ اگست میں ہوگی اور پسند سے ہے۔ ابھی صرف نکاح ہوا ہے۔

☆ شوبز میں آمد؟

o۔ محنت سے، جدوجہد سے اس فیلڈ میں آیا۔ اور میرا اس فیلڈ میں آنا کسی کو اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ والدین کا کہنا تھا کہ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کرو۔

☆ پہلا ڈراما؟

o۔ سات سُر رشتوں کے ’’پی ٹی وی سے آن ایر ہوا تھا۔

☆ آپ کے مشہور ڈرامے؟

o۔ ریڈی اسٹڈی گو’ ’غیرت‘ ‘ اور میں اور تم 2.0۔

☆ پہلی کمائی/ کس کو دی؟

o۔ پانچ ہزار اور امی کو دے دیے تھے۔

☆ شوبز کی بڑی برائی؟

o۔ فیورٹ ازم اور اقربا پروری۔

☆ آپ صبح اٹھ جاتے ہیں؟

o۔ جی سات بجے تک اٹھ جاتا ہوں۔

☆ صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے۔

o۔ دل چاہتا ہے کہ دوبارہ سو جاؤں۔

☆ اچھی یا بری خبر سب سے پہلے کسے سناتے ہیں؟

o۔ اپنی امی کو

☆ اپنے آپ میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟

o۔ کم سوچنا چاہتا ہوں۔

☆ فخر کا کوئی لمحہ؟

o۔ جب لوگ کام کی تعریف کرتے ہیں تو اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے۔

☆ بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی تک برقرار ہے؟

o۔ کم سونا۔

☆ طبیعت میں ضد کا عنصر؟

o۔ ہے...... کبھی کبھی ضدی ہو جاتا ہوں۔ مگر وہ ضد جائز ہوتی ہے۔

☆ اسپورٹس سے لگاؤ/ پسندیدہ کھیل؟

o۔ کھیلوں سے بہت لگاؤ ہے۔ اور مجھے کرکٹ اور بیڈمنٹن پسند ہے۔

☆ زندگی سے کیا سیکھا؟

o۔ کہ ہر دکھ سکھ میں آپ کی فیملی ہی آپ کے ساتھ ہوتی ہے۔

☆ اپنے آپ کو کس عمر کا تصور کرتے ہیں؟

o۔ جتنی عمر ہے میری اتنا ہی تصور کرتا ہوں۔

☆ عشق اور محبت میں فرق؟ آپ کو عشق ہوا یا محبت؟

o۔ عشق محبت کی انتہا کو کہتے ہیں اور مجھے دونوں ہوئے ہیں۔

☆ پہلی بار کیمرے کے سامنے آئے تو؟

o۔ تو بہت زیادہ کنفیوز تھا۔

☆ کبھی ہجوم میں تنہائی محسوس کی؟

o۔ اکثر ہوتی ہے جب لوگ نئے ہوں۔

☆ دل کی دھڑکن کب تیز ہو جاتی ہے؟

o۔ ایکشن کی آواز آنے سے پہلے (ریکارڈنگ کے وقت)۔

☆ مارننگ شو کی میزبانی ملے تو؟

o۔ جی میں تو روز ہی میزبانی کے فرائض انجام دیتا ہوں ’’اے آر وائی زندگی‘‘ پر۔

☆ گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟

o۔ امی سے۔

☆ بھوک میں آپ کی کیفیت؟

o۔ چڑچڑا ہو جاتا ہوں۔

☆ اگر کسی ایرلائن کا اوپن ٹکٹ ملے تو؟

o۔ تو لندن (یوکے) جاؤں گا۔

☆ اگر کسی ارب پتی کا بلینک چیک مل جائے تو؟

o ۔ تو اس کے اکاؤنٹ میں ایک روپیہ چھوڑ کر سب رقم نکال لوں گا۔

☆ سیاست میں آئے تو کس کو فالو کریں گے؟

o۔ کسی کو بھی نہیں۔ سب ایک جیسے ہیں۔

☆ ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہتے ہیں؟

o۔ کہ اپنے والدین کی عزت کی اہمیت کو سمجھیں۔

☆ جھوٹ کب بولتے ہیں؟

o۔ جب ڈر لگتا ہے۔

☆ گھر آ کر کیا دل چاہتا ہے؟

o۔ آرام کرنے کا دل چاہتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 281

PERFUMED TALC
خوشبو جو رہے دن بھر ساتھ
BLACK CAT PERFUMED TALC Romance
BLACK CAT PERFUMED TALC ELEGANT
BLACK CAT Romance
BLACK CAT
f/BlackCatPakistan
www.peridotproducts.com
اب تین نئی مسحور کن خوشبوؤں کے ساتھ

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

ستائیسویں قسط

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیو شمتی ...... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔ معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ، وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے، آئے کت اور وسامہ، معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیو شمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے، اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت مائی جان ہیں اور تین بچے، رامین، کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شامیر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

BOOKSPK

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے۔ مگر وہ انکار کر کے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آ جاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی ماموں، معاویہ کے والد اس رشتے سے ناخوش ہیں مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کر لیتا ہے۔ کچھ رد و کد کے بعد آئے کت بھی راضی ہو جاتی ہے۔

شامیر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے۔ مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والدین مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں، مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو دادی کے تمام لوگ نیکی سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر ازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلا پیمانے پر کرواتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

مٹھو بھائی خوش نصیب کو خودکشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا پتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صاحبت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شامیر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کر دیتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خودکشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شامیر کے جن سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شامیر ایک زیر تعمیر بنگلے پر اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شامیر خوش نصیب کو کمرے میں بند کر کے چلا جاتا ہے۔

آئے کت کسی بھی آسیب کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے اس کے خیال میں کوئی اسے ڈرا رہا ہے۔ مگر معاویہ اسے آسیب ہی سمجھتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے وہ نکاح کا انتظام کرتا ہے۔ مگر عین نکاح کے وقت آئے کت پراسرار انداز میں غائب ہو جاتی ہے۔

خوش نصیب تھوڑی کوشش کر کے باہر آ جاتی ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں اسے شامیر بیری والے ملنگ بابا کے ساتھ شیطانی عملیات میں مصروف نظر آتا ہے۔ وہیں جبران ہوتا ہے جو اسے دیکھ لیتا ہے۔ جبران، خوش نصیب کو وہاں سے نکال دیتا ہے فراڈیے شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ جبران درحقیقت معاویہ ہے جو کسی روح کی تلاش میں شامیر سے ٹکرایا ہے۔

شامیر کے دھمکانے پر خوش نصیب گھر میں کسی کو بھی اس کی اصلیت سے آگاہ نہیں کرتی، فضیلہ چچی صیام کا رشتہ شامیر اور کیف کے لیے منہا کا عندیہ دیتی ہیں۔ کیف گھر آتا ہے۔ جہاں خوش نصیب اسے شامیر کے بارے میں بتانا چاہتی ہے مگر صباحت تائی کے آنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

شامیر کو شیطان کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی پیشانی پر تل ہو۔ خوش نصیب اس کے خیالات اور دھمکیاں سن کر بہت پریشان ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کیف کو بتاتی ہے مگر کیف اس بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

شامیر اور صیام کی منگنی ہوتی ہے تو خوش نصیب کیف کی پسند کا بتاتی ہے یوں صیام کی منگنی شامیر کے بجائے کیف سے ہو جاتی ہے۔ کیف خوب غصہ کرتا ہے مگر خوش نصیب نے یہ سب صیام کو بچانے کے لیے کیا ہے کیوں کہ اس کی پیشانی پر بھی تل ہے۔

شامیر خوش نصیب کو نئے سرے سے دھمکاتا ہے۔ اپنے والدین کی شادی کی سالگرہ پر منفرا کی اتفاقی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے وہ اسے سب سے ملواتی ہے۔ سب اس کے حسن اور دولت سے متاثر ہوتے ہیں۔

بشام کے جنگل سے ایک عورت کی مسخ لاش ملتی ہے۔ اس کے جسم پر آئے کت کا عروسی جوڑا تھا، مگر معاویہ نے اسے آئے کت ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کی تلاش کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر اردشیر ازی نے اس سلسلے میں اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ آئے کت کے تمام اکاؤنٹس خالی پڑے تھے اور اس کا فریب کھل گیا تھا مگر ان سب باتوں کے باوجود معاویہ اس کی تلاش کا ہر ذریعہ اپناتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اس ناکامی نے اسے تلخ اور بدمزاج بنا دیا ہے مونٹوک میں اس کی منفرا اور آدم سے ملاقات رہتی ہے۔

خوش نصیب، عرفان ماموں کو شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ کیف کو اس کی باتوں پر ذرا یقین نہیں آتا۔ عرفات ماموں کو فالج ہو جاتا ہے۔

شامیر خوش نصیب کو دھمکاتا ہے کہ ماموں کو یہ سزا اس نے دی ہے اور آئندہ اس کے حمایتیوں کا اور وہ برا حشر کرے گا۔

ماہ نور، شامیر سے محبت کا اعتراف کرتی ہے۔ خوش نصیب اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔ فضیلہ چچی خوش نصیب کو بہو نہیں بنانا چاہتیں مگر شفیق چچا کے سمجھانے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ خوش نصیب، طوطے بھائی سے شادی پر معترض ہے مگر روشن امی اسے لفٹ نہیں کراتیں۔ خوش نصیب تمام سچائی عرفان ماموں کو بتاتی ہے۔ انہیں یقین آ جاتا ہے۔ کیف بھی سن لیتا ہے مگر شش و پنج کا شکار ہوتا ہے۔

صیام، کیف کی بے رخی سے تنگ آ کر شامیر کو خود سے شادی کرنے کا عندیہ دیتی ہے۔ شامیر انکار کر دیتا ہے۔

معاویہ، منفرا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ بات اپنے والد کو بتاتا ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور چاہتے کہ یہ شادی فلک بوس میں ہو۔ معاویہ راضی ہو جاتا ہے۔

خوش نصیب ایک شاپنگ مال میں معاویہ سے ٹکراتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کے حق میں اس کے گھر والوں کے سامنے گواہی دے، مگر معاویہ اس کی کسی بھی طرح کی مدد کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ خوش نصیب عرفات ماموں کے دوست مسٹر رضوی کے گھر پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی ہے۔ منفرا کو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسز رضوی کینیڈا شفٹ ہونے والی ہیں لہٰذا وہ منفرا سے خوش نصیب کی سفارش کرتی ہیں۔ منفرا خوش نصیب سے تمام حالات سن کر اس کی مدد کرنے کی خاطر اسے آیا رکھ لیتی ہے۔ معاویہ سخت مخالفت کرتا ہے، مگر بعد میں راضی ہو جاتا ہے۔ عرفات ماموں وفات پا جاتے ہیں۔ کیف ایک فیشن میگزین سے منسلک ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کی دوستی زرگل سے ہو جاتی ہے۔ ایک روز ان کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوتی ہے جس کی بھانجی کو ایک ڈبا پیر نے ہوس کا نشانہ بنا کر

نہیں مانتا، مگر زرگل ان پر یقین رکھتا ہے۔ دونوں میں بحث چھڑ جاتی ہے اور زرگل کے چیلنج پر کیف، زرگل اور یاسر کے ساتھ قلعہ فلک بوس اور آیوشمتی کا سراغ لگانے بشام جاتا ہے، مگر راستے میں ایک گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔

حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی' قلعہ فلک بوس پر فلم بنانے والی ٹیم کو لے جا رہی تھی۔ ان لوگوں کی موت سے زرگل خدشات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر کیف کے اصرار پر یہ لوگ بشام پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سلطان احمد نامی شخص کے گھر پر قیام کرتے ہیں۔ کیف فلک بوس کی تصویریں بناتا ہے مگر ایک کھائی میں گرنے کی وجہ سے کیمرے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کبیر کا بیٹا پاشا اسے کھائی میں گرنے سے بچالیتا ہے۔

کبیر ان تینوں کو آیوشمتی کے آسیب سے ڈراتا ہے اور انہیں قلعے میں اندر داخل ہونے نہیں دیتا۔ کیف اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ صیام سے شادی سے انکار پر وہ گھر چھوڑ کر آجاتا ہے۔ خوش نصیب اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار کیف کو سمجھتی ہے۔ کیف اسلام آباد میں اس کی تعلیم وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے مگر اس سے ملتا نہیں البتہ عرفات ماموں سے رابطہ رکھتا ہے۔ عرفات ماموں کی وفات کے بعد اسے خوش نصیب کی کچھ خبر نہیں۔ وہ اسے ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

صابر تایا اور شفیق چچا میں کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔ وہ گھر کا بٹوارہ کرلیتے ہیں۔ کیف کے والد اسے معاف کردیتے ہیں۔

خوش نصیب کو معاویہ کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ وہ بچوں' منفرا اور خوش نصیب کو لے کر قلعہ فلک بوس کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

کیف کو خبر ملتی ہے کہ قلعے کے اصل مالکان آرہے ہیں تو وہ ان کی آمد سے پہلے قلعے میں گھسنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ زرگل' کیف اور یاسر تینوں قلعے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں یاسر ایک پراسرار وجود کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

رونے کی آواز وسامہ کی تھی۔ منفرا اور خوش نصیب کو وہ دوسری منزل سے ملتا ہے۔ دونوں اس واقعے سے پریشان ہو جاتی ہیں۔ منفرا کیف سے مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ سلمان احمد کے گھر میں آگ لگ جاتی ہے اس واقعے کو آیوشمتی سے منسوب کرکے سلمان احمد بہانے سے کیف کو اپنے گھر سے نکال دیتا ہے کبیر بابا کیف کو بستی میں چور مشہور کردیتے ہیں۔

BOOKSPK
Online Magazine

بالآخر کیف، فلک بوس پہنچ جاتا ہے۔ کیف اور منفرا کو کبیر بابا مشکوک لگتے ہیں۔ خوش نصیب کے پاس شامیر کی تصویر دیکھ کر منفرا اس سے واقفیت کا اظہار کرتی ہے مگر بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

کیف رات کو اس کمرے کی تلاشی لینے جاتا ہے جہاں وسامہ پراسرار انداز میں پہنچ گیا تھا خوش نصیب اور منفرا اسے تلاش کرتی ہوئی خود بھی وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں ایک حیرت ناک منظر نظر آتا ہے۔

آیوشمتی، کیف کو اپنی کہانی سناتی ہے۔ منفرا اور خوش نصیب بھی وہاں آجاتی ہیں۔

آتے کت کا باپ پاکستانی اور ماں ترک تھی۔ خاندان والے اس شادی کو قبول نہیں کرتے۔ وہ آتے کت کو چھین کر اس کی ماں کو ترکی جانے پر مجبور کردیتے ہیں، آتے کت کے والد ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہو جاتے ہیں۔ آتے کت کو یتیم خانے میں داخل کرادیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے پر آتے کت کو احساس ہوتا ہے کہ ماں کے پاس جانے کے لیے پیسے ضروری ہیں، وہ پیسوں کے حصول کے لیے جائز، ناجائز ذرائع اختیار کرتی ہے۔

آتے کت جس اسپتال میں نرس ہے وہاں ایک روز معاویہ اور شیرازی اپنی زخمی بھائی وسامہ طالب کو لاتا ہے۔ وسامہ کو آتے کت پسند آجاتی ہے اور آتے کت کو معاویہ۔ معاویہ اپنے بھائی کا رشتہ دیتا ہے، آتے کت غلطی سے اسے معاویہ کا رشتہ سمجھ کے قبول کرلیتی ہے بعد میں وسامہ کے گھر والے اس شادی کو قبول نہیں کرتے۔ معاویہ دونوں کو فلک بوس بھیج دیتا ہے۔ فلک بوس پہنچ کر آتے کت کو آیوشمتی کی کہانی پتا چلتی ہے۔ وسامہ سے پیچھا چھڑانے اور معاویہ کو حاصل کرنے کے لیے وہ پاشا کے سامنے وسامہ کو نفسیاتی اور ظالم اور خود کو مظلوم ظاہر کرکے ہمدردی حاصل کرلیتی ہیں اور پاشا کی مدد سے وسامہ کو پراسرار واقعات سے ڈرا کر سارا الزام آیوشمتی پر لگادیتی ہے۔

پھر ایک سنہری صبح معاویہ وہاں آپہنچا۔

وسامہ کو معاویہ کی آمد سے بڑا حوصلہ ملا تھا۔ فلک بوس پر چھایا ہوا خوف اور خاموشی کا سایہ بھی معاویہ کے قہقہوں اور باتوں سے چھٹ گیا۔ اگرچہ وہ وہاں ہونے والے قتل کے بارے میں تفتیش کرنے کے لیے آیا تھا لیکن نہ تو اسے اس کام میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی وسامہ چاہتا تھا کہ وہ اس مسئلے میں الجھے۔

وہ معاویہ کی آمد سے خوش تھا لیکن پھر وہ ہوا جس نے ذہنی طور پر وسامہ کے پرخچے اڑادیے۔ اسے یقین ہو گیا۔ فلک بوس میں ہونے والے عجیب وغریب واقعات میری ہی موجودگی کا نتیجہ ہیں۔ وہ آئے کت کی بدولت باقاعدہ میری موجودگی کو محسوس کرنے لگا تھا۔ سلیپ پیرالائز کے وہ حملے جو پہلے کبھی کبھار ہی اس پر حملہ آور ہوتے تھے، اب اکثر نیند میں وہ اسی کیفیت کا شکار رہنے لگا تھا اور اس کا دورانیہ بھی بڑھنے لگا تھا۔ ڈر اور خوف کے زیر اثر وہ معصوم انسان آئے کت کی انگلیوں کے لمس، سانس کی آواز تک کو میری آواز سے تشبیہ دینے لگا تھا۔

ایسے ہی ایک دن شام کے وقت آئے کت نے وسامہ کو اسٹڈی میں پھر سے ڈرا دیا تھا۔ وسامہ کو محسوس ہوا کہ آئے کت اسے پکار رہی ہے لیکن آئے کت کو وہاں موجود نہ پاکر وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ بیساکھی کا سہارا لے کر وہ تیزی سے نچلی منزل کی طرف گیا تھا اور اسی کوشش میں سیڑھیوں سے گر بھی گیا تھا۔ آئے کت کو پہلی منزل پر اپنے سامنے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں ہی اسے ستانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اسے ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا کہ آئے کت کے لیے اس سے پہلے نیچے آجانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ آئے کت نے اسے زمین سے اٹھنے میں مدد دی تھی۔ اس نے وسامہ سے کہا تھا کہ وہ اوپر جا کر چیک کرلیتی ہے کہ آیا وہاں کوئی ہے یا نہیں لیکن وسامہ اسے کسی حالت میں اوپر اکیلے بھیجنے پر راضی نہیں تھا۔ اس کی ضد سے تنگ آکر آئے کت نے معاویہ کو جگانے کا مشورہ دیا تھا۔

''میں معاویہ کو جگاتی ہوں۔۔۔'' آئے کت نے نرمی سے کہا تھا

لیکن وسامہ اس پر بھی راضی نہیں تھا۔

''نہیں۔۔۔ معاویہ بہت جذباتی ہے۔۔۔ وہ ضرور اوپر جانے کی کوشش کرے گا۔۔۔'' وسامہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا۔

جس وقت آئے کت اور وسامہ آپس میں بات کر رہے تھے، معاویہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے وہاں پر آگیا تھا۔

''میرا کیا دماغ خراب ہے جو میں بائیس سال کی عمر میں اوپر جانے کی کوشش کروں گا؟''

وسامہ اور آئے کت نے بے ساختہ اس آواز پر گردن موڑ کر ہال کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔ معاویہ کچی نیند سے بیدار ہوا وہاں کھڑا تھا۔ اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اب بیزاری سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''میں اتنی گہری نیند سو رہا تھا۔۔۔ آپ دونوں نے اتنا شور مچایا کہ میری نیند خراب ہو گئی۔۔۔ کمال ہے یار! گھر آئے مہمان کے ساتھ تم لوگ یہ سلوک کرتے ہو۔'' وہ بہت ناراضی سے کہہ رہا تھا۔

معاویہ نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا اور ہال نما لاؤنج کی ساری بتیاں جلادیں' صرف فانوس کو اس نے چھوڑ دیا۔ نڈھال سا وسامہ اپنی بیساکھی کی قید سے آزاد ہو کر سر جھکائے اب وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ آئے

کت اس سے چند قدم پیچھے کھڑی دانتوں سے انگوٹھے کا ناخن کتر رہی تھی۔ سر اس نے بھی جھکا رکھا تھا۔ دیکھنے میں لگتا تھا کہ سخت اضطراب کا شکار ہے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان دونوں کے پاس آ گیا تھا اور ان دونوں کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اپنے چہرے پر معاویہ کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے آئے کت نے بے دھیانی میں سر اٹھایا اور اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"تو۔۔۔ تم دونوں یہ کہنا چاہتے ہو کہ فلک بوس آسیب زدہ ہے؟ اور یہاں آیوشمتی کی روح کئی سالوں سے بھٹکتی پھر رہی ہے؟" اس کے لہجے میں بے حد سنجیدگی تھی لیکن ان دونوں میں سے اگر کوئی بھی اس کی طرف دیکھ لیتا تو جان جاتا کہ معاویہ شیرازی اس وقت بڑی مشکل سے اپنے قہقہوں کا گلا گھونٹ رہا ہے۔

"نہیں۔۔۔ میں نہیں۔۔۔" آئے کت نے جلدی سے کہا۔ یہاں سے اس کے کھیل کا دوسرا حصہ شروع ہوا تھا۔ وہ حصہ جہاں سے اس نے معاویہ کو احساس دلانا شروع کیا تھا کہ اس کا بھائی وسامہ ایک نفسیاتی مریض ہے۔

"آ۔۔۔ وسامہ کا خیال ہے۔۔۔ کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔" وہ اپنا کردار وسامہ کے سامنے بھی بے داغ رکھنا چاہتی تھی تب ہی جھجک کر بولی تھی۔

اس بار معاویہ اپنا قہقہہ روک نہیں پایا۔ وہ ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔

آئے کت ابھی بھی چہرے پر سنجیدگی سجائے رہی تھی اور وسامہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔

جب معاویہ دیر تک ہنس چکا تو وسامہ نے سنجیدگی اور قدرے بے چارگی سے کہا۔

"یہ سب مذاق نہیں ہے معاویہ! کہ اس پر ہنسا جائے۔۔۔ وہ ابھی بھی یہیں کہیں ہے۔۔۔ اسی قلعے میں۔۔۔ ہم تینوں کے آس پاس۔" اس کی آواز میں اب بھی خوف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"اوہ! رئیلی۔۔۔" اس نے غیر سنجیدگی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور زور سے بولا۔ "اگر ایسی بات ہے تو اسے ابھی بھی ہمارے پاس ہونا چاہیے۔۔۔ ہیلو۔۔۔ میڈم آیوشمتی!۔۔۔ کیا آپ میری آواز سن سکتی ہیں۔۔۔ پلیز سامنے آئیں اور آ کر مجھ سے بات کریں۔۔۔ میرے بھائی نے آپ کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔۔۔ لیکن میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ پلیز سامنے آئیں۔۔۔ کوئی ہے؟ کوئی سن رہا ہے مجھے۔۔۔" وہ شرارت سے زور زور سے بول رہا تھا اور پورے لاؤنج میں گھوم رہا تھا۔

اس کی شرارتی آواز قلعے کی دیواروں سے ٹکرائی اور گونج بن کر ہم چاروں کی سماعتوں سے ٹکرانے لگی۔

وہ اگر دیکھ پاتا تو جان جاتا کہ میں تو اس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔۔۔ مگر اس کے پاس وہ نظر ہی نہ تھی کہ مجھے دیکھ پاتا۔۔۔

"معاویہ! پلیز۔۔۔" آئے کت نے تیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں وسامہ کی بات کو سنجیدگی سے سننا چاہیے۔"

آئے کت نے فوراً وسامہ کی سائیڈ لی تھی لیکن آئے کت کا اس طرح سے معاویہ کو ٹوکنا خود معاویہ کو بہت برا لگا تھا۔

"تمہیں مجھے instructions (ہدایات) دینے کی ضرورت نہیں ہے، میں اپنے بھائی کی باتیں سنجیدگی سے ہی سن رہا ہوں۔۔۔" اس نے دو ٹوک آئے کت سے کہا۔

آئے کت کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔

وہ دونوں اپنی ہی بحث میں پڑ گئے تھے۔ معاویہ کے لہجے میں آئے کت کے لیے گزرے دنوں کا تمام تر غصہ سمٹ آیا تھا لیکن اس نے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس کی باتیں اور بے یقین انداز جہاں وسامہ کو ہرٹ کر رہا تھا وہاں آئے کت کے منصوبے کو تیزی سے کامیابی کی طرف لے جا رہا تھا۔

آئے کت کی مرضی کے مطابق۔۔۔ معاویہ اردشیرازی نے میرے وجود سے انکار کر دیا تھا۔۔۔

"میں اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتا ہوں معاویہ۔۔۔ وہ میرے آس پاس رہتی ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے اس کی آواز سنی ہے معاویہ!۔۔۔ وہ بولتی ہے۔۔۔ مجھے آوازیں دیتی ہے۔۔۔ میری بات کا یقین کرو۔۔۔ تم تو میری بات کا یقین کرو۔۔۔"

وہ خوف زدہ تھا۔ اس کا بھائی اور یقیناً اس کی بیوی بھی۔۔۔ کوئی بھی اس کی بات پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دونوں باتیں مل کر اسے پاگل کر رہی تھیں سو وہ چلا کر بولا۔۔۔ منت سے بولا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں ہراس کے ساتھ ساتھ نمی بھی دکھائی دینے لگی۔

مجھے اس پر بے تحاشا ترس آیا تھا۔۔۔ وہ میری اصلیت جان پاتا اور یہ سمجھ سکتا کہ میں اس کی دشمن نہیں ہوں بلکہ اس کی اپنی بیوی اس کی دشمن ہے تب بھی یہ دکھ اسے مار ڈالتا۔۔۔ محبت کی طرف سے ملنے والے دکھ انسان کو مار ہی ڈالتے ہیں۔

معاویہ خاموش سا رہ گیا۔ آئے کت کے لیے یہ بڑی نازک صورت حال تھی چنانچہ اس نے گھور کر معاویہ کو دیکھا اور خاموش رہنے کا اشارہ کر کے وسامہ کے قدموں میں پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔

"آپ پریشان نہ ہوں وسامہ! اگر واقعی یہاں کوئی آسیب ہے تو ہم اسے یہاں سے بھگا دیں گے۔۔۔ اس عورت کی روح آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔۔۔ یہ وعدہ ہے میرا آپ سے۔"

وسامہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔

وسامہ نے اس کی بات کا یقین کرتے ہوئے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر اسے اپنی پیشانی سے لگا لیا۔ چند لمحے وہ اسی طرح گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر آئے کت اٹھی اور آہستہ سے اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی کمرے کی طرف لے گئی۔

معاویہ اتنے بڑے لاؤنج میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔

جانے سے پہلے وسامہ نے ایک نظر بھی معاویہ کو نہیں دیکھا تھا۔ جسے اس کی بات کا اعتبار ہی نہیں، اسے دیکھ کر اس نے کرنا بھی کیا تھا سو خاموشی سے اس کے ساتھ چلا گیا جو اس کی بات پر یقین کر رہی تھی۔۔۔

☆☆☆

آئے کت اسے لے کر کمرے میں آ گئی تھی۔ وسامہ کی بے ساکھی کو اس کے بازو سے علیحدہ کرتے ہوئے آئے کت نے اسے بیڈ پر لیٹنے میں مدد دی اور اسے سونے کی تلقین کی تھی۔ وہ وسامہ کا ہاتھ تھام کر تب تک اس کے پاس بیٹھی رہی تھی جب تک وسامہ سو نہیں گیا تھا۔

اس کے سونے کے بعد وہ اس کے پاس سے اٹھی تھی اور چہرے پر پرسکون مسکراہٹ سمیٹے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی نظریں وسامہ کا طواف کر رہی تھیں اور دماغ اپنے پلان کی کامیابی پر مسرور سا معاویہ کو سوچے چلا جا رہا تھا۔

اسی وقت وسامہ پر سلیپ پیرالائزڈ اٹیک ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے تھے۔ دماغ کی رگ قدرے ابھر آئی تھی اور چہرے پر بے تحاشا اضطراب سمٹ آیا تھا۔

آئے کت کے شیطانی دماغ میں جھٹ سے ایک نئے خیال نے جنم لیا تھا، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ سے دروازے کی طرف گئی اور دروازے کو تھوڑا سا کھول کر پھر سے بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے صوفے پر پڑی اپنی سفید چادر اٹھائی تھی اور اسے سر پر اوڑھ لیا تھا۔ ٹیبل پر پڑی فروٹ باسکٹ میں سے چھری اٹھا کر وہ وسامہ کی جانب بڑھ گئی تھی۔

وسامہ پر جھکتے ہوئے اس نے چھری کی نوک کلائی پر رکھ کر آہستہ سے حرکت کی اور اس کی گردن کی طرف بتدریج لے جاتی چلی گئی۔

وسامہ کے چہرے کا اضطراب کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ یقیناً وہ حرکت کرنے کو بے چین ہو رہا تھا لیکن بے سود۔۔۔ اس کے کندھے جکڑے ہوئے تھے۔ وہ خود کو ذرا سا بھی ہلانے سے قاصر تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دیوہیکل وجود اس پر جھکا ہوا ہو اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے وسامہ کے کندھوں کو جکڑ رکھا ہو۔

وسامہ نے خود کو اس کی قید سے آزاد کرنا چاہا لیکن بے سود وہ جتنی طاقت لگاتا تھا' وہ دیوہیکل وجود اس سے دوگنی زیادہ طاقت سے اس پر جھک آتا تھا۔ وسامہ کا دل دہشت سے بھر گیا۔ اس کا سانس گھٹ رہا تھا۔

اسی دوران آئے کت چھری کو اس کی گردن سے حرکت دیتے ہوئے اس کے کان تک لے گئی تھی۔ اس کے بعد وہ وسامہ کے کان کے پاس جھک آئی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی وسامہ نے اپنے ––– کان میں ایک سرگوشی سنی۔ یہ کسی کے سانس کی آواز تھی جیسے [illegible]پ پھنکار رہا ہو۔

''مجھے چھوڑ دو۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا تھا۔

''نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔'' وسامہ نے اپنے کان کے بالکل قریب سنسناتی ہوئی سرگوشی سنی۔ یہ آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔۔۔ کبھی پاس آتی۔ کبھی دور چلی جاتی۔۔۔ ''کبھی نہیں چھوڑوں گی۔۔۔ نہیں چھوڑوں گی۔۔۔''

''میں۔۔۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔'' وہ سسکا۔ جواب میں اس کے کندھوں پر پڑا ہوا بوجھ ہلکا پڑ گیا۔ پھر ایک کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کی آواز اس کے کان میں گونجی۔ وسامہ کو ایسا لگا جیسے اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہو۔

آئے کت اپنا کام مکمل کر کے تیزی سے اس کے ساکت وجود سے دور ہٹ گئی تھی۔ اگلے چند ہی لمحوں میں وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی اور وسامہ نے کندھوں سے بوجھ ہٹتا ہوا محسوس کیا تھا۔ وہ کب گہری نیند میں گیا، وہ نہیں جانتا تھا۔

اسی وقت معاویہ شرمندہ شرمندہ سا وسامہ کے کمرے کے دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ آئے کت کمرے سے نکلی۔ معاویہ کو کھڑا دیکھ کر رکی پھر نظر انداز کر کے کمرے کا دروازہ بہت آہستگی سے بند کیا اور جوں ہی پلٹی معاویہ ایک دم سے اس کے سامنے آ گیا۔

''یہ سب کیا تماشا ہے؟''

''مجھے نہیں پتا۔۔۔'' آئے کت نے تحمل سے کہا۔ ''میں وسامہ کی چیخیں سن کر کمرے سے نکلی سی۔۔۔ میں نے دیکھا' وہ بہت بری طرح ڈرا ہوا تھا۔ باقی ساری بات تو تمہارے سامنے ہی ہوئی ہے۔'' وہ تیزی سے جھوٹ بولتی چلی گئی۔

''میں اس ساری بات سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔'' معاویہ نے ناراضی سے کہا۔ ''اچانک وسامہ کو کیسے یہ شک ہوا کہ فلک بوس میں کوئی بدروح ہے؟ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

معاویہ بے حد مشکوک انداز میں بات کر رہا تھا۔

''پچھلے تین چار مہینوں سے وسامہ اپنے شک کا اظہار کر رہا تھا۔۔۔'' آئے کت نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نے اس کی بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔۔۔ تم جانتے ہو' وہ ذرا جلدی ڈر جاتا ہے۔۔۔ میں نے سوچا۔ ایسی ہی کوئی بات ہو گی لیکن آج جس طرح وسامہ نے ری ایکٹ کیا ہے۔۔۔ میں پریشان ہو گئی ہوں۔''

''تمہیں پریشان ہونا بھی چاہیئے۔'' معاویہ نے رکھائی سے کہا۔ ''تمہارا شوہر کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہو رہا ہے اور تم نے اس بات کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔''

''یہ درست نہیں ہے۔۔۔'' آئے کت کا دل اس کے ''نفسیاتی مرض'' کا لفظ استعمال کرنے پر سکون سے بھر گیا۔ اس کا تیر نشانے پر لگا تھا لیکن اس وقت اس کی بدگمانی دور کرنا ضروری تھا۔

''میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی لیکن۔۔۔۔ ہاں۔۔۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ لیکن اس سے پہلے وسامہ کی حالت ایسی کبھی نہیں ہوئی۔۔۔ اف۔۔۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اس نے سر تھام کر پریشان ہونے کی کامیاب ایکٹنگ کی تھی اور معاویہ اس کی باتوں میں بھی آ گیا تھا۔

اگلی صبح معاویہ نے آئے کت سے اپنے رویے کی معذرت کر لی تھی اور ساتھ ہی ساتھ وسامہ کے رویے کے لیے فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے اس بارے میں نہ بتانے پر خفگی کا اظہار کیا تھا،

آئے کت نے جواب میں کہا تھا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی یہ بات اتنی پریشان کن لگی ہی نہیں۔ چند مہینے پہلے وسامہ نے فلک بوس میں کچھ اثرات کا ذکر کیا تھا۔ وہ اکثر رات کو ڈرنے لگا تھا لیکن ایسے ہی جیسے کبھی انسان سوتے ہوئے ڈر جاتا ہے۔ اس کی حالت مجھے بھی اتنی پریشان کن نہیں لگی تھی کہ میں تمہیں یا کسی اور کو اطلاع کرتی۔۔۔ ویسے بھی تم نے ہی مجھے بتایا تھا وسامہ بچپن سے تھوڑا ڈرپوک واقع ہوا ہے۔۔۔ وہ اکثر اندھیرے سے ڈر جاتا تھا۔ اکیلے رہنے سے اسے خوف آتا تھا۔۔۔ لیکن یہ تو اکثر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔۔۔ مگر جو کچھ کل ہوا۔۔۔ وہ اکثر لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔'' وہ ایسے بول رہی تھی جیسے کوئی انسان مستقل پریشانی سے تھک چکا ہو۔

''کیا تم نے کبھی کوئی ایسی چیز دیکھی جو تمہیں مافوق الفطرت لگی ہو؟'' معاویہ نے پوچھا۔

آئے کت نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں۔۔۔ میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔۔۔ نہ ہی میں نے ان اثرات کو محسوس کیا ہے جن کا ذکر وسامہ کرتا ہے۔''

''وسامہ اثرات کا ذکر کرتا ہے؟'' معاویہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ میں نے بتایا ناں۔۔۔ چند مہینے سے اسے عجیب عجیب چیزیں نظر آنے لگی ہیں۔۔۔ کبھی اس کی کوئی چیز غائب ہو جاتی تھی۔۔۔ کبھی اسے چیزیں ہلتی ہوئی نظر آنے لگتیں۔۔۔ کبھی لیپ ٹاپ نہیں ملتا

تھا۔۔۔ اور کبھی وہ کہتا تھا اسے سایے نظر آتے ہیں۔۔۔ اسپشلی سیکنڈ فلور پر وہ شام کے بعد کبھی نہیں جاتا تھا۔ اسے گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی لیکن خدا گواہ ہے معاویہ! میں نے یہاں ایسا کچھ محسوس نہیں کیا۔۔۔ اگر واقعی یہاں اثرات ہوتے تو مجھے بھی نظر آتے۔۔۔۔''

ان کی بات ابھی یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ وسامہ کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ وہ دونوں فوراً اندر کی جانب بھاگے تھے۔

وہ دونوں تالاب کے کنارے سے بھاگتے ہوئے اس تک پہنچے۔ چیخ چیخ کر اس کی آواز بیٹھ چکی تھی۔ وہ بدحواس ہو چکا تھا اور اسے قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ رو رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ پر خون لگا ہوا تھا اور دایاں کان بھی خون سے رنگا ہوا تھا۔ معاویہ نے اسے زبردستی بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ اس کی حالت کچھ سنبھلنے کے بعد وہ دونوں اسے ڈسپنسری لے گئے تھے۔ ڈسپنسر نے انہیں بتایا تھا کہ یہ کسی تیز دھار آلے سے کٹے جانے کا زخم ہے لیکن آئے کت نے وسامہ کو یقین دلایا تھا کہ یہ کسی کیڑے کے کاٹنے کی وجہ سے ہوا ہے اور وہ پریشان نہ ہو۔

یہ اگلی صبح کا ذکر ہے جب وسامہ اور آنٹی لن کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ معاویہ وہاں آیا تھا اور اس نے بیٹھتے ہی بولنا شروع کر دیا تھا۔

''میں نے سارے فلک بوس کا جائزہ لیا ہے۔۔۔ تمام ملازمین سے بھی انکوائری کی ہے۔۔۔ مجھے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ یہاں کوئی آسیب بھی رہائش پذیر ہے۔''

وسامہ کا دل فوراً ہی ناشتے سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ ہاتھ روک کر بے بسی سے معاویہ کو دیکھنے لگا۔

''میرا خیال ہے، تم دونوں میرے ساتھ چلو۔۔۔ اسلام آباد میں ہم کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے۔۔۔''

''مجھے پتا تھا۔ تم یہی کہو گے۔'' وسامہ نے ہیجانی انداز میں اس کی بات کاٹی۔

''لیکن مجھے کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت نہیں ہے میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے آیوشمتی کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔۔۔ وہ یہیں ہے ہمارے آس پاس۔۔۔ اسی جگہ۔''

وہ ٹھیک بول رہا تھا۔ میں وہاں ہی موجود تھی۔۔۔ ان کے بہت پاس۔۔۔

''وسامہ! میری سنو۔۔۔'' معاویہ نے رسان سے اسے سمجھانا شروع کیا تھا۔ وہ اسے اس کے بچپن کے واقعات یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ انہیں کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے اس مسئلے کو ڈسکس کرنا چاہیے۔

''وہ بچپن تھا معاویہ!'' وسامہ نے جھنجھلا کر کہا تھا۔ ''بچپن میں ہر دوسرے بچے کے ایسے خیالی دوست ہوتے ہیں۔۔۔ تم بھول رہے ہو نہ میں بچہ ہوں نہ وہ بدروح میرے دوست کا کردار نبھا رہی ہے۔۔۔ وہ میرے پیچھے لگی ہوئی ہے، وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔''

معاویہ نے جیسے لاجواب ہوتے ہوئے وسامہ کو دیکھا پھر بولا۔

''تمہیں یہ کیوں لگتا ہے، وہ نقصان ہی پہنچائے گی؟۔۔۔ اگر واقعی اس کا کوئی وجود ہے تو کیا پتا، وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہو۔'' معاویہ نے تصویر کا ایک نیا رخ اسے دکھایا۔ ''میری بات مانو وسامہ! اگر اگلی بار تمہیں اس روح کی موجودگی محسوس ہو تو ڈرنے کے بجائے اس سے بات کرنے کی کوشش کرنا... مجھے یقین ہے، کوئی نہ کوئی پوزیٹو بات ضرور سامنے آئے گی۔'' معاویہ نے بہت سنجیدگی سے باری باری ان دونوں کو

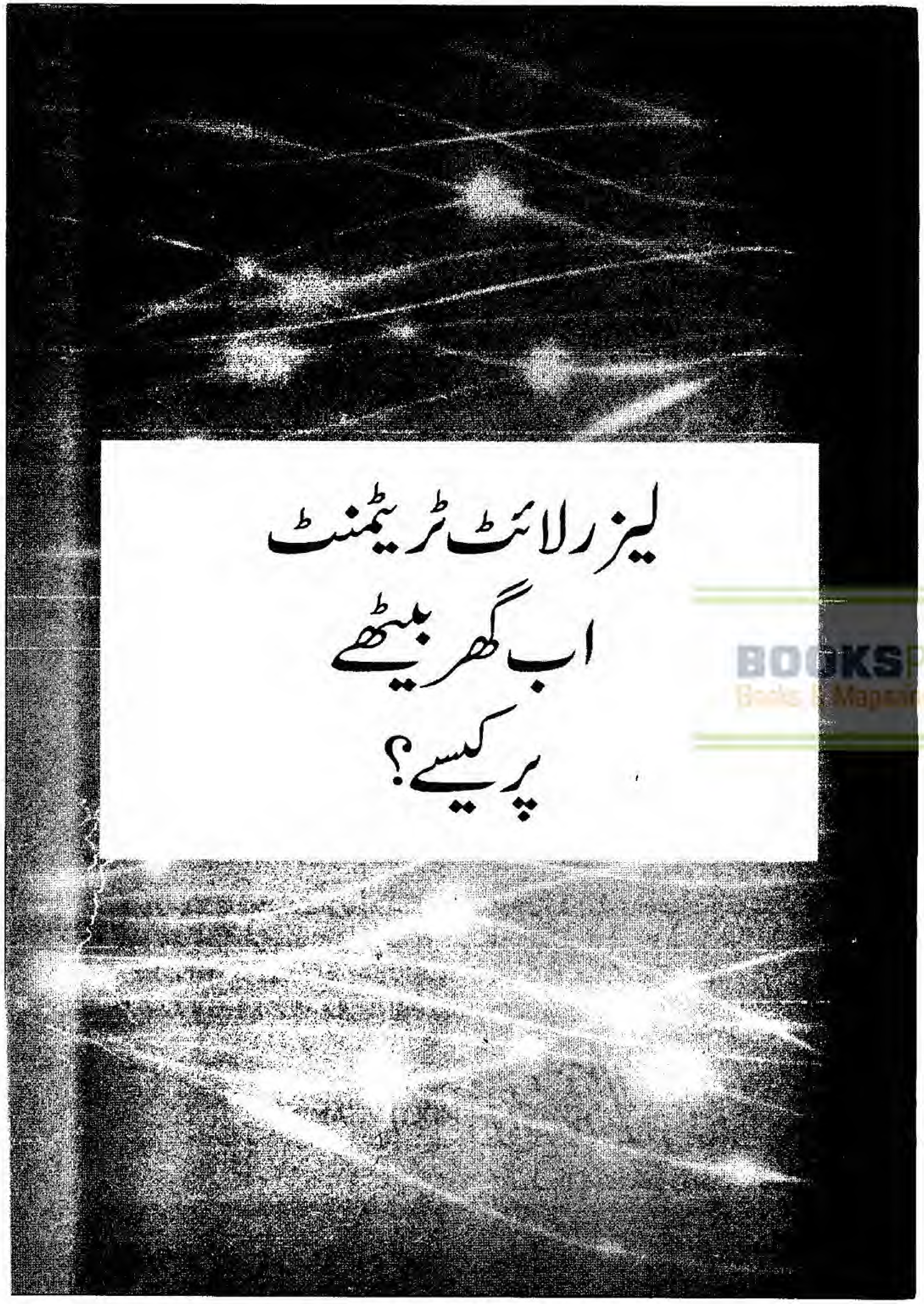

دیکھا تھا۔

''اور اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو میرے ساتھ سائیکاٹرسٹ کے پاس چلو۔۔۔ مجھے یقین ہے جس پریشانی سے تم خود نہیں نکل پا رہے' ایک بہترین سائیکاٹرسٹ کے ساتھ تین چار سیشنز تمہیں اس پریشانی سے ضرور نکال دیں گے۔''

وسامہ خاموشی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔

''وسامہ کی حالت بلاشبہ پریشان کن ہے لیکن یہ وقتی فیز ہے۔۔۔ گزر جائے گا اگرچہ مجھے اپنے بھائی کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے لیکن تم اتنی پریشان ہو' اس لیے بتا رہا ہوں۔۔۔ وسامہ کو بچپن سے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا شوق رہا ہے اور اپنا یہ شوق پورا کرنے کے لیے وہ اکثر من گھڑت کہانیاں سنایا کرتا تھا.... آج میری ماموں سے بات ہوئی تھی' انہوں نے ہی مجھے یہ بات یاد دلائی ہے۔۔۔'' معاویہ نے آئے کت کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

آئے کت کے لیے یہ ایک دھچکا تھا۔ وہ سمجھتی تھی وسامہ اس کے لیے کھلی کتاب کی طرح ہے لیکن اب آ کر اسے احساس ہو رہا تھا اس کھلی کتاب کے کئی چیپٹرز پڑھنا ابھی باقی تھے۔۔۔ اگر وہ اس بارے میں پہلے سے جانتی ہوتی تو یقیناً اسے دو سال وسامہ کے ساتھ ضائع نہ کرنے پڑتے اور بہت پہلے وہ اپنے پلان میں کامیاب ہو چکی ہوتی۔

''اور کان کے اس زخم کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے معاویہ کی سوچ کے بارے میں مزید جاننے کی غرض سے بات برائے بات پوچھا تھا۔

''تمہیں یاد نہیں۔۔۔ تم نے خود کہا تھا' وہ کسی کیڑے کے کاٹنے کا زخم تھا۔'' معاویہ نے اسے یاد دلایا۔

''معاویہ!'' آئے کت نے یک دم جھجکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے صرف وسامہ کی پریشانی دور کرنے کے لیے ایسا کہا تھا۔ وہ زخم واقعی کسی تیز دھار چیز کے کاٹنے سے بنا تھا۔'' اس نے معاویہ کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

معاویہ کو دھچکا لگا۔ وہ یک دم پریشان ہوا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وسامہ نے خود کو خود ہی زخم پہنچایا ہے۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو' اس وقت کمرے میں وسامہ اکیلا تھا۔۔۔ بعض نفسیاتی مریض ایسا کرتے ہیں' وہ خود کو ایذا پہنچاتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے انہیں سکون ملتا ہے۔'' وہ جیسے جھجک کر معاویہ کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔

''کیا تم نے وسامہ کے مزاج میں کچھ اور بھی تبدیلیاں نوٹ کی ہیں؟'' معاویہ نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔ میں خود الجھی ہوئی ہوں۔'' اس نے معاویہ کی فکرمندی میں بڑے اطمینان سے اضافہ کیا تھا۔ ''فکر مجھے اس بات کی ہے کہ کہیں اس روح سے بات کرنے میں ناکامی کی صورت میں وہ خود کو کوئی بڑا نقصان نہ پہنچا لے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ ان شاء اللہ۔'' معاویہ نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''میں اسلام آباد جا رہا ہوں وہاں کسی سائیکاٹرسٹ سے وسامہ کا کیس ڈسکس کروں گا۔ تب تک تمہیں وسامہ کا خیال رکھنا ہے۔ سائے کی طرح اس کا خیال رکھنا ہوگا تاکہ وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔''

OUR BEST FORMULA
Fair & Lovely
ADVANCED MULTI VITAMIN™
EXPERT FAIRNESS SOLUTION
آئی پی ایل ٹریٹمنٹ جیسی فیئرنیس

لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسا نکھار

بہترین فیئرنیس کے لئے دنیا بھر میں جلد کے ماہرین لیزر ٹریٹمنٹ کی جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر یہی ٹریٹمنٹ صرف ایک کریم سے مل جائے تو؟
اب لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسی فیئرنیس ملے ''فیئر اینڈ لولی ایڈوانس ملٹی وٹامن'' سے۔
اس کا طاقتور ملٹی وٹامن فارمولا لیزر لائٹ کی طرح جلد کی گہرائی تک جاتا ہے۔ سیاہ خلیات کو صاف اور روشن کر کے جلد کو نکھارتا ہے۔
تو لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسے نکھار کے لئے صرف فیئر اینڈ لولی کا بیسٹ فارمولا۔

Fair & Lovely | ADVANCED MULTI VITAMIN™

لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ سے مراد جلد کے ماہر آئی پی ایل (Intense Pulsed Light) ہے

• عکسی خاکہ

''میں پوری کوشش کروں گی۔'' معاویہ کو اس کے بھائی کے پاگل پن کے بارے میں پوری طرح یقین دلانے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر وسامہ کے پیچھے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

معاویہ نے واپس جاتے ہی ملک کے مشہور و معروف سائیکائٹرسٹ سے اپائنمنٹ لی لیکن جب یہ بات وسامہ کو پتا چلی تو وہ بیزار ہو گیا۔

''مجھے معاف کرنا معاویہ! لیکن میں نہیں جاؤں گا۔'' اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

معاویہ نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر اسے کچھ ادویات بھجوا دیں جن کے بارے میں معاویہ کا کہنا تھا اس نے کسی سائیکائٹرسٹ سے وسامہ کا کیس ڈسکس کر کے حاصل کی ہیں۔ وسامہ دوائیوں کے اس لفافے کو دیکھ کر عجیب سی ذہنی کیفیت کا شکار ہوا لیکن اپنے سکون کے لیے اس نے ان دوائیوں کا استعمال شروع کر دیا۔

ان ادوایات کے استعمال سے وہ گھنٹوں سویا رہتا۔ لیکن یہ نیند دیکھنے والوں کے لیے تھی خود اسے عجیب بے چینی سی محسوس ہوتی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ سوئی جاگی کیفیت کا شکار ہے۔ سارا ہی وقت اسے عجیب عجیب خواب اور مناظر نظر آتے رہتے۔ کبھی وہ خود بھاگ رہا ہوتا اور کبھی کوئی اس کے تعاقب میں ہوتا۔ سوتے ہوئے ایسا لگتا کوئی ہیولا اس کے ساتھ آ کر بیٹھا ہے' اسے ہاتھ لگا رہا ہے آنکھ کھل جاتی تو غنودہ ذہن کے ساتھ یہ سائے اسے خود پر لپکتے ہوئے محسوس ہوتے۔

مختصر الفاظ میں آئے کت کے بُنے ہوئے جال نے وسامہ کے گرد خوف کی ایسی فضا قائم کی کہ اسے مزید کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی ذہنی حالت اس حد تک ابتر ہو چکی تھی کہ آئے کت کے کچھ کیے بغیر وہ ہر وقت خوف کا شکار رہتا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اس کھیل کا اختتام کیا جاتا۔

اور آئے کت اس کھیل کا اختتام بہت پہلے ہی لکھ چکی تھی۔

اسے وسامہ کو اس حد تک پاگل کر دینا تھا کہ معاویہ خود اسے کسی پاگل خانے میں چھوڑ آتا۔

پاشا کی مدد سے ایک ایسے آدمی کا انتظام کیا گیا جو پیسے لے کر فلک بوس میں نقلی عامل کا روپ دھار کر آئے۔ وسامہ کو اس کے بارے میں بتایا گیا کہ آئے کت اسے وادی سے بلا کر لائی ہے۔ یہ آخری مدد تھی جو پاشا سے آئے کت نے لی تھی کیوں کہ اگلے ہی روز اپنے والد کے حکم پر پاشا کو بشام چھوڑ کر ایک لمبے عرصے کے لیے شہر جانا پڑا تھا۔۔۔

اس نقلی عامل نے وسامہ کو یقین دلایا کہ اس کا کہنا بالکل درست ہے اور فلک بوس حقیقتاً کسی بدروح کے زیرِ اثر ہے۔ اس نے وسامہ سے کہا کہ وہ ایک عمل کرے گا جس سے وہ بدروح فلک بوس کو چھوڑ دے گی۔

عمل شروع کیا گیا اور اس کرائے کے عامل نے کامیاب اداکاری کے ذریعے بدروح کے ہاتھوں زخمی ہونے کا ڈراما کیا اور فلک بوس سے جان بچا کر بھاگ گیا۔

وسامہ کی یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔

اس نے بڑی مشکل سے عامل کو راضی کیا کہ وہ اسے روح کے بارے میں بتائے۔ عامل صاحب اتنے خوف زدہ تھے کہ بول بھی نہ پا رہے تھے۔

''وہ۔۔۔ وہ بہت بھیانک چہرہ تھا۔۔۔ ایسے عمل کے دوران کانوں میں آوازیں ضرور آتی ہیں لیکن آنکھیں اور کان بند رکھ کر عمل مکمل کرنا ہوتا ہے۔۔۔ آج سے پہلے کبھی میں نے ایسی کسی آواز پر آنکھیں نہیں کھولیں۔۔۔ لیکن کل۔۔۔ پتا نہیں کیوں ان آوازوں سے میں ڈر گیا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ وہ چہرہ بالکل میرے سامنے تھا۔۔۔ اور ایسا کریہہ تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔۔۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور ایک ہاتھ پر اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔۔۔ اگر میں وہاں سے بھاگ نہ گیا ہوتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتی۔''

وسامہ کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

''کوئی اور پیر فقیر، تانترک رہ گیا ہے تو اسے بھی لے آؤ۔۔۔ تاکہ سب آئیں اور اس آسیب کے شر کا شکار ہو کر میری پریشانی میں اضافہ کرتے رہیں۔'' وسامہ نے بے بسی بھرے غصے کے ساتھ آئے کت سے کہا تھا۔

آئے کت نے ابھی بھی اسے یہی یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہے اور یہ سب اس کا وہم ہے۔ وہ معاویہ کو یقین دلا چکی تھی کہ وسامہ نفسیاتی مریض ہے اور اب اسے وسامہ کو بھی کنفیوز کرنا تھا۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ وسامہ خود بھی نہ جان سکے کہ اس کے ساتھ ہونے والے واقعات اس کی ذہنی خرابی کا نتیجہ ہیں یا فلک بوس کی بلا اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔

وسامہ نے طے کیا' وہ لوگ وہاں سے چلے جائیں گے۔ یقیناً یہ ایک اچھا فیصلہ ہو سکتا تھا اگر زندگی نے اسے مہلت دی ہوتی تو۔۔۔ یا شاید اگر وسامہ کی زندگی کی آیوشمتی یعنی آئے کت نے اسے مہلت دی ہوتی تو۔۔۔ وسامہ نے یہی سن رکھا تھا آسیب جس جگہ قابض ہو' وہاں کسی کو بسنے نہیں دیتا تو ممکن ہے آیوشمتی اسی لیے اسے تنگ کرتی ہو کہ وہ دونوں فلک بوس کو چھوڑ کر چلے جائیں۔

وسامہ نے طے کیا وہ فلک بوس سے چلے جائیں گے اور دوبارہ کبھی یہاں نہیں آئیں گے اور یہ بھی کہ وہ معاویہ کو قائل کرے گا' وہ فلک بوس کو بیچ دے اور دوبارہ کبھی یہاں نہ آئے۔

یہ طے کرتے ہی وہ قدرے پرسکون ہوا لیکن اس روز بھی سونے کے لیے اسے نیند کی ایک سے زیادہ گولیوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔

☆☆☆

بشام میں اس رات گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔

آئے کت سارے کام سمیٹ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ وسامہ اس کے ساتھ لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔

''آپ سو کیوں نہیں جاتے؟''

''نیند نہیں آ رہی۔'' اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

''سونے کی کوشش کریں وسامہ۔۔۔!''

''تم سو جاؤ۔۔۔ میں بھی تھوڑی دیر میں سو جاؤں گا۔''

آئے کت نے بڑھ کر اس کے بازو پر سر رکھ لیا تھا۔ وہ کافی تھکی ہوئی تھی تو جلد ہی گہری نیند میں چلی گئی۔

وسامہ جب کافی دیر تک کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تو اس نے اٹھ کر نیند کی گولیاں کھائیں۔ دو

، چار۔۔۔ اور وہ جانتا تھا' وہ حماقت کر رہا ہے۔ لیکن نیند تھی کہ آ کر نہ دے رہی تھی ویسے بھی اسے اب عادت پڑ چکی تھی نیند کی دوائیاں کافی مقدار میں کھانے کی۔

بہر حال اس کے بعد اسے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

اس کے سونے کے کچھ دیر بعد ہی آئے کت کسی عجیب سی کیفیت کے زیر اثر جاگ گئی تھی۔

اسے اپنی نیند ٹوٹنے کی وجہ پہلے تو سمجھ میں نہیں آئی تھی پھر اس کی نظر وسامہ کی طرف اٹھ گئی تھی اور اسے وجہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وسامہ سلیپ پیرالائز کے زیر اثر تھا۔۔۔

آئے کت کو غصہ آنے لگا۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ سونا چاہتی تھی اور اگر وسامہ کو ابھی نہ جگاتی تو وسامہ اٹیک سے باہر آتے ہی چیخیں مار مار کر اسے جاگنے پر مجبور کر دیتا۔ وہ اکثر یہی سب کرتا تھا۔

وہ اٹھ کر وسامہ کے قریب ہوئی اور نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''وسامہ۔۔۔ وسامہ۔۔۔''

وسامہ نے سر پٹخا۔ وہ خود کو حرکت دینا چاہ رہا تھا لیکن نیند آور دوا کی زیادہ مقدار لینے کی وجہ سے اس کا ذہن اس کے اپنے قابو سے باہر تھا۔ وہ چاہ کر بھی مکمل طور پر اپنے اعصاب پر قابو نہیں پا رہا تھا۔

''وسامہ۔۔۔! وسامہ۔۔۔!'' آئے کت نے پھر سے اسے پکارا تھا۔

وسامہ نے بدقت تمام آنکھیں کھولی تھیں اور بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔

دبی دبی کتنی ہی چیخیں اس کے منہ سے آزاد ہوئی تھیں۔ وہ اس پر نظر جمائے بار بار اسی کو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

اس کی چیخوں سے پریشان ہو کر آئے کت نے بلا ارادہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اب وسامہ کی جان لرز گئی۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مر جانے کی حد تک کانپتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے پورے جسم کی طاقت لگا کر خود کو آئے کت سے چھڑایا گرتا پڑتا وہ بیڈ سے اٹھا اور گھسٹتا ہوا دروازے کی طرف بھاگنے لگا۔

بیسا کھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھی لیکن وہ اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ اپنی جان بچانے کے خیال سے سارے جسم میں ایک الگ ہی قوت بیدار ہو گئی تھی۔

خود کو گھسیٹ کر چلتے ہوئے وہ بار بار مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی آئے کت بھی اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی تھی۔ اگر اس حالت میں وہ خود کو کوئی نقصان پہنچا لیتا تو نہ صرف اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا بلکہ معاویہ کو مطمئن کرنا بھی ناممکن ہو جاتا۔

وسامہ کی رفتار میں تیزی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

سارا فلک بوس رات کی خاموشی اور اسرار میں ڈوبا ہوا تھا' باہر بارش تڑ تڑ برس رہی تھی اور خوب گرج چمک کے ساتھ شاید صبح تک جاری رہنے والی تھی

آئے کت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ وسامہ کو اس حالت سے کیسے باہر لائے۔ وہ تیزی سے گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھ رہا تھا بالآخر وہ تیزی سے تہ خانے کی طرف بڑھا اور جیسے تیسے تہ خانے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

آئے کت نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا تھا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ وسامہ اندر سے لاک لگا چکا تھا۔

ایک انسان اضطراب میں جیسی حرکتیں کر سکتا ہے۔ وسامہ بھی بالکل ویسے ہی کر رہا تھا۔

ایک لمحے کو آئے کت کا دل چاہا کہ اسے یہاں ہی چھوڑے اور جا کر سو جائے پھر وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے سے چابیوں کا گچھا اٹھا لائی تھی۔ چند چابیوں کو آزمانے کے بعد وہ تہ خانے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

یہاں اور بھی خاموشی اور اسرار پھیلا ہوا تھا۔

اس نے اندر داخل ہو کر وسامہ کو ڈھونڈنا چاہا۔۔۔ مگر ناکامی ہوئی۔ وسامہ وہاں نہیں تھا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ تہ خانے کا اور کوئی دروازہ نہیں تھا جہاں سے وسامہ باہر نکل پاتا۔

وہ چند لمحے وہاں کا جائزہ لینے کے بعد باہر کی جانب بڑھی تھی۔ تب ہی اسے کمرے میں رکھی اکلوتی تابوت نما الماری میں کسی کھٹ پٹ کا احساس ہوا تھا۔

الماری کا دروازہ خودکار تھا۔ اگر وہ باہر سے بند ہو جاتا تو اسے اندر سے نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

آئے کت کو ایک لمحہ ہی کافی تھا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔ وسامہ الماری میں خود کو بند کر چکا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی تھی تا کہ وسامہ کو باہر نکال سکے لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئی۔

جب قسمت خود اس پر مہربان ہو رہی تھی۔۔۔ جب قسمت خود اس کو وسامہ سے نجات دلا رہی تھی۔۔۔ جب قسمت خود اسے معاویہ کے قریب ہونے کا موقع دے رہی تھی۔۔۔ تو وہ اپنی قسمت کو خود سے ٹھوکر کیسے مار سکتی تھی۔۔۔

کانپتی ٹانگوں اور کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ وہ مڑی اور تہ خانے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

بہتر گھنٹے بعد جب وسامہ کو الماری سے نکالا گیا تو اس کی موت کو چھتیس گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔

☆☆☆

پولیس آئی۔ لیکن تحقیقات پوری طرح شروع ہونے سے پہلے ہی معمہ حل ہو گیا۔

کسی نے کہا۔ وسامہ نے خودکشی کی ہے۔ ایسی الماری جسے صرف باہر سے کھولا جا سکتا تھا، اس میں کوئی کیوں جا کر بیٹھے گا جبکہ وہ یہ بات بھی جانتا ہو کہ اندر سے اس الماری کا دروازہ کھلنا ناممکن بات ہے۔ پھر الماری کے دستے پر وسامہ کے فنگر پرنٹس موجود تھے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں اس کے خون میں نشہ آور دوائیوں کا اثر ملا تھا۔ یقیناً اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خود کو الماری میں محبوس کر لیا ہو گا اور وہیں اس کی موت واقع ہو گئی ہو گی۔

قیاس کے اس دراز ہوتے سلسلے پر پولیس کی حتمی رپورٹ نے فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔ اس رپورٹ سے صرف وسامہ طالب کی موت کے کیس کو ہی بند نہیں کیا گیا اس رپورٹ نے بشام کی وادی میں پھیلی ہوئی فلک بوس کی نحوست پر مبنی کہانیوں پر بھی مہر ثبت کر دی تھی۔

معاویہ نے وہاں سے وسامہ کا سامان سمیٹا اور ایک بار پھر فلک بوس کو میرے سہارے چھوڑ کر وہ سب وہاں سے چلے گئے۔

اس دن کے بعد میں نے کئی بار معاویہ کو فلک بوس میں دیکھا۔ وہ اکیلا آتا تھا اور عجیب اضطراب کی

کیفیت میں سارے فلک بوس میں پھرتا رہتا تھا۔

عجیب وحشت کے عالم میں وہ فلک بوس میں مجھے تلاش کرتا پھرتا تھا۔

اس آسیب کا پتا لگانے کی کوشش کرتا تھا جس کا خوف اس کے بھائی کو نگل گیا تھا۔۔۔

لیکن فلک بوس اس کی نظر میں خالی تھا۔ وہاں خاموشی، اداسی اور وحشت کا عنصر ضرور تھا لیکن اسے میرا کوئی وجود نہیں ملتا تھا اور پھر جب وہ مجھے ڈھونڈنے میں ناکام ہو جاتا تو وہاں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر روتا تھا۔ بالکل کسی بچے کی طرح۔۔۔ جس سے اس کا پسندیدہ کھلونا چھین کر اس کے سامنے ہی توڑ دیا گیا ہو۔

گو کہ معاویہ ہمیشہ سے یہی مانتا تھا کہ آیو کمتی محض وسامہ کا واہمہ تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ وسامہ کوئی نفسیاتی مریض بن چکا تھا حالانکہ وہ جب تک زندہ رہا معاویہ خود اسے یقین دلاتا رہا کہ آیو کمتی اس کا ذہنی عارضہ ہو سکتی ہے حقیقت نہیں۔ لیکن اب اس کے گزر جانے کے بعد وہ خود ہی مخمصے میں پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

یہ ان ہی دنوں میں سے ایک دن کی بات ہے جب معاویہ فلک بوس میں موجود تھا۔ پاشا اپنے ماں باپ سے ملنے شہر سے بشام آیا تھا۔ وہ وسامہ کی موت کی خبر سن کر بھاگا آیا تھا۔ فلک بوس آ کر جب اسے وسامہ کی خودکشی کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ ششدر رہ گیا۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے باپ کو دیکھتا جاتا تھا۔ اس نے اور آئے کت نے وسامہ کو اس حد تک لے جانا تو نہیں چاہا تھا۔ وہ تو بس وسامہ کی سچائی دنیا کے سامنے لانا چاہتے تھے۔ وہ مرے مرے قدموں سے باپ کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ باپ سے آئے کت کے بارے میں کوئی بات کر پاتا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوارٹر میں خاتون بی بی کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا پھر کچھ دیر بعد اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

''پاشا خان! تم ٹھیک ہو؟'' خاتون بی بی نے اس کے بالوں کو سہلا کر پوچھا تھا۔

''اماں! وسامہ صاحب تو ٹھیک ٹھاک تھے نا پھر یہ اچانک کیسے۔۔۔؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا تھا۔ اس کے لہجے میں الجھن تھی

''بس بیٹا۔۔۔! ان کا وقت آ گیا تھا۔'' خاتون بی بی نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی نرم طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔

''بیمار تھے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں میرا بچہ۔۔۔! بیمار نہیں تھے۔ بس فلک بوس میں رہنا ان کو راس نہیں آیا۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

ماں بیٹے کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد خاتون بی بی نے دوبارہ سے بات کا آغاز کیا تھا۔

''اللہ ان کے اگلے سفر کو آسان کرے۔۔۔ یقین ہی نہیں آتا کہ اتنا اچھا اور نرم دل انسان حرام موت کو گلے لگا بیٹھا ہے۔''

اس کا احساس جرم کچھ مزید بڑھ گیا۔

دل ''اچھا اور نرم دل'' پر ہی اٹک گیا تھا۔ وہ اٹھ کر کوارٹر سے باہر نکل آیا اور پھر فلک بوس سے بھی نکلتا چلا گیا۔ اس کا رخ قبرستان کی جانب تھا۔ وہ وسامہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنا چاہتا تھا۔

اس کا احساسِ جرم کچھ نیا نہیں تھا۔ اسے جانے کیوں اس سارے معاملے میں خاص طور پر اس نقلی عامل والے ڈرامے پر ہمیشہ سے اعتراض تھا۔ اس نے آئے کت کو اس کام سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن پھر آئے کت کے آنسوؤں کے آگے ہار گیا تھا۔ شہر جانے کے بعد اس نے جب جب اس بارے میں سوچا تھا۔ اسے آئے کت کی بتائی کہانی میں ہمیشہ نئے جھول نظر آئے تھے۔ وہ اپنے بچپن سے وسامہ کو دیکھتا آ رہا تھا۔ وہ بہت نرم خو اور ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا۔ مالک ہو کر بھی اس نے پاشا اور اس کے خاندان سے کبھی نوکروں والا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ وسامہ اپنی بیوی کے لیے اتنا ظالم نہیں ہو سکتا جب کہ اس نے ہمیشہ وسامہ کو آئے کت سے نرمی سے ہی بات کرتے دیکھا تھا۔

اس نے کتنی بار سوچا کہ وہ وسامہ کو سب سچ بتا دے یا کم از کم اپنے باپ کو ہی اس بارے میں بتا دے مگر آئے کت کی شکل دیکھتے ہی اس کا دل پھر سے سب کچھ بھول جاتا تھا۔ وہ ساحرہ تھی اور اپنا سحر قائم کرنا جانتی تھی۔

وہ سر جھکائے قبرستان میں داخل ہوا تھا۔ کچھ آگے جا کر وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ سامنے وسامہ کی قبر کے سامنے معاویہ بیٹھا تھا۔ اپنا سر گھٹنوں میں دیے وہ اکڑوں بیٹھا تھا اور ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

پاشا فوراً ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا تھا اور معاویہ کی باتیں سننے لگا۔

وہ معاویہ سے آئے کت کے بارے میں بول رہا تھا۔ وہ اس کی قبر کے سامنے بیٹھا اس کی اور آئے کت کی تمام کہانی کو دہرا رہا تھا۔ وہ وسامہ سے گلہ کر رہا تھا کہ وہ اتنا بزدل کیوں بن گیا کہ اسے اور آئے کت کو اکیلا چھوڑ گیا۔

پاشا ہکا بکا ساری کہانی سنتا چلا گیا تھا۔ اس پر حقیقت کسی عذاب کی طرح آشکار ہوئی تھی۔ اسے آج پہلی بار پتا چلا تھا کہ اسے کس طرح پاگل بنایا گیا تھا۔

سرخ چہرہ لیے وہ قبرستان سے نکل گیا تھا۔

تین گھنٹے بعد وہ کبیر کے سامنے بیٹھا اسے سب باتیں تفصیل سے بتا رہا تھا اور کبیر خان اپنا سر پیٹنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔

''تمہارا گناہ بہت بڑا ہے پاشا خان! میں تمہیں معاف کر بھی دوں تو اللہ تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ تمہاری وجہ سے ایک معصوم انسان ایسی موت مرا ہے کہ روح کانپتی ہے۔ میں تمہارے اس گناہ میں تمہارا ساتھ دے کر خود کو کسی کا قاتل نہیں بنا سکتا۔'' کبیر خان نے افسردہ مگر سخت لہجے میں بات مکمل کی تھی۔

پاشا کا سر کچھ مزید جھک گیا۔

''میری روح پر بہت بوجھ ہے بابا! آپ جو کہو گے میں ویسا کرنے کو تیار ہوں۔ ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔''

''ہمیں معاویہ صاحب کو سب بتانا ہوگا۔ تمہاری کیا سزا ہے یہ وہی طے کریں گے۔'' کبیر خان نے سرد مہری سے کہا تھا۔

اور پھر اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر معاویہ کے پاس آیا تھا اور اسے ساری بات بتا دی

تھی۔

معاویہ ششدر سا ساری بات سنتا چلا گیا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

پاشا کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی جب معاویہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور الٹے ہاتھ کا زور دار مکا پاشا کے منہ پر مارا تھا اور اس نے ایک بار پر اکتفا نہیں کیا تھا۔

پاشا کی اچھی طرح دھلائی کرنے کے بعد وہ گاڑی لے کر فلک بوس سے نکل گیا تھا۔ اس کی اگلی منزل ایبٹ آباد تھی جہاں اس کے بھائی کی اصل قاتل موجود تھی۔

☆☆☆

اس روز صبح ہوئی تو آسمان کے چہرے پر دھند کا عکس پھیلا تھا۔

یہ ڈوبتے ہوئے اکتوبر کے دن تھے اور درختوں کے پتے تازہ سردی کے بوجھ سے اپنے آپ میں سمٹتے اور جھکتے تھے۔

مکان کے داخلی دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے معاویہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ طالب ماموں کے اس دو منزلہ چھوٹے سے گھر پر اُترنے والی آج کی صبح ہمیشہ جتنی روشن ہرگز نہیں تھی۔

اس کا بوجھل دل اور بھی اداسی سے بھر گیا۔ حلق میں آنسوؤں کا کڑواپن اترا تو اس نے دو تین گہرے سانس لیے آنسوؤں کو اپنے دل میں اتارا اور خود کو جی بھر کر لتاڑا۔ وہ یہاں آنسو بہانے نہیں آیا تھا۔ وہ یہاں ان تمام آنسوؤں کا حساب لینے آیا تھا جو اس گھر کے جوان بیٹے کی موت کے بعد ان سب نے بہائے تھے۔

عین اس وقت جب وہ دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بھی بجا چکا تھا۔ تو اسے ادراک ہوا وہ اتنا بہادر ہرگز نہیں تھا۔ کسی سے آنسوؤں کا حساب مانگنے سے پہلے انہیں پونچھنا پڑتا ہے۔ ان کے بہنے پر قابو پانا پڑتا ہے۔

اس کا دل چاہا واپس پلٹ جائے اور اس نے ایسا کیا بھی۔ آنکھ میں آنسو لے کر جوں ہی واپسی کے لئے پلٹا اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ معاویہ کے پلٹتے قدم جیسے دہلیز نے جکڑ لیے تھے۔ آنسو اس کی آنکھ سے پھسل کر گالوں پر پھیل چکے تھے۔

آئے کت ششدر سی اسے دیکھے گئی۔ دونوں خاموش تھے۔

معاویہ کے آنسوؤں نے آئے کت کو کوفت میں مبتلا کر دیا اور یہ کوفت اس کی آنکھوں میں سرد مہری بن کر چمکی تھی۔

"کون ہے آئے کت؟" ممانی پوچھتے ہوئے اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"معاویہ۔" ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سرعت سے آئے کت کے عقب سے نکلیں اور ننھے بچوں کی طرح معاویہ کو خود سے لپٹا لیا۔

"وسامہ بھی چلا گیا۔۔۔ تم نے بھی آنا چھوڑ دیا۔۔۔" وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے بچوں کی طرح ہی سسک رہی تھیں۔

معاویہ نے پرواہ نہیں کی۔ وہ بھی رونے لگا۔ وہ بہت بڑی سچائی جان کر آیا تھا۔ اس سے اس سچ کا غم اٹھایا نہیں جاتا تھا۔ بہرحال وہی تو تھا جس نے سب کے منع کرنے کے باوجود نہ صرف وسامہ کا اس کی شادی کے معاملے میں اس کا ساتھ دیا تھا بلکہ اس کا نکاح بھی کروا دیا تھا۔ وہی تھا جس نے ماموں کے وسامہ کو گھر سے نکال دینے پر انہیں فلک بوس میں جانے کو کہا تھا۔ اس کے پاس اپنی کی ہوئی غلطیوں کی ایک لمبی لسٹ تھی۔

آئے کت ان کے آنسوؤں سے اکتا کر واپس مڑ گئی تھی۔ ان کے آنسوؤں کی یہی قدر تھی آئے کت کی نظر میں۔

"آؤ۔۔۔ اندر آؤ۔۔۔ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

صاعقہ ممانی اسے لیے اندر آئیں۔ طالب ماموں ٹی وی کے سامنے چپ چاپ بیٹھے اس ٹاک شو میں دھیان لگانے کی کوشش کر رہے تھے جو اب تقریباً ختم ہونے والا تھا اور ماموں کا چہرہ صاف بتاتا تھا انہیں ایک بھی لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔

معاویہ آگے بڑھا اور چپ چاپ ان کے پیروں کے پاس بیٹھ کر اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

طالب ماموں چونکے اور پھر ساکت سے ہو گئے۔ چند لمحے بعد انہوں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ معاویہ کے سر پر رکھا پھر آہستہ سے جھکے اور اس کے بالوں پر ایک شفقت بھرا بوسہ دیا اور اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک نہیں سکے۔ اور بنا آواز روتے چلے گئے۔

اسی وقت آئے کت اندر آئی۔ ان سب کو روتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں غصہ بھر گیا۔

"اس سے اچھا تھا تم یہاں کبھی نہ آتے۔۔۔" اس نے بنا اسے مخاطب کیے کہا۔ لہجہ پُرتپش تھا۔ "ان تین مہینوں میں ہمیں وسامہ کے بغیر رہنے کی عادت ہو گئی ہے کچھ دن اور گزرتے تو سب تمہیں بھی بھول جاتے۔"

"اللہ نہ کرے کیسی باتیں کر رہی ہو۔" صاعقہ ممانی دہل کر بولیں۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔۔۔ یہ نہ آتا یہاں۔۔۔ کم سے کم آپ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تو نہ آتے۔۔۔" اس نے تلخی سے کہا تھا

"میں شرمندہ ہوں۔" معاویہ نے کہا۔

"کیا فائدہ اس شرمندگی کا۔۔۔ وسامہ تو واپس نہیں آ سکتا۔" اس نے کڑوے لہجے میں کہا ایک چھلکتی ہوئی نگاہ معاویہ پر ڈالی تھی اور پلٹ کر سرعت سے باہر نکل گئی تھی۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو آئے کت۔۔۔ اب شرمندگی کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ تم نے ہمارا جو نقصان کیا ہے۔۔۔ میں اس کا بدلا سود سمیت لوں گا۔۔۔ پھر شاید میری شرمندگی کچھ کم ہو جائے۔۔۔ میرا وعدہ رہا تم سے آئے کت۔۔۔ تم ترسو گی موت کے لیے۔۔۔ اور تمہیں زندہ رہنا پڑے گا۔" معاویہ نے باہر نکلتی آئے کت کو دیکھ کر اپنے دل میں عزم کو دہرایا تھا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آ گیا تھا۔ یہ طالب ماموں کے گھر میں اس کا اور وسامہ کا کمرہ تھا۔ ان دونوں کے سنگل بیڈ ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ درمیان کی چھوٹی تپائی پر اب بھی وہی ٹیبل لیمپ رکھا تھا جو وسامہ کے زیر استعمال رہتا تھا۔ اس کی اسٹڈی ٹیبل اس کی کرسی اس کی الماری۔۔۔

معاویہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگاتا اپنی سسکیاں روک رہا تھا، کتنی ہی یادیں ماضی کی کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ اس سے قبل کہ وہ زمین پر بیٹھ جاتا اور آنسوؤں کو بہہ جانے دیتا، کمرے کا دروازہ کھلا۔ معاویہ نے جھٹکے سے گردن موڑ کر دیکھا۔ آئے کت اپنی جھونک میں اندر داخل ہو رہی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے ٹھٹک کر پوچھا تھا۔

''یہ میرا کمرہ ہے۔'' اس سے نظریں ملائے بغیر بولا۔

''یہ وسامہ کا کمرہ تھا۔'' آئے کت نے غصے سے کہا۔

''ہم دونوں کا تھا۔'' معاویہ تحمّل سے بولا۔

''تھا۔۔۔اب نہیں ہے۔'' تلخی کچھ اور بڑھ گئی۔ ''اس گھر پر، اس کمرے پر، وسامہ سے وابستہ کسی بھی چیز اور فرد پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔۔۔'' اس نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا تھا۔

اپنے پلان کے مطابق، اسے اب معاویہ کو احساس جرم میں مبتلا کرنا تھا کہ وسامہ کی موت کی وجہ وہی ہے کیوں کہ اسی نے ان دونوں کو فلک بوس میں بھیجا تھا اور اس حساب سے آئے کت اب معاویہ کی ذمہ داری بنتی ہے۔ اگر وہ یہ جان پاتی کہ معاویہ اس کی سچّائی سے واقف ہو چکا ہے تو یقیناً کب کی یہاں سے بھاگ چکی ہوتی۔۔۔لیکن۔۔۔

معاویہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھا اور الماری کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن اس سے پہلے آئے کت نے الماری کے پٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہٹو آگے سے۔'' وہ ذرا جھنجلا کر بولا۔ ''یہ میرے بھائی کا کمرہ ہے اور تم مجھے یہاں کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے نہیں روک سکتیں۔''

''یہ تمہارے بھائی کا کمرہ تھا۔۔۔اب یہ میرا کمرہ ہے۔'' وہ دانت کچکچا کر بولی۔ ''اور اب یہ میرا بھائی میرا بھائی کرنا بند کرو۔۔۔اب تو بے چارہ اس دنیا میں بھی نہیں رہا۔۔۔آخر کب تک یہ محبت کا ڈھونگ رچاتے رہو گے۔'' اس نے جتنی نفرت سے کہا تھا اتنی ہی تیزی سے معاویہ کے ماتھے پر پڑے بلوں میں اضافہ ہوا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں عین ممکن تھا اگر آئے کت عورت نہ ہوتی تو اب تک معاویہ ایک پنچ مار کر اس کے دو تین دانت تو ضرور توڑ چکا ہوتا۔

''تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی؟'' اس نے تقریباً غرا کر کہا تھا۔

''میرے سامنے اونچی آواز میں بات مت کرنا معاویہ! تمہاری اصلیت میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' اس نے معاویہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بنا ڈرے کہا تھا۔ آئے کت کا اعتماد معاویہ کی آنکھوں میں غصہ بن کر پھیل گیا۔ یکا یک ان دونوں کے ارد گرد سے ہر منظر غائب ہونے لگا اور کھڑکیاں دروازے سب اڑنچھو ہو گئے اور ان دونوں نے خود کو فلک بوس میں کھڑے پایا۔ وہی اسرار جو دھند کی مانند رگ وپے میں اترتا تھا اس وقت بھی معاویہ کے خون میں دوڑنے لگا۔

''معاویہ۔۔۔!'' صاعقہ ممانی کی آواز ان دونوں کو فلک بوس سے کھینچ لائی تھی۔ ان دونوں نے ہی جیسے اس لمحے کسی راز کی پاسداری کی تھی اور اپنے اپنے تاثرات بدل لیے تھے۔ ''معاویہ! کھانا کھالو۔'' آواز دوبارہ آئی۔

''آرہا ہوں۔'' اس نے آواز لگائی ایک تیز نظر آئے کت پر ڈالی اور انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولا۔

''میری اصلیت کی بات دوبارہ مت کرنا۔۔۔تمہارا اصلی چہرہ تو میں سب کو دکھاؤں گا۔''

☆☆☆

معاویہ بد دلی سے کھانا کھا رہا تھا اور صاعقہ ممانی خاموشی سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''بہت کمزور ہو گئے ہو۔۔۔کھانا نہیں کھاتے کیا؟'' فکرمندی سے پوچھا

معاویہ کھاتے کھاتے ایک دم رکا۔ اس کا دل چاہا انہیں آئے کت کی اصلیت بتائے پھر ارادہ بدل دیا۔

''بابا کا کک آپ کے جیسا اچھا کھانا نہیں پکاتا۔۔۔میں سوچ رہا ہوں کچھ دن اسے آپ کے پاس بھیج دوں۔۔۔دو چار اچھے کھانے ہی پکانا سکھا دیں اسے۔'' صرف انہیں دکھانے کو وہ اب جلدی جلدی کھانے لگا تھا۔

وہ ممانی سے وسامہ کی باتیں کرنے لگا۔ باتوں کے دوران ہی آئے کت کی بات چل نکلی تھی جب معاویہ نے خفگی سے سر جھٹک کر کہا تھا۔

''اس سارے فساد کی جڑ ہی آئے کت تھی۔۔۔نہ وہ وسامہ کی زندگی میں آتی۔ نہ ماموں وسامہ کو گھر سے نکالتے' نہ اسے فلک بوس جا کر رہنا پڑتا اور نہ۔۔۔'' ایک دم غصے سے بولتا وہ چپ ہو گیا۔ بغیر ثبوت کے وہ انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

''اور نہ؟'' ممانی اس کے لفظوں میں الجھ گئی تھیں۔

''کچھ نہیں۔۔۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''معاف کرنا۔۔۔میں تمہیں بتانا بھول گئی۔۔۔وہ کمرہ اب آئے کت کے زیر استعمال ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔۔۔لیکن آپ کو وہ کمرہ اسے نہیں دینا چاہیے تھا۔'' معاویہ نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ ''وسامہ چلا گیا لیکن مجھے تو واپس آنا ہی تھا۔''

''اس نے بہت منّت سے پوچھا تھا معاویہ! میں انکار نہیں کر سکی۔''

معاویہ نے غور سے ان کی بات سنی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں وہ منّت سے ہی پوچھتی ہے۔'' اس نے زیر لب کہا تھا۔

کھانا کھا کر معاویہ اس کمرے میں آ گیا جو صاعقہ ممانی نے اس کے لئے تیار کیا تھا۔

وہ تھکا ہوا تھا اور ذہن پر بوجھ بھی تھا اسی لیے فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔

کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد بالآخر اسے نیند آ گئی۔ دوبارہ اس کی آنکھ اردشیر ازی کی کال سے کھلی تھی۔ باپ سے بات کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ بارش ہو رہی تھی اور سارے گھر میں پکوڑوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ معاویہ سیدھا کچن میں آ گیا۔ صاعقہ ممانی پکوڑے تل رہی تھیں جوں ہی وہ کچن میں داخل ہوا اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

''میں بس تمہیں جگانے آ ہی رہی تھی۔''

''آپ کے پکوڑوں کی خوشبو نے جگا دیا۔'' وہ پاس آیا اور پلیٹ سے اٹھا کر پکوڑا کھانے لگا۔ ''ساتھ چائے بھی مل جائے تو کیا بات ہے۔''

''بیٹھو۔۔۔میں بنا رہی ہوں۔''

اس نے بیٹھتے ہوئے ماموں اور پھر آئے کت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

''یہیں کہیں ہو گی۔۔۔اس نے کہاں جانا ہے۔'' وہ گہری' دکھ بھری سانس بھر کر بولیں۔ ''بڑی مشکل

سے اس نے اس حقیقت کو قبول کیا ہے کہ وسامہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔۔۔ مجھے افسوس ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ ہم اس لڑکی کو پہچان کیوں نہیں سکے۔ آئے کت تو بہت اچھی ہے معاویہ! وسامہ سے بہت محبت تھی اسے۔" وہ بڑے دکھ سے بول رہی ہیں۔

معاویہ خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

"میرا خیال تھا یہ اپنی ماما کے پاس چلی گئی ہوگی۔" اچانک اس نے کہا۔

"تمہیں نہیں پتا۔۔۔ آئے کت کی ماں کا تو چند مہینے پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا ہے۔"

معاویہ نے ایک دم شاکڈ ہو کر ممانی کو دیکھا تھا۔ اس کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

"افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آئے کت کو بھی اس بارے میں نہیں پتا تھا۔" ممانی چائے لے کر دوسری کرسی پر جا بیٹھیں۔

"افسوس ہوا۔۔۔" اس نے سرد مہری سے بات ختم کر دی تھی۔

اس کی نظریں کچن کے دروازے سے کچھ فاصلے پر چادر میں لپٹی بیٹھی آئے کت پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

اس رات جب معاویہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا اور پھر بھی سونے میں کامیاب نہ ہو سکا تو وہ ٹی وی آن کر کے کوئی ٹاک شو دیکھنے لگا تھا۔ اسی وقت آئے کت اس کے کمرے کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ اس نے دستک دی تھی۔ اندر سے اسے اندر آنے کی اجازت دی گئی لیکن اس نے اندر جانے کے بجائے دروازہ دوبارہ سے بجایا اور تیزی سے نچلی منزل کی طرف چلی گئی۔

معاویہ نے اٹھ کر دروازہ کھول کر چیک کیا۔ دروازے پر کوئی نہیں تھا لیکن اسے محسوس ہوا کہ سیڑھیوں پر کوئی بھاگ کر نیچے گیا ہے۔ جس وقت وہ چیک کرنے کے لیے نیچے آیا، اس نے آئے کت کو کچن میں دیکھا تھا۔ اگر وہ وقت پر اس کی جانب نہ پلٹتی تو شاید معاویہ حفاظت کے غرض سے اٹھایا ہوا گلدان اس کے سر پر مار چکا ہوتا۔

☆☆☆

اگلے دن معاویہ نے پورا گھر دوبارہ سے چیک کیا تھا لیکن اگر کوئی سراغ ہوتا تو ملتا۔ وہ سمجھ گیا کہ تمام گڑبڑ آئے کت کی ہی پھیلائی ہوئی ہے۔

"رات مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے دروازہ ناک کیا ہو۔ لیکن جب میں باہر نکلا تو باہر کوئی بھی نہیں تھا۔" ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اس نے طالب ماموں اور صاعقہ ممانی کو بتایا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" ماموں نے کہا

"میں بھی غلط فہمی سمجھتا اگر میں نے کسی کو سیڑھیوں پر بھاگتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہوتا۔" اس نے ہوا میں تیر چلایا تھا۔ وہ آئے کت کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" صاعقہ ممانی ایک دم سے پریشان ہو گئی تھیں۔ "اس کا مطلب رات کو کوئی گھر میں گھسا تھا۔۔۔ یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ممانی! میں سارا گھر چیک کر چکا ہوں۔ نہ تو کوئی چوری کے آثار ہیں نہ کسی کے بھاگ نکلنے کے۔۔۔ باہر کے دروازے کو ویسے ہی لاک لگا ہوا ہے جیسے رات آپ نے لگایا تھا۔"

"پھر وہ کون ہو سکتا ہے؟" طالب ماموں فکرمندی سے بولے ان کے لہجے میں الجھن تھی۔

"ہو سکتا ہے آیو گھمتی ہو۔" آئے کت نے آملیٹ کی پلیٹ میز کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے آسیب بہت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں... کیا پتا وہ بھی فلک بوس سے یہاں آ گئی ہو۔"

معاویہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ اسے اس سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ آئے کت کو یہ بات ماموں اور ممانی کے سامنے نہیں کرنا چاہیے تھی۔ کم سے کم معاویہ کا یہی خیال تھا۔

"وسامہ کے بعد اب وہ معاویہ کے پیچھے ہوگی۔ آئی تھنک معاویہ! تمہیں کسی عامل کے پاس جانا چاہیئے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ اندازہ لگانا مشکل تھا وہ طنز کر رہی ہے یا سنجیدہ ہے۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہو گی؟" معاویہ نے سختی سے کہا۔

"نہیں۔" چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے آئے کت نے ترنت کہا۔ "فلک بوس تمہارا ہے تو وہاں رہنے والے آسیب کا سب سے زیادہ حق بھی تم ہی پر ہے۔۔۔ وسامہ بے چارے تو غلط فہمی میں مارے گئے۔"

"آئے کت! اس طرح کی باتیں مت کرو۔" صاعقہ ممانی اس کے تیور پہچان کر منت سے بولی تھیں۔

"میں اس طرح کی باتیں کیوں نہ کروں۔ آپ اس دن پوچھ رہی تھیں ناں وسامہ کیوں چلا گیا دنیا سے۔۔۔ میں بتاتی ہوں آپ کو۔ وہ اس لیے چلا گیا کیونکہ معاویہ نے اسے موت کے منہ میں دھکیلا۔" وہ ایک دم سے پھٹ پڑنے کے انداز میں بولی تھی۔ معاویہ کے سر پر جیسے آسمان آ گرا تھا۔ وہ اپنا کیا ہوا جرم اس پر ڈال رہی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔" وہ غضب ناک ہو کر گرجا۔

"کاش یہ بکواس ہوتی۔۔۔ کاش میں بکواس ہی کر رہی ہوتی۔۔۔ لیکن یہی سچ ہے مسٹر معاویہ شیرازی!۔۔۔ ایسا سچ جو تم کبھی کسی کے سامنے آنے نہیں دو گے۔۔۔ تم اچھی طرح جانتے تھے فلک بوس آسیب زدہ ہے... اس کے باوجود.. اس کے باوجود تم نے مجھے اور وسامہ کو وہاں جانے دیا۔ تم نے ہمیں خود مجبور کیا کہ وہاں جا کر رہیں جہاں کوئی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

"یہ سچ نہیں ہے۔" وہ زور سے بولا۔

"یہ سچ ہے۔" وہ بھی چلائی۔ "تم جلتے تھے وسامہ سے۔ تم ہمیشہ اس جیسا بننا چاہتے تھے۔۔۔ یاد کریں انکل! یہ بات آپ نے خود مجھے بتائی تھی کہ معاویہ بہت چھوٹی عمر سے وسامہ کو فولو کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا میں وسامہ جیسا بننا چاہتا ہوں۔ اور جب یہ ویسا نہیں بن سکا۔۔۔ ویسا ہر دل عزیز نہیں بن سکا تو اس نے وسامہ کو فلک بوس بھجوا دیا۔۔۔ کیونکہ یہ جانتا تھا وہ آسیب کسی کو بھی وہاں ٹکنے ہی نہیں دے گا۔" وہ بہت کامیابی سے اپنے مہرے آگے بڑھاتے ہوئے بول رہی تھی۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے وسامہ کی موت کا ذمہ دار مجھے مت ٹھہراؤ۔" معاویہ چیخ کر بولا تھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ وسامہ کی موت کی ذمہ دار تم ہو۔۔۔ محبت کی شادی کرنے کے باوجود تم کبھی اسے وہ خوشی دے ہی نہیں پائیں جو اس جیسا اچھا انسان ڈیزرو کرتا تھا۔" کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"اچھا۔۔۔ میں اسے خوشی نہیں دے پائی اس لیے میں نے وسامہ کو۔۔۔ اپنے شوہر کو قتل کر

دیا۔۔۔ واؤوو۔۔۔ کس قدر بے تکا الزام ہے۔'' آئے کت نے سلگ کر کہا۔

''مجھے نہیں پتا کیا ہوا کیا نہیں۔۔۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کی موت میں کہیں نہ کہیں تمہارا ہاتھ ہے۔۔۔''

''ٹھیک ویسے ہی جیسے میں مانتی ہوں وسامہ کے اس دنیا سے چلے جانے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔'' وہ سابقہ انداز میں بولی۔

''تم نے محبت کے نام پر اسے موت کے گھاٹ اتارا۔۔۔'' وہ غرّایا۔

''اور تم نے بھائی بن کر۔'' وہ بھی چلّائی۔

طالب ماموں نے شاک سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔؟۔۔۔ کیوں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے ہو۔''

''کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔'' آئے کت نے دوٹوک انداز میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''میں اسے قتل کر دوں گا۔۔۔ میری بات لکھ کر رکھ لیں۔۔۔ میں واقعی اسے قتل کر دوں گا۔'' اس نے ہاتھ مار کر میز پر پڑے برتن گرا دیے اور تن فن کرتا باہر نکل گیا۔

''معاویہ!۔۔۔ معاویہ!۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔'' وہ دونوں ہی اس کے پیچھے لپکے تھے۔

معاویہ وہاں سے سیدھا کچن میں گیا تھا۔ اسے کسی تیز دھار آلے کی ضرورت تھی جس سے ایک ہی بار میں آئے کت کی طرف نکلنے والے تمام حساب برابر کر پاتا۔

'معاویہ۔۔۔ بیٹا! تم کیا کر رہے ہو؟'' صاعقہ ممانی نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔۔

''میں آئے کت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ جیسے غصے سے پاگل ہوتا یہاں وہاں ہاتھ مار رہا تھا۔

''غصہ تھوک دو معاویہ! وسامہ جا چکا ہے۔۔۔ اس طرح جذباتیت کا مظاہرہ کرنے سے وہ واپس نہیں آ جائے گا۔'' طالب ماموں نے اسے پکڑ کر روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ معاویہ نے زبردستی اپنا آپ ان سے چھڑا لیا۔

''مجھے چھوڑ دیں ماموں! مجھے روکنے کی کوشش مت کریں۔۔۔ آپ صحیح کہتے تھے آئے کت اس قابل نہیں تھی کہ وسامہ جیسا لڑکا اس سے شادی کرتا۔۔۔ ہم اسی وقت روک لیتے وسامہ کو تو آج وہ ہمارے درمیان ہوتا۔۔۔'' وہ ہیجانی انداز میں زور زور سے بول رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہ رہا ہو۔ وہ غم و غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اسے تیز دھار چھری مل گئی تھی۔ اسے لیے وہ باہر کی طرف لپکا۔ طالب ماموں نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

''تمہارے پاس ثبوت ہے؟'' وہ اسے باہر نکلنے سے روکنے کی تگ و دو کر رہے تھے اور ہلکان ہو رہے تھے۔

''تمہارے پاس ثبوت ہے معاویہ! کہ وسامہ کو آئے کت نے قتل کیا ہے؟''

اسی وقت آئے کت بھی وہاں آ گئی تھی۔

''مجھے چھوڑ دیں ماموں! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔'' ان کی بات سنے بغیر وہ خود کو چھڑا کر تیزی سے آئے کت کی طرف بڑھا۔ عین ممکن تھا وہ اسے چھری سے زخمی کر دیتا۔ طالب ماموں نے سرعت سے اسے پکڑ کر اپنی طرف رخ موڑا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر لگایا۔ وہ تھپڑ کھا کر ساکت ہو گیا تھا۔

''تمہارے پاس گواہ ہے جس کی گواہی یہ ثابت کرے کہ آئے کت وسامہ کی قاتل ہے؟۔۔۔ کوئی ایسا ثبوت جو آئے کت کو سزا دلوانے کا سبب بن سکے؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہے تمہارے پاس۔۔۔ صرف شک کی بنیاد پر دوسروں کو سزائیں نہیں سنائی جاتیں معاویہ! اور اگر صرف شک کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صادر کرنا ہے تب تو ہمیں آئے کت کی بات بھی مان لینی چاہیے۔۔۔ وہ سمجھتی ہے وسامہ کو تم نے موت کے منہ میں دھکیلا تھا' اس حساب سے کوئی نہ کوئی فرد جرم تو تم پر بھی عائد ہوتی ہے۔۔۔ ایک کے شک کو سچ ماننے کا مطلب ہے' دوسرے کے شک کو بھی سچ مان لیا جائے۔۔۔ تمہیں شک ہے تو ثبوت لے کر آؤ۔۔۔ اس کے جرم کو ثابت کرو۔۔۔ اس کے گناہ پر سے پردہ اٹھاؤ۔۔۔ یہ نہیں کہ خود سے سزا دینے نکل کھڑے ہو۔'' وہ جیسے غصے سے بولتے بولتے ہانپنے لگے تھے۔

اپنی بات پوری کرنے کے بعد وہ ممانی سمیت وہاں سے چلے گئے تھے۔

آئے کت نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر نظر چرا کر باہر نکل گئی تھی۔

معاویہ نے ہاتھ اٹھا کر اس تیز دھار چھری کو دیکھا۔ بے بسی کا احساس اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا۔ اس نے چھری کو فرش پر پھینک دیا تھا۔ طالب ماموں کی باتیں اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ ثبوت کہاں سے لاتا وہ۔۔۔ اردشیر ازی پہلے ہی مزید تحقیقات سے منع کر چکے تھے۔ پولیس کے مطابق وسامہ نے نشے کی حالت میں خود کو الماری میں بند کیا تھا۔ ایسے میں کون اس کی یا کبیر اور پاشا کی بات کا یقین کرتا۔۔۔

''میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں آئے کت۔۔۔ تمہیں اپنے کیے کا حساب تو ہر حال میں دینا ہی ہو گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی حد تک جانا پڑے۔ قانون تجھے انصاف نہیں دے گا۔۔۔ مگر میں اپنا بدلہ لے کر رہوں گا۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

طالب ماموں کے ایک تھپڑ نے کافی کام کیا۔ معاویہ غصے میں گھر سے نکلا تھا۔ بارش بھی اس روز وقفے وقفے سے برستی رہی۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے سڑکوں پر پھرتا رہا قسم کھائی تھی مڑ کر وہاں نہیں جائے گا جہاں ایک دو ٹکے کی لڑکی کے لیے اس پر ہاتھ اٹھایا گیا اسے جھوٹا قرار دیا گیا تھا۔ لیکن ایسی جذباتیت کی قسموں کی مدت کم ہی ہوتی ہے سو شام ڈھلے' جب اس نے واپس آنے کا سوچا تب تک وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے آئے کت سے کس طرح بدلہ لینا ہے۔ اس کے ذہن میں سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ قانون اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کرے گا کیوں کہ اردشیر ازی اس معاملے کو قانون تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے۔ ماموں کو اس کی بات کا یقین نہیں تھا اور بغیر ثبوت کے وہ اس کی بات ماننے کو راضی بھی نہیں تھے تو جب سب اس کے خلاف ہی تھے تو اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔۔۔

آئے کت کو خود سزا دینے کا فیصلہ۔۔۔

جس وقت وہ گھر آیا ممانی گیٹ پر ہی اس کی منتظر تھیں۔ معاویہ نے ان سے فوراً معافی مانگ لی تھی۔ اور یہی کام اس نے شام میں ماموں کے سامنے بھی کیا تھا۔ وہ دونوں معاویہ سے زیادہ دیر ناراض رہ بھی نہیں

سکتے تھے سو ماموں نے بھی اسے فوراً ہی معاف کر دیا تھا۔ وہ ماموں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

آئے کت نے ایک نگاہ ان سب پر ڈالی پھر سر جھٹک کر وہاں سے باہر نکل گئی۔

محبتوں کے یہ مظاہرے اسے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔

معاویہ نے اس کے باہر جانے کی کوئی خاص پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ ماموں ممانی کے ساتھ بیٹھ کر بیتے دنوں کی باتیں دہراتا رہا تھا۔ پھر جب ممانی نے کچن میں جانے کا عندیہ دیا تو انہیں کچن میں جانے سے منع کرتے ہوئے وہ کھانا باہر سے لینے چلا گیا تھا۔

جس وقت وہ کھانا لے کر واپس آیا، آئے کت اور ممانی کچن میں تھے۔ وہ دروازے کی اوٹ میں رک کر ان کی باتیں سننے لگا۔ ممانی اسے سمجھا رہی تھیں۔

''وسامہ کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا آئے کت! مجھے دیکھو ماں ہوں اس کی لیکن دل پر صبر کی سل رکھ لی ہے۔ اللہ نے تمہیں اس بچے کی صورت میں جینے کی آس دی ہے۔۔۔ آنے والا بچہ وسامہ نہیں ہوگا لیکن اس کا پرتو تو ہوگا۔۔۔ بیٹا! ایسے مایوسی کی باتیں کر کے اللہ کو ناراض نہ کرو۔''

معاویہ کا دل چاہا تھا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

آئے کت ماں بننے والی تھی اور وسامہ کے ہونے والے بچے کو وہ نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی تمام پلاننگ غارت ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا دل بیک وقت خوشی اور دکھ سے بھر گیا۔ وہ چچا بننے والا تھا، اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی لیکن وہ اب اپنے بھائی کا بدلہ نہیں لے سکتا تھا، اس بات کا دکھ بھی کم نہیں ہو سکتا تھا۔

معاویہ اندر آیا اور کھانے کا سامان اس نے شیلف پر رکھ دیا۔

''میں کھانا لے آیا ہوں ممانی۔۔۔!''

اس کی آواز پر وہ دونوں چونکیں۔ آئے کت نے تیزی سے آنکھیں صاف کیں اور اپنے کھانے کی پلیٹ اٹھا کر سرعت سے کچن سے نکل گئی۔ اس کا انداز صاف بتاتا تھا وہ معاویہ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔

صاعقہ ممانی نے گہری سانس بھری اور اٹھ کر شیلف کے پاس آ گئیں۔

''یہ تو بہت سارا کھانا اٹھا لائے ہو تم۔ ہم تین افراد کتنا کھا سکتے ہیں۔''

معاویہ ابھی تک گردن موڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے ایک آن میں آئے کت غائب ہوئی تھی۔ وسامہ کے آنے والے بچے کے بارے میں سن کر اس کا دل گداز ہونے لگا تھا۔ بات حیران کن تھی لیکن وسامہ کا دکھ اس کے بچے کے بارے میں سن کر کم ہو گیا تھا۔

اس نے ممانی کی بات پر ذرا چونکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور ان کی بات سمجھنے میں اسے کچھ وقت لگا۔

''آ۔۔۔ جو کھانا بچ جائے وہ صبح کام والی ماسی کے گھر بھجوا دیجیے گا۔''

''ہاں... یہ ٹھیک ہے۔'' وہ کھانا پلیٹوں میں نکالنے لگیں۔ تب ہی ان کی نظر میز پر پڑی جہاں پانی کا گلاس جوں کا توں رکھا تھا۔

''یہ پانی کا گلاس تو یہیں رہ گیا۔ میں آئے کت کو دے کر آتی ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا۔ معاویہ نے ان کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

''میں دے آتا ہوں۔''

''معاویہ۔۔۔!''

''جی؟'' وہ دروازے کے قریب رک کر پلٹا۔

''بیٹا! کوئی تلخ بات مت کرنا۔'' صاعقہ ممانی نے منّت سے کہا۔ ''آئے کت پریگننٹ ہے۔ اس حالت میں پہلے ہی بہت صدمے اٹھا چکی ہے۔۔۔ اب رحم کرو اس پر۔''

معاویہ کا دل ایک دم سے جیسے خالی ہو گیا تھا۔ آئے کت کے صدمے کی تو اسے کچھ خاص پروا نہیں رہی تھی لیکن ماموں اور ممانی کو ایک اور غم کیسے دے دیتا وہ۔

''میں صرف پاشا کی بات پر کیسے یقین کر سکتا ہوں۔۔۔ بھلا آئے کت ایسا کیوں کرے گی؟ اور اگر ایسا تھا بھی تو وسامہ کو کبھی تو شک ہونا چاہیے تھا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ اور پھر اسے آئے کت پر کیے گئے شک پر افسوس ہوا تھا۔

یعنی آئے کت کی رسی ابھی بھی دراز ہی رکھی گئی تھی۔۔۔ الزام مجھ سے ہٹتے ہٹتے پھر میری ذات پر ہی آ ٹھہرا تھا۔۔۔

اسی لمحے میں فیصلہ ہو گیا تھا۔ ماموں ممانی اور وسامہ کے ہونے والے بچے کی خاطر آئے کت کو معاف کرنے کا فیصلہ۔۔۔

معاویہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ وسامہ کے کہنے کے مطابق آئے کت کا پورا خیال رکھے گا اور اس کے ساتھ اپنے بُرے رویے کا ازالہ بھی کرے گا۔ اسے پاشا یا کبیر کسی کی بات نہیں سننی تھی۔ اسے اب صرف وسامہ کی بیوہ اور ان کے بچے کے بارے میں سوچنا تھا۔

''جی۔۔۔'' اس نے گہری سانس بھر کر ممانی کو جواب دیا اور باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

معاویہ اسے سارے گھر میں ڈھونڈتا ہوا باہر نکلا۔ آئے کت لان سے منسلک برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی اور سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

چھوٹی سی ستواں ناک سردی سے لال ہو رہی تھی۔ براؤن بال جنہیں دیکھ کر ہمیشہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے مٹھی بھر سونا اس کے سر پر پھینک دیا ہو اس وقت ڈھیلے سے جوڑے کی صورت میں پشت پر پڑے تھے۔ کچھ بال چہرے پر بکھر گئے تھے۔ وہ ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے کہ لان میں لگے ہوئے لیمپ پوسٹ کی روشنی اس کی پشت پر پڑ رہی تھی اور دور سے دیکھنے پر بالوں کا سنہرا پن اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ننھے منے کئی جگنو اس کے بالوں پر آنکھ مچولی کھیلنے آ گئے ہوں۔ یہی سنہرا پن اس کی بے تحاشہ سفید رنگت میں بھی تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور بالوں کی رنگت سے میل کھاتی تھیں۔ پلکیں اتنی گھنی اور سیاہ تھیں کہ ایسا لگتا تھا قدرت نے آنکھوں کی حفاظت کے لئے باڑھ لگا دی ہو۔ بھنویں کمان کی طرح تنی ہوئی تھیں اور پیشانی چھوٹی لیکن قابل رشک تھی۔

معاویہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگا اور اس لمحے رات کے اس پہر میں اس نے اعتراف کیا وسامہ اگر اسے دیکھ کر دیوانہ ہوا تھا تو یہ کوئی اتنی انہونی بات بھی نہیں تھی۔ وہ اتنی خوبصورت اور دلکش تھی کہ اس کے لیے کوئی بھی دیوانہ ہو سکتا تھا۔

آئے کت کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ معاویہ کو پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑے دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کیونکہ وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں کوئی غصہ اور نفرت نہیں تھی۔۔۔ بلکہ کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔۔۔ جیسے کسی سوچ کے زیر اثر کنفیوژ سا کھڑا ہو۔ اس نے اپنے گرد لپیٹی چادر سمیٹی۔ اور قریب رکھی پلیٹ اٹھا کر جانے لگی۔

‘‘کیا ہم تھوڑی دیر یہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟’’ گلا کھنکھار کر صاف کرتے ہوئے معاویہ نے قدرے جھجک کر کہا۔

آئے کت نے اس فرمائش کو ذرا حیرانی سے سنا تھا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئی۔ معاویہ اس سے کچھ فاصلہ پر ایک دوسری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ خاموشی ان دونوں کے درمیان کچھ دیر حائل رہی پھر معاویہ نے پانی کا گلاس آئے کت کے قریب رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

‘‘کانگریچولیشنز۔۔۔ وسامہ ہوتا تو بہت خوش ہوتا۔’’ اس نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ جس قسم کا سلوک وہ صبح آئے کت کے ساتھ کر چکا تھا

‘‘تھینک یو۔۔۔’’ آئے کت نے ذرا دیر بعد آہستہ سے کہا۔ ‘‘یقیناً وہ بہت خوش ہوتا۔۔۔ اسے اولاد کی بہت خواہش تھی۔’’

معاویہ کا دل لبالب اداسی سے بھر گیا۔

‘‘ممانی صحیح کہتی ہیں۔۔۔ تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے۔’’ معاویہ نے اس کی پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

‘‘میں کوشش کر رہی ہوں۔’’ اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی تھی۔ وہ ایک کامیاب اداکار تھی۔ ‘‘لیکن میرا دل نہیں چاہتا معاویہ۔۔۔ مجھے بھوک نہیں لگتی۔ پیاس نہیں لگتی۔۔۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ وسامہ مجھے چھوڑ کر۔۔۔’’ وہ بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔ معاویہ نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنا دکھ کھل کر رو لے۔

وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ آنسوؤں کے ساتھ، سسکیوں اور آہوں کے ساتھ۔

معاویہ کے سینے میں سسکیاں اودھم مچانے لگیں۔ آنسو آنکھوں کے کنارے آ گئے تھے لیکن اس نے ضبط کیا۔ وہ دل سے تسلیم کر چکا تھا آئے کت بے قصور ہے اور اس کا دکھ بہر حال اس کے دکھ سے بڑا اور ناقابل برداشت ہے لیکن پھر ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ کچھ دیر بعد اس نے خود پر قابو پایا تھا اور پھر سے بات کا آغاز کیا تھا۔

‘‘مجھے معاف کر دو۔۔۔ غصے میں، میں کافی کچھ الٹا سیدھا بول گیا تھا۔۔۔’’ معاویہ نے شرمندگی سے معذرت کی تھی۔

‘‘میں جانتی ہوں۔۔۔ میں نے بھی غصے میں کافی کچھ بول دیا تھا۔۔۔ سوری۔’’ وہ واقعی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

‘‘تم نے بھی سوری بول دیا۔۔۔ میں نے بھی۔۔۔ کیا میں یہ سمجھوں، ہمارے درمیان دشمنی ختم ہوئی۔’’ معاویہ نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

‘‘اسے دشمنی کہہ کر تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔۔۔ وہ ہم دونوں کی جذباتیت تھی۔۔۔ اور کچھ نہیں۔’’

آئے کت نے فوراً کہا تھا۔ وہ اس موضوع کو مزید ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

‘‘وہ دشمنی ہی تھی آئے کت۔۔۔! اگر ماموں نہ روکتے۔۔۔ تو شاید میں تمہیں قتل کر چکا ہوتا۔۔۔ یا ایک آدھ گھاؤ تو ضرور لگا دیا ہوتا۔’’ وہ جھجکتے ہوئے لیکن سچائی کے ساتھ بولا تھا۔

آئے کت گہری سانس بھر کر بولی۔ ‘‘میں پھر بھی یہی کہوں گی ہم کبھی ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے۔’’

‘‘ہم دوست بھی نہیں تھے۔’’ اس نے ترنت کہا۔

‘‘میں نے تم سے دوستی کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔ تم نے بہت بری طرح دھتکارا تھا مجھے۔’’ آئے کت نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

‘‘اس بات کو۔۔۔ اس وقت کو بھول جاتے ہیں۔۔۔ آؤ ہم اپنی کہانی کو ایک نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔’’ اس نے سادگی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔ ‘‘ویسے بھی وسامہ کہتا تھا کوئی کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ جہاں کوئی کہانی ختم ہوتی ہے وہیں سے کوئی دوسری کہانی شروع ہو رہی ہوتی ہے۔۔۔ بس یہ ہے کہ ہمیں اس آغاز کا پتا تھوڑی دیر سے چلتا ہے۔’’

معاویہ کی بات مکمل ہونے تک آئے کت کی آنکھوں میں مسکراہٹ در آئی تھی۔ وہ نقلی آنسو بہاتے بہاتے ہی مسکرا دی۔

‘‘میں وسامہ کو مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔۔۔ اگر قدرت مجھے موقع دیتی تو میں اپنی زندگی اسے دے دیتی لیکن اس کی سانسوں کا تسلسل ٹوٹنے نہ دیتی۔’’ وہ بڑے دکھی انداز میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

معاویہ پھر افسردہ ہو گیا۔ اس کے دل پر بھاری سل آ رکی تھی۔ ایک بار پھر اسے اپنی کچھ گھنٹے پہلے کی سوچ پر افسوس ہوا تھا۔

‘‘ہم سب یہی کرتے آئے کت!۔۔۔ لیکن قدرت موقع نہیں دیتی.. کبھی نہیں دیتی۔’’ معاویہ نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

‘‘وہ آسیب۔۔۔’’ آئے کت نے کہنا چاہا۔ وہ اس آسیب کی کہانی کو آج مکمل طور پر اپنی زندگی سے ختم کر دینا چاہتی تھی۔

‘‘اس آسیب کی حقیقت اتنی سی ہے کہ ہم نے بچپن میں اس کی کئی کہانیاں سنی تھیں۔۔۔ جھوٹ اور سچ پر مبنی۔۔۔ من گھڑت۔۔۔ مجھے نہیں لگتا فلک بوس آسیب زدہ ہے۔۔۔۔’’

‘‘لیکن وسامہ کو اس آسیب پر یقین تھا۔۔۔’’ وہ افسردہ ہو گئی۔

‘‘ہم دوبارہ اس بارے میں بات نہیں کریں گے۔’’ وہ ہر حال میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

‘‘ہاں۔۔۔ ہم نہیں کریں گے۔’’

تبھی ایک جگنو کہیں سے اڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھوں کے عین سامنے جھومنے لگا۔ معاویہ کے دل میں جانے کیا سمائی۔ اس نے سرعت سے ہاتھ لہرایا اور جگنو کو مٹھی میں قید کر لیا اور ایک آنکھ ہتھیلی کی درز سے لگا کر اندر دیکھنے لگا۔ پھر مسکرا کر بند مٹھی آئے کت کے سامنے کر دی۔ اشارے سے وہ اسے بھی اندر جھانکنے کا کہہ رہا تھا۔ آئے کت کو یہ بچکانہ کھیل دلچسپ لگا۔ معاویہ کے اکسانے پر اس نے بھی ایک آنکھ بند کر کے دوسری کھلی آنکھ سے معاویہ کی بند مٹھی کی درز سے اندر جھانکا۔

تاریک کوٹھڑی میں جیسے امید کی لو جگمگا رہی تھی۔ آئے کت کو اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ اسے اپنی منزل اس مٹھی میں قید روشنی میں نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

معاویہ کے لیے وسامہ کو بھلانا آسان نہیں تھا لیکن اس رات کے بعد ان دونوں کی دوستی ہو گئی۔

معاویہ اپنی کہی ہوئی باتوں اور اپنی طرف سے لگائے گئے الزامات پر اس قدر شرمندہ تھا کہ اس شرمندگی سے نکلنے کا اسے ایک ہی راستہ سمجھائی دیا اور وہ آئے کت کے ساتھ نرمی سے پیش آنے لگا۔ وہ دونوں اکثر شام کو چہل قدمی کے لیے نکل جاتے اور تین چار گھنٹوں تک واپس آتے۔ دیر رات تک باہر برآمدے یا ٹی وی لاؤنج میں کوئی موضوع چھڑ جاتا اور بڑی دیر تک صحت مند بحث ہوتی رہتی۔ اس نشست میں طالب ماموں اور صاعقہ ممانی بھی ان دونوں کے ساتھ شامل رہتے۔

ایسی ہی ایک شام میں آئے کت نے معاویہ کو بتایا تھا کہ وسامہ کے انتقال سے کچھ دن پہلے اردشیرازی نے اسے کال کی تھی، ساتھ ہی ساتھ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے یہ بھی کہا تھا کہ وسامہ کی موت کے پیچھے اس کال کا ہی کوئی تعلق ہے۔ معاویہ جو پہلے ہی باپ کو بھلا بیٹھا تھا اس بات پر مزید بپھر گیا۔

اسے خود سے باپ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ اردشیرازی دو دن بعد ہی معاویہ کو لینے خود آ گئے تھے۔ انہیں اپنا بیٹا عزیز تھا اور بیٹے کے بدلتے تیور تو وہ اس سے فون پر بات کرنے کے بعد ہی سمجھ گئے تھے۔ دوسری طرف معاویہ ایک نیا کھاتا کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

اس نے آتے ہی باپ سے وسامہ کی موت اور اس کو کی گئی فون کال کے بارے میں بازپرس شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بے حد تلخی سے اپنے باپ کو وسامہ کی موت کے لیے الزام دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اس کے باپ کی دی ہوئی پریشانی ہے جو اس کے بھائی کو کھا گئی۔ وہ وسامہ کی موت کو خودکشی ماننے کے لیے راضی نہیں تھا۔

اردشیرازی نے غصے سے اس کے تمام الزامات کی تردید کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہا تھا۔

"ہم وسامہ کی موت کو خودکشی نہیں مانتے۔ ایک اتفاق ہو سکتا ہے کہ وہ الماری میں جا کر بیٹھ گیا ... لیکن اگر شک کی بنیاد پر ہی کسی کو نامزد کرنا ہے ... تو میں آئے کت پر شک کا اظہار کرتا ہوں۔" انہوں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔ "آخری وقت میں جو انسان وسامہ کے سب سے قریب رہا وہ آئے کت ہی ہے ... اس لیے پہلا شک اسی پر جاتا ہے۔"

ان کی بات معاویہ کو مزید آگ لگا گئی تھی۔ وہ اپنے لگائے ہوئے الزامات کی شرمندگی سے ہی نہیں نکل سکا تھا کہ باپ نے بھی یہی بات کر دی۔ اس نے اسی وقت ان سے قطع تعلقی کا اعلان کر دیا تھا۔ اردشیرازی ناکام واپس لوٹ گئے تھے۔

☆☆☆

وسامہ کی موت کا صدمہ دل سے لگا کر اس نے اپنی ذاتی زندگی کو بالکل ہی فراموش کر دیا تھا۔ وہ نہ اپنی پڑھائی کی فکر کر رہا تھا نہ کاروبار کی۔ باپ سے بھی وہ لاتعلقی اختیار کر چکا تھا ممکن تھا وہ کسی دن اسے اپنی جائیداد سے عاق کرنے کا لیگل نوٹس ہی دے دیتے۔

وہ اپنے ساتھ کیا کر رہا تھا اس بارے میں واضح طور پر کچھ بھی کہنا ممکن نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ بس وقت گزار رہا ہے۔ بے مصرف۔ نہ مستقبل کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دیا تھا نہ مستقبل کا کوئی خواب اس کی آنکھوں میں باقی رہا تھا۔

صرف ایک چیز تھی جس کی اسے فکر تھی اور وہ چیز آئے کت تھی یا اس کا آنے والا بچہ۔

گو کہ اس نے اس بات کا اظہار کبھی زبان سے نہیں کیا تھا لیکن کچھ باتیں صرف زبان سے کہنے سے نظر نہیں آتیں نہ محسوس کی جا سکتی ہیں۔ آئے کت اور معاویہ کی بڑھتی ہوئی دوستی پر سب سے پہلے صاعقہ ممانی چونکیں، جب معاویہ نے ان سے آئے کت کا چیک اپ کروانے کی بات کی۔ وہ اس کے ماہانہ چیک اپ اور دوائیوں کے لیے فکرمند ہو رہا تھا اور چاہتا تھا صاعقہ ممانی شہر کی بہترین گائنا کالوجسٹ کے پاس آئے کت کو لے کر جائیں۔

"میں خود بھی کسی اچھی ڈاکٹر کی تلاش میں ہوں ... میں جلد ہی آئے کت کو چیک اپ کے لیے لے جاؤں گی۔" انہوں نے اپنے دل میں اٹھتے وسوسوں سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے ممانی ...! وسامہ ہوتا تو یقیناً یہ کام بہت پہلے کر چکا ہوتا۔" اس نے کہا تھا۔

"معاویہ ..." وہ جانے لگا تو ممانی نے بے ساختہ اسے پکارا۔

"جی؟"

"تمہیں یاد ہے ناں ... آئے کت ... وسامہ کی بیوہ ہے؟" کسی انجان خدشے سے ان کا لہجہ لرز رہا تھا۔

معاویہ چونک گیا۔ گڑبڑا گیا۔ شہ رگ کے قریب سے ایک سنسنی کی لہر سی اٹھی اور خون کے ساتھ سارے جسم میں پھیل گئی۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔

"وسامہ نے مجھ سے آئے کت کا خیال رکھنے کا وعدہ لیا تھا ... مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے ... میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا ممانی ...!" اس نے نظریں چرا کر کہا تھا اور تیزی سے کچن سے نکل گیا تھا کیونکہ وہ اپنے جواب سے مطمئن تھا۔

سب کچھ ایسا ہی چلتا رہا۔ کچھ دن بعد وہ لوگ آئے کت کی فرمائش پر بشام آ گئے تھے۔ بقول اس کے وہ وسامہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتی تھی اور فلک بوس میں اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کو تازہ کرنا چاہتی تھی۔ وسامہ نے ماموں ممانی کو ساتھ چلنے پر کیسے راضی کیا یہ ایک الگ داستان ہے لیکن وہ لوگ بشام آ گئے تھے۔

یہاں آتے ہی ان سب کے غم تازہ ہو گئے۔ میرے لیے ان کی نفرت میں اضافہ ہو گیا۔ معاویہ مارا مارا میری تلاش میں پورے فلک بوس میں پھرتا تھا۔

پھرتی تو آئے کت بھی تھی لیکن صرف معاویہ کو دکھانے کے غرض سے ...

دوسری طرف کبیر خان، معاویہ کا مسلسل جھکاؤ آئے کت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آئے کت نے دو تین بار اسے بلاوجہ ڈانٹا تھا اور معاویہ نے ہر بار اس کی بات کی تائید کی تھی۔ کبیر خان کی ہمت نہیں ہوئی کہ معاویہ سے دوبارہ آئے کت کے بارے میں کوئی بات کرتا۔ سو اس نے اس معاملے میں چپ رہنے کا فیصلہ کیا۔

آئے کت جس مقصد کے لیے یہاں آئی تھی وہ پورا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ پاشا سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے کسی طرح اس سارے معاملے سے علیحدہ کرنا چاہتی تھی لیکن پاشا وہاں نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی واپس شہر جا چکا تھا۔

اب اسے اپنے دوسرے مقصد پر کام کرنا تھا۔۔۔ اور وہ تھا پریگنینسی کے بارے میں بولے ہوئے جھوٹ سے نجات پانا۔۔۔ وہ پریگننٹ نہیں تھی۔ یہ صرف ایک حفاظتی اقدام کے طور پر بولا جھوٹ تھا تاکہ وسامہ کے والدین کے پاس پناہ لی جاسکے۔ قدرت نے یہاں بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ معاویہ اور ممانی کے بار بار چاہنے کے باوجود بھی وہ اسے ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جاسکے تھے۔ ہر بار کچھ نہ کچھ ایسا مسئلہ ہوتا کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کا معاملہ التوا کا شکار ہوجاتا۔

اسی دوران ایک دن جب وہ اور معاویہ ، وسامہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کر کے واپس آئے تو ممانی نے انہیں بتایا کہ ماموں کو کمرے سے ایک مری ہوئی گلہری ملی ہے۔ اب کی بار یہ حرکت سچ میں ایک بلی کی تھی لیکن معاویہ کے دل میں پہلا خیال میرا ہی آیا تھا۔ آئے کت نے اسے جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ ماموں، معاویہ کو سمجھاتے رہے تھے کہ وسامہ کی موت اس کی ذہنی حالت کا نتیجہ ہی تھی لیکن معاویہ نے ان کی بات کا بھی کچھ خاص اثر نہیں لیا تھا۔

شاید وہ اسی طرح میری تلاش جاری رکھتا، اگر ایک دن آئے کت اپنے دوسرے مقصد میں کامیاب نہ ہوجاتی۔

اس کی قسمت واقعی اچھی تھی کہ اس کی پلاننگ کے مطابق ہی اس کو مواقع بھی مل جاتے تھے۔ معاویہ اکثر ہی آئے کت کو وادی میں گھمانے پھرانے کے جاتا تھا۔ وادی میں لوگوں نے سوچنا شروع کردیا تھا کہ معاویہ، اپنے بھائی کی بیوہ کو اپنانا چاہتا ہے۔ معاویہ نے ان لوگوں کی بات پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے اور سوچتے ہیں لیکن ممانی کو اس بات کی فکر ضرور تھی۔ انہوں نے اس بارے میں طالب ماموں سے بھی بات کی لیکن انہیں اس بات پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا لیکن ممانی کسی طور اس بات پر راضی نہیں تھیں۔

جب انہوں نے آئے کت اور معاویہ سے اس بارے میں بات کی تو دونوں ہی دنگ رہ گئے۔ پھر معاویہ کو اس زور کی ہنسی آئی کہ ہنستے ہنستے اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ آئے کت اسے ہنستا دیکھ کر غصے میں گھر گئی۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا لیکن چونکہ اس غصے کے اظہار کا کوئی ذریعہ نہیں تھا سو اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

"تمہارے ماموں کا خیال ہے اس شادی میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔۔۔ اگر تم ااور آئے کت راضی ہوجاؤ تو۔۔۔" ممانی نے اسے بتایا تھا۔

"ممانی پلیز۔۔۔!" وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ "یہ بات اب کی ہے دوبارہ مت کیجیے گا۔۔۔ میں آئے کت کی بہت عزت کرتا ہوں وسامہ کے حوالے سے وہ بہت قابل احترام ہے میرے لیے۔۔۔ بھائی کو مرے ہوئے چند مہینے بھی نہیں گزرے اور آپ لوگ چاہتے ہیں میں اس کی بیوی سے شادی کے بارے میں سوچنے لگوں۔۔۔ بے غیرت نہیں ہوں میں۔" وہ بہت ہی بُرا مان گیا تھا اس بات کا۔

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔۔۔ تم۔۔۔" صاعقہ ممانی نے کہا

"میں تمہیں صرف وارن کرنا چاہ رہی تھی کہ باہر نکلتے ہوئے احتیاط کیا کرو۔ تم دونوں کو ساتھ ساتھ گھومتا پھرتا دیکھ کر لوگ اپنی مرضی کے مطلب نکال رہے ہیں۔"

"کوئی میرے سامنے یہ بات کہے۔۔۔ میں اس کا منہ توڑ دوں گا۔" وہ ناراضی اور غصے سے بولا۔ صاعقہ ممانی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"مجھے بھی یہ خیال آیا تھا لیکن عدت کے دوران ایسی بات کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا مجھے۔ تمہارے ماموں کے نزدیک یہ سب سے بہتر آپشن ہوسکتا ہے.. اس طرح آئے کت اور اس کا ہونے والا بچہ دونوں بے گھر ہونے سے بچ جائیں گے۔"

"میرے نزدیک سب سے بہتر آپشن یہ ہے کہ دوبارہ اس بارے میں بات ہی نہ کی جائے۔" اس نے ناراضی سے کہا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔

اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کس طرح آئے کت کی جانب متوجہ ہوتا جارہا ہے۔ لیکن آئے کت کی ہزارہا کوشش کے باوجود بھی معاویہ اس کی جانب اس حد تک راغب نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنا لیتا۔ ماموں ممانی اور وادی والوں کی کہی ہوئی باتیں بھی اس پر اثر نہیں کر رہی تھیں۔ سو اگلی صبح وسامہ کی قبر کے پاس بیٹھے آئے کت نے ترپ کا پتّا بہت چالاکی سے استعمال کیا تھا۔

"میں نے سوچ لیا ہے۔ میں واپس استنبول چلی جاؤں گی۔" آئے کت کہہ رہی تھی۔

"وہاں جا کر کیا کروگی؟" معاویہ اس کے ارادے پر حیران ہوا۔ بہن بھائی کوئی تھے نہیں۔ فادر کا کچھ پتا نہیں اور ماں کی ڈیتھ ہوچکی تھی۔

جہاں تمہارا کوئی نہیں ہے وہاں جا کر اب کیا کروگی؟"

"میرا تو اب یہاں پر بھی کوئی نہیں ہے۔" آئے کت نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور پلٹ کر واپسی کے رستے پر قدم بڑھا دیے لیکن وہ واپس فلک بوس جانے کے بجائے وادی میں گھومتے پھرتے رہے تھے۔ آئے کت نے اسے لوگوں کی باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا لیکن معاویہ نے دھیان نہیں دیا تھا۔ اسی دوران بارش شروع ہوگئی تھی۔ وہ دونوں ایک چھوٹے سے ہوٹل کے آگے رک کر چائے پینے لگے جب معاویہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے لگ رہا ہے۔۔۔ استنبول جانے کا تمہارا فیصلہ غلط ہے۔"

آئے کت نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"میں یہاں رہ کر بھی کیا کروں گی معاویہ! وسامہ تھا تو میری ہر خوشی اسی سرزمین سے جڑی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔۔۔ لیکن اب۔" وہ پھر سے باہر دیکھنے لگی۔ مصنوعی غم اس کے چہرے پر طاری تھا۔ "سچ کہوں تو ایک آخری سہارا یہ بچہ ہی ہے.. ورنہ وسامہ کے بعد تو زندہ رہنے کی کوئی وجہ ہی نہ بچتی میرے پاس۔"

"پھر تم ڈلیوری کے بعد چلی جانا۔۔۔ اکیلے جا کر تمہیں دقت ہوگی۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تم بات نہیں سمجھے۔ زندہ رہنے کی وجہ ہے میرے پاس۔ لیکن زندگی گزارنے کے اسباب تو مجھے خود بنانے ہوں گے۔ اپنا اور اس بچے کا پیٹ بھرنے کے لیے پیسہ کمانا ہے۔ گھر تلاش کرنا ہے۔ اور یہ سب کام جتنی جلدی شروع کرلوں، اتنا ہی بہتر ہوگا۔"

"تم ان سب چیزوں کی کیوں فکر کر رہی ہو۔ جب تک میں ہوں، تمہیں کسی چیز کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں تمہارا احسان لینا نہیں چاہتی۔" اس نے دوٹوک کہا۔

"یہ احسان نہیں ہے۔ وسامہ کے بعد تم میری ذمہ داری ہو اور میں یہ ذمہ داری آخری دم تک نبھاؤں گا۔" وہ چھوٹا سا لڑکا بہت بڑی بات بول رہا تھا۔

آئے کت نے ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی کہ اس کی بات کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ اسے اپنانے کی بات کر رہا تھا؟

’’اور یہ ذمہ داری تمہیں کس نے سونپی ہے؟‘‘

’’وسامہ نے۔‘‘ اس نے ترنت کہا۔

آئے کت چپ سی رہ گئی۔ ساری خوش فہمی پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا تھا معاویہ نے۔ پھر اس نے کہا۔

’’وسامہ نے جذباتیت میں ایک بات کہہ دی ہوگی۔۔۔ لیکن میں تم پر برڈن نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں تم بے فکری سے اپنی زندگی جیو۔۔۔ اور۔۔۔ اور میرے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دو۔‘‘ وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کی طرف بڑھی۔

معاویہ پہلے حیران ہوا پھر لپک کر اس کے پیچھے آیا۔ وہ گھر واپس جا رہے تھے۔

بارش کی وجہ سے پہاڑوں پر پھسلن زیادہ تھی۔ معاویہ کی بدقسمتی کہ اس نے شارٹ کٹ اختیار کیا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے آئے کت کا ہاتھ تھامے اسے سہارا دیے ہوئے تھا، تب ہی اس نے کسی بات پر ہاتھ جھٹکا۔ یہ ایک غیر ارادی عمل تھا لیکن آئے کت پھسل گئی تھی۔ دونوں کی زندگی بچ گئی لیکن آئے کت نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے مس کیرج کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ وہ خود بھی نرس رہ چکی تھی سو اس کی بات پر یقین کرنا ہی پڑا۔ پھر وادی سے بلائی گئی دائی، جسے آئے کت نے پیسے دے کر خرید لیا تھا، نے بھی آئے کت کی ہی بات کو دہرا دیا۔

یہ ایک اور تکلیف دہ غم تھا جس سے معاویہ اور ماموں ممانی کو گزرنا پڑا تھا۔ معاویہ کا غم اس بات سے کچھ اور بڑھ گیا تھا کہ آئے کت نے اس حادثے کا قصوروار اسے ٹھہرایا تھا۔

معاویہ نے آئے کت سے مل کر اسے سمجھانا چاہا تھا لیکن آئے کت اس کی بات سننے پر راضی نہیں تھی۔ بے چارے معاویہ نے تھک ہار کر اس سے شادی کا عندیہ تک دے ڈالا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آئے کت اس بات پر خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ اور عین ممکن تھا کہ ایسا ہو بھی جاتا اگر معاویہ اسے شہر لے جا کر گائنا کولوجسٹ سے اس کا چیک اپ کروانے کی بات نہ کر دیتا۔ آئے کت کے سر پر بشام کے سارے پہاڑ ایک ساتھ ٹوٹے تھے اس بات پر۔۔۔ اس کی فول پروف پلاننگ میں اس بات کا ذکر نہیں تھا۔ اسے لگا تھا، معاویہ بھی سب کی طرح اس کی اور دائی کی بات پر بھروسا کر کے چپ ہو جائے گا۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ آئے کت جانتی تھی کہ معاویہ اسے کسی ایسے ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر جائے گا جسے خریدنا اس کے بس میں ہو۔

بہت سوچنے کے بعد اسے ایک ہی حل نظر آیا تھا۔۔۔ اور وہ تھا یہاں سے بھاگنے کا فیصلہ۔۔۔

معاویہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن آئے کت نے غصے کا اظہار کر کے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔

آئے کت نے جو ارادہ کیا تھا پھر اسے پورا کر کے ہی چھوڑا۔ صاعقہ ممانی اور طالب ماموں نے پوری جان لگا کر کوشش کی کہ اسے روک لیا جائے لیکن آئے کت نے ان کی بات مان کر نہ دی۔ جانے سے پہلے وہ معاویہ سے بات کرنے اس کے پاس آئی تھی۔

’’تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟‘‘ معاویہ نے پوچھا

آئے کت نے نظریں جھکائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ’’معاویہ!... کیا میں امید رکھوں... تم نے مجھے معاف کر دیا ہوگا؟‘‘

’’معافی کس بات کی؟‘‘ اس نے الجھ کر پوچھا۔

’’تم جانتے ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں... کیوں مجھے بار بار میری ہی نظروں میں ذلیل کر دیتے ہو معاویہ!‘‘ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور بری طرح رونے لگی۔

’’میرے دل پر اتنا بوجھ ہے.. میرا ضمیر مجھے اتنی ملامت کرتا ہے کہ میرا دل چاہتا ہے میں مر جاؤں.. کاش کاش... اس روز بشام کی کھائیاں مجھے نگل گئی ہوتیں۔‘‘

معاویہ شرمندہ ہوا اس کا دل بوجھل سا ہو گیا۔

’’میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا آئے کت!... میں نے تو کبھی بھی کچھ نہیں کہا...‘‘ وہ بے چارگی سے بولا تھا۔ ’’تم نے ایک بار معافی مانگی تھی اور میں اس بات کو بھول بھی گیا تھا... قسم کھا کے کہتا ہوں، دوبارہ کبھی میں نے اس بات کو یاد بھی نہیں کیا.. تم ہمیشہ میرے لیے وسامہ کی بیوی کی حیثیت سے قابل احترام رہی ہو۔‘‘ بھول جاؤ اس بات کو... میں نے معاف کر دیا تھا تمہیں۔‘‘ معاویہ نے کہا۔

’’تم نے معاف کر دیا تھا لیکن میں نے تو خود کو معاف نہیں کیا...‘‘ آئے کت دکھ سے بولی۔

’’اللہ نے بھی مجھے معاف نہیں کیا ہوگا تب ہی مجھے ایسی بڑی سزا ملی ہے... نہ شوہر رہا نہ اولاد.. اگر وسامہ کو پتا چلتا تو وہ کیا کرتا میرے ساتھ... شاید مجھ پہ تھوک دیتا۔‘‘ وہ بولتی جا رہی تھی۔

’’تم ایسا مت سوچو... خدارا! تم ایسا مت سوچو.... جب میں نے ہی تمہیں معاف کر دیا تو اللہ تمہیں کیوں سزا دے گا۔‘‘

’’میں کیسی گھٹیا عورت نکلی جس نے شوہر کی موجودگی میں کسی دوسرے مرد کے لیے سوچا... میں مر کیوں نہیں گئی تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے.. یقین کرو معاویہ! اگر مجھے موقع ملا تو اس گناہ کے لیے میں خود کو سنگسار کرنا ٹھیک سمجھوں گی...‘‘

معاویہ نے دیکھا کہ وہ رو رہی تھی، سسک رہی تھی اپنے اس گناہ کے لیے شرمسار ہو رہی تھی جس کا اس نے صرف ارادہ کیا تھا۔ اس پر عمل درآمد سے پہلے ہی اللہ نے اسے ہدایت دے دی تھی اور وہ شوہر کی طرف پلٹ گئی تھی۔ کیا اس سے اعلا منصب، باکرہ اور کوئی عورت ہو سکتی تھی جو اپنے دل میں آئے ایک نامناسب خیال کے لیے بھی خود کو آگ میں جھونک دینے جیسی بڑی سزا کی حق دار قرار دیتی ہو۔ معاویہ کے دل میں اس کا منصب بڑھ گیا تھا۔

وہ اسے روکنا چاہتا تھا لیکن روک نہیں سکا تھا۔ اس کے استنبول جانے کی ساری تیاری اس نے خود کر کے دی تھی اور اس کے جانے سے ایک دن پہلے معاویہ نے اپنی تسلی کے لیے زبردستی اس کے تمام ٹیسٹ کروائے تھے۔

آئے کت ترکی چلی گئی اور معاویہ لاہور آ گیا۔ شاید یہ کہانی یہاں ہی ختم ہو جاتی اگر ایک ہفتے بعد معاویہ کو اسپتال سے کال کر کے ڈاکٹر یہ اطلاع نہ دیتیں کہ آئے کت کبھی پریگنٹ نہیں تھی۔۔۔ حتیٰ کہ وہ تو ماں بننے کی صلاحیت سے ہی محروم تھی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

نیر فہیم خان

ایک چراغ روشن ہے

افطار کا وقت قریب تھا۔ مریم کی بے قرار نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں، فیصل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ تھوڑا سا بیسن تھا اس میں نمک مرچ ڈال کر ایک آلو کے قتلے کاٹ کر پکوڑے بنالیے تھے۔ یہی افطاری تھی اور یہی کھانا...... دونوں بچے بھی بے چینی سے باپ کا انتظار کر رہے تھے۔

''امی...... اذان ہونے والی ہے' ابو تو آئے ہی نہیں؟''

''ہاں بیٹا! دعا کرو' آتے ہی ہوں گے۔'' مریم نے پریشانی چھپاتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا، فیصل اندر داخل ہوا۔

''ابو آگئے...... ابو آگئے......'' دونوں بچے شور مچاتے بھاگے۔ شور مچانے کا ایک سبب اس کے ہاتھ میں پکڑی تھیلیاں بھی تھیں۔ مریم بھی اٹھ کر لپکی۔

''سلام کرتے ہیں بیٹا!''

''السلام علیکم۔'' دونوں نے فرماں برداری سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے تھیلیاں مریم کو پکڑائیں اور بچوں کا ہاتھ تھامے صحن میں آ گیا، جہاں زمین پر بچھی چٹائی پر مختصر سا دسترخوان تھا۔ پانی کے گلاس۔ ایک پلیٹ آلو کے پکوڑے اور چٹنی۔

''ہم آپ کا بہت دیر سے انتظار کر رہے تھے۔'' سعد نے شکوہ کیا۔

''جی بیٹا! بس ہو گئی دیر۔''

مریم سامان پلیٹوں میں ڈال رہی تھی۔ جوس کا ڈبہ، سموسے، پکوڑے، بن کباب......

''واہ ابو، جوس ہم پییں گے۔'' سعد چہکا۔

''بیٹا! ابو کا روزہ ہے، ان کو دے دو۔'' مریم نے سمجھایا۔

''دو ڈبے ہیں ہم چاروں بانٹ لیں گے۔''

فیصل سے سعد کی اتری شکل نہ دیکھی گئی۔ وہ چھوٹا تھا اور جلد روٹھ جاتا تھا، اس کی نسبت حنین سمجھ دار تھی اور کسی بات پر جھگڑا نہیں کرتی تھی۔ اب بھی وہ خاموشی سے بیٹھی تھی۔

''مدرسے گئی تھیں بیٹا!''

''جی ابو!'' اس نے سعادت مندی سے کہا۔

''کون سا سپارہ ہے؟''

''ابو! میرا چھٹا سپارہ ہے، باجی کہہ رہی تھیں اب جلدی جلدی پڑھنا اور یاد کرنا تو قرآن پاک مکمل ہو جائے گا۔'' وہ پُر جوش انداز میں بولی۔

''ماشاء اللہ میری بیٹی قرآن پاک مکمل کرے گی تو اسے اچھی والی گڑیا لا کر دوں گا۔'' فیصل نے پیار سے بیٹی کو دیکھا۔ حنین کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''سچ ابو۔''

''بالکل سچ۔''

''اللہ کا پکا وعدہ؟'' وہ کچھ بے یقین تھی۔

''بالکل، اللہ کا پکا وعدہ۔'' وہ ہنس پڑا۔

یہ بچوں کی خاص عادت تھی، قول کی پاس داری اور وعدے کو پورا کرنے کے لیے دونوں یہ جملے کہتے تھے۔ اس کا مطلب اب یہ کام ہر صورت کرنا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ گناہ دیں گے۔ اذان ہوئی، روزہ کھول کر فیصل سعد کو لیے نماز پڑھنے چلا گیا۔ مریم نے دسترخوان سمیٹا اور نماز پڑھ کر دال چڑھانے لگی، تھوڑا سا آٹا تھا، گوندھ کر روٹیاں بنالیں۔ فیصل اور سعد نماز پڑھ کر

آئے تو کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر فیصل تھوڑی دیر آرام کی غرض سے لیٹا، مریم اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''کام کا کیا ہوا فیصل؟''

''کچھ نہیں، سارا دن دھکے کھا کھا کر واپس آ جاتا ہوں۔ تم جانتی تو ہو' رمضان میں کام ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اپنا کام شروع کیا تھا تو قسمت نے ساتھ نہ دیا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

فیصل ایک ہوٹل پر کام کرتا تھا، درمیانے درجے کا ہوٹل جس پر مزدور پیشہ لوگ کھانا کھایا کرتے تھے۔ اسی ہوٹل کے مالک سے بات کر کے ہوٹل کے سامنے چھولوں کا ٹھیلا لگایا تھا مگر بھلا ہو بلدیہ عظمیٰ کا ناجائز تجاوزات کی حد میں اس کا ٹھیلا بھی آ گیا۔ سارا سامان ضبط اور نقصان الگ، قرضہ

سر پر چڑھ گیا۔ رمضان کی وجہ سے ہوٹل بھی بند تھے، اتنا کام نہ ہوتا تھا سو وہ تقریباً بے روزگار ہی تھا۔

''اب کیا کریں گے، راشن تو بالکل ختم ہے۔'' مریم فکر مند ہوئی۔

''یہ دو سو روپے رکھ لو، آٹا منگوا لینا، روٹی ہو گی تو چٹنی سے بھی کھا لیں گے۔'' اس نے مڑے تڑے نوٹ نکالے، مریم نے خاموشی سے تھام لیے۔

''اور افطاری......؟''

''وہ میں لے آؤں گا۔'' فیصل نظریں چرا کر بولا۔

''بھلا ہو اہل کراچی کا جو مسافروں اور راہ چلتے لوگوں کو افطاری کراتے ہیں۔ ان لوگوں سے افطاری جمع کر لیتا ہوں، اپنی بھوک کی پروا نہیں مگر بچوں کا خیال آ جاتا ہے۔ وہ انتظار کرتے ہیں۔'' مریم نے بھی سر جھکا لیا۔

''آپ بھائی صاحب سے بات کریں شاید وہ......''

''نہیں مریم! بھائی صاحب شاید مدد کر دیں مگر بھابھی ان کو طعنہ دینے کی عادت ہے، پورے خاندان میں مشہور کر دیں گی۔ میں بھائی صاحب کے پاس کام کروں گا۔ وہ میری محنت کا معاوضہ دیں گے اور بھابھی سارے خاندان میں گاتی پھریں گی کہ جیسے مفت میں راشن ڈلوایا ہے۔ خاندان میں جو عزت ہے وہ بھی ملیا میٹ کر دیں گی۔'' فیصل نے صاف انکار کر دیا۔

''میرا میکہ تو خود غربت زدہ ہے۔ وہ اپنا پورا کر لیں کافی ہے، کسی کی مدد کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ میرے پاس سلائی کے کچھ پیسے ہیں، کچھ راشن ڈلوائی ہوں۔ چند دن تو گزارا ہو جائے گا، باقی اللہ مالک ہے۔'' اذان کی آواز گونجی۔

''میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں، تم سورۃ واقعہ ضرور پڑھ لینا۔''

''اچھا۔'' مریم بھی اٹھ گئی۔

☆☆☆

''ارے بھائی یہاں تو ضرورت مندوں کی لائن لگی ہے۔'' حلیمہ فون پر بات کر رہی تھیں۔

''ہر سال اضافہ ہو جاتا ہے، مہنگائی، بے روزگاری اور دہشت گردی نے سفید پوشوں کا بھرم قائم رکھنا مشکل کر دیا ہے......نہیں فکر مت کرو، میں حق داروں کو ان کا حق ضرور دیتی ہوں، پوری دیانت داری کے ساتھ ان تک پہنچاتی ہوں۔ اچھا......اللہ برکت دے، ٹھیک ہے اللہ حافظ۔''

''کس کا فون تھا امی۔''

''تمہارے ماموں کا تھا بیٹا! زکوٰۃ کی رقم بھجوا رہے ہیں مستحقین کے لیے۔''

''اچھا، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کتنی رقم ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''پندرہ لاکھ روپے پاکستانی بنیں گے تقریباً۔'' انہوں نے سوچتے ہوئے بتایا۔

''یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' ملاحہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹیں۔

''ماشاءاللہ بولو۔'' حلیمہ نے سخت برا منایا۔

''میرا بھائی پوری دیانت داری سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے مزید ترقی دیتا ہے۔ ہر سال زکوٰۃ کی رقم بڑھ جاتی ہے اور پھر فطرہ بھی اعلا درجہ کا دیتا ہے اس کی رقم بھی زیادہ ہوتی ہے۔ عام لوگ گیہوں کے حساب سے دیتے ہیں، وہ کشمش کے حساب سے دیتا ہے۔''

''چلیں اچھا ہے، کتنے لوگوں کی مدد ہو جائے گی۔''

''میں جنرل اسٹور والے کو فون کر دوں کہ راشن کے پیکٹ بنا لے، اس دفعہ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ رحمت کا عشرہ بیتنے والا ہے، حق داروں کو ان کا حق جتنی جلدی ملے اتنا ہی اچھا ہے۔'' وہ فون پر مصروف ہو گئیں، ملاحہ کمرے سے نکل آئی۔

حلیمہ ایک راشن بیگ کا معائنہ کر رہی تھیں جو جنرل اسٹور والے نے نمونے کے طور پر بھیجا تھا۔ دس کلو آٹا، تین کلو بیسن، دو کلو چنے، نمک، لال مرچ، دھنیا، ہلدی، شربت کی بوتل، کھجور، سویاں، پانچ کلو چاول......

''بھئی۔ یہ سب تو ٹھیک ہے مگر تیل اور گھی اچھی کوالٹی کے رکھو، یہ دو نمبر تیل میرے راشن بیگ میں مت ڈالنا اور ہاں خشک دودھ بھی رکھو، اب ہر گھر میں ہر وقت تو دودھ میسر نہیں ہوتا۔ چائے کی پتی اور چینی بھی اچھی والی رکھنا۔ کسی کو دیں تو اچھی چیز تو دیں، دالیں صاف رکھنا، پچھلی بار بہت شکایت تھی سارا کچرا دال کی صورت بھر کر پیک کر دیا تھا اب کی بار ایک چیز بھی کم ہوئی یا کوالٹی کے حساب سے خراب ہوئی تو اگلے سال آرڈر نہیں دوں گی۔'' حلیمہ نے تفصیلی ہدایت نامہ جاری کیا۔

''نہیں باجی! کوئی شکایت نہیں ہو گی، آپ اچھی رقم دیتی ہیں تو ہم برا سامان کیوں ڈالیں گے۔'' لڑکے نے خوشامدی انداز میں کہا۔

''بیٹا! یہ امانت ہے، میرے رب کا حکم ہے اس کے بندوں تک رزق پہنچانا ہے۔ میرا رب پاک ہے اور پاک اشیا ہی پسند کرتا ہے۔ غریبوں کو دینے کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ الا بلا بے چاروں کو دے دیں۔'' وہ سنجیدہ ہوئیں۔

''جی......جی......ٹھیک کہا آپ نے، یہ بیگ تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے، بس مطلوبہ اشیا اور ڈالو اور پچاس بیگ تیار کرو۔ ضرورت پڑی تو اور کہہ دوں گی، سامان اتنا ہو کہ ایک چھوٹی فیملی رمضان سکون سے گزار لے۔''

''جی بہتر۔'' اس نے سر ہلایا۔

''اچھا، اس بیگ کو چھوڑ جاؤ، حساب میں لگا لینا۔'' لڑکا چلا گیا۔ وہ کمرے میں آ کر ضرورت مندوں کی لسٹ بنانے لگیں۔

☆////☆

''امی! آج آلو گوشت بنا لیں۔'' حنین نے فرمائش کی۔ مریم نے بے اختیار بیٹی کے چہرے پر نظر دوڑائی، جہاں آس کا ایک جہاں آباد تھا۔ سنجیدہ سی معصوم حنین کبھی فرمائش نہیں کرتی تھی، آج شاید دل کی خواہش سے مجبور ہو کر اظہار کر بیٹھی۔ مریم انکار کر کے اس کا دل نہ توڑ سکی۔

''بیٹا! آج تو پیاز کریلے کا سالن بنا رہی ہوں، آلو گوشت کل بنا لیں گے۔''

''جی امی! ٹھیک ہے۔'' وہ فوراً مان گئی۔ مریم کا دل کسی نے مسل سا دیا تھا، وہ آنسو چھپاتے ہوئے پیاز کاٹنے لگی۔

''امی! آپ کے بہت آنسو آ رہے ہیں، میں پیاز کاٹ دوں۔'' اسے ماں کی فکر ہوئی۔

''نہیں بیٹا! آپ اپنا اسکول کا کام کرو، میں کر لوں گی۔''

''جی۔'' وہ اسکول کا بیگ لینے چلی گئی۔

غربت نے چھین لی بچوں سے شوخی
سہمے ہوئے رہتے ہیں شرارت نہیں کرتے

☆////☆

''السلام علیکم!'' مریم اندر داخل ہوئی، نظر صحن میں بکھرے راشن پر لمحہ بھر رکی تھی۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہو بیٹا؟ کہاں غائب ہو۔'' حلیمہ نے پیار سے اسے گلے لگایا۔

''بس رمضان المبارک کی وجہ سے مصروفیت زیادہ ہے، آپ کے کپڑے تیار ہو گئے تھے سوچا دے آؤں۔'' وہ شاپر آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا، ملاحہ کے کپڑے آ گئے ہیں، وہ بھی لے جاؤ۔ عید سے پہلے سی دینا، بڑی راتوں میں پہنے گی۔'' انہوں نے کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

''کوشش کروں گی۔'' نظر بھٹک کر پھر راشن بیگ کی طرف اٹھ گئی۔

''کاش ایک بیگ مل جائے تو رمضان سکون سے گزر جائے۔'' دل میں خواہش ابھری، بچوں کی معصوم شکلیں نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔

''توبہ کرو مریم! اب تم زکوٰۃ لو گی؟'' دماغ نے فوراً ڈپٹا۔ اس نے نگاہوں کو کنٹرول کر لیا۔ حلیمہ کپڑے لے کر اندر چلی گئیں، تھوڑی دیر بعد واپس

آئیں تو ایک اور شاپر ساتھ تھا، ایک بڑے ڈونگے میں سالن تھا۔

“آج قورمہ بنایا تھا، تمہارے گھر بھجوانے والی تھی کہ تم خود آگئیں۔ چلو اچھا ہوا، تم سنبھال کر لے جانا۔”

“جی بہت شکریہ۔” وہ ممنون ہوگئی۔

“فیصل کا کام کیسا چل رہا ہے؟”

“آپ جانتی ہیں کہ رمضان میں تو بالکل بے روزگار ہوتے ہیں، کبھی کوئی مزدوری مل جاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے وہ بھوکا اٹھا رہا ہے۔ سلا نہیں رہا۔” اس کے لہجے میں تشکر تھا۔

“السلام علیکم!” ملاحہ مدرسے سے آگئی تھی۔

“مریم باجی! کیسی ہیں؟ میرے کپڑے آگئے ہیں، آپ بس میرے کپڑے سی کے دیں، سب سے پہلے۔” ملاحہ مریم کو دیکھ کر پرجوش ہوئی۔

“لڑکی! سانس تو لو، سی دے گی کپڑے، پہلے خیر خیریت تو پوچھو۔” حلیمہ نے ٹوکا۔

“پوچھی تو ہے…… ہے ناں باجی!” اس نے گواہ بنایا۔

“ہاں پوچھی ہے اور فکر نہ کرو۔ میں تمہارے کپڑے سب سے پہلے تیار کروں گی۔” اٹھارہ سالہ ملاحہ کے چہرے پر بچوں سی معصومیت تھی، وہ سن کر خوش ہوگئی۔

“مریم! برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔” حلیمہ نے پوچھا۔

“بولیے آپا، اجازت کیسی؟” مریم نے خوش دلی سے کہا۔

“اگر تم برا نہ مانو تو ایک بیگ لے جاؤ، تم جانتی ہو کہ یہ زکوٰۃ کے پیسوں سے ہیں مگر تم تو مستحق ہو، تم چاہو تو……”

“نہیں باجی! ابھی سفید پوشی کا بھرم ہے۔ محنت کر رہی ہوں، اللہ کامیاب کرے گا۔” دل تو چاہ رہا تھا لے، مگر عزت نفس نے گوارا نہ کیا۔

“آپ کا بہت شکریہ، میں چلتی ہوں۔” آنسو اچانک آئے تھے۔ وہ انہیں چھپانے کے لیے فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ حلیمہ سرد آہ بھر کر رہ گئیں، ملاحہ سنجیدہ چہرہ لیے ماں کے پاس آبیٹھی۔

“امی! آپ نے یہ کیا کیا۔”

“کیا بیٹا؟”

“آپ نے مریم باجی سے کیوں کہا کہ زکوٰۃ کے پیسے ہیں۔” وہ سنجیدہ تھی۔

“مگر بیٹا! زکوٰۃ کی رقم کے بارے میں تو بتانا پڑتا ہے ناں تاکہ ضرورت مند اور مستحق کو ملے۔ اگر ہم نے کسی صاحب نصاب کو دے دی تو زکوٰۃ ہی ادا نہیں ہوگی۔” انہوں نے کہا۔

“بتانے کی ضرورت نہیں ہے امی!” ملاحہ نے انکار کیا۔

“کیا مطلب؟” وہ چونک کر بولیں۔

“مطلب یہ کہ آج ہی ہمیں زکوٰۃ کے بارے میں اہم معلومات دی گئی ہیں، اس میں غیر نصاب شخص کو ڈھونڈنا تو شرط ہے مگر جتانا شرط نہیں۔” اس نے سمجھایا۔

“لو بھلا بتاؤ…… اگر کوئی نہ لینا چاہے اور ہم بتا بتائے بے چارے کو زکوٰۃ دے دیں تو اس کی عزت نفس مجروح نہ ہوگی۔” حلیمہ جلدی سے بولیں۔

“یہ ہی تو دین اسلام کی خوب صورتی ہے کہ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ زکوٰۃ گالی نہیں ہے کہ کسی کو دی جائے تو اسے برا لگے۔ ہمارے معاشرے نے اسے گالی بنا دیا ہے، اگر کوئی گھریلو حالات کے سبب زکوٰۃ لیتا ہے تو ذہن میں کمتر تصور ضرور کرلیتے ہیں، چاہے زبان سے نہ بولیں۔ ہمیں تو زکوٰۃ لینے والوں کا احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ زکوٰۃ لیتے ہیں تو ہمارا مال پاک ہوتا ہے، اس میں برکت آتی ہے ہماری زندگی میں سکون رہتا ہے کیونکہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی جائے وہ محفوظ ہوجاتا ہے۔ زکوٰۃ لینے والے تو ہمارے محسن ہیں جن کی مدد سے ہم ایک اہم دینی فریضہ ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ذرا سوچیے اگر آپ سے کوئی زکوٰۃ لینے والا ہی نہ ہو تو کیا کریں گی آپ؟” ملاحہ نے سوال کیا۔

“ظاہر ہے پریشان ہوجاؤں گی، اپنے مال کی زکوٰۃ گھر میں تو نہیں رکھ سکتے۔” حلیمہ بیگم نے جواب دیا۔

“بالکل ٹھیک، زکوٰۃ لینے والے لوگ ہمیں اس پریشانی سے بچاتے ہیں، ہمیں تو چاہیے کہ جو مال ہم راہ خدا میں خرچ کر رہے ہیں، وہ بہت ادب اور احترام کے ساتھ پیش کریں تاکہ رب کریم قبول کرے۔”

“لیکن بیٹا! ہم تو ادب سے ہی پیش کرتے ہیں، راشن دینا بھی ثواب کا کام ہے۔” حلیمہ نے رسانیت سے کہا۔

“امی! بالکل ثواب کا کام ہے مگر جو شخص بھی راشن کا مخصوص بیگ لے کر اس گھر سے نکلے گا، تو دوسروں کو پتا چلے گا کہ اس نے زکوٰۃ لی ہے۔ اس کی عزت نفس تو مجروح ہوتی ہوگی ناں، اب یہ ہی دیکھیے مریم باجی کے گھر کی حالت آپ کے سامنے ہے مگر وہ سفید پوش اور خوددار ہیں، آپ نے انہیں آفر کی مگر وہ اپنی عزت نفس کی وجہ سے انکار کرگئیں۔ زمانے کی نگاہوں میں بھرم قائم رکھنا بھی ایک مجبوری ہے۔”

“تو پھر کیا کیا جائے؟” ملاحہ کی باتیں ان کے دل کو چھو رہی تھیں۔

“امی! اسلام دین فطرت ہے، اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ اس طرح سے دو ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے کو پتا نہ چلے۔ ایک بات یاد رکھیں، زکوٰۃ کی رقم کے لیے ضروری نہیں کہ لفظ زکوٰۃ ادا کرکے ہی سامنے والے کی مدد کی جائے۔ ہم گفٹ کہہ سکتے ہیں، عیدی کا نام دے سکتے ہیں، کچھ قرض کہہ کر دے سکتے ہیں، ادا ہوجائے گی۔ بس سامنے والا صاحب نصاب نہ ہو یعنی اس پر زکوٰۃ دینا فرض نہ ہو اگر اس کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ خود زکوٰۃ ادا کرسکتا ہو تو ایسے اشخاص کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ آپ یہ جو راشن کے بیگ بنوا کر بانٹتی ہیں، کیا بہتر نہیں کہ ان ضرورت مندوں کے گھر جاکر عزت کے ساتھ خاموشی سے ایک لفافہ ان کی نذر کردیا جائے۔ ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہوگی اور ہمارا کام بھی ہوجائے گا۔” ملاحہ نے کہا۔ حلیمہ غور سے سن رہی تھیں۔

“ان کو بلا کر نہیں دے سکتے؟” حلیمہ کچھ الجھ کر بولیں۔

“دے سکتے ہیں مگر امی! کام ہمارا ہے۔ ثواب ہم نے کمانا ہے تو تھوڑی سی مشقت کرلینے میں کیا حرج ہے۔ مسلمان کے دل میں خوشی داخل کرنا بھی تو نیکی ہے۔”

“ملاحہ! تُو تو بہت سمجھ دار ہوگئی ہے۔” حلیمہ کی آنکھوں میں توصیف تھی، وہ ہولے سے مسکرادی۔

“ایک اور اچھی تجویز ہے، اگر آپ مانیں۔”

“ہاں کہو بیٹا!”

“امی! ماموں جان کی بھیجی رقم کا مقصد کسی کی مدد کرنا ہے۔ ہم اس رقم کو اتنے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے کام نہیں آتی۔ رمضان اور عید کے مہینے آرام سے گزر جاتے ہیں، اس کے بعد وہی مسائل۔ وہی زندگی کی بدصورت تصویر، اگر ہم اس رقم سے ایک یا دو افراد کی بھرپور مدد کریں تو وہ ان شاء اللہ اگلے چند سالوں میں کئی دوسرے لوگوں کی مدد کرنے کے قابل ہوجائیں گے اور زکوٰۃ کا اصل مقصد یہ ہی ہے کہ غربت ختم ہو۔ فیصل بھائی بے روزگار ہیں، ان کو معقول روزگار فراہم کردیا جائے تو یہ زیادہ اچھا ہے اور آپ کی سہیلی جو ایک غریب سے علاقے میں رہتی ہیں جن کی دو بیٹیاں اور ایک معذور بیٹا ہے……”

“رشیدہ؟”

“جی جی…… رشیدہ خالہ، اگر ان کو ایک چھوٹا سا مکان دلا دیا جائے تو ان کا کرائے کا جھنجٹ ختم ہوگا۔ بیٹا چھوٹی سی دکان کھول لے تو ماں کا سہارا بن سکتا ہے، کم از کم دو لوگوں کی زندگی تو اچھی ڈگر پر چل نکلے گی۔”

“ملاحہ…… تُو نے تو میرا دل خوش کردیا۔” انہوں نے پیشانی چوم لی۔ “سالوں سے یہ رقم بانٹ رہی ہوں مگر کسی ایک کی حالت بھی نہ سنبھلی۔ اس

طرح ان کے حالات بدل سکتے ہیں، میں کل ہی جاتی ہوں بس دعا کرنا اللہ قبول کرے۔"

"آمین۔" ملاحہ نے دل سے دعا دی۔ یہ سب علم دین حاصل کرنے کا فیض تھا جس نے ذہن کو جلا بخشی تھی۔

☆////☆

"کوئی ہے؟" انہوں نے دستک کے ساتھ پوچھا۔

"آپ...... آیئے آپا! کیسی ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم سناؤ۔" انہوں نے فیصل کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آپ کی دعا ہے، آیئے۔" وہ کمرے میں لے آیا۔ مریم نماز پڑھ رہی تھی۔

"آپا! السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام!" نماز سے فارغ ہوکر اس نے سلام کیا، جس کا انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"آپ کے کپڑے تو تیار نہیں ہوئے، میں جلدی سی دوں گی۔"

"میں کپڑے لینے آئی بھی نہیں ہوں۔ اصل میں مجھے فیصل سے کام تھا۔"

"مجھ سے؟" فیصل حیران ہوا۔ "کہیے۔"

"آرام سے بیٹھو اور میری بات سنو، مریم تم بھی آجاؤ۔" مریم نے حیرانی سے فیصل کو دیکھا اور نا سمجھی کے عالم میں بیٹھ گئی۔

"فیصل بیٹا! تمہاری ماں میری بہت اچھی دوست تھی، جب میں شادی ہوکر آئی تو انہوں نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ ہر مشکل وقت میں میری بڑی بہنوں کی طرح مدد کی۔ ان کے بہت احسانات ہیں مجھ پر، اس لیے تم سے بڑا پیار ہے، تمہارا بچپن میرے ہاتھوں میں گزرا ہے۔ تم بیٹوں کی طرح عزیز ہو مجھے۔"

"جی آپا! آپ بھی میرے لیے بہت محترم ہیں۔" فیصل تابع داری سے بولا۔

"تو بیٹا! میں ایک کام لے کر تمہارے پاس آئی ہوں، انکار نہ کرنا۔"

"جی کہیے۔" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"مریم سے پتا چلا کہ تم بے روزگار ہو، تو میں نے سوچا۔ میرے پاس کچھ رقم پڑی ہے، تم لے لو اور اپنا کاروبار شروع کردو۔" فیصل پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، مریم بھی ساکت ہوئی۔

"ہاں...... میں نے تمہارے بھائی صاحب سے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ گلی کے کارنر پر ایک دکان خالی ہے، وہ کرائے پر دلوادیں گے۔ تم وہاں چپس کھانے پینے کی چیزوں کی دکان کھولو، بہت چلے گی۔ مریم کے ہاتھ میں ذائقہ ہے اور تم محنتی ہو، امید ہے اللہ کے حکم سے کامیابی مل جائے گی۔"

"آپا......" مریم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ فیصل کا حال بھی مختلف نہ تھا۔

"تم دکان دیکھ لو، مجھے بتا دینا اور پیسوں کی فکر نہ کرنا۔" انہوں نے موٹا سا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ فیصل کو تو جیسے یہ سب خواب لگ رہا تھا۔

"ارے پکڑو، سنبھال کر رکھنا۔" انہوں نے پیار بھری خفگی سے ڈپٹا۔

"حنین بیٹا...... کیا رزلٹ آیا تھا اس بار۔"

"جی، سیکنڈ آئی تھی۔"

"ارے واہ...... بھئی مریم! میری گڑیا کو کوئی اچھا سا گفٹ دیا؟"

"وہ...... آپا...... میں......"

"رہنے دو تم۔ کپڑوں میں لگی رہنا، حنین تم ایسا کرو میرے ساتھ چلو۔ میں اپنی بیٹی کو بہت اچھا گفٹ دلاؤں گی۔" انہوں نے حنین کو پیار کیا، وہ گھبرا کر ماں کو دیکھنے لگی۔

"چلو، ملاحہ آپی بھی انتظار کررہی ہیں۔" ماں کی رضامندی پاکر وہ فوراً اسکارف لینے بھاگی۔

"آپا...... آپ کا احسان......" اس نے کہنا چاہا۔

"فضول باتیں مت کرو، کوئی احسان نہیں، قرض ہے جب سیٹ ہوجاؤ تو اتار دینا۔ اب میں چلتی ہوں دیر ہورہی ہے۔" وہ بے حد سکون کے ساتھ مسکرائی تھیں۔ ملاحہ اور حنین کو شاپنگ کرا کر اس کی پسند کی فراک، خوب صورت جوتے پیاری سی گڑیا، سعد کے کپڑے جوتے وہ لدھی پھندی واپس آئی تھی، سنجیدہ سی حنین کے لبوں کے ساتھ آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ حلیمہ نے اپنے دل میں ایک ٹھنڈک کا احساس اترتے محسوس کیا۔

☆////☆

فیصل نے بڑی محنت سے کاروبار سیٹ کیا، اللہ کے کرم اور رحمت سے حالات بہت تیزی سے بدلے تھے۔ ایک سال میں ہی وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ ساری نہ سہی مگر آدھی رقم ضرور اتار سکے۔ وہ حلیمہ آپا کا شکر گزار تھا کہ انہوں نے اس کی ناامید زندگی میں ایک امید جگادی تھی، اس نے مریم کو رقم کا لفافہ دیا تاکہ واپس کر آئے۔ مریم حلیمہ آپا کے گھر آئی تو وہ کسی سے محو گفتگو تھیں۔

"رشیدہ آپا! اس میں شکریہ کی کیا بات ہے، میرا دل بہت خوش ہے کہ آپ کو سہارا مل گیا، بچیوں کو اپنی چھت مل گئی۔"

"میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی پورا آٹھ لاکھ...... آٹھ لاکھ کا گھر تم نے خرید کردے دیا اور پلٹ کر پوچھا بھی نہیں مگر میں نے سوچا تھا' میں جلد از جلد یہ پیسے لوٹاؤں گی۔ میرا بیٹا ٹانگ کٹنے کے بعد زندگی سے بے زار تھا، اب اپنی موبائل کی دکان میں سیٹ ہے، بہت دعائیں دیتا ہے۔" مریم خاموشی سے بیٹھ کر ان کی بات سن رہی تھی، حلیمہ آپا کی عزت اس کی نظر میں مزید بڑھ گئی۔

"رشیدہ آپا! یہ میری رقم نہیں ہے، میرے پاس کسی کی امانت تھی، میں نے آپ کو دے دی، جب بھی حالات بہتر ہوں اور رقم جمع ہوجائے کسی اور کی مدد کردیجیے گا۔ ابھی تو آپ پر بہت ذمہ داریاں ہیں، بچیوں کی شادیاں ہیں، فرحان کا علاج ہے۔ ماشاءاللہ جوان بچہ ہے، مصنوعی ٹانگ لگوادیں گی تو پتا بھی نہ چلے گا۔ اللہ آپ کو پوتے پوتیوں کی خوشیاں دکھائے، یہ رقم رکھ لیں، جمع کرلیں، پریشان نہ ہوں۔"

"مگر حلیمہ! کام دھندے تو زندگی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں، میں کس طرح قرض اتاروں گی۔" وہ متفکر ہوئیں۔

"یہ قرض حسنہ ہے، میں نے آپ سے مانگا نہیں ہے، بس یہ درخواست ہے کہ اگر زندگی میں کبھی موقع ملے تو کسی اور مجبور بے سہارا کی مدد کردیجیے گا۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے، ہمیشہ پھلتا پھولتا رکھے۔ تمہاری اولاد کو نیک بنائے۔" رشیدہ خالہ دل سے دعا دے رہی تھیں۔ وہ بے ساختہ آمین کہہ رہی تھی۔

"مریم تم سناؤ...... کیسے آنا ہوا۔ کام کیسا چل رہا ہے؟" حلیمہ بیگم نے شفقت سے پوچھا۔

"آپ کی دعا اور رب کی مہربانی سے بہت کرم ہے۔" مریم کا لہجہ بااعتماد اور پُرسکون تھا۔

"اللہ ہمیشہ خوش رکھے۔" انہوں نے دعا دی۔

"آپا! دعاؤں میں یاد رکھیے گا، میں بھی آپ کی طرح اپنے حصے کا دیا جلاسکوں۔"

مریم کا جملہ سمجھ کر حلیمہ آپا کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔

"ان شاءاللہ۔" انہوں نے یقین سے کہا، ملاحہ بھی مسکرادی۔

"دین کو اچھی طرح اپنانے میں ہی کامیابی ہے۔" یہ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

* * *

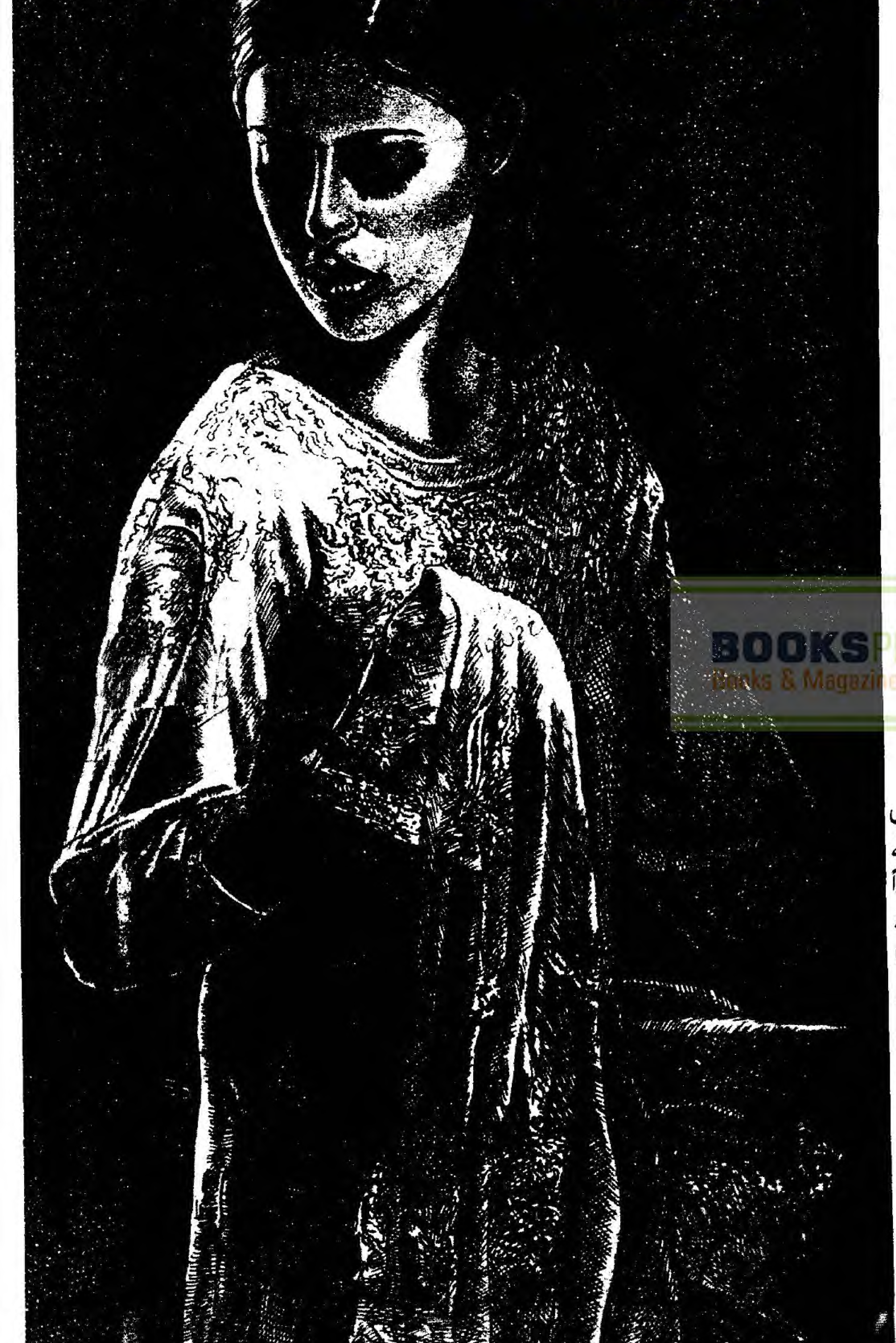

ناولٹ

ٹین کی چھت سے

ثریا انجم

"روشن! آپ کے میاں نے دوسری شادی کررکھی ہے۔"

بعض لوگوں کو اپنی بات کہنے کی اس قدر جلدی ہوتی ہے کہ وہ یہ سوچنے کا تکلف نہیں کرتے کہ اس طرح اچانک ان کی کہی ہوئی بات کا سننے والے پر کیا اثر ہوگا۔ چاہے ان کے قدموں تلے سے زمین نکل جائے یا ان کے سر پر آسمان آگرے۔ بس وہ اپنی بات کہہ کر ہلکے ہوجاتے ہیں۔

میں جو رسمی علیک سلیک کے بعد مسز حامد کو اپنے ہمراہ لیے سٹنگ روم کی طرف بڑھ رہی تھی، ساکت ہوکر رہ گئی۔ میرے بڑھتے قدم زمین میں دھنس گئے، میں نے گردن موڑ کر مسز حامد کی طرف دیکھا جو میرے متوقع ردعمل کی امید میں رک گئی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایسا دھماکے دار انکشاف کرنے کے بعد طمانیت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے پتھر کی طرح جامد قدموں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور ایک ایسی آواز میں جو خود میرے کانوں کے لیے اجنبی تھی، انہیں مخاطب کیا۔

"آپ اندر آئیں پھر بات کرتے ہیں۔"

اس مرتبہ حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔ وہ لمحے بھر کو ٹھٹکیں پھر گردن جھٹک کر میرے ساتھ ہولیں۔

ایسا نہیں تھا کہ اپنے شوہر کی دوسری شادی کی خبر میرے لیے کوئی معمولی بات تھی جسے سن کر میں وقتی طور پر حیران ہونے کے بعد نارمل ہوگئی تھی، نہیں بلکہ مسز حامد کے اس ایک جملے نے میرے احساسات اور جذبات کو سن کردیا تھا یا شاید میں مرگئی تھی، شاید نہیں یقیناً میں مرچکی تھی اور اب میرا بے جان وجود مسز حامد کے روبرو بغیر کسی ظاہری تاثر کے صدیق کی دوسری شادی کی داستان سن رہا تھا۔

دل کے کسی دور دراز گوشے میں ایک نحیف سی خواہش ڈھارس دلا رہی تھی کہ شاید یہ سب جھوٹ ہو یا مسز حامد کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ سولہ سال کی شادی شدہ پرسکون زندگی کے بعد صدیق ایسا نہیں کرسکتے۔

"میری چھوٹی نند اپنی دوست سے ملنے اس کے گھر گئی تو برابر والے دروازے سے اس نے صدیق بھائی کو نکل کر جاتے دیکھا، وہ تو انہیں فوراً پہچان گئی اور بڑھ کر سلام کیا تو صدیق بھائی سٹپٹا گئے اور ایسا ظاہر کرنے لگے جیسے انہوں نے شمسہ کو پہچانا ہی نہیں مگر آپ تو میری نندوں کو جانتی ہیں کہ کس قدر تیز ہیں، وہ تو اگر کسی کے پیچھے پڑجائیں تو آسانی سے کہاں چھوڑتی ہیں۔ صدیق بھائی نے تو یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ اپنے کسی دور پرے کے رشتے دار سے ملنے آئے تھے مگر شمسہ کہاں یقین کرنے والی تھی۔"

مسز حامد کی رہی سہی جھجک بھی میرے اس قدر خاموش ردعمل کے بعد دور ہوچکی تھی اور اب وہ

بڑے مزے سے چٹخارے لے لے کر سارا واقعہ بیان کررہی تھیں، انہیں مجھ پر گزرنے والی قیامت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

''اس نے اپنی دوست سے پوچھا تو ساری حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ اس کے برابر والے اپارٹمنٹ میں رہنے والی ناہید دراصل صدیق بھائی کی بیوی ہے۔ وہ چھ سات ماہ پہلے وہاں شفٹ ہوئی تھی اور اپنے شوہر کے مستقل طور پر وہاں نہ رہنے کا جواز یہ پیش کرتی تھی کہ وہ اپنی جاب کے سلسلے میں اکثر دوسرے شہر جاتے رہتے ہیں۔''

مسز حامد سانس لینے کے لیے لمحہ بھر کو خاموش ہوئیں تو میں نے بھی اپنی رکی ہوئی سانس بحال کرنے کی کوشش کی۔ صدیق مجھ سے بھی یہ ہی کہہ کر کہ وہ کام کے سلسلے میں کبھی حیدرآباد تو کبھی لاہور جارہے ہیں، ہفتے میں دو تین دن گھر سے غیر حاضر رہتے تھے۔

''شمسہ بتارہی تھی کہ اس نے بہانے سے تمہاری سوکن کو دیکھ بھی لیا، وہ بتارہی تھی کہ ذرا بھی اچھی نہیں' کہاں روشن بھابھی اور کہاں وہ چھپکلی۔''

مسز حامد نے ایسا برا منہ بنایا جیسے انہوں نے واقعی کوئی چھپکلی دیکھ لی ہو۔ ایک دم ہی مجھے سب کچھ بالکل بے معنی لگنے لگا۔

''مجھے بچوں کے لیے لنچ تیار کرنا ہے، وہ اسکول سے آنے والے ہوں گے۔'' میں نے کھڑے ہوکر رکھائی سے کہا تو مسز حامد کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ وہ سوچ رہی ہوں گی کہ میں کرید کرید کر صدیق کی دوسری شادی اور بیوی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلوم حاصل کرنے کی کوشش کروں گی مگر میں نے تو بس جو کچھ انہوں نے کہا خاموشی سے سن لیا۔ اپنی طرف سے تو کوئی سوال کیا ہی نہیں۔

''روشن! آپ کو کیا پہلے سے اپنے میاں کی حرکتوں کی خبر تھی؟'' جاتے جاتے انہیں اس نئے خیال نے رکنے پر مجبور کردیا مگر میں نے ان کے سوال کو یکسر انداز کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ میری اس انتہا کی بدلحاظی پر انہوں نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا اور مزید کچھ کہے بنا گیٹ پار کرگئیں۔

گیٹ بند کرکے میں نے پلٹ کر اندر جانا چاہا تو ایک بار پھر میرے قدم رک گئے۔ میں نے سر اٹھا کر اپنے گھر کی طرف دیکھا —— کار پورچ سے گزر کر ون یونٹ کے طرز پر بنے ہوئے گھر میں تین بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کے علاوہ کھلا کھلا سا سٹنگ لاؤنج تھا' جس کے ایک جانب اوپن کچن اور دوسری جانب اوپر جانے کے لیے زینہ تھا۔ اوپر چھت پر میں نے اپنی پسند کے کچھ پودے رکھے ہوئے تھے اور بچوں نے آسٹریلین طوطے پالے ہوئے تھے۔

یہ گھر ہماری ضرورت کے لیے بہت کافی تھا اسی لیے جب صدیق نے کچھ عرصے پہلے اوپر مزید دو کمروں کی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے بھرپور مخالفت کی۔

''کیا ضرورت ہے بلاوجہ پیسہ ضائع ہوگا، دو بیڈ روم بچوں کے لیے اور ایک ہمارے لیے کافی ہے۔ کوئی ایسے مہمان بھی نہیں آتے تو پھر اوپر کے کمرے جب ہمارے کسی استعمال میں نہیں ہوں گے تو بنوانا بھی بے کار ہے۔ کہیں آپ کا کرائے پر دینے کا ارادہ تو نہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہ ممکن ہوگا کیونکہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تو......'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر صدیق کی طرف دیکھا جو کسی خیال میں کھوئے ہوئے تھے جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

''کرائے پر دینے کے لیے تو آپ کو زینہ بھی باہر بنوانا ہوگا۔ اس کے لیے جگہ کہاں ہے؟'' میں نے ان کا کندھا ہلایا تو وہ چونک پڑے۔

''اوہ بھئی، تم سمجھتی نہیں ہو۔ ابھی بچے چھوٹے ہیں تو ابھی ضرورت نہیں مگر آگے چل کر تو ہوگی۔

کلثوم اپنے گھر کی ہوجائے گی مگر فواد اور جواد کی شادی بھی تو ہوگی پھر ہم ایک کو اوپر والا حصہ دے دیں گے اور ایک نیچے رہے گا۔''

مجھے صدیق کی اتنی لمبی پلاننگ پر بے ساختہ ہنسی آگئی کیونکہ فواد اور جواد ابھی تیرہ چودہ سال کے تھے اور کلثوم تو صرف نو برس کی تھی۔ میرے اس طرح ہنسنے پر صدیق برا مان گئے۔

''تمہیں اندازہ نہیں' مہنگائی کس تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ابھی میرے پاس کچھ پیسے ہیں، کل جب تینوں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھے گا تو اخراجات بھی اس قدر زیادہ ہوجائیں گے کہ کسی اور کام کے بارے میں سوچنا بھی محال ہوگا۔'' ان کے مضبوط ارادے کے سامنے میری کمزور سی مخالفت دم توڑ گئی اور صدیق نے اگلے چند دنوں کے بعد ہی اوپر کام شروع کروادیا۔

ابھی دو ہفتے قبل ہی اوپر کی تعمیر مکمل ہوئی تھی' صدیق نے دو کمروں کے علاوہ ایک چھوٹا سا کچن بھی بہت جدید انداز میں بنوایا تھا جس کے سامنے نیچے کا کچن بہت پرانا اور بے رونق لگنے لگا تھا۔ میں نے صدیق سے کہا کہ اب کام ہو ہی رہا ہے تو نیچے کے کچن کو بھی ذرا نیا انداز دے دیں مگر انہوں نے یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ اب تو سارے پیسے خرچ ہوگئے ہیں تھوڑا صبر کرلو، سال چھ مہینے بعد بالکل نیا کچن بنوادوں گا۔''

☆☆☆

گیٹ کے پاس اپنے خیالوں میں گم نجانے کتنی دیر گزر گئی تھی کہ اچانک مجھے گرمی کا احساس ہوا۔

دوپہر ہونے کو تھی' مجھے اب بچوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنا تھا، یہ سوچ کر میں اندر کی جانب بڑھی۔

اندر اب مکمل خاموشی تھی، صفائی کرنے والی صبح سویرے ہی سب کام کرکے جاچکی تھی۔ کچن کا سب کام میں خود کرتی تھی لہٰذا اب کسی اور کے آنے کا امکان کم ہی تھا۔ سٹنگ لاؤنج کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا، میں نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں انڈیلتے ہوئے دیوار پر آویزاں گھڑی پر نظر ڈالی۔

بارہ بجنے میں کچھ دیر باقی تھی، بچے ڈھائی بجے کے بعد آتے تھے میرے پاس ابھی اتنا وقت تھا کہ میں کھانے کی تیاری سے پہلے اپنے کھنچے ہوئے اعصاب کو ذرا سا سکون پہنچانے کی کوشش کرلوں۔ یخ پانی حلق سے نیچے اتارتے ہوئے مجھے اپنے آپ پر حیرت سی ہوئی۔

''کیا واقعی مجھے صدیق سے کسی بے وفائی کی امید تھی؟ کیا میں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی سوچا تھا کہ شادی کے اتنے سالوں بعد ان کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آجائے گی، نہیں میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ تو پھر میں اس قدر نارمل کیوں تھی، نہ میں چیخی نہ چلائی، نہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہوئی۔ بس ایک جھٹکا سا لگا جیسے بجلی کے ننگے تاروں نے مجھے چھولیا ہو اور پھر ہر طرف ایک دھند سی چھاگئی، ماضی، حال، مستقبل سب اس دھند کی لپیٹ میں آگیا۔

نکاح کے دو بول ایک مرد اور عورت کے دل میں ایک ایسا جذبہ جگادیتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے

جہلم میں
خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن
کے ڈسٹری بیوٹر
ھمایوں نیوز ایجنسی
جہلم
فون نمبر: 0300 2634626
0346 5802235

ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

صدیق کو ملازمت کرتے تین سال گزر چکے تھے اور ان کے گھر والوں کو لگتا تھا کہ اب ان کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میں نے بھی بی اے کے پیپر دے کر پڑھائی سے جان چھڑا لی تھی اور میرے بھیا، بھابھی میرے بوجھ کو اپنے سر سے اتار پھینکنے کے خواہش مند تھے۔ دونوں گھرانوں کی ملاقات جیسے بھی ہوئی مگر نتیجہ میری اور صدیق کی شادی کی صورت میں نکلا۔

ہم نے بہت عام سے انداز میں اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز کیا۔

شروع کے چند ماہ خواب کی سی کیفیت میں گزر گئے اور جب فواد کی آمد کے آثار ظاہر ہوئے تو اچانک ہی صدیق کی جاب ختم ہو گئی۔ میں نے اچھی بیویوں کی طرح اس مشکل وقت میں صدیق کا ساتھ دیا اور انہیں کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ان حالات میں میرے لیے پہلی پہلی پریگنسی کا وقت گزارنا کس قدر کٹھن تھا۔ فواد کی پیدائش پر ہاسپٹل کے اخراجات پورے کرنے کے لیے صدیق کو اپنی پرانی گاڑی بیچنی پڑی اور اس سلسلے میں جن لوگوں سے ان کا ملنا جلنا ہوا اس نے انہیں ایک نئے راستے پر قدم رکھنے کا حوصلہ دیا۔

فواد ایک ماہ کا ہو گیا تھا، صدیق روز صبح گھر سے نکلتے اور اکثر رات گئے واپس آتے۔ میں خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگا لیتی کہ وہ ابھی تک نوکری کے حصول میں ناکام رہے ہیں۔

اس روز وہ معمول کے خلاف گھر میں ہی تھے، میں فواد کو سلا کر کچن میں جانے لگی تو انہوں نے آواز دے کر روک لیا۔

”روشن! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ ان کی آواز مدھم اور لہجہ فکر میں ڈوبا ہوا تھا، میں بنا کوئی جواب دیے ان کے قریب بیٹھ گئی، کئی لمحے خاموشی سے گزر گئے پھر کسی قدر ہچکچاتے ہوئے صدیق نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”مجھے بزنس شروع کرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”بزنس۔“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے ہمیشہ نوکری کی تلاش کے بارے میں ہی بات کی تھی۔

”ہاں، میں اپنا بزنس کرنا چاہتا ہوں کیونکہ سات آٹھ ماہ کی کوشش کے باوجود مجھے کوئی ڈھنگ کی جاب نہیں ملی اور اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا، ویسے بھی ہمیں اپنے بچے کے بارے میں سوچنا ہے۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل بھی گئی تو آگے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنا مشکل ہوگا۔ میں اتنے دنوں سے اسی سلسلے میں مختلف لوگوں سے مل کر معلومات لے رہا تھا۔ اگر میں پرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کام شروع کر دوں تو اچھا خاصا منافع ہو سکتا ہے مگر اس کام کو شروع کرنے کے لیے جو رقم درکار ہے وہ فی الحال میرے پاس نہیں۔“ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

”اگر تم اپنا زیور مجھے دے دو۔“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر منتظر نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

”مگر میرے پاس اتنا زیور کہاں ہے کہ جس کو بیچ کر کوئی بزنس شروع کیا جا سکے۔“ میں نے دل ہی دل میں اپنے بھائی کے دیے ہوئے ہلکے سے سیٹ اور صدیق کی طرف سے ملنے والے قدرے وزنی سیٹ اور کڑوں کا تخمینہ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو، باقی انتظام بھی ہو جائے گا۔ بس میں کسی طرح ایک گاڑی خرید لوں، اگر ایک مرتبہ یہ سلسلہ شروع ہو گیا تو مجھے امید ہے کہ یہ کام چل نکلے گا۔“

وہ پرجوش انداز میں بولے تو میں خاموش ہو گئی حالانکہ اندر ہی اندر اس خوف نے ذہن کو جکڑ لیا تھا کہ اگر ان کا منصوبہ ناکام ہوا تو ہم بالکل خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔

☆☆☆

جیسے کوئی خاص لمحہ دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے بالکل اسی طرح ارادے کی کامیابی کے لیے بھی کوئی وقت مخصوص ہوتا ہے اور یہ وہی وقت تھا کہ جب صدیق نے بغیر کسی تجربے اور بڑی رقم کے پرانی گاڑیوں کا بزنس شروع کیا اور کامیابی نے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری گاڑی بھی بک گئی، پہلے سست روی اور پھر بڑی تیزی کے ساتھ صدیق کا بزنس بڑھنے لگا۔

ڈیڑھ پونے دو سال میں وہ اس قابل ہو گئے کہ ایک مشہور کاروباری علاقے میں اپنا شوروم کھول لیا۔ ”فواد موٹرز“ وہ اپنا وزیٹنگ کارڈ چھپوا کر لائے تو خوشی سے ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اپنی کھلونا کار سے کھیلتے ہوئے فواد کو گود میں اٹھا لیا۔

”میرا بیٹا میرے لیے خوش نصیبی کی نوید بن کر آیا ہے۔“ انہوں نے ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا تو خوشی اور فخر کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اور جواد کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے چند ماہ کے جواد کو ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے بازو پھیلا کر ہم دونوں کو بھی اپنے قریب کر لیا۔

”تم سب ہی میری خوش بختی کی علامت ہو۔“ ان کے مان بھرے لہجے نے میری آنکھوں میں رکے آنسوؤں کو بہہ نکلنے کا راستہ دے دیا۔

”تم دیکھنا روشن! ہمارے حالات بہت جلد بدل جائیں گے۔“

بہت جلد نہ سہی مگر دھیرے دھیرے حالات بدلتے گئے۔ ہمیں کرائے کے مکانوں سے چھٹکارا مل گیا اور ہم ایک بہت اچھے علاقے میں اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہو گئے۔ نئے گھر کی پہلی خوشی ہمیں کلثوم کی صورت میں ملی، صدیق بیٹی کی پیدائش پر بہت خوش تھے مگر اب وہ گھر میں بہت کم رہتے تھے۔ صبح ذرا دیر سے جاتے مگر رات کو بہت دیر سے گھر لوٹتے تھے، مگر ہم ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد بھیا اور بھابھی کے ساتھ میں نے جو مشکل وقت گزارا تھا اس کے بعد مجھے اپنا گھر کسی جنت سے کم نہیں لگتا تھا جہاں نہ کوئی روک ٹوک تھی نہ پریشانی۔

فواد اور جواد اسکول جانے لگے تھے، میرا پورا دن بچوں اور گھر کے کاموں میں گزر جاتا۔ رات کو بچوں کو سلانے کے بعد میں صدیق کے انتظار میں جاگتی رہتی، وہ اکثر کھانا باہر ہی سے کھا کر آتے۔

”ایک کلائنٹ کے ساتھ تھا، وہ زبردستی کھانے پر لے گیا۔“

”یار! ایک بندے کو گھیرنا تھا اسی لیے اسے کھانا کھلانا پڑا۔“

کھانا کھا کر آنے کی یہ ہی دو وجوہات تھیں اور میں ان پر کوئی بحث بھی نہیں کر سکتی تھی لہٰذا خاموشی سے اکیلے ہی دو چار نوالے کھا کر سونے کے لیے لیٹ جاتی، ویسے بھی مجھے شکایت کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا، صدیق کی کاروباری اور میری گھریلو مصروفیات بھی اسی رفتار سے بڑھتی گئیں۔

☆☆☆

کوئی آواز مسلسل آ رہی تھی، کوئی مانوس آواز جو سمجھ میں آنے کے باوجود نامانوس سی لگ رہی تھی۔ ڈور بیل...... ہاں ڈور بیل لگاتار بج رہی تھی، یہ احساس ہونے کے بعد میں بہ مشکل اٹھ کر گیٹ تک گئی۔

”مما! دروازہ کھولیں۔“ کلثوم کی آواز سن کر میں نے جلدی سے گیٹ کھولا۔

”تم لوگ آج اتنی جلدی کیوں آ گئے؟“ ان کے گرمی سے تمتمائے چہرے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی دیر سے باہر کھڑے تھے۔

”جلدی کہاں...... ہم تو اپنے ٹائم پر ہی آئے ہیں۔“ جواد اسکول بیگ گھسیٹتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا مگر فواد وہیں رک کر غور سے میری طرف دیکھتے

ہوئے فکر مندی سے بولا۔

”مما! کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس کا ہمدردانہ لہجہ میری آنکھوں میں آنسو لیے آیا۔

”ہاں بس سر میں بہت درد ہے۔“ میں نے ضبط کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر آنکھیں چھلک ہی گئیں۔

”اچھا، آپ اندر چلیں۔ میں آپ کے لیے اچھی سی چائے بناتا ہوں۔“ اس نے مجھے سہارا دینے کے لیے میرے شانوں کے گرد اپنا بازو پھیلالیا، اندر جا کر مجھے یاد آیا کہ میں نے بچوں کا لیے کھانا بھی نہیں بنایا تھا۔

دو ڈھائی گھنٹے کیسے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا، ذہن کچھ سوچنے پر آمادہ نہیں تھا اور جسم پر ایسی ناتوانی طاری تھی کہ گیٹ تک جا کر واپس آنے میں سارا وجود سنسنانے لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو صوفے پر گرادیا اور بے بسی سے اپنے تینوں بچوں کی طرف دیکھا۔

”تم لوگ کپڑے بدل لو، تب تک میں کھانا بنالوں گی۔“ میں نے ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی مگر فواد نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

”مما پلیز، آپ لیٹ جائیں ہم انڈا فرائی کر کے بریڈ کے ساتھ کھالیں گے اور آپ کے لیے چائے بھی بن جائے گی بس آپ آرام کریں۔“

”مجھے انڈا فرائی کرنا آتا ہے۔“ کلثوم معصومیت سے بولی تو میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

بچوں نے میرے لیے چائے بھی بنالی اور اپنے لیے بھی کچھ الٹا سیدھا بنا کر کھالیا اور ان کا میرے لیے اس طرح فکر مند ہونا میرے اندر ایک نیا احساس جگا گیا۔

شام کو میں نے بچوں کی پسند کا کھانا بنایا، ان کے ہوم ورک میں تھوڑی بہت مدد کی، خاص طور پر کلثوم کا پورا ہوم ورک مجھے ہی کروانا پڑتا تھا۔ وہ چھوٹی بھی تھی اور لاڈلی بھی تو اسے قابو کرنا ذرا مشکل ہوتا تھا۔

سارے کاموں سے فارغ ہو کر میں نے اپنے آپ کو شاور کی ٹھنڈی پھوار کے حوالے کر دیا۔ ٹھنڈا پانی جسم کی تھکن اور ذہن پر پڑا بھاری بوجھ اپنے ساتھ بہالے گیا۔ آئینے کے سامنے بالوں کے درمیان سیدھی مانگ نکالتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ لگ بھگ چالیس سال کی دراز قد، قدرے فربہی مائل گھر گرہست عورت خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور مجھے اس کی آنکھوں سے جھلکتے خوف کو ختم کرنا تھا اگر قسمت مجھے کسی آزمائش میں ڈال ہی چکی تھی تو مجھے قسمت سے نہ سہی حالات سے تو مقابلہ کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

”آج مسز حامد آئی تھیں۔“ میں نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے بات شروع کی۔

”وہ بتا رہی تھیں کہ آپ نے کسی ناہید نامی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔“ میں سوال کرنا چاہ رہی تھی مگر سارے الفاظ الٹ پلٹ ہو گئے۔

صدیق حسب معمول کھانا باہر سے کھا کر آئے تھے اور کپڑے تبدیل کر کے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بہت اطمینان سے انہوں نے میری بات سنی اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، ان کی نظریں ابھی بھی سامنے لگے ایل ای ڈی پر تھیں۔ وہ کچھ کہنے سے پہلے شاید مناسب الفاظ ڈھونڈ رہے تھے مگر مجھے ان کی خاموشی میں اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔

رات کے اس پہر مجھے ایسا لگا جیسے سورج بالکل میرے سر پر آ گیا ہے اور میرا پورا وجود جل کے بھسم ہونے والا ہے۔ میں نے شاید ابھی تک امید کی نازک ڈور تھام رکھی تھی۔ اب وہ بھی میرے ہاتھوں سے نکل گئی تو مقابلہ کرنے کا ارادہ بھی کمزور پڑنے لگا، میں جیسے کھلے آسمان تلے آ گئی۔

دیکھو روشن! جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا، اب تمہارے ناراض ہونے اور میرے صفائیاں دینے سے کچھ بدلنے والا نہیں البتہ میرے اور تمہارے تعلق میں رنجشیں اور دوریاں ضرور پیدا ہو جائیں گی، تو بہتر ہو گا کہ اب تم اس صورت حال کو خوش دلی سے قبول کرلو۔ مرد کو ویسے بھی ایک سے زائد شادیاں کرنے کا حق ہمارے مذہب نے دے رکھا ہے‘ جہاں تک دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کا تعلق ہے تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے اور بچوں کے معاملے میں میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔ تم میری بیوی ہو اور میرے بچوں کی ماں، ہم نے بہت اچھا وقت ساتھ گزارا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آنے والے وقت میں بھی ہمارے درمیان کوئی تلخی جنم نہ لے۔ میں خود تمہیں ناہید کے بارے میں بتاتا مگر مجھے کسی مناسب وقت کا انتظار تھا، مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ یہ بات تمہیں کسی باہر کے فرد نے بتائی۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ تمہیں کس قدر صدمہ ہوا ہو گا مگر روشن! تمہیں اتنے دنوں تک بے خبر رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں تمہیں اس صدمے سے بچانا چاہتا تھا۔ اب اپنے گھر کے ماحول کو پہلے جیسا رکھنا تمہارے ہاتھ میں ہے، بچوں کو بتانے کی ذمہ داری بھی میں تمہیں سونپنا چاہتا ہوں کیونکہ تم ماں ہو اور تم ہی انہیں بہتر طور پر ہینڈل کرسکتی ہو۔“

انہوں نے ایک ہی دفعہ میں ساری باتیں کہہ ڈالیں جن کے لیے شاید انہوں نے بہت پہلے سے الفاظ جوڑ رکھے تھے۔

خوش دلی، کوتاہی، مذہب، مناسب وقت، ذمہ داری، ہر لفظ کا انہوں نے بہت صحیح جگہ پر استعمال کیا۔ اس طرح کہ میرے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا۔ وہ بھرپور انداز میں اپنا دفاع کر کے پُرسکون ہو چکے تھے اور میرا سکون ہمیشہ کے لیے کھو چکا تھا۔

☆☆☆

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

سوہنی ہیئر آئل

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اُگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت-/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/350 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/500 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

راز کھل جائے تو آنکھوں کا لحاظ بھی جاتا رہتا ہے۔

دو ہی دن گزرے تھے کہ شام سے ذرا پہلے گھر کے سامنے لوڈنگ ٹرک آ کر رکا' جس کے پیچھے صدیق اپنی گاڑی سے اتر کر ٹرک کے ساتھ آنے والے مزدوروں کو ہدایت دینے لگے، جواد دوڑ کر میرے پاس آیا۔

”مما! بابا نیا فرنیچر لائے ہیں۔“ وہ خوشی سے بولا تو میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی، اب اسے کیا بتاتی کہ اس کے بابا نیا فرنیچر ہی نہیں نئی بیوی بھی لا چکے ہیں۔

صدیق نے اپنی نگرانی میں سارا سامان اوپر بنے نئے پورشن میں سیٹ کروایا، فواد اور جواد کے سوالوں کا جواب ہوں ہاں میں دے کر وہ میرے پاس آئے۔ ان کی آنکھوں میں ایک واضح پیغام تھا کہ آگے آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لیے مجھے تیار ہو جانا چاہیے۔ جس میں سب سے مشکل مرحلہ ان کے نوجوانی میں قدم رکھتے بیٹوں کو گھر میں ہونے والی تبدیلی کے بارے میں بتانا تھا۔ میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتی رہ گئی اور وہ ”میں ابھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“ کہہ کر تیزی سے واپس پلٹ گئے، شاید انہوں نے کسی کو وقت دے رکھا تھا۔ کسے...... یہ جاننے کی اب نہ مجھے ضرورت تھی نہ ہی خواہش، ہاں مگر میں یہ ضرور جان گئی تھی کہ صدیق نے جو کام مجھے سونپا ہے وہ مجھے بغیر کسی ٹال مٹول کے فوری طور پر انجام دینا ہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا مطلب بھی میں ان کی آنکھوں کے پیغام کی طرح اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

تینوں بچوں کو اپنے سامنے بٹھا کر میں خاموشی سے ان کے ناپختہ ذہنوں کے بارے میں سوچنے لگی جن پر یہ انوکھی خبر نہ جانے کس انداز سے اثر انداز ہونے والی تھی۔

”مما! آپ کو ہم سے کوئی خاص بات کہنی ہے؟“ بالآخر فواد میری مسلسل خاموشی سے اکتا گیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، چودہ سال کی عمر میں اس کے چہرے کے نقوش واضح ہو چکے تھے۔ چوڑا چہرہ، کھڑی ناک، گھنی سیاہ بھوؤں تلے ذہین چمک دار آنکھیں اور اوپری ہونٹ پر نمودار ہوتا ہلکا ہلکا رواں...... وہ بہت غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میرے دل میں چھپے راز کو جان لینا چاہ رہا ہو، جواد اور کلثوم معصومیت سے بڑے بھائی کا منہ تک رہے تھے۔

”مما......“ اس بار اس نے قدرے اونچی آواز میں پکارا۔

”ہاں...... وہ اصل میں تمہارے بابا نے دوسری شادی کر لی ہے اور اب وہ ہمارے ساتھ اسی گھر میں رہیں گی۔“ اس کی پکار مجھے جھنجوڑ گئی اور میں بے اختیار وہ ایک جملہ کہہ گئی جس کے کہنے کے لیے میں پچھلے کئی دنوں سے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی مگر ہر بار ہمت ہار جاتی تھی۔ فواد کی روشن آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹ سی گئیں۔

”مما! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ اس نے بمشکل آنکھیں جھپک کر بے یقینی سے لرزتی آواز میں سوال کیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور آج شاید وہ تمہارے بابا کے ساتھ یہاں آ جائیں ہمیشہ اسی گھر میں رہنے کے لیے۔“ جو ہو چکا تھا اس کی خبر دینے کے بعد میں نے وہ بھی بتا دیا جو ہونے جا رہا تھا۔

جواد بھی اب تک بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھا، کلثوم معصومیت سے ہم سب کی طرف دیکھ رہی تھی، نو سال کی بچی دوسری شادی کا مطلب تو شاید جانتی تھی مگر اپنے ہی باپ کی دوسری شادی کی خبر اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”میں بابا سے کبھی بات نہیں کروں گا۔“ حیرت کا اثر کم ہوا تو اس کی جگہ رنج اور غصے نے لے لی، فواد تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور میں بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آنے کا کہہ کر جانے والا رات گئے واپس آیا۔ گیٹ کھلنے اور گاڑی کے اندر آنے کی آواز پر میں ہمیشہ کی طرح استقبال کے لیے نہیں اٹھی۔

تینوں بیڈ رومز میں اندھیرا تھا صرف سٹنگ لاؤنج کی لائٹ جل رہی تھی جہاں سے آنے والی قدموں کی آہٹ اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں سے ہو کر معدوم ہو گئی اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

رات کا سناٹا...... ڈبل بیڈ کا خالی حصہ جسے اب خالی ہی رہنا تھا۔

میں اپنے آپ کو بہت بے چاری سی لگی۔

بے چاری تو شاید میں ہمیشہ ہی سے تھی، ابا کے مرنے کے بعد اماں کو پڑنے والے دوروں میں ان کو سنبھالتی۔ بھیا کی تنک مزاجی کو خاموشی سے برداشت کرتی تو سب یہی کہتے۔

”اتنی سی عمر میں بے چاری پر بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے۔“

بھیا اپنی کولیگ کو بیاہ لائے، جنہوں نے آتے ہی روایتی بہو اور بھابھی والا کردار اپنا لیا۔ اماں کو یکدم ہی دنیا چھوڑنے کی جلدی پڑ گئی، بھیا پہلے ہی کون سا مجھے گردانتے تھے جو اب مجھ پر ہونے والی زیادتیوں پر دھیان دیتے۔

میں صبح کالج جانے سے پہلے گھر کے آدھے کام نمٹا جاتی اور واپس آ کر بھی ایک پل کے لیے فارغ بیٹھنا بھابھی کی نظروں میں بہت بڑا جرم بن جاتا۔

”بے چاری بس نام کی ہی روشن ہے ورنہ نصیب تو اندھیری رات کی طرح کالے ہیں۔“ پاس پڑوس اور ملنے جلنے والے ترس کھا کر کہتے تو مجھے رونا آ جاتا مگر آنسو آنکھوں سے باہر نہ آئیں یہ پابندی میں نے خود اپنے اوپر لگائی تھی۔ پھر نجانے ان ہی ترس کھانے والوں میں سے کسی نے خوب اچھی طرح سے بھابھی کے کان بھرے کہ جتنی جلد ہو سکے، مجھ سے چھٹکارا حاصل کر لیں ورنہ اگر عمر نکل گئی تو ساری زندگی بوجھ بن کر ان کی اور ان کے بچوں کی خوشیوں کی حصہ دار بنی رہے گی۔ بات نہ جانے کس قدر مؤثر انداز میں کی گئی کہ بھیا بھابھی فوری طور پر اس پر عمل کرنے کے لیے رضا مند ہو گئے۔

صدیق کا رشتہ بھی میرے ان ہی خیر خواہوں کی طرف سے آیا تھا، یوں بہت سادگی سے بھیا نے میرا بوجھ اتار پھینکا، رخصتی سے ایک روز پہلے بھابھی نے انتہائی دل سوزی اور محبت سے مجھے کچھ خاص نصیحتیں کیں جیسا کہ مائیں بیٹیوں کو رخصت کرنے سے پہلے کرتی ہیں مگر ان کی باتوں میں ایک پیغام بہت واضح تھا کہ ایک بار اس گھر سے چلے جانے کے بعد میں ان سے کسی قسم کی امید نہ رکھوں' کیونکہ میکہ ماں باپ کے دم سے ہوتا ہے اور بھائیوں کی اپنی زندگی کے ہزار جھمیلے ہوتے ہیں' لہٰذا بہنوں کو اپنے مسائل خود حل کرنے چاہئیں نہ کہ بھائی کا منہ دیکھیں مگر صدیق کے گھر آنے کے بعد مجھے کسی بھی ایسے مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ میں بھیا بھابھی کے گھر کا رخ کرتی، زندگی کے پندرہ سال بڑی خاموشی سے گزر گئے۔

کیا پتا تھا کہ یہ خاموشی اپنے اندر اس طوفان کو چھپائے ہوئے تھی جس نے میری گرہستی کے تنکے بکھیر دیے۔

”میرا گھر“ کتنا اچھا لگتا ہے کسی عورت کو یہ دو لفظ کہنا اور کہنے سے زیادہ اس پر غرور کرنا، وہ عورت جو اپنے شوہر کے مکان کو گھر کا روپ دیتی ہے اور اس گھر میں تین چار سال گزارنے اور اس کے بچوں کی ماں بننے کے بعد اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ وہ اس راجدھانی کی ملکہ ہے، اپنے پرسکون گھر میں مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا تھا۔

میں نے صدیق کا ہر مشکل وقت میں ساتھ دیا تھا، ہر ہر پل ان کے آرام کا خیال رکھتی تھی، انہیں کوئی فکر یا پریشانی نہ ہو اس خیال سے گھر اور بچوں

[illegible] بھول گئی تھی کہ اگر زندگی کے پندرہ سولہ سال ایک ہی ڈھنگ سے گزرتے چلے جائیں۔ ہر صبح کی شام ایک جیسی ہو، ہر عمل کا ردعمل حسب توقع ہو تو جذبے سرد پڑ جاتے ہیں۔ انسان گوشت پوست کے بجائے دھات سے بنی مشین کے روپ میں ڈھل جاتا ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ زندگی کی گاڑی ایک جیسے ہموار رستے پر چلتے چلتے رک جاتی ہے۔ اسے چلتے رہنے میں مدد دینے والا ایندھن کب ختم ہوا، پتا ہی نہیں چلتا۔ مجھے بھی پتا نہیں چلا کہ میرے اور صدیق کے درمیان اتنا فاصلہ کب آیا کہ کسی تیسری ہستی کو اپنے لیے جگہ بنانے کا موقع مل گیا، برسوں سے جو رشتہ اعتبار اور محبت کی ڈوریوں سے بندھا ہوا تھا وہ ایسے ٹوٹا کہ مجھے احساس تک نہ ہو سکا۔

نصف ماہ کا پورا چاند دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتا میری کھڑکی تک آ گیا تھا اور میں نے بھی ان گزرتے لمحوں میں اپنی گزشتہ زندگی دوبارہ جی لی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد فجر کی اذان فضاؤں میں گونجنے والی تھی اور ایک نئے دن کا آغاز ہونے سے پہلے مجھے اپنی اور اپنے بچوں کی آئندہ زندگی کے بارے میں بہت کچھ سوچنا تھا۔ اس دن جب مجھے صدیق کی دوسری شادی کے بارے میں پتا چلا تھا تب سے آج تک جب وہ اسے اس گھر میں لے آئے تھے، میرے شب و روز جس کیفیت میں بسر ہوتے تھے اب مجھے اس کیفیت سے باہر نکلنا تھا۔ اپنے بچوں کے لیے اور اپنے لیے بھی۔ کیا ہوا جو احساسات برف ہو گئے تھے مگر زندگی تو باقی تھی اور اس زندگی کے اور کتنے رنگ مجھ پر کھلنے تھے اس کا فیصلہ بھی وقت کے ہاتھ میں تھا۔

☆☆☆

''ہیلو...... السلام علیکم!'' کھنکتی ہوئی آواز پر میں نے مڑ کر دیکھا۔

بچوں کا ناشتا میز پر لگا کر اب میں ان کے لنچ باکس تیار کر رہی تھی۔ تینوں بچے خلاف معمول خاموشی سے سر جھکائے ناشتا کر رہے تھے، فواد کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ جواد کی نظریں بھی اپنی پلیٹ پر مرکوز تھیں، کلثوم البتہ بے چینی سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی، اس اچانک بلند ہونے والی آواز پر سب نے بے اختیار سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔

وہ ابھی دو تین اسٹیپ اوپر ہی تھی اور وہیں رک کر شاید میرا اور بچوں کا ردعمل جانچنا چاہ رہی تھی۔

''وعلیکم السلام!'' میں نے دبی ہوئی آواز میں سلام کا جواب دیا۔

فواد نے جھٹکے کے ساتھ کرسی کو پیچھے دھکیلا اور قریب رکھا اسکول بیگ اٹھا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جواد اور کلثوم نے میری طرف دیکھا تو میں نے انہیں آنکھ سے اشارہ کیا جسے سمجھ کر انہوں نے پلٹ کر سلام کا جواب دیا اور ناشتا ادھورا چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''اللہ حافظ مما!'' ان دونوں نے بھی اپنے اپنے بیگ اٹھائے اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے بڑے بھائی کی طرح باہر کا رخ کیا' حالانکہ ابھی اسکول وین کے آنے میں کچھ دیر باقی تھی، میں نے جلدی جلدی بچوں کے لنچ باکس بند کیے اور انہیں دینے کے لیے لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی جہاں تینوں بچے گیٹ کے نزدیک خاموش کھڑے تھے۔ گھر میں آنے والی اتنی بڑی تبدیلی نے ایک ہی رات میں ان کے چہروں کی رونق چھین لی تھی، میرے لیے اس وقت ان سے کچھ کہنا یا تسلی دینا بہت مشکل تھا بس بھرے گلے سے اللہ حافظ ہی کہہ سکی۔

واپس اندر آئی تو صدیق بھی نیچے آ چکے تھے اور وہ دونوں دروازے کی طرف رخ کیے گویا میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو کسی تعارف کی ضرورت تو نہیں۔'' صدیق نے جیسے ماحول کو نارمل بنانے کی کوشش کی۔

''آپ کا خیال بالکل درست مانا جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ روشن ہیں اور روشن جان گئی ہوں گی کہ میں ناہید ہوں۔'' اس نے شوخ لہجے میں صدیق کو جواب دیا، جواب قدم بڑھا کر میرے نزدیک آ گئے تھے۔

''بھئی روشن آج تو تم ناہید کو مہمان سمجھ کر ناشتا کروا دو، اس کے بعد تم دونوں آپس میں طے کر لینا کہ تم لوگ ایک ہی کچن میں کھانا بناؤ گی یا اپنا اپنا کچن الگ رکھو گی۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔''

مردوں کے لیے کس قدر آسان ہوتا ہے اپنے آپ کو مشکل سے مشکل صورت حال سے الگ کر لینا۔

میں نے کسی قدر حیرت سے مڑ کر صدیق کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر معمول سے بڑھ کر تازگی اور رونق تھی۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں، یہ ہم عورتوں کی آپس کی بات ہے تو ہم خود طے کر لیں گے۔'' اس کے انداز میں اس قدر خود اعتمادی تھی کہ لمحے بھر کو مجھے اپنا آپ کمزور پڑتا محسوس ہوا مگر خود سے کیا ہوا وعدہ یاد کر کے میں نے جلد ہی اپنے اعصاب پر قابو پا لیا اور اپنی ساری توجہ ان دونوں کے لیے ناشتا بنانے پر لگا دی۔

ناشتے کے دوران وہ مسلسل کھوجتی ہوئی نظروں سے سٹنگ روم اور کچن کا جائزہ لیتی رہی، بائیں آنکھ کی انگلی سے وہ اپنے کان میں پہنے بڑے سے بالے کو لگاتار چھیڑ رہی تھی شاید وہ اتنی خود اعتماد نہیں تھی جتنا وہ مجھ پر ظاہر کرنا چاہ رہی تھی بالکل اسی طرح جیسے میں اپنے پل پل کمزور پڑتے اعصاب کو سنبھالے ہوئی تھی۔

صدیق اپنی عادت کے مطابق خاموشی سے ناشتا ختم کر کے بیڈ روم میں چلے گئے جہاں میں روزانہ ان کے پہننے کے کپڑے تیار رکھتی تھی مگر آج میں نے ایسا کچھ نہیں — کیا تھا۔

ناہید اب بڑی دل جمعی سے ناشتا کرنے میں مصروف تھی لہٰذا میں اس پر ایک نظر ڈال کر خاموشی سے اپنے بیڈ روم میں آ گئی جہاں صدیق الماری کھولے ہینگر میں ٹنگے کپڑوں کا جائزہ لے رہے تھے۔

''مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔'' میں نے آہستہ سے انہیں مخاطب کیا۔

''ہاں ہاں کہو۔'' انہوں نے پلٹ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی نرمی سے کہا تو مجھے لگا کہ جیسے میں آگے ایک لفظ بھی نہیں بول سکوں گی مگر ضبط کے کڑے لمحے سے گزر کر میں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ اپنے کندھے پر سے ہٹایا اور ان سے قدرے فاصلے پر کھڑی ہو گئی، ان کی منتظر نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے ذاتی استعمال کی ساری چیزیں یہاں سے ہٹا لیں، مجھے اچھا نہیں لگے گا آپ کا بار بار یہاں آ کر واپس جانا۔'' کوشش کے باوجود میری آواز گھٹ گئی۔

''کیا تم میرا اور اپنا تعلق ختم کرنا چاہ رہی ہو؟'' انہوں نے کسی قدر پست آواز میں سوال کیا۔

''میرا اور آپ کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا، مگر میرے علاوہ بچوں کے سامنے بھی یہ صورت حال کچھ اتنی مناسب نہیں ہو گی۔'' اپنی بات ختم کر کے میں وہاں رکی نہیں، واپس لاؤنج میں آ گئی جواب خالی تھا۔

☆☆☆

زندگی نے ایک بالکل ہی مختلف رخ اختیار کیا تھا۔

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں خاموشی سے مان لینے میں ہی عافیت ہوتی ہے، میں نے بھی مان لی تھیں مگر میرے آس پاس کے لوگوں کے لیے یہ صورت حال شاید مجھ سے بھی زیادہ رنج کا باعث تھی، ایک ایک دو دو کر کے وہ میرے پاس آتے' ہمدردی جتاتے، مشورے دیتے مگر میں اس قدر بے توجہی سے ان کی باتیں سنتی کہ وہ ناراض ہو جاتے اور پھر بھی

میرے معاملے میں نہ بولنے کا کہہ کر چلے جاتے مگر تھوڑے دنوں بعد پھر آجاتے۔ مجھے پتا تھا کہ ان میں سے کچھ واقعی میرے غم گسار تھے اور کچھ محض اس لیے آتے تھے کہ اوروں کو بتانے کے لیے کوئی چٹ پٹی خبر مل جائے مگر مجھے ہمیشہ سے نہ ہمدردی سمیٹنے کا شوق تھا نہ ہی اپنے گھر کی بات دوسروں تک پہنچانا پسند تھا مگر میرے روکھے رویے کے باوجود یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا پھر شاید انہیں بھی صبر آ گیا یا عادت ہوگئی' جیسے مجھے عادت ہوگئی تھی صبح ان دونوں کو ساتھ جاتے اور شام کو ساتھ ساتھ واپس آتے دیکھنے کی' حالانکہ بہت دنوں تک اس ساتھ کو دل تو کیا آنکھوں نے بھی قبول نہیں کیا تھا۔

صدیق لمبے چوڑے قد کاٹھ کے سنجیدہ سے مرد، جن کا بڑھا ہوا پیٹ اور سامنے سے اڑے ہوئے سر کے بال ان کی عمر کا اعلان کرتے نظر آتے اور وہ درمیانے سے بھی ذرا دبتے ہوئی قد اور دبلے پتلے سراپے کی چلبلی سی لڑکی جسے عورت کہنے میں ہچکچاہٹ سی ہوتی، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے اگر باپ بیٹی نہیں تو میاں بیوی بھی نہیں لگتے تھے۔ وہ یقینی طور پر مجھ سے سات آٹھ برس چھوٹی تھی اور صدیق سے تو بہت چھوٹی مگر وہ آرام سے انہیں نام لے کر مخاطب کرتی اور مجھ سے تو اس نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا۔

''دیکھیں روشن! میں آپ کو باجی یا آپا کہہ کر بلاوجہ آپ کو آپ کی عمر کا احساس نہیں دلانا چاہتی لہٰذا میں آپ کو روشن ہی کہوں گی۔'' اس کی احسان جتاتی آنکھیں بے دھڑک میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں شاید میری پسپائی کا منظر۔

اور اس کی آنکھیں ہی تو تھیں جو میری سوکن بن گئی تھیں، بے تحاشا چمک دار مسکراتی آنکھیں، طنز کرتی، مضحکہ اڑاتی، حق جتاتی اور کبھی کھوج لگاتی آنکھیں میرے لیے چیلنج بن گئی تھیں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کوئی لڑائی نہیں لڑی تھی جو کچھ بھی ملا اور جو نہ ملا اس پر خاموشی سے سر جھکایا تھا اور اب بھی صدیق کی دوسری شادی اور گھر کے بٹوارے کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر مان لیا تھا اور سب کچھ اس کے حوالے کر دیا تھا مگر وہ ہر ہر لمحے مجھے اکساتی رہتی میں جتنا نظر انداز کرتی وہ اتنا ہی آگے بڑھتی' جیسے میرے اور اس کے درمیان کوئی ریس لگی ہو، مجھے ڈر تھا کہ میں کہیں تھک نہ جاؤں۔

☆☆☆

اس روز بڑے دنوں بعد بچے اپنے پرانے موڈ میں تھے۔

میں نے جواد اور کلثوم کے لیے نگٹس بنائے تھے اور فواد کے لیے شامی کباب تل رہی تھی، صدیق کی طرح اسے بھی گھر کے بنے ہوئے کھانے زیادہ پسند تھے اور ویسے بھی وہ دو ڈھائی سال کی عمر سے ہی ہر کام صدیق کے انداز میں کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ عام طور پر لڑکے باپ کی نقل کرتے ہیں۔ صدیق کی طرح اسے بھی گاڑیوں کا شوق تھا، اسکول کی چھٹیوں میں وہ اکثر ان کے ساتھ شوروم چلا جاتا اور واپسی پر بڑے جوش و خروش کے ساتھ مجھے مختلف گاڑیوں کے بارے میں اپنی نئی نئی معلومات سے آگاہ کرتا۔'' اس کے مسلسل بولنے میں اکتا جاتی تو ہنس کر کہتا۔

''آپ کیا جانیں گاڑیاں کتنی اچھی ہوتی ہیں، یہ تو بس میں جانتا ہوں یا پھر بابا!''

وہ بڑے فخر سے صدیق کی طرف دیکھتا اور وہ بھی بالکل اسی انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتے۔

مگر یہ گھر میں آنے والے بدلاؤ سے پہلے کی باتیں تھیں، اب تو جیسے اسے چپ سی لگ گئی تھی۔

جواد اور کلثوم تو پھر بھی ہنس بول لیتے تھے بلکہ ناہید سے بھی کافی حد تک بے تکلف ہوگئے تھے مگر فواد اس کی موجودگی میں زیادہ تر اپنے کمرے میں رہنے کی کوشش کرتا اگر صدیق کبھی اسے بلاتے بھی تھے تو وہ ہوم ورک زیادہ ہونے یا اگلے روز ٹیسٹ کا بہانہ کر کے وہیں بیٹھا رہتا اور صدیق بھی زیادہ اصرار نہیں کرتے۔ باپ بیٹے کے درمیان آجانے والی دوری میرے دل کو بوجھل کر دیتی مگر مجھے اس دوری کو سمیٹنے کے لیے ابھی انتظار کرنا تھا، جب تک وہ لڑکپن کے دور سے نکل کر سمجھ داری کی عمر کو پہنچ جاتا، ابھی اس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا اس کی شخصیت میں بگاڑ پیدا کر سکتا تھا۔

کلثوم نے اپنا کیچپ میں لتھڑا ہوا ہاتھ جواد کے منہ پر مل دیا تھا، وہ غصے سے چلا رہا تھا اور فواد اس کی شکل دیکھ کر بے تحاشا ہنس رہا تھا اس شور میں ہمیں دروازہ کھلنے کا پتا نہیں چلا۔

''ہیلو...... السلام علیکم!'' ناہید نے ہمیشہ کی طرح کھنکھناتی آواز میں ہمیں متوجہ کیا۔

وہ تینوں یک دم خاموش ہوگئے اور میں سلام کا جواب دے کر فرائنگ پین میں سے تلا ہوا کباب نکالنے لگی۔

''اوہو! یہاں تو دعوتیں اڑائی جا رہی ہیں۔'' ناہید نے آگے بڑھ کر کلثوم کی پلیٹ میں سے نگٹ اٹھالیا۔

''چلو بھئی، چلو جلدی سے سب لوگ تیار ہوجائیں' ہم سب آؤٹنگ پر جا رہے ہیں اور باہر آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔''

''فواد، آؤ باہر چل کو دیکھو، ہم کیا لائے ہیں۔''

صدیق نے جو ناہید کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئے تھے بازو پکڑ کر فواد کو کرسی سے اٹھایا، بہت دنوں بعد وہ پہلے جیسی بے تکلفی سے اپنے بڑے بیٹے سے مخاطب ہوئے تھے۔ ناہید کی چبھتی ہوئی نظریں فواد اور صدیق کے چہروں سے ہو کر میرے چہرے پر آرکیں، پل بھر میں ان کا انداز بدلا، سختی کی جگہ جھنجلاہٹ نے لے لی۔

''میں بہت دنوں سے صدیق سے کہہ رہی تھی کہ آپ گاڑیوں کا بزنس کرتے ہیں اور — اتنے پرانے ماڈل کی گاڑی رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کو تو اپنے لیے نیو ماڈل کی گاڑی رکھنی چاہیے اور دیکھو آخر میں نے ان سے اپنی بات منوا ہی لی اور آج ہم نے برانڈ نیو کار خریدی ہے۔''

فواد کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا، اس نے بڑی آہستگی سے صدیق کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

''مما! کل میرا بہت امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے، آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔ ذرا جلدی سے میرے روم میں آجائیں۔''

میں پڑھائی میں فواد کی کس حد تک مدد کر سکتی تھی یہ میں بھی اچھی طرح جانتی تھی اور صدیق بھی مگر ہم دونوں ہی کچھ نہ بول پائے۔

صدیق کے چہرے پر گہری مایوسی طاری ہوگئی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں فواد کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے، ناہید اپنے مخصوص انداز میں لب بھینچ کر مسکرانے لگی۔

''مما! ہم تیار ہوجائیں؟'' کلثوم نے معصومیت سے میری طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''ہاں ہاں ڈیر! جلدی سے تیار ہوجاؤ، آپ کی مما منع تھوڑی کریں گی؟'' میرے بجائے ناہید نے جواب دیا۔

ان کے جانے کے بعد میں دبے قدموں سے فواد کے کمرے میں آئی' وہ اپنے بیڈ پر چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا، میں اس کی حالت کا اندازہ بخوبی لگا سکتی تھی۔ وہ بہت عرصے سے صدیق سے نئی گاڑی لینے کے لیے کہہ رہا تھا مگر وہ ہر بار ٹال جاتے تھے، کبھی پیسوں کی کمی تو کبھی نئی گاڑی کے چھن جانے کا زیادہ چانس ہونے کا بہانہ کر کے اور اب انہوں نے ہم لوگوں کو بتائے بغیر نئی گاڑی خرید لی تھی۔ فواد کو رنج تو ہونا ہی تھا۔

انہیں واپس آتے آتے آدھی رات ہوگئی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہوئے ناہید نے اپنی عادت کے مطابق ''ہیلو...... السلام علیکم'' کا نعرہ بلند کیا مگر لاؤنج میں اس کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا، فواد

شاید سوچ چکا تھا یا ایسا ظاہر کر رہا تھا اور میں اپنے کمرے میں خاموشی سے کلثوم کے اندر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

''مما! آپ بھی ہمارے ساتھ چلتیں، بہت مزا آیا۔ ہم نے خوب سیر کی اور بابا نے مجھے اور بھائی کو ہماری پسند کا کھانا کھلایا۔ بابا کی نئی گاڑی بہت اچھی ہے اور آنٹی کہہ رہی تھیں کہ جب وہ کار چلانا سیکھ جائیں گی تو ہمیں روز آؤٹنگ کے لیے لے جایا کریں گی۔''

کلثوم خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں بتا رہی تھی اور میں دکھے دل سے سوچ رہی تھی کہ اب وہ اتنی بھی چھوٹی نہیں کہ میری کیفیت کا ذرا بھی احساس نہ کر سکے مگر شاید اتنے دنوں کی گھٹن کے بعد اسے اس ماحول سے نکلنے کا موقع ملا تھا اور وہ بھی باپ کے ساتھ، تو اسے تو خوش ہونا ہی تھا۔

''اب وہ مجھ سے میرے بچے تو نہیں چھین سکتی۔'' میں نے خود کو تسلی دی اور کلثوم سے کپڑے بدل کر سونے کا کہہ کر آنکھیں موند لیں، نیند کو آخرکار آنا ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

بچے اسکول جا چکے تھے اور میں ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھی، مجھے اس کے آنے کا پتا نہیں چلا۔

''روشن! آپ سوچتی تو ہوں گی کہ میں نے آپ کی جگہ لے کر آپ پر اور آپ کے بچوں پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔''

اس کی آواز نے جہاں مجھے چونکایا وہیں اس کے اس جملے نے میرے اندر جیسے کوئی آگ سی بھڑکا دی۔

''ناہید! شاید تمہیں اب تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ دنیا میں کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا، نہ اس کی موجودگی میں اور نہ ہی اس کے جانے کے بعد۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض لوگوں کو اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لیے بار بار ڈھول پیٹنا پڑتا ہے۔''

میں نے پلٹ کر بالکل اسی کے لہجے میں جواب دیا اور شاید یہ پہلی بار ہوا تھا ورنہ ہمیشہ تو میں اس کی باتوں کو خاموشی سے نظرانداز کر دیا کرتی تھی۔

''اوہو! میں نے تو بس ایک بات کہی تھی، آپ شاید برا مان گئیں۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر مسکرائی' آنکھوں میں فاتحانہ چمک لیے، کرسی کی پشت پر کہنیاں ٹکیے بظاہر وہ بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑی تھی مگر وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ جدید تراش کے خوش رنگ لباس اور نفاست سے کیے گئے میک اپ میں وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی اور یہ ہی احساس اسے وقت سے پہلے میرے سامنے لے آیا تھا ورنہ روز تو صدیق کے ساتھ ہی نیچے اترتی تھی۔

''دراصل رات صدیق دیر تک جاگے تو صبح انہیں اٹھانا مشکل ہو گیا۔ اب وہ تیار ہو رہے تھے تو میں نے سوچا کچھ وقت آپ کے ساتھ گپ شپ ہو جائے مگر آپ تو......'' اس کی تیز نظروں نے میرے اندر اٹھنے والے طوفان کو بہ آسانی بھانپ لیا تھا، کبھی کبھی جب مجھ پر خود ترسی کا دورہ پڑتا تھا تو جہاں اور سب باتیں تھیں وہیں میں خود کو اس کے مقابلے میں بہت کم عقل بھی سمجھتی تھی، اس نے صدیق جیسے جہاں دیدہ آدمی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور میں پندرہ سولہ سال کی رفاقت کے باوجود انہیں اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھی تھی۔ ہمارے درمیان اگر اب کچھ تھا تو ہمارے بچے تھے اور میں صرف ان بچوں کی ماں کی حیثیت سے اس گھر میں رہ رہی تھی۔ صدیق کی بیوی ہونے کا حق تو اب ناہید کے پاس تھا، اس نے اپنا کچن اوپر سیٹ کر لیا تھا اور اب صدیق ناشتا اور رات کا کھانا اوپر ہی کھاتے تھے۔

کبھی کبھار اگر وہ بچوں کے ساتھ بیٹھ بھی جاتے تو ناہید بھی بلا تکلف ہمارے ساتھ شامل ہو جاتی۔ فواد کے چہرے کا رنگ بدل جاتا اور وہ بہ مشکل ایک دو لقمے لے کر اٹھ جاتا۔ ناہید کی جتاتی نظریں صدیق کی طرف اٹھتیں اور وہ سر جھکا کر

انہوں نے آہستہ آہستہ یہ کبھی کبھی کا بچوں کے ساتھ بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا' وہ اپنے جوان ہوتے بیٹے کو کسی اور امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

''روشن! آپ کن خیالوں میں کھو گئیں؟'' اس نے چٹکی بجا کر ایک بار پھر مجھے چونکا دیا۔

''آپ کو پتا ہے نا زیادہ سوچنے سے چہرے پر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے۔''

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر فروٹ باسکٹ سے انگور اٹھا کر بڑی نفاست سے ایک ایک دانہ منہ میں ڈالنے لگی اور میں اس پر ایک خاموش نظر ڈال کر رہ گئی اور میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ یوں بھی میں نے اپنے اردگرد چپ کی دیواریں کھڑی کر لی تھیں حالانکہ وہ اکثر و بیشتر ان دیواروں کو گرانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی شاید اسے میری خاموشی میں اپنی شکست کا احساس ہوتا تھا۔ وہ مجھے اپنے دوبدو لا کر کوئی بڑا طوفان اٹھانا چاہتی تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ جو طوفان میری زندگی میں آنا تھا وہ تو آ چکا تھا' اور میں نے یہ سوچ کر صبر بھی کر لیا تھا کہ ایسا ہی ہونا تھا سو ہو گیا، کیوں ہوا؟ یہ سوچنا میں چھوڑ چکی تھی۔

☆☆☆

وقت گزر رہا تھا۔

فواد کے میٹرک کے امتحان ختم ہوئے تو گویا میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔

ناہید کے گھر میں آنے کے بعد فواد کی شخصیت میں بہت تبدیلی آئی تھی، لڑکپن کی دہلیز پھلانگ کر وہ ایک دم ہی جیسے بہت بڑا ہو گیا تھا۔ چھوٹے بھائی بہن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور اپنی کسی پسندیدہ چیز کے لیے ضد کرنا تو اس نے چھوڑ ہی دیا تھا مگر اپنی تعلیم کی طرف سے بالکل غافل نہیں ہوا تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ وقت اپنی پڑھائی کو دینے لگا تھا۔ اس کے احساس ذمہ داری پر میں جتنا بھی اللہ کا شکر ادا کرتی کم تھا۔

آج آخری پیپر دے کر آنے کے بعد جو وہ کھانا کھلایا تھا جو اس نے آدھی بند آدھی کھلی آنکھوں سے کھا تو لیا اور واپس بستر پر ڈھیر ہو گیا اور میں پانی کا گلاس اس کی سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ تکیے پر سر رکھے نیند کے انتظار میں کافی دیر گزر گئی' ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ کلثوم بے خبری کی نیند میں دھیرے سے کسمسائی تو میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بہت معصوم لگ رہا تھا۔

''اللہ میری بچی کو ہر بری گھڑی سے بچائے۔''

بے ساختہ دل سے دعا دیتے ہوئے میں نے اس کی پیشانی پر بکھرے بال ہٹانے چاہے اور پھر گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا، پھر دوبارہ چھو کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہو رہا تھا۔

''مما پانی......'' میرے ہاتھ کا لمس پا کر وہ نیند میں بڑبڑائی۔

''ابھی لائی۔'' کہہ کر میں جلدی سے پانی لینے لاؤنج میں آئی، گلاس میں پانی انڈیلتے کئی خیال میرے ذہن میں آ کر گزر گئے۔

تین برس کی عمر میں جب کلثوم کو بہت تیز بخار ہوا تھا تو اس کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے تھے اور آنکھیں اوپر چڑھ گئی تھیں' اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کلثوم کے لیے اتنا تیز بخار ہونا بہت خطرناک ہو سکتا ہے لہٰذا آئندہ احتیاط کرنا ہو گی کہ اول تو اسے بخار نہ ہو اور اگر ہو جائے تو فوراً ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی جائیں اور جتنی جلد ہو سکے ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں، اس کے بعد سے ہم بہت احتیاط کرتے تھے۔

کلثوم کو پانی پلا کر میں واپس کچن میں گئی اور پیالے میں پانی بھر کر سوچنے لگی کہ اب کیا کروں، گھبراہٹ میں یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پٹیاں کرنے کا کپڑا کہاں رکھا ہے۔

ٹھنڈے پانی کی پٹیوں سے اثر دکھایا، کلثوم کی تپتی ہوئی پیشانی کسی حد تک نارمل ہوئی اور اس کے

چہرے کی نرمی میں کمی آئی تو اس خیال نے مجھے ایک بار پھر پریشان کردیا کہ مجھے اس کے بارے میں صدیق کو بتانا چاہیے۔ مرد خود چاہے اپنے گھر اور اپنی اولاد کی طرف سے کتنے ہی بے پروا ہوجائیں مگر ماں کی ذرا سی غفلت برداشت نہیں کرتے۔ ہمیں اس وقت کلثوم کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہاسپٹل لے کر جانا چاہیے، یہ سوچ کر میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ صبح کا انتظار خطرناک بھی ہوسکتا تھا۔

میں ایک نظر کلثوم کے چہرے پر ڈال کر آہستہ سے بیڈ سے اٹھی اور موبائل ہاتھ میں لے کر اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔ میرا ارادہ تھا کہ اوپر جاکر دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے صدیق کو کال کرلوں گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی ان کے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچتے ہی صدیق کی تیز آواز نے میری موبائل کے بٹن پر پریس کرتی انگلیوں کو ساکت کردیا۔

''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاسکتا۔''

''چاہے مجھے چھوڑنا پڑے؟'' ناہید کی تیکھی آواز بھی خاصی بلند تھی۔

''میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہاں اگر تم مجھے چھوڑنا چاہتی ہو تو بڑی خوشی سے اپنے ارادے پر عمل کرسکتی ہو اور ویسے بھی مجھ تک آنے سے پہلے تم نے نجانے کس کس کو چھوڑا یا کس کس نے تمہیں چھوڑا۔ اپنے گھر والوں کے لیے بھی تم یہ ہی کہتی ہو کہ تم خود ان سے ملنا نہیں چاہتیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ تم سے ملنا نہ چاہتے ہوں، بہر حال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مگر تم یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لو کہ میں اپنی بیوی بچوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

''میں بھی تو آپ کی بیوی ہوں۔'' اس بار ناہید کی آواز میں شکستگی تھی۔

''ہاں تو بیوی بن کر رہو، روشن بھی تو رہ رہی ہے مگر [illegible] پسند ہے۔ ہر روز نئی فرمائشیں، ہر روز نیا مطالبہ۔ کبھی کہتی ہو، الگ گھر چاہیے، کبھی بچّے کے لیے کئی کئی دن موڈ خراب رکھتی ہو حالانکہ میں نے نکاح کرنے سے پہلے ہی واضح کردیا تھا کہ نہ میں الگ گھر افورڈ کرسکتا ہوں اور نہ ہی مجھے مزید بچوں کی خواہش ہے اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تم بچے کو زنجیر کی طرح استعمال کرسکو گی تو یہ بھی تمہاری بھول ہے۔ مرد کو کبھی کسی زنجیر سے نہیں باندھا جاسکتا، میں کپڑے زیور کی حد تک تو تمہاری فرمائشیں پوری کرسکتا ہوں مگر آئندہ ایسی کوئی بات نہ کہنا کہ میں کسی فیصلے پر مجبور ہوجاؤں۔''

صدیق کو میں نے ہمیشہ بہت نرم لہجے میں بات کرتے سنا تھا مگر اس وقت ان کے الفاظ کانٹوں کی طرح نوکیلے اور لہجہ شعلوں کی طرح جھلسا دینے والا تھا۔ میرے اندر کی عورت زخم زخم ہوگئی، پیچھے مڑے بغیر الٹے قدموں ایک ایک زینہ اترتی میں واپس آ گئی۔

کلثوم آرام سے سو رہی تھی، اس کا بخار تقریباً اتر چکا تھا۔

پتا نہیں اسے بخار ہوا بھی تھا یا نہیں۔

شاید مجھے اوپر جا کے وہ سب سننا تھا، صدیق کو ایک اور حیثیت سے جاننا تھا۔

اس بات کا ادراک ہونا تھا کہ عورت تو صرف عورت ہوتی ہے اب چاہے وہ پہلی بیوی ہو یا دوسری......روشن ہو یا ناہید......وہ تو بس ایک عورت ہے۔

عورت کتنی احمق ہے کہ اپنے جیسی دوسری عورت کو اپنا مقابل سمجھ کر اس کو ہرانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اس کی شکست کو اپنی جیت سمجھتی ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک مرد سے شکست کھا رہی ہے، اس کے فریب میں آ کر بے وقوف بن چکی ہے۔

*

امت العزیز شہزاد

جیسے دل کہیں

''جوان! مورال کیسا ہے؟'' حکمہ کی معصوم سی آواز اس وقت شوخی سے لبریز تھی۔

''بہت بلند ہے مس حکمہ یزدانی!'' جواباً صالح، جواب سے کچھ دیر قبل ہی اپنے کام سے تھکا ماندہ لوٹا تھا، اپنے لہجے میں بشاشت سمو کر بڑے مضبوط لہجے میں گویا ہوا۔ وہ اس وقت اپنے چھوٹے سے کمرے سے ملحقہ بالکونی میں کھڑا تھا۔ لہجے کے برعکس چہرے پر گہری سنجیدگی اور فکر مندی چھائی ہوئی تھی۔

''ویری گڈ!'' حکمہ کو اس کا پر اعتماد لہجہ پسند آیا۔ ''اور کل محاذ پر آنے کی تیاری کیسی ہے؟''

''تیاری کیسی......؟'' وہ انجان بن کر الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔ ''ہر لمحہ تیار، کامران ہیں ہم۔'' وہ زیر لب مسکرا کر بولا۔

''اچھا؟'' وہ اس بار ذرا حیرت سے بولی۔ ''تمہیں ذرا بھی گھبراہٹ نہیں ہو رہی؟''

''گھبراہٹ تو نہیں۔'' وہ اپنے ازلی سنجیدہ انداز میں بولا۔ ''البتہ فکر مند ضرور ہوں کہ دیکھیں، اس پہلی ملاقات کا انجام کیا ہوتا ہے؟''

''اوہو، ایک تو تمہیں پتا نہیں کس حکیم نے ہر وقت سنجیدہ اور منفی باتیں کرنے کا مشورہ دے رکھا ہے۔'' وہ بری طرح چڑ گئی۔ ''منزل ہمارے اتنے قریب ہے اور تم ہو کہ ان لمحات کو انجوائے کرنے کے بجائے خواہ مخواہ کے اندیشوں میں پڑے ہوئے ہو۔''

''نہیں حکمہ! ہماری منزل ابھی بہت دور ہے، ابھی تو ہم محض پہلے تک ہی پہنچے ہیں۔'' صالح نے حسب عادت حکمہ کی رجائیت پسند فطرت کے برعکس بات کی۔

''دیکھو صالح!'' وہ بھی ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''سارا مسئلہ مما سے تمہاری ملاقات ہونے تک ہے، اس کے بعد سارے معاملات آسان ہیں، کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم اتنے اچھے ہو کہ مما تمہیں مسترد کر ہی نہیں سکتیں۔'' اس کے لہجے میں صالح کے لیے اتنا اعتماد، تفاخر اور یقین تھا کہ صالح کے دل کو بے چینی نے آلیا۔

''ہاں حکمہ!'' وہ بولا۔ ''شاید میں اچھا ہوں مگر قسمت کو آپ کی اچھائیوں سے کوئی غرض نہیں

ہوتی۔'' اس کے لہجے میں اس کی مشقت سے بھری زندگی کا تجربہ بول رہا تھا، حکمہ کو تاسف نے آ گھیرا۔

''تم ایسا کیوں سوچتے ہو صالح؟''

''بات میرے سوچنے کی نہیں، حقیقت پسند ہونے کی ہے، خیر......'' اس نے سر جھٹک کر خود کو اس کیفیت سے باہر نکالتے ہوئی ایک ٹھنڈی سانس لی لیکن فون کی دوسری جانب موجود حکمہ اس کی کیفیت بھانپ کر متاسف لہجے میں بولی۔

''اتنی نا امیدی کی باتیں مت کرو صالح! میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے، ویسے میں تمہیں بتا دوں۔'' اس بار اس کے لہجے میں ڈھیر سارا پیارا اور ایقان اُمڈ آیا۔ ''میری مما بہت سوئیٹ اور اچھی ہیں، تمہیں ان سے مل کر ان شاء اللہ مایوسی نہیں ہوگی۔'' وہ اپنی جانب سے اسے تسلی دینے لگی۔

''ہاں بے شک اچھی تو وہ ہیں، تب ہی تو میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی مجھ سے ملاقات کرنے پر راضی ہو گئیں۔'' وہ اس بار ذرا مطمئن لہجے میں بولا تو حکمہ ذرا کی ذرا گڑبڑا سی گئی اس کی بات پر۔

''آں......ہاں۔''

''حکمہ! تم نے واقعی انہیں میرے متعلق سب کچھ سچ بتا دیا ہے نا؟'' اس کی لڑکھڑاتی آواز پر صالح مشکوک ہو کر بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

''یہ تم کیا بے کار کی باتیں لے بیٹھے ہو صالح!'' وہ اپنی آواز پر مکمل قابو پا کر الٹا اسے ڈپٹنے لگی۔ ''کتنی مرتبہ دہراؤں کہ میں اپنی مما کو تمہارے متعلق تمام ''ضروری'' باتیں بتا چکی ہوں۔ بس اب تم اطمینان سے سو جاؤ اور کل گھر وقت پر پہنچ جانا، دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔''

''ہاں، ان شاء اللہ۔'' وہ اس کی بات پر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا، اسی لیے ذرا شوخ ہو کر اسے چھیڑنے کی خاطر بولا۔

''پر امید تو میں بھی ہوں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر بالفرض محال انہوں نے مجھ سے ملنے کے بعد بھی مجھے ری جیکٹ کر دیا تب...... پھر تم کیا کرو گی پیاری حکمہ؟''

''تب میں تمہارے ساتھ بھاگ کر کورٹ میرج کر لوں گی، اب خوش...... یہ ہی سننا چاہ رہے تھے نا تم۔'' وہ بری طرح بھنا گئی۔

''ہاہا......'' چشم تصور سے حکمہ کا لال بھبوکا چہرہ دیکھ کر وہ لطف لینے والے انداز میں ہنس پڑا۔

''بخدا، یہ نہیں چاہ رہا تھا میں، لیکن اگر تمہارا یہ ہی منصوبہ ہے تو بندہ ساتھ دینے کا پابند ہے۔''

''بھاڑ میں جاؤ تم۔'' حسب توقع وہ بے طرح چڑ گئی۔ ''اب میں فون بند کر رہی ہوں اور ہاں کل وقت پر پہنچ جانا، مجھے ری مائنڈ نہ کروانا پڑے، او کے۔ اللہ حافظ۔''

''اوہ...... ارے...... ارے بات تو سنو۔''

اس نے بوکھلا کر جلدی سے کہا مگر تب تک حکمہ فون بند کر چکی تھی۔ صالح نے فون اپنے کان سے ہٹا کر دوبارہ نمبر ملایا۔

''آپ کے مطلوبہ نمبر سے......'' لیکن حسب عادت وہ ناراض ہو کر فون باقاعدہ بند کر کے بیٹھ گئی تھی۔

''ہوں......'' صالح فون اسکرین دیکھ کر محظوظ انداز سے مسکرایا۔ ''یعنی پکی والی ناراضی، خیر......'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر فون ٹراؤزر کی جیب میں ڈالا اور دونوں ہتھیلیاں دیوار پر پھیلا کر افق پر چھائے اندھیرے کو اپنی گہری پر سوچ نگاہوں سے دیکھنے لگا، وہ یقیناً اس وقت کل ہونے والی اس اہم ملاقات کی بابت متفکر تھا۔ کل کا دن اپنے دامن میں اس کے لیے نہ جانے کیا لے کر آنے والا تھا؟

☆✲☆

اگلے دن وہ مقررہ وقت پر اپنا بہترین لباس زیب تن کیے، حکمہ کے نفاست سے آراستہ مہمان خانے کے سفید دبیز صوفے پر اضطراری انداز سے بیٹھا سرسری مگر توصیفی نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لینے میں

مشغول تھا، تب ہی دھیرے سے کھنکھارتے ہوئے مسز ثمینہ یزدانی نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔

ہلکے انگوری رنگ کی سوتی ساڑھی میں ملبوس، بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنائے اور ریم لیس نفیس سی عینک آنکھوں پر ٹکائے بلاشبہ وہ ایک بارعب اور متاثر کن شخصیت کی مالک خاتون تھیں۔

''السلام علیکم!'' انہیں اندر داخل ہوتا دیکھ کر صالح احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

''وعلیکم السلام! پلیز بیٹا، بیٹھو...... بیٹھو۔'' انہوں نے مدھم لہجے میں دھیرے سے مسکرا کر کہا۔ صالح نے دوبارہ اپنی نشست سنبھال لی، وہ خود بھی اس کے عین سامنے والے ہلکے سرمئی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ صالح لاکھ پراعتماد سہی مگر اس لمحے ان کی گہری نگاہیں خود پر جمی محسوس کر کے تھوڑا سا پریشان ہو گیا۔

''آج تو موسم پھر بھی بہتر ہے۔'' وہ یقیناً اس کیفیت کا اندازہ لگا چکی تھیں، اس لیے نرم لہجے میں عام سی بات سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''ورنہ پچھلے دنوں تو خوب ہی گرمی پڑی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' اس نے دل ہی دل میں خود کو کوس کر اس بار قدرے اعتماد سے جواب دیا۔ ''آج موسم واقعی بہت اچھا ہے۔'' اس اثناء میں ملازمہ تازہ پائن ایپل جوس کے نفیس سے دو گلاس رکھ گئی۔

(اوہ! یعنی حکمہ کا یہاں آنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں) وہ دل ہی دل میں سوچ گیا۔

''جوس گرم ہو جائے گا بیٹا، لو نا۔'' انہوں نے اپنا گلاس میز سے اٹھاتے ہوئے اسے ٹوکا تو وہ خیالات کی دنیا سے باہر نکلا اور سر اثبات میں ہلاتے ہوئے گلاس بھی اٹھا لیا۔

''اور......'' ثمینہ نے جوس کا گھونٹ لے کر پوچھا۔ ''گھر میں کون کون ہوتا ہے تمہارے؟''

(بیٹے سنبھل جا، انٹرویو کا آغاز ہوا چاہتا ہے) اس نے دل ہی دل میں اپنی پیٹھ ٹھونکی اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''جی، آج کل تو بس میں اور امی ہی ہوتے ہیں۔ مجھ سے بڑی ایک بہن بھی ہے، جن کی ہم نے پچھلے سال ہی شادی کی ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ۔'' انہوں نے گردن ہلائی۔ ''اور تمہارے والد؟'' انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''جب میں آٹھ برس کا تھا، تب ایک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔'' وہ اس ذکر پر افسردہ ہو گیا۔

''اوہ! آئم سو سوری۔'' ثمینہ تاسف سے بولیں۔

''اٹس او کے آنٹی!'' وہ غم زدہ انداز میں پھیکا سا مسکرایا۔

''پھر تو تمہاری والدہ نے تم لوگوں کی پرورش کی خاطر بہت محنت کی ہوگی۔''

''جی بالکل۔'' وہ تیزی سے بہت ہموار لہجے میں بولا۔ ''میری والدہ نے کڑی محنت اور مشقت کر کے ہم دونوں کو پالا پوسا ہے۔ دراصل میرے والد پاکستان اسٹیل مل میں ایک معمولی سے ملازم تھے، ان کی قلیل پنشن میں ہمارا گزارہ ممکن ہی نہ تھا۔ میری والدہ چونکہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں، اس لیے انہیں کوئی نوکری ملنا تو ممکن ہی نہ تھا، اس لیے انہوں نے گھر بیٹھے محنت اور مشقت کو اپنا شعار بنا لیا لیکن کسی کے آگے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا اور ہمیں بھی ہمیشہ یہ ہی تلقین کی کہ کام کوئی بھی چھوٹا یا معمولی نہیں ہوتا، اس لیے محنت کرنے میں شرم نہ کرو۔''

والدہ کے ذکر پر اس کا چہرہ فخر و انبساط سے تمتمانے لگا۔ ثمینہ بغور اس کی یہ بات سن رہی تھیں، وہ خاموش ہوا تو تائیداً متاثر ہونے والے لہجے میں بولیں۔

''بے شک...... بے شک، بالکل درست کہتی ہیں تمہاری والدہ۔ محنت کرنے میں شرم کیسی؟ اور یوں بھی کام کرنے والے ہاتھوں کو تو اللہ نے اپنا دوست قرار دیا ہے۔''

''جی بس آنٹی!'' وہ ان کی بات پر خوشی محسوس

کرتے ہوئے انکساری سے بولا۔

"میری اور میری بہن کی تربیت امی نے ان ہی خطوط پر کی ہے۔"

"بہت اچھی بات ہے، اوہ...... آؤ زارا! کدھر رہ گئی تھیں بیٹا؟" بولتے ہوئے ان کی نگاہ معاً ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے باہر کھڑی لڑکی پر پڑی، وہ بھی جیسے ان کے متوجہ ہونے ہی کی منتظر تھی۔

"میں ذرا ٹوٹو کے ساتھ بزی ہوگئی تھی۔" نووارد نخریلی چال چلتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ "آپ تو جانتی ہیں، ضیاء نہ ہوں تو انہیں کتنا مس کرتا ہے۔" وہ صالح کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے سامنے دیوار کے ساتھ رکھے سنہری دیوان پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بڑی بناوٹی قسم کی بے نیازی سے بیٹھ گئی۔

"ہاں بھئی!" ثمینہ شفقت سے مسکرائیں۔ "اس سے اٹیچ بھی تو بہت ہے۔ خیر بھئی زارا بیٹے! ان سے ملو یہ صالح ہیں۔" (گویا اس کا نام ہی اس کا مکمل تعارف ٹھہرا)۔ "اور صالح! یہ زارا ہے، میری بڑی بیٹی...... میرے داماد ضیاء حسن آج کل کاروباری دورے پر بیرون ملک گئے ہوئے ہیں، سو یہ چندروز کے لیے یہاں آ گئی۔"

"ہیلو!" زارا نخوت سے اسے دیکھ کر ہلکا سا منہ ٹیڑھا کر کے گویا بادل نخواستہ بولی۔ حالانکہ نیلی کُرتی اور پٹیالہ میں ملبوس اس دوشیزہ کو یہ تردد کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی بہر حال......

"ہائے!" صالح نے بھی زبردستی مسکرا کر یہ "ہائے" منہ سے نکالی۔ اسی اثناء میں ملازمہ دوبارہ چلی آئی اور اپنے ساتھ لائی ٹرالی میں سے ناشتے کے لوازمات میز پر چننے لگی۔

یعنی انٹرویو کے اس مرحلے پر چائے کا وقفہ ہوگیا، اس دوران ثمینہ، صالح سے ہلکی پھلکی "غیر رسمی" گفتگو کرتی رہیں، جبکہ زارا نہ جانے کیوں بڑی الجھی الجھی، پرسوچ کھوجتی نگاہوں سے اس تمام عرصے میں بنا کچھ کہے، کبھی چپس چباتے، کبھی نمکو ٹونگتے، صالح کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ صالح ظاہر ہے متوجہ تو اپنی "ممکنہ ساس صاحبہ" ہی کی طرف تھا تاہم زارا کی خود پر جمی نظروں سے نہ صرف الجھن محسوس کر رہا تھا بلکہ اب تو اسے اس کے اس انداز سے کچھ کچھ غصہ بھی آنا شروع ہو چکا تھا یعنی کہ حد ہوگئی۔

(پتا نہیں اس ماڈرن خاتون کے ساتھ کیا مسئلہ ہے...... اپنی اتنی اچھی والدہ اور سویٹ سی چھوٹی بہن سے قطعی متضاد کیوں دکھائی دے رہی ہے یہ) اس نے بے چینی سے سوچا۔

"دیکھو بیٹا!" یقیناً وقفہ برائے چائے اختتام کو پہنچا تھا، تب ہی ثمینہ یزدانی نے چائے کا خالی کپ ٹرے میں واپس رکھنے کے بعد، ٹشو سے اپنے لب تھپتھپا کر کہنا شروع کیا۔

"مجھے زیادہ گھما پھرا کر بات کرنا پسند نہیں، اس لیے جب حلمہ نے مجھ سے تمہارا ذکر کیا تب میں نے تمہارے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے تم سے بالمشافہ ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا کہ دیکھوں تو میری بیٹی جس شخص کو بطور لائف پارٹنر پسند کر بیٹھی وہ اس کے قابل ہے بھی یا نہیں۔"

وہ یہاں تک کہہ کر یوں چپ ہوئیں گویا آگے بات جاری رکھنے کے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ کر رہی ہوں۔ صالح مکمل سنجیدگی سے ان کی جانب متوجہ تھا جبکہ زارا اب آنکھیں چھوٹی کر کے جیسے اپنے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دیکھو بیٹا!" ثمینہ نے لمبی سانس لے کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "ہمارا زمانہ بہت مختلف تھا، لیکن آج ہم مانیں یا نہ مانیں' وقت تبدیل ہو چکا ہے۔ میں نے ان بچیوں کے والد کے بعد ان کی تربیت ایسے خطوط پر کی تھی کہ یہ اپنے اچھے برے میں تمیز کر سکیں اور میرا سر کبھی شرمندگی سے نہ جھکنے دیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میری دونوں بیٹیوں نے ہمیشہ میرے دیے گئے مان اور اعتماد کا خیال رکھا۔" ان کی آنکھیں اس بات پر چمکنے لگی تھیں، صالح ان کی کیفیت سمجھ کر ہلکا سا مسکرایا۔

"سچ کہوں تو تم سے ملنے سے پہلے میرا دل مختلف خدشات کا شکار تھا مگر مجھے خوشی ہے کہ تم سے مل کر مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میں نے ہمیشہ ہی سے اپنی بیٹیوں کے لیے عزت دار گھرانے کے تعلیم یافتہ اور محنتی لڑکوں کی خواہش کی تھی اور میں اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے میری خواہش کو پورا کیا۔"

وہ ملائمت سے مسکرا کر بڑے حوصلہ افزا لہجے میں بولیں تو صالح جو اس تمام عرصے میں تنے ہوئے اعصاب اور بے تحاشا دھڑکتے دل پر بمشکل قابو پائے' خود کو پراعتماد ظاہر کرنے کی کوشش میں ہلکان تھا۔ ان کے منہ سے اپنے لیے پسندیدگی کا اتنا واضح اظہار سن کر یکدم ہی بے یقینی میں گھر گیا۔

تو کیا وہ یہ پہلا اور دشوار گزار مرحلہ بہ احسن و خوبی پار کر گیا ہے؟

کیا اس کی قسمت اس پر مہربان ہو چکی ہے کہ وہ بنا کسی رکاوٹ کے اپنی منزل کے اتنے نزدیک اتنے سہل طریقے سے پہنچ چکا تھا؟

"بس اب تمہارے گھر والوں سے بھی ہماری ملاقات ہو جائے تو اچھا ہے۔" وہ مسکرا مسکرا کر جیسے اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتے ہوئے بولیں تو وہ گڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"جی...... جی، بالکل۔" فرط جذبات میں اس کے منہ سے الفاظ پھسل رہے تھے۔ "میری والدہ تو خود آپ سے ملاقات کی شدت سے منتظر ہیں۔"

(اب ایسا بھی کیا بچپنا میاں صالح! جو آپ مارے خوشی کے یوں بے قابو ہوئے جا رہے ہیں) اس نے دل ہی دل میں اپنی طفلانہ جذباتیت پر خود کو ڈپٹا اور اس مرتبہ بڑے متوازن لہجے میں گویا ہوا۔

"اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو اسی اتوار ہمارے غریب خانے کو رونق بخش دیں۔"

سند قبولیت پا کر اس کا ازلی پراعتماد انداز لوٹ آیا تھا۔ ثمینہ اس کی جلد بازی دیکھ کر جی ہی جی میں مسکرا دیں، تاہم بردبار لہجے میں بڑے سبھاؤ سے بولیں۔

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں، ان شاء اللہ ضرور آئیں گے مگر پہلے بہتر یہ ہوگا کہ تم اپنی والدہ کو کسی روز ہمارے ہاں لے آؤ...... کیوں زارا؟" انہوں نے بولتے بولتے اتنی دیر سے خوف ناک چپ اوڑھے بیٹھی اپنی دختر کو گفتگو میں شامل کرنے کی غرض سے یوں ہی پوچھا۔

"تم مسز شہاب علوی کے ڈرائیور ہو نا؟" وہ چبھتے لہجے میں یکدم۔ بولی' اس سے بہتر تھا کہ اب بھی خاموش ہی رہتی۔

اس کے غیر معمولی انداز پر صالح بری طرح ٹھٹک گیا۔

"کیسی فضول قسم کی بات کر رہی ہو تم زارا!" ثمینہ نے بے حد ناگواری سے اسے ٹوکا۔

"آپ خود پوچھ لیں اس سے۔" زارا بھڑک کر زہر خند لہجے میں اس کی جانب حقارت سے دیکھ کر بولی۔ "کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" وہ طنزیہ انداز میں براہ راست اسی سے مخاطب ہوئی تھی اس بار۔

"جی۔" اس نے مسز ثمینہ یزدانی کے چہرے کے تاثرات تو سرعت سے تبدیل ہوتے ضرور دیکھے تھے مگر شاید وہ تاثرات کا درست ادراک نہیں کر پایا تھا۔ اسی لیے باوجود مقابل کے ناپسندیدہ' پُرتحیر لہجے کے' سر اٹھائے مکمل اعتماد سے بولا۔

"آپ درست کہہ رہی ہیں اور آپ کی والدہ میرے بارے میں یہ بات جانتی ہیں۔" اس نے ثمینہ کا متغیر چہرہ دیکھا۔ "کیوں آنٹی؟"

"وہاٹ...... ؟" زارا بے یقینی سے ثمینہ کو دیکھ کر تقریباً چیخی۔

"تو آپ یہ بات جانتی تھیں؟"

اور ثمینہ جو اس انکشاف پر صدمے سے ششدر بیٹھی تھیں، دھیرے سے نفی میں سر ہلا کر بولیں۔

"نہیں......"

اور اس ایک لفظ نے صالح کا سارا اعتماد سال خوردہ عمارت کی طرح ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس کر ڈالا۔

* * *

BOOKSPK

”ہائے گاڈ حکمہ!“ جانے والا اپنی کم حیثیت کی وزنی گٹھری اپنے شکستہ کاندھوں پر اٹھائے یہاں سے کب کا جاچکا تھا۔ قیامت آچکی تھی اور اب وہ مجرمانہ انداز سے اپنی پروفیسر ماں اور متمول حیثیت والی بڑی بہن کے سامنے سر جھکائے کھڑی حساب کتاب بھگتا رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں بہہ بہہ کر سوج چکی تھیں مگر تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں، خود اسی کی طرح۔

”تمہیں سارا زمانہ چھوڑ کر وہ ڈرائیور ہی ملا تھا عشق کرنے کے لیے۔“ وہ کڑے تیوروں سے اسے گھور کر جھاڑنے والے انداز میں بولی۔ مسز ثمینہ یزدانی الگ سر تھامے بیٹھی تھیں۔

”آخر تم نے کیا سوچ کر اسے گھر تک بلالیا؟“ اس کا طیش کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ”ارے ہمارا معاشرے میں ایک مقام ہے، کوئی حیثیت ہے کچھ اور نہیں تو کم از کم ضیاء ہی کے بارے میں سوچ لیا ہوتا۔ شہاب علوی ان کے کاروباری رفقاء میں سے ہیں اور یہ لڑکا ان کی وائف کا ڈرائیور اُف......“ اس نے بولتے بولتے جھرجھری سی لی۔ ”اگر انہیں اس معاملے کی بھنک بھی پڑ گئی تو جانتی ہو وہ کتنا برا محسوس کریں گے؟“

”تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی حکمہ؟“ زارا خاموش ہوئی تو ثمینہ دبے دبے سے غصے میں گویا ہوئیں۔

”کیونکہ میرے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی جو بطور خاص بتائی جاتی۔“ وہ اپنے بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے مسلسل گیلے ہوتے رخسار بے دردی سے رگڑ کر کسی بھی قسم کی لڑکھڑاہٹ سے قطعی طور پر پاک لہجے میں بولی۔ ”وہ تعلیم یافتہ ہے، پچھلے ڈیڑھ دو سال سے اچھی نوکری کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے۔ بہن کی شادی، والدہ کی بیماری اور روزمرہ کے دیگر اخراجات...... اس پر بہت دباؤ تھا۔ چھوٹی موٹی جابز سے لے کر ہوم ٹیوشنز، سیلز مینی وغیرہ وغیرہ، اسے جو کام بھی ملا اس نے کیا...... اور اب وہ پچھلے چھ سات ماہ سے یہ گاڑی چلانے والی نوکری کر رہا ہے، مگر ہمیشہ تو نہیں کرے گا۔ اس کا مستقبل روشن ہے پھر آپ لوگوں کو اعتراض کس بات پر ہے؟“

”اعتراض اس دو ٹکے کے آدمی کی حیثیت پر ہے۔“ اس کے دلائل سن کر زارا کو تو پتنگے ہی لگ گئے۔

”دو ٹکے کا وہ نہیں......“ حکمہ تڑپ ہی تو گئی۔ ”آپ لوگوں کی ذہنیت ہے جو انسانوں کو ان کی مالی حیثیت کے پلڑے میں تول کر بے مول کر دیتی ہے۔“

”آپ دیکھ رہی ہیں اس کی ڈھٹائی۔“ وہ اسے پسپائی اختیار نہ کرتے دیکھ کر ماں کو مخاطب کر کے احتجاجاً چلائی۔ جو کسی گہری سوچ میں مستغرق دکھائی دیتی تھیں۔

”بجائے شرمندہ ہونے کے مسلسل اس کا دفاع کر رہی ہے۔“

”ہاں تو کیوں نہ کروں؟“ وہ سسک کر بولی۔ ”وہ ڈاکو، چور یا پھر کوئی مجرم تو نہیں جو اس کے دفاع پر مجھے شرمندگی محسوس ہو بلکہ مجھے تو فخر ہے اس پر کہ وہ انتہائی دگرگوں حالات میں بھی ثابت قدم رہا اور بجائے کوئی غلط راستہ یا شارٹ کٹ اختیار کرنے کے محنت کرنے کو ترجیح دی۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم......“ زارا کو اس مرتبہ اس کے جواب نے اس قدر زیچ یا کر دیا کہ وہ اسے بھاڑ میں جھونک کر فی الفور وہاں سے چلی گئی۔

”مام......“ اس کے کمرے سے چلے جانے کے بعد وہ خطرناک حد تک سنجیدہ، ثمینہ کے گھٹنوں کے پاس زمین پر آ بیٹھی اور بڑی لجاجت...... بڑی آس سے پوچھنے لگی۔

”کیا آپ کو بھی میرا انتخاب غلط لگ رہا ہے، آپ نے تو ہمیشہ ہی اپنے اسٹوڈنٹس کو تمام انسانوں کے مساوی ہونے کا درس دیا ہے۔ کیا آپ بھی اس کی اچھائیوں سے صرف نظر کر کے اس کی حیثیت کے پلڑے میں اسے تول کر مسترد کر دیں گی؟“

”انسان سماجی حیوان ہے حکمہ!“ وہ بہت گہرے مدھم مگر ذومعنی لہجے میں بولیں۔ ”معاشرے سے کٹ کر نہیں رہا جاسکتا...... زارا درست کہہ رہی ہے، اگر یہ رشتہ جڑ گیا تو معاشرتی اعتبار سے ہمیں کئی سوالوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا اور جس کے متحمل ہم نہیں ہو سکتے۔ تمہاری محبت اور اس لڑکے کے لیے محسوسات اپنی جگہ، مگر تم خود کو ہماری جگہ رکھ کر سوچو...... ہم بھی مجبور ہیں۔“

”مام!“ حکمہ نے بڑے تحیر اور بے یقینی سے ان کی زبان سے ادا ہونے والے ان کے ہی لیکچرز کی نفی کرتے الفاظ سنے تھے۔ ”یہ آپ کہہ رہی ہیں مام؟“

”ہاں، میں کہہ رہی ہوں۔“ اس بار وہ خود پر قابو پا کر بولیں البتہ آنکھوں سے گہرا رنج مترشح تھا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم اس لڑکے کو بھول جاؤ اور ہمیں کسی آزمائش میں مبتلا مت کرو۔“ وہ بے لچک لہجے میں بولیں۔

”ٹھیک ہے پھر مام!“ حکمہ یکدم ہی رونا دھونا چھوڑ کر بہت عجیب سے پتھریلے لہجے میں بولی۔ ”میں آپ کو دکھ دینے یا کسی بھی قسم کی آزمائش میں مبتلا کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔

میں آپ کے اس نام نہاد عزت دار معاشرے میں آپ کی ساکھ کی خاطر اپنی محبت قربان کر دوں گی مام!“ وہ سسکیاں روکنے کی ناکام کوشش میں بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

”مگر اتنا بتادوں کہ اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی اجڑ جائے گا مام! میری روح بے جان ہو جائے گی۔ میرا یہ ظاہری وجود اندر سے پوری طرح خالی ہو جائے گا مگر چھوڑیں...... میں یہ سب آپ کو بتا ہی کیوں رہی ہوں۔ آپ کیا جانیں کہ روح کے بغیر زندگی کیسی ہوتی ہے؟ آپ بھلا کیا جانیں؟“

وہ کرلاتی ہوئی اٹھی اور مڑ کر سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔ اپنے عقب میں اپنے نشتر الفاظ کی بازگشت سے انہیں لہولہان ہوتا چھوڑ کر۔

اور یہی تو ہمارے معاشرے کا دستور ہے، ہم دوسروں کو اچھائی اور انسانیت کے لمبے لمبے لیکچرز تو بڑی آسانی سے پلا دیتے ہیں مگر بوقت عمل خود ہمارا رویّہ بھی دوسروں جیسا ہی ہوتا ہے یعنی منافقانہ۔

ہم اپنے لیے کوئی نہ کوئی گنجائش نکال ہی لیتے ہیں، دنیا کیا سوچے گی؟ لوگ کیا کہیں گے؟ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں بھی یہی فکریں کھائے جاتی ہیں اور ایسے میں انسانیت پر دیے اور سنے جانے والے تمام درس دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

یہ ایک دائرہ ہے اور ہم سب اس میں سفر کر رہے ہیں، مگر کسی نہ کسی کو تو بہرحال ایک نہ ایک دن یہ دائرہ بدلنا پڑے گا نا......

یوں میں نے یہ دائرہ بدل دیا......

”میں نے تم سے کہا تھا نا صالح!“ اپنے نرم بستر پر نیم دراز حکمہ کی آواز میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ ”کہ میری مام بہت اچھی ہیں، ان کے نزدیک انسان کا کردار، اس کی شرافت ہی سب کچھ ہے۔ وہ محنتی اور سیلف میڈ لوگوں کو پسند کرتی ہیں۔ ہاں تھوڑی بہت کش مکش کا شکار وہ ضرور ہوئیں لیکن دیکھ لو، انہوں نے بالآخر تمہیں سند قبولیت بخش ہی دی۔ ہاں زارا تھوڑی ناراض ہے لیکن مجھے امید ہے، جوں ہی تمہیں کوئی اچھی نوکری ملی، اس نے بھی راضی ہو ہی جانا ہے اور مجھے یہ بھی واثق امید ہے کہ تمہیں جلد ہی کوئی اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ اچھا سنو...... وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ......“

حکمہ کی کھنکتی آواز باہر تک سنائی دے رہی ہے اور اس کی آواز سے جھلکتی بے پناہ مسرت میرے لیے بے اندازہ طمانیت کا باعث بن رہی ہے۔ ہاں یہ ہی تو چاہتی تھی نا میں کہ کتابوں میں لکھی باتوں پر اس کا ایقان قائم رہے، لہٰذا تھوڑی دشواری کا سامنا تو رہا مگر میں نے اس کی خاطر اپنا ظرف تھوڑا سا بڑا کر کے اسے اس کے دل کی خوشی دے دی۔ وہ خوشی جو مجھے حاصل نہ ہو سکی۔

صرف اس لیے کہ میرے ساتھ یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے ذہین و فطین، اساتذہ کا پسندیدہ، نیک نام اور شریف النفس اقبال انصاری جو مجھ سے محبت کرنے کی جسارت کر بیٹھا تھا، اس کا بنیادی اور ناقابل معافی جرم یہ تھا کہ وہ ایک سبزی فروش کا بیٹا تھا۔

☆

BOOKSPK

افشین نعیم

محبت ہو گئی ہے تم سے

مکمل ناول

عثمان صوفہ کم بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹا ہوا موبائل پر کینڈی کرش کھیل رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ گنگناتا بھی جارہا تھا جب مہرین اسے ڈھونڈتی ہوئی آئی۔

''عثمان! میرے پیارے بھائی، ایک کام کرو گے؟'' لہجے میں حد درجہ شیرینی اور حلاوت گھول کر بھائی کا کندھا ہلایا۔

''بجو! آپ کا پیارا بھائی پہلے ہی سے ایک عدد کام کررہا ہے۔'' نظریں موبائل سے ہٹائے بغیر جواب دیا۔

''بات سنو میری۔'' اس کا کندھا ہلایا۔ ''اور اس کو تو پرے کرو۔'' ساتھ ہی موبائل پر حملہ کرنا چاہا۔

''نہ، نہ، نہ......'' عثمان نے ایک ہاتھ سے بہن کے حملے کو ناکام بنایا۔ دوسرا ہاتھ ہنوز موبائل پر

BOOKSPK
Novels & Magazines

مصروف رکھا۔ ''اس وقت موبائل سے دور رہیں، گیم انتہائی حساس دور سے گزر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، کھیلتے رہو تم اور جمعہ کی نماز کے لیے اپنا سوٹ خود استری کر لینا۔'' مہرین کہہ کر رکی نہیں۔

''ہوں، ہیں، آں......'' گیم چھوڑ چھاڑ بہن کے پیچھے بھاگا۔ ''سنیں تو بجو! کیا کہہ رہی تھیں آپ؟''

''میں کہہ رہی تھی جمعہ کے لیے اپنا سوٹ خود استری کر لینا۔''

''نہیں، وہ...... اس سے پہلے کا پوچھ رہا ہوں۔'' عثمان نے کچھ خجل ہو کر سر کھجایا۔

مہرین نے جانچتی، تولتی نگاہوں سے خود سے چار سال چھوٹے بھائی کو دیکھا۔ ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی اداکاری کی۔

''ہاں، یاد آیا......'' چٹکی بجائی۔ ''میں کہہ رہی تھی میرا ایک کام کرو گے؟''

''تو بجو! اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے، آپ حکم کریں۔'' سر کو تعظیماً تھوڑا سا خم کیا۔

''وہ جو مین بائیس نمبر اسٹاپ ہے نا، وہاں فارمیسی کے سامنے ایک بن کباب والا ٹھیلہ لے کر کھڑا ہوتا ہے اس سے بن کباب لا دو پلیز۔ بہت بھوک لگ رہی ہے، روٹی کھانے کو بالکل دل نہیں کر رہا۔''

''اوکے، ابھی لایا۔ لائیں پیسے دیں۔'' اس نے ہاتھ آگے کیا۔

مہرین نے سو، سو کے دو نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے۔

''ایک سو تیس روپے کا آئے گا بن کباب، باقی کے ستر روپے سے تم اپنے لیے کچھ لے لینا۔'' مہرین نے سخاوت کے تمام ریکارڈ توڑے۔

''ساٹھ روپے اور دے دیتیں تو میں اپنے لیے بھی بن کباب ہی لے لیتا۔''

''ساٹھ روپے جیب سے ڈال لینا اور لے لینا اپنے لیے بھی بن کباب۔''

''جی، بہت شکریہ مشورے کا۔'' منہ بناتا باہر نکلا۔

امی، ابو کسی رشتے دار کی عیادت کو گئے ہوئے تھے، گھر میں بس مہرین اور عثمان تھے۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ امی کو ٹھیلے ویلے سے چیزیں منگوانا سخت ناپسند تھا سو آج ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مہرین نے بن کباب منگوایا تھا۔ اور اب وہ شدت سے عثمان کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

بائیک کی آواز سن کر بھاگتی ہوئی گیٹ تک پہنچی، عثمان بائیک سنگل اسٹینڈ پر کھڑی کر کے اندر آ رہا تھا۔

''بائیک اندر نہیں لائے؟''

''نہیں، ذرا کام سے جا رہا ہوں، تھوڑی دیر تک آتا ہوں واپس۔'' وہ ہیلمٹ لینے اندر آیا تھا۔

''بن کباب کہاں ہے؟'' مہرین نے اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں تھا ٹھیلے والا۔'' وہ آرام سے کہتا، ہیلمٹ سر پر پہنتا ہوا باہر کی جانب بڑھا۔

ایک دم ہی مہرین کا موڈ آف ہوا۔ ''تو کچھ اور لے آتے۔''

''آپ نے کب کہا تھا کچھ اور لانے کے لیے۔''

''لاؤ پیسے واپس کرو۔'' سخت خفا انداز میں ہاتھ پھیلایا۔

عثمان نے جیب سے پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے۔

''ویسے انسان شکریہ ہی ادا کر دیتا ہے، میں گیا تو تھا نا اتنا قیمتی وقت ضائع کر کے اب اگر ٹھیلے والا نہیں تھا تو میرا قصور تو نہ ہوا نا۔'' مہرین نے جواباً فقط گھورنے پر اکتفا کیا۔

''ارے ہاں۔'' اس کو کچھ یاد آیا تو بولا۔ ''میں نے اپنے ستر روپے کاٹ لیے ہیں، یہ بقایا ایک سو تیس روپے ہیں۔'' کہتے ہوئے بائک کو کک لگائی اور یہ جا وہ جا۔

مہرین نے غصے سے کھولتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جہاں ایک سو تیس روپے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

☆✿☆

''صدیقی صاحب! تزئین کے گھر کے اس قدر قریب سے گزر رہے ہیں، آئیے ذرا ملتے ہوئے چلتے ہیں۔'' فرحانہ بیگم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شوہر کو مخاطب کیا۔

''بھئی مجھے نہیں پسند، بیٹی کے سسرال میں زیادہ آنا جانا۔'' نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آخری بار آپ شاہ نور کی پیدائش پر گئے تھے، بیٹی کے سسرال۔ دس دن بعد شاہ نور کی سالگرہ ہے یعنی پورا ایک سال ہو گیا ہے۔'' وہ سخت ناراضی سے بولیں۔

''کہہ تو رہا ہوں نہیں پسند زیادہ آنا جانا۔ بیٹی' داماد آ کر مل جاتے ہیں، آپ اور بچے جا کر مل لیتے ہیں' کافی ہے۔'' مسکراہٹ دباتے بظاہر سنجیدگی سے بولے۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ جان بوجھ کر اس راستے سے آئے تھے۔ خود اپنا بھی دل کر رہا تھا بیٹی، نواسے سے ملنے کو پر بیگم کو زچ کرنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔

''بس پھر ٹھیک ہے، مجھے اتار دیجیے تزئین کے گھر کے سامنے، آپ جائیے گھر، میں خود آ جاؤں گی۔''

''یہ لیجیے۔'' عین تزئین کے گھر کے سامنے گاڑی روکی۔ فرحانہ بیگم خفا خفا سی اترنے لگیں۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' صدیقی صاحب بڑے موڈ میں تھے آج۔ وہ بات سننے کو رکیں۔

''آپ اس عمر میں بھی، غصے میں قیامت ڈھاتی ہیں۔'' فرحانہ کچھ جھینپ کر نیچے اتریں۔

''بس باتیں بنوالو۔''

ان کی تقلید میں صدیقی صاحب بھی نیچے اترے' فرحانہ نے ایک نظر انہیں اترتے دیکھا پر بولیں کچھ نہیں۔ تزئین تو خوشی سے بے حال ہو گئی ماں باپ کو دیکھ کر۔

''ابھی، آپ ہی لوگوں کو کال کرنے والی تھی۔'' ''آنٹی (ساس) اور نغمہ (نند) فیصل آباد گئی ہوئی ہیں، سامعہ بھابھی بچوں کو لے کر اپنی امی کی طرف گئی ہیں۔ احمر دو دن کے لیے آؤٹ آف اسٹیشن ہیں مجھ سے کہہ گئے ہیں کہ عثمان کو بلا کر گھر چلی جانا۔'' تزئین نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''پھر تو اچھا ہوا جو ہم لوگ خود ہی آ گئے۔ اتنی مشکل سے تمہاری امی کو راضی کر کے لایا ہوں۔ آنے کو تیار ہی نہیں تھیں کہ بیٹی کے سسرال زیادہ آنا جانا اچھا نہیں لگتا۔'' بات وہ تزئین سے کر رہے تھے، نظریں بیگم کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ تزئین نے حیران ہو کر ماں کی شکل دیکھی۔ ''کیوں امی......؟''

''یہ میں گھر چل کر بتاؤں گی، تم سامان لے کر آؤ۔''

''کس کو؟'' صدیقی صاحب کی زبان سے پھسلا۔

گجرات
اور اطراف کے لیے
خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن
کے نئے ڈسٹری بیوٹر
پنجاب بُک ڈپو
پھالیہ، گجرات
فون نمبر: 0321 7740355
0300 7740355

’’محلے والوں کو۔‘‘ فرحانہ بیگم نے گھورتے ہوئے کہا۔

’’اچھا اچھا، میں سمجھا میری خبر لینی ہے گھر جا کر۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ فرحانہ بیگم بھی مسکرانے لگیں۔

* * *

تیمور صاحب‘ چشمہ آنکھوں پر لگائے، دونوں ٹانگیں سینٹرل میز پر رکھے‘ اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے جب جگو ہاتھ میں چائے کی دو پیالیاں اٹھائے، لہراتا، چائے چھلکاتا ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔

’’بڑے صاب! چائے۔‘‘ اس تیزی سے تیمور صاحب کی جانب بڑھا گویا چائے پیش کرنے نہیں ٹکر مارنے جارہا ہو۔

’’ارے، ارے دور رہو بھئی، کپڑوں پر گرے گی چائے۔‘‘ وہ فوراً سنبھل کر سیدھے ہوئے۔

جتنی تیزی جگو دکھارہا تھا چائے پیش کرنے میں، اس سے زیادہ تیزی سے انہوں نے چائے کا کپ تھاما۔ جگو سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کپڑوں پر ہی چائے انڈیل دیتا۔ دوسری پیالی زوردار آواز کے ساتھ میز پر پہنچی۔ چائے کناروں سے چھلک کر میز پر گری۔

’’یہ چھوٹے صاب کا چائے۔‘‘

تیمور صاحب نے ناپسندیدہ نظروں سے دونوں پیالیوں کو دیکھا جہاں پیالی پر چائے کے آنسو رواں تھے۔ کہیں کہیں پتی کے ذرات بھی چپکے نظر آرہے تھے۔

’’کب عقل آئے گی جگو تمہیں؟ کتنی بار کہا ہے چائے ٹرے میں رکھ کر لایا کرو اور پیالی کو اتنا مت بھرا کرو۔‘‘

’’اور وہ بھی تو بولیں نا، چائے کا پتی ٹھیک سے چھانا کرو۔‘‘

تیمور صاحب نے مزید کچھ بھی کہنے سے اجتناب کیا، جگو کو کچھ سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔

’’ٹرے میں اس واسطے نہیں لایا کہ دو ٹرے گندے برتن میں پڑا ہے، صرف ایک صاف ہے۔‘‘ کہہ کر واپس کچن میں چلا گیا۔

’’تو اس ایک صاف ٹرے کا اچار ڈالنا تھا۔‘‘ انہوں نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ اس کا جواب ان کو محض چند سیکنڈ بعد ہی مل گیا۔

جگو ٹرے میں چائے کی پیالی سجائے‘ ایک سائیڈ پر بسکٹ رکھے فوراً ہی واپس آگیا۔

اسی وقت وہاج تولیے سے سر رگڑتا اندر آیا۔ تب تک جگو چھوٹے صوفے پر سیٹ ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ گود میں ٹرے دھری تھی اور بسکٹ چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا۔

’’واہ بھئی! عیاشیاں ہو رہی ہیں، چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھائے جارہے ہیں۔‘‘ وہاج نے جگو کی ٹرے سے بسکٹ اچکنا چاہا۔

اس کی اس کوشش کو جگو نے بسکٹوں کو ہاتھ سے ڈھانپ کر انتہائی کامیابی سے ناکام بنایا۔

’’یہ لو، چھوٹے صاب۔‘‘ اپنے ہاتھ سے ایک بسکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ’’آپ کا چائے وہ سامنے پڑا ہے، اس میں ڈبو کر کھاؤ۔‘‘

’’ابے، اکیلا بیٹھا بسکٹ کھا رہا ہے، ہمیں خالی خولی چائے پر ٹرخا رہا ہے۔‘‘ وہاج نے تیمور صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا‘ جہاں اسے خالی چائے ہی نظر آرہی تھی بسکٹ نامی کسی شے کا نام و نشان تک نہ تھا۔

’’صاب! دس روپے کا پیکٹ تھا، چھ بسکٹ تھا اس کے اندر۔ اب آپ لوگ کو بانٹ دیتا تو باقی کیا بچتا۔‘‘

’’او بنیے، چھ بسکٹ تھے تو دو، دو تینوں کو آجاتے۔ اکیلا ڈکار گیا چھ کے چھ بسکٹ۔‘‘

’’اکیلا نہیں ڈکارا، ایک آپ کو بھی دیا ہے ابھی۔‘‘

’’بڑا احسان ہے سر آپ کا۔‘‘

’’جہانگیر سرکار! آپ خواہ مخواہ ہمارے ہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ کو تو سیاست میں حصہ لینا چاہیے، انتہائی کامیاب سیاست دان بنیں گے۔‘‘

’’ہاں صاب! امارا اماں بھی کہتی ہے، ہم بہت بڑا آدمی بنے گا۔ یہ دیکھو، یہ امارا ہاتھ میں لکیر بھی ہے۔ یہ صرف بڑا آدمیوں کا ہاتھ میں ہوتا ہے۔‘‘

جیسے ہی جگو نے ہاتھ آگے کر کے دکھانے کی کوشش کی، ٹرے کا بیلنس خراب ہوا اور چائے کی پیالی زوردار آواز کے ساتھ زمین بوس ہوئی۔ اور چائے آزادانہ مختلف اطراف میں سفر کرنے لگی۔ تیمور صاحب نے ناگواری سے اس سارے منظر کو دیکھا (یہ جگو نامی بلا ان کے اعصاب کے لیے بہت بڑا امتحان تھی) پھر سر جھٹک کر توجہ اخبار کی جانب کی۔

جگو تو دکھ اور صدمے کی زیادتی سے گنگ رہ گیا۔

’’امارا سارا چائے گر گیا۔‘‘

’’جگو سرکار! یہ اس سیٹ کی آخری پیالی تھی نا؟‘‘ وہاج نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

’’صاب! انسان کو دنیا کی چیزوں کا غم نہیں کرنا چاہیے، یہ سب کچھ فانی ہے، بس اللہ کا ذات باقی رہنے والا ہے۔‘‘

’’یار جگو! چھ سال ہوگئے ہیں تجھے ہمارے ہاں رہتے ہوئے۔ آج تک تجھے ڈھنگ کی چائے بنانی نہیں آئی، روز شام کو یہ کڑوا کسیلا کاڑھا بنا کر رکھ دیتا ہے۔‘‘ وہاج نے چائے پی کر برا سا منہ بنایا۔

’’صاب! رزق میں کیڑے مت نکالو، اللہ ناراض ہوگا۔ تم کو نہیں پینا‘ لاؤ، ام کو دے دو۔‘‘

’’یہ لے، تُو ہی پی لے۔‘‘ آدھی پیالی چائے بچا کر جگو کو پکڑائی۔ جس کو جگو نے مستعدی سے تھام لیا۔

’’جہانگیر صاحب! آپ کے کھانے پینے کا سیشن تمام ہوگیا ہو تو اب گھر کے کاموں کی جانب توجہ کر لیجیے۔‘‘ تیمور صاحب نے اخبار تہ کر کے سائیڈ پر رکھتے ہوئے جگو کو مخاطب کیا۔ تیمور صاحب کے اس انداز تخاطب سے جگو خائف ہوجایا کرتا تھا۔

’’جی بڑے صاب! ابھی پہلے کچن کا کام کرے گا پھر گھر صاف کرے گا۔‘‘ کہتے ہی کچن کی طرف دوڑ لگادی۔

* * *

جہانگیر عرف جگو آج سے چھ سال قبل تیمور لاج آیا تھا، تیرہ سال کا ڈرا، سہا بچہ جس کو یہاں کی زبان بھی ٹھیک طرح نہیں آتی تھی۔

ایک کنال پر محیط اس بنگلے میں تین نفوس رہائش پذیر تھے، تیمور سلطان، مسز تیمور اور ان دونوں کا اکلوتا بیٹا وہاج تیمور۔

تیمور سلطان سول انجینئر تھے، وہاج پیشے کے اعتبار سے بینکر تھا۔ ان ہی دنوں جب کہ مسز تیمور زور شور سے وہاج کے لیے لڑکیاں تلاش کر رہی تھیں، ان پر یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ وہ خون کے سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔

گو علاج ساتھ ساتھ جاری رہا، پر وہاج کی شادی کا سلسلہ جو اُن کی بیماری کی وجہ سے وقتی طور پر مؤخر ہوا تھا، دوبارہ شروع نہ ہوسکا۔ وہ تین سال اس مرض سے لڑ لڑ کر آخر جان کی بازی ہار گئیں۔

مسز تیمور کی بیماری کے آخری دنوں میں جب کہ تلاش بسیار کے باوجود کوئی فل ٹائم ملازمہ مل کے نہ دے رہی تھی، جگو کو بہ امر مجبوری رکھا گیا تھا جو اُن کی موت کے بعد اس گھر کی ضرورت بن چکا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس نے کچھ نہ کچھ زبان سیکھ لی تھی، گزارے لائق کام کر لیا کرتا اگرچہ کام کم خرابی زیادہ کرتا تھا۔ آخری دنوں میں اس نے بیگم تیمور کی خوب خدمت کی، کچھ اس وجہ سے بھی باپ بیٹا اس کی اکثر غلطیوں کو نظر انداز کر جاتے۔

بیگم تیمور کی وفات کے کوئی چھ، سات ماہ بعد گھر کی فضا میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہونا شروع

ہوئی۔

تیمور صاحب اور وہاج اپنے اپنے آفس سے واپس آتے تو گھر پھیلا ہوا ہوتا، کچن الگ گندے برتنوں سے بھرا ہوا ہوتا۔ جگو سے استفسار کیا جاتا تو کبھی کہتا سر میں درد تھا، کسی دن اس کے پیٹ میں درد ہوتا۔ کسی دن اس کو بخار ہوتا، حیرت اور مزے کی بات یہ تھی کہ یہ تمام تکالیف اس کو دن میں ہوتیں شام کو بھلا چنگا ہو جاتا، سارے کام جلدی جلدی نمٹاتا۔

آخر دو ماہ یہ سب برداشت کرنے کے بعد ایک دن تیمور صاحب نے وہاج کو چھٹی کر کے جگو کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کا کہا۔ تو وہاج معمول کے مطابق تیار ہو کر آفس کے لیے نکلا، ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آیا تو گیٹ پر لگا بڑا سا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ یہ خاصے اچنبھے کی بات تھی، ان کے گھر تالا کبھی نہیں لگا تھا۔ بہرحال وہ دن وہاج نے گیٹ کے سامنے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گزارا تھا۔ سارا دن گزار کر ان باپ بیٹے کی آمد سے کوئی تیس پینتیس منٹ قبل جگو صاحب کی گھر آمد ہوئی۔

وہاج کو دیکھ کر تو جگو کے پسینے چھوٹ گئے۔

''صاب آپ ...... اتنی جلدی کیسے آ گیا؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔

''اندر چل بیٹا! بتاتا ہوں۔'' وہ گردن سے دبوچ کر جگو کو اندر لے آیا۔

شام کو تیمور صاحب کے سامنے پیشی پر جگو نے رو رو کر اپنے گناہوں کا اعتراف کیا پھر گڑگڑا کر معافی مانگی۔

جگو صاحب کی مصروفیات کی تفصیل کچھ اس طرح تھی کہ بیگم تیمور کے انتقال کے بعد اس نے دو تین گھروں کے چھوٹے موٹے کام پکڑ لیے تھے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ بھی تالا لگا کر گھر سے نکل جاتا تھا اور ان کی آمد سے قبل واپس آ جاتا۔

''صاب میرا قصور نہیں ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''آپ جو تنخواہ دیتے ہو وہ پوری بابا لے لیتا ہے۔ خرچ کا واسطے ایک روپیہ بھی نہیں چھوڑتا امارے پاس، بولتا ہے تیرا رہائش اور کھانا صاب لوگ کے ساتھ ہے، تجھے پیسہ کیا کرنا ہے۔

ام اپنا خرچ نکالنے کا واسطے یہ کام کیا صاب! اللہ کا واسطہ ام کو نوکری سے مت نکالنا ورنہ بابا ام کو جان سے مار دے گا۔ بس ام کو یہ مہینہ پورا کرنے دو، ام آگے سے ان لوگ کو کام کا منع کر دے گا۔''

تیمور صاحب نے بہرحال اس کو معاف کر دیا، وجہ اس کا رونا دھونا اور معافی تلافی نہیں تھی۔ ان دو چھڑے چھانٹ مردوں کے گھر میں کوئی ملازمہ تو آنے کو تیار ہوتی نہیں تھی، پھر کل وقتی قابل اعتبار ملازم کا ملنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ اب ایسے میں جگو جیسا بھی کام کرتا تھا' غنیمت تھا، سو جگو کو برداشت کرنا ان کی مجبوری تھی۔

☆ ☆ ☆

''تزئین! تم بتا رہی تھیں احمر کی چچی اپنے بھتیجے کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ تم نے احمر کے کان میں بات ڈالنی تھی نا کہ مہرین کے لیے بات کرے۔''

''امی! میں نے کی تھی احمر سے بات، انہوں نے اپنی چچی سے بات بھی کی تھی پر چچی نے تو منہ پر ہی انکار کر دیا۔

''نہیں بھئی تزئین کی بہن کی عمر زیادہ ہے۔ ہمیں اتنی بڑی عمر کی لڑکی نہیں چاہیے۔'' تزئین نے منہ بگاڑ کر نقل اتاری۔

''حالانکہ لڑکا بھی تیس بتیس سے کم کا نہیں ہے۔''

فرحانہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

''میں نے تو احمر سے کہہ دیا، بس نہ کرنے کے بہانے ہیں ورنہ نغمہ میں کیا کمی ہے۔ اس کے لیے فرماتی ہیں بہت چھوٹی ہے، جوڑ نہیں بنتا — اتنی خواہش تھی آنٹی کی کہ نغمہ کا رشتہ ادھر ہو جائے۔''

فرحانہ خاموشی سے سنتی رہیں، کچھ بولنے کو دل ہی نہ

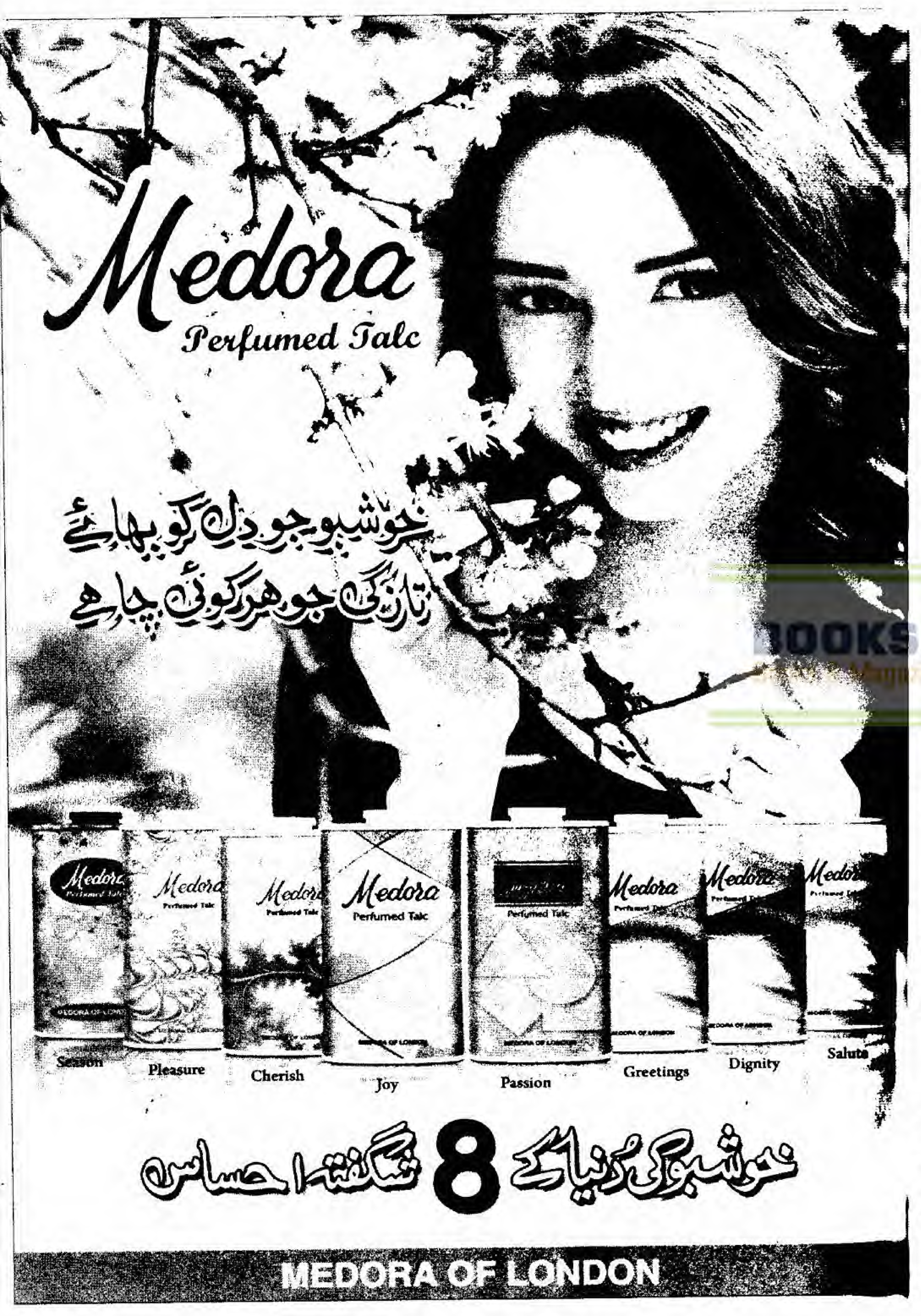

چاہا۔

”میرا خیال ہے امی! چچی کی دلچسپی ہی نہیں ہے اس معاملے میں، ان کی بھابھی کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔ بھائی نے بہن کے ذمے لگادیا ہے بیٹے کا رشتہ، بہن نے ہامی تو بھرلی ہے پر یوں ہی ٹال مٹول کرتی رہتی ہیں۔“

”مہرین پورے انتیس برس کی ہوجائے گی اگلے ماہ۔“ فرحانہ آزردگی سے بولیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں، اللہ سب بنادے گا، ویسے بھی دیکھنے میں تیئس چوبیس سے زیادہ کی نہیں لگتی مہرین!“

تب ہی عثمان، شاہ نور کو گود میں اٹھائے اندر آیا۔

”آپی! یہ نیا کرتب دیکھیں ہم ماموں بھانجے کا۔“ کہتے ہی شاہ نور کو زور سے ہوا میں اچھالا۔

امی اور تزئین‘ دونوں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ شاہ نور صاحب نے لمحہ بھر کو سانس روکی اور ماموں کی گود میں واپس کیچ ہونے پر کھلکھلا کر ہنسنا شروع کردیا۔ تزئین کے پہنچنے تک عثمان ایک مرتبہ اور شاہ نور کو ہوا میں اچھال کر کیچ کرچکا تھا۔

شاہ نور جی دار بچہ تھا، بس خلا میں معلق سانس روکتا پھر ہنسنا شروع۔

”بدتمیز انسان! اپنے بچوں کے ساتھ کرنا یہ کرتب۔“ تزئین نے شاہ نور کو عثمان کی گود سے جھپٹا۔

”ارے میں تو خود چاہتا ہوں کہ اپنے بچوں کے ساتھ کروں یہ کرتب، آپ لوگوں کو بھتیجے بھتیجیاں گود دوں کھلانے کا موقع دوں، پر کوئی مجھ غریب کی سنے تب نا۔“ عثمان نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”نہ شرم، نہ لحاظ...... بس جو منہ میں آتا ہے، بولے جاتا ہے یہ لڑکا۔ کوئی اس کو سمجھائے‘ ہر بات یوں ماں بہنوں کے سامنے کرنے والی نہیں ہوتی۔“ فرحانہ سخت خفا ہوکر بولیں۔

”تو لادیں نا بیوی، نہیں کروں گا ماں بہنوں کے سامنے ایسی باتیں۔“

”مہرین کی شادی سے پہلے تو سوچنا بھی مت اپنی شادی کا۔“ انہوں نے گھرکا۔

”ہک ہاہ۔“ عثمان نے ٹھنڈی سانس لی۔ تب ہی مہرین چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔

”ویسے امی، میرا خیال ہے ہمیں عثمان کے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کردینا چاہیے، جیسے ہی مہرین کا رشتہ طے ہوگا‘ ساتھ ہی دونوں کی کردیں گے۔“ تزئین مخاطب ماں سے تھی دیکھ وہ عثمان کو رہی تھی۔

”لڑکی تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے آپی! اپنے آس پاس نگاہ دوڑائیں، قریب میں ہی مل جائے گی۔“ عثمان‘ تزئین کو دیکھ کر شرارت سے بولا۔

”ہوں۔“ تزئین نے لمبی سے ہوں کی۔

”سب سمجھتی ہوں میں، یہ جو تم بھاگ بھاگ کر میرے گھر آتے ہو نا، اس کے پس پردہ مقاصد، سب سمجھتی ہوں میں۔ امی سن لیجیے آپ اپنے سپوت کی باتیں۔“

فرحانہ کا ان دونوں کی نوک جھونک کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں تھا۔ ان کی نظریں مہرین کے چہرے پر جمی تھیں، ذہن میں ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

”لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔“

☆ ✿ ☆

”صاب‘ کھانا تیار ہے، آپ دونوں ہاتھ دھوکر کر آجاؤ۔ ام گرم گرم روٹی آپ کو دیتا جاتا ہے۔“ جگو نے پانی کا جگ، گلاس، پلیٹیں اور سالن کا ڈونگا لاکر ڈائننگ ٹیبل پر رکھا۔ وہاج اور تیمور صاحب اپنی اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

”اوئے جگو! یہ کیا بنایا ہے؟“ وہاج نے سالن کے ڈونگے کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا، ساتھ ہی ہانک لگائی۔

”آلو گوشت ہے صاب۔“

”یار، ہم نے اس کو کھانا ہے یا اس میں ڈبکیاں لگانی ہیں۔“ وہاج نے پتلے شوربے والے سالن کو دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں جگو سے استفسار کیا۔

”صاب! آپ کا مرضی، کھانا ہے تو کھالو، نہانا ہے تو نہالو۔ ہم ایسا ہی کھانا بنا سکتا ہے۔“ جگو چمٹے میں دبی روٹی‘ پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔ روٹی کو دیکھ کر وہاج سالن کا غم بھول گیا۔ دونوں ہاتھوں سے روٹی پکڑ کر چہرے کے عین سامنے کی۔

”یار! یہ روٹی کے نام پر کب تک ہم ایسے عجیب وغریب نقشے کھاتے رہیں گے۔“ بغیر کسی کو مخاطب کیے خود کلامی کی۔

”اگر معائنہ مکمل ہوگیا ہو تو کھانا شروع کریں۔“ تیمور صاحب سالن نکالے‘ منتظر نظروں سے وہاج کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”جی، جی ضرور۔“ وہاج نے روٹی واپس پلیٹ میں رکھ کر پلیٹ تیمور صاحب کی جانب کھسکائی۔

”ویسے بابا، آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے ایک بات بتاؤں۔“ تھوڑا توقف کیا۔ تیمور صاحب کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

”مجھے معلوم ہے آپ جاننا چاہ رہے ہیں، چلیں بتادیتا ہوں۔ پرامن احتجاج ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔“ تیمور صاحب نے سوالیہ نظروں سے وہاج کو دیکھا۔

”میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر آپ تشدد پسندی کی راہ اختیار نہیں کرنا چاہتے تو نہ کریں پر اپنی رائے کسی طریقے سے تو عوام الناس تک پہنچائیں نا۔“

”کیا یہ اندازہ مجھے خود لگانا ہے کہ بات کس تناظر میں کی جارہی ہے۔“

”افوہ بابا کبھی تو بغیر سمجھائے ہی سمجھ جایا کریں۔ چلیں میں وضاحت کردیتا ہوں۔ بھئی سیدھی اور صاف بات ہے اگر اس پھیکے، سیٹھے، لم لم شوربے جیسے سالن اور یہ عجیب وغریب جیومیٹریکل فگرز جیسی روٹیاں دیکھ کر آپ پلیٹ اٹھا کر دیوار سے نہ بھی ماریں تو کم ازکم ایک آدھ طعنہ تو مار ہی دیا کریں جگو کو۔“

”یہ کام تو تم اکیلے بھی کافی اچھا کرلیتے ہو، میری کیا ضرورت ہے؟“

”بھئی میں اپنے حصے کا کام کرتا ہوں، آپ اپنے حصے کا کریں۔ سخت طیش دلاتی ہے مجھے آپ کی بے نیازی بلکہ بے حسی کہنا زیادہ مناسب ہے۔“

”مجھے یہ بتاؤ اس سے فرق کیا پڑے گا؟“

”کیا مطلب، کیا فرق پڑے گا۔ اگلے کو کچھ تو احساس ہوگا۔“

”بس ہوچکا احساس، جگو کو کچھ کہنے کا مطلب دیوار سے سر پھوڑنا ہے۔ اس لیے بیٹا‘ میری مانو تو تم بھی میرے والی پالیسی اپنالو، خاموشی سے وقت گزارے چلے جاؤ۔“

”بابا!“ ابھی وہ کچھ کہنے کے لیے لب وا کرہی رہا تھا کہ جگو روٹی لیے چلا آیا۔

”صاب! آپ لوگ امارے ہاتھ کا بنا کھانا کھاتا ہے اور اماری برائیاں کرتا ہے۔“ جگو نے سخت ناراض نظروں سے وہاج کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو تیرے ہاتھ کے یہ عجیب وغریب کھانے کھاکر پڑوسیوں کی برائیاں کریں کیا؟“

”صاب! آپ اپنا زبان قابو نہیں رکھتا‘ اسی واسطے آپ کا شادی بھی نہیں ہوتا۔“ جگو کا غصہ نکالنے کا اپنا انداز تھا، کہہ کر رکا نہیں کچن کو سدھارا۔

”بس تو نہ ٹھیک کرنا اپنی حرکتیں، جو ٹھیک کرنا ہے ہم ہی کریں۔“ وہاج تپ کر اونچی آواز میں بولا تاکہ آواز کچن تک پہنچ جائے۔

”دیکھ لیجیے، آپ کی وجہ سے آج یہ بھی شادی نہ ہونے کا طعنہ مار گیا ہے۔ اب یہ اوقات رہ گئی ہے میری۔“ وہاج سخت ناراضی سے باپ کو دیکھتا گویا ہوا۔

تیمور صاحب تو اچھل ہی پڑے اس الزام

پر۔ “میری وجہ سے کیوں بھئی؟”

“آپ اتنے لاپروا نہ ہوتے نا تو کبھی کی شادی ہوگئی ہوتی میری۔ میری عمر کے لڑکوں کے دو دو، تین تین بچے ہیں۔ ایک آپ ہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے اکلوتے بیٹے کی شادی کی۔”

“چھوٹے صاب! آپ کی عمر کے لڑکے نہیں ہوتے، آدمی ہوتے ہیں۔” جگو نے ایک مکروہ سا قہقہہ لگایا۔ وہ روٹی بنا بنا کر لاتا جا رہا تھا‘ ساتھ ساتھ کمنٹری بھی جاری تھی۔

“ایک لفظ آگے نہ بولنا منحوس! نہیں تو یہ ڈونگا تیرے سر پر خالی کردوں گا۔”

جگو نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔ جانتا تھا شادی کے ذکر پر صاب ایسے ہی جذباتی ہوجاتا ہے۔ تیمور صاحب نے دھیان سے بیٹے کا تپا ہوا چہرہ دیکھا (معاملہ خاصا سیریس ہوتا جارہا ہے)۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔

“یار! کہہ تو رکھا ہے تمہاری پھپھو کو۔ اب اللہ کی طرف سے ہی کوئی سبیل نہیں بن رہی تو کیا، کیا جاسکتا ہے۔” صفائی دینے کی کوشش کی۔

“بابا! آپ کو خود بھی اچھی طرح پتا ہے، اس معاملے میں پھپھو کی سنجیدگی کا عالم۔ ہر ہفتے آکر ہزاروں روپے بٹور کرلے جاتی ہیں کہ لڑکی دیکھنے جانا ہے، پھر بڑے آرام سے اگلی دفعہ کہہ دیتی ہیں بات نہیں بنی۔ عقل کے اندھے کو بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لڑکی دیکھنے کے لیے انہیں ہر ہفتے ہزاروں روپے کیوں چاہیے ہوتے ہیں۔ کیا لڑکی والوں نے لڑکی دیکھنے پر کوئی ٹیکس وغیرہ لگانا شروع کردیا ہے جس سے ہم لاعلم ہیں یا پھر وہ جہاز میں بیٹھ کر لڑکی دیکھنے جاتی ہیں۔ آج تک کبھی کسی فیملی کو لڑکا دکھانے تو لے کر نہیں آئیں۔” وہاج سخت خفا تھا۔

“لڑکا...... ہاہاہا......” جگو روٹی رکھنے آیا تھا۔ یہ سن کر ایک فلک شگاف قہقہہ اس کے حلق سے برآمد ہوتے ہی دم توڑ گیا۔ وہاج کے تاثرات دیکھ کر، وہاج خوں خوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

“لڑکا...... وہ لڑکا...... ام کہہ رہا تھا روز صبح ایک پھیری والا ادھر آتا ہے۔ وہ ام سے پوچھ رہا تھا یہاں پر جو ایک جوان سا بڈھا اور بڑی عمر کا لڑکا رہتا ہے وہ تمہارا کیا لگتا ہے۔” جگو نے جھٹ سے بات بنائی اور کچن کی طرف دوڑ لگادی۔

“مجھ سے بھی میرے دوست پوچھتے ہیں‘ یہ جو تمہارے گھر میں بن مانس پھرتا ہے‘ تمہارا کیا لگتا ہے۔” کچن کی طرف منہ کرکے اونچی آواز میں بولا۔ ادھار رکھنے کا تو وہ بھی قائل نہیں تھا۔

“صاب! اپنے دوستوں کو بولو، زبان کو لگام دو۔ انہیں بتاؤ وہ امارا والد صاب ہے‘ الٹی سیدھی بات نہیں کرنا ان کے بارے میں۔” اس بار جگو نے کچن ہی سے جواب دیا۔

وہاج اور تیمور صاحب نے بے ساختہ ہی ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں کی ہنسی ایک ساتھ چھوٹی۔

“حاضر جوابی تو ختم ہے اس جگو کے بچے پر۔” وہاج ہنستے ہوئے بولا۔

تیمور صاحب نے شکر ادا کیا اس کا موڈ ٹھیک ہونے پر۔ جگو نے کچن کے دروازے سے جھانکا، حالات سازگار دیکھ کر اپنا کھانا لے کر باہر ہی آگیا۔ چھوٹے صوفے پر سیٹ ہوکر بیٹھ گیا، یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی، گود میں دھری ٹرے سے کھانا شروع کیا۔ وہاج کی نظر یوں ہی اس کی ٹرے پر پڑی تو دیکھا‘ وہ روٹی اور دو آلو کے کباب رکھے کھانا کھانے میں مشغول تھا۔

“اوئے‘ یہ کیا کھا رہا ہے؟”

“صاب! ام سے شوربے والا کھانا نہیں کھایا جاتا، ام اپنے واسطے بازار سے آلو کی ٹکیاں لایا تھا۔” توجہ ہنوز کھانے پر مرکوز رکھی۔

تیمور صاحب اور وہاج بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

☆❁☆

“بجو...... میری پیاری بجو! یہ دیکھیں میں اپنی بہن کے لیے چاکلیٹس لایا ہوں۔” عثمان نے بہن کو چاکلیٹ پیش کی۔ مہرین نے چاکلیٹ پکڑی “تھینکس” کہا اور بے نیازی سے کھانا شروع کردی۔ نظریں ہنوز ٹی وی پر جما رکھی تھیں۔

“بجو! میں نے بازار میں پتا کیا ہے‘ ابھی آپ کا رسالہ نہیں آیا، جیسے ہی آئے گا نا میں لے آؤں گا۔”

“بہت شکریہ۔” ہنوز بے نیازی کا لبادہ اوڑھے رکھا۔

“بجو! چائے پئیں گی، بنا کر لاؤں۔” عثمان کسی بھی طرح اسے راضی کرنا چاہ رہا تھا۔ بن کباب والے واقعے کے بعد سے مہرین نے اس سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔

“ہاں بھئی میں بھی پیوں گی چائے۔” تزئین، شاہ نور کو گود میں اٹھائے اندر آئی۔

“آپ کو چائے تب ملے گی جب بجو چائے پینے پر راضی ہوں گی۔”

“ارے، بجو تو خود چائے کی دیوانی ہے، یہ کیوں نہیں پیے گی چائے۔ کیوں مہرین!” تزئین نے بہن کو دیکھا۔

“چائے تو میں پی لوں گی، پر تمہارا کام کرکے نہیں دوں گی۔ ساری چاپلوسیاں سمجھ میں آرہی ہیں مجھے۔” آخر مہرین واپس اپنی جون میں لوٹی۔

“نو پرابلم، ابھی لایا۔” عثمان چھلانگ لگا کر غائب ہوا۔

“ہوں...... چائے تو بہت مزے کی بنائی ہے۔” مہرین نے تعریف کی۔ تزئین نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

“ایسا کرنا عثمان! بیوی کو بھی ایسی چائے بنانا سکھا دینا۔” تزئین مزے سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

“لو بھلا، سکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود بنالیا کروں گا۔”

“اور چائے پیش کرنے کے بعد برتن دھو کر کچن بھی صاف کردیا کروں گا، جملہ پورا بولو نا۔” مہرین نے ٹکڑا لگایا۔

“بس ایک دفعہ آپ لوگ اپنی بھابھی لے تو آئیں، پھر دیکھیے گا‘ کیسا فرماں بردار شوہر بن کر رہتا ہوں۔”

“توبہ عثمان! کتنا شوق ہے تمہیں شادی کا۔” تزئین نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

“سب کنواروں کو ہوتا ہے، اپنا وقت بھول گئیں اور بجو کو بھی اتنا ہی شوق ہوگا، کیوں بجو......؟” عثمان اب مہرین سے مخاطب تھا، مہرین کا چہرہ لمحہ بھر کو پھیکا پڑا، پھر فوراً اسے خود کو سنبھالا۔

“فضول باتیں بند کرو اور کام بتاؤ جس کے لیے اتنی چاپلوسیاں کر رہے ہو۔”

“لو بھلا، اب کیا میں اپنی بہنوں کو چائے بھی مطلب سے پلاؤں گا؟ اتنا بھی گھٹیا نہیں ہوں میں۔”

“اتنے ہی گھٹیا ہو تم، بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں میں تمہیں۔” مہرین نے صاف گوئی کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑے۔

عثمان نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ “بجو! انسان کو سفاکی کی حد تک صاف گو نہیں ہونا چاہیے۔”

“دو منٹ ہیں تمہارے پاس، جلدی سے پھوٹ دو۔” اس نے ہاتھ سے وی بناتے ہوئے کہا۔ “دو منٹ بعد تم درخواست پیش کرنے کا حق بھی کھو چکے ہوگے۔”

“ہیں...... کام...... نہیں کام تو کوئی ایسا خاص نہیں تھا۔” عثمان نے سر کھجایا۔ “ویسے...... وہ اصل میں بجو! آپ کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔”

“مجھے معلوم ہے، کام کی بات کرو۔”

“بہت ذائقہ ہے آپ کے ہاتھ میں۔”

“ایک منٹ بیس سیکنڈ۔” مہرین نے شہادت کی انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ نظریں گھڑی پر جما رکھی تھیں۔

“بجو! ایمان سے آپ جیسی بریانی تو پورے

پاکستان میں کوئی نہیں بنا سکتا۔“

”اوں ہوں...... کچھ زیادہ ہی لمبی چھوڑ دی ہے۔“ تزئین نے دونوں کی گفتگو میں دخل اندازی کی۔

”اوکے، تمہیں واقعی کوئی کام نہیں ہے۔“ مہرین نے ہاتھ جھاڑے۔

”بجو! یہ زیادتی ہے، ابھی پچاس سیکنڈ باقی ہیں۔“

”پینتالیس سیکنڈ۔“ مہرین کی نظریں دوبارہ گھڑی کا طواف کرنے لگیں۔

”اوکے، اوکے بتاتا ہوں۔“ عثمان نے ہاتھ اٹھادیے۔ مزید وقت ضائع کرنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔

”آفس میں ٹریٹ دینی ہے پروموشن کی خوشی میں۔ بیس لوگوں کا کھانا تیار کرنا ہے آپ کو۔“ عثمان نے آخر بلی تھیلے سے نکال ہی دی اور کن اکھیوں سے بہن کے تاثرات کا جائزہ لیا جو ہرگز بھی حوصلہ افزا نہیں تھے۔ ساتھ ہی دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر زور سے سر دائیں بائیں ہلانا شروع کردیا۔

”نہیں بجو نہیں...... انکار نہیں سنوں گا میں۔ خدارا بجو...... انکار نہ کیجیے گا۔ آپ کو آپ کے ہونے والے بھتیجے بھتیجیوں کا واسطہ۔“

”عثمان بند کردو یہ ڈرامے، ریسٹورنٹ میں ٹریٹ دو اپنے اسٹاف کو۔ میں ہرگز بیس لوگوں کے لیے کھانا نہیں بنا رہی۔“

”یہ آپ کا حتمی فیصلہ ہے؟“ آنکھیں سکیڑ کے بہن کو دیکھا۔

”جی۔“ مہرین نے سکون سے جواب دیا۔

”میں آپ کو ایک منٹ دے رہا ہوں، نظر ثانی کرلیجیے۔“ عثمان نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔ اب کے مہرین نے جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

”تیس سیکنڈ رہ گئے ہیں، کرلیں نا نظر ثانی۔“ آواز میں حد درجہ لجاجت سمو لی۔

”عثمان! تم میرا اور اپنا قیمتی وقت ضائع کررہے ہو۔“

”کیوں، تم دونوں نے اس قیمتی وقت میں مکان تعمیر کرنا تھا۔“ تزئین نے شگوفہ چھوڑا، وہ خود کو تھوڑا الگ تھلگ محسوس کررہی تھی۔

دونوں ہی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”میں آپ سے آخری بار پوچھ رہا ہوں، آپ کھانا بنا کردیں گی یا نہیں۔“

”نہیں۔“ مہرین نے قطعیت سے کہتے ہوئے بات ختم کی۔

”ٹھیک ہے پھر۔“

اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ سمجھتیں، عثمان تیر کی سی تیزی سے کمرے کے کونے میں جاکر سر نیچے، ٹانگیں اوپر کرکے کھڑا ہوگیا۔

”جب تک آپ ہامی نہیں بھریں گی، میں یہیں الٹا کھڑا رہوں گا۔“

”اُف میرے اللہ، عثمان! کتنے بڑے کارٹون ہو تم۔“ تزئین کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

”آپی! آپ بجائے بجو کو منانے کے، انہیں راضی کرنے کے میری بے بسی پر ہنس رہی ہیں۔“

”آپی! آپ مزید شہہ دیں اس کو، اس کی حرکتیں انجوائے کرکے۔ مسخرہ کہیں کا۔“ مہرین نے بہ آواز بلند اپنے نیک خیالات سامعین تک پہنچائے۔

”کتنی ظالم ہیں بجو آپ! ذرا ترس نہیں آرہا، آپ کو مجھ معصوم پر۔“ عثمان نے دہائی دی۔

”ایسے ہی کھڑے رہو تم، ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے ہو، اچھا خاصا کماتے ہو پھر بھی خرچ کرتے جان جاتی ہے۔ مر نہیں جاؤ گے ایک ماہ کی سیلری ٹریٹ پر خرچ کردو گے تو۔“

”اتنا کماتا نہیں ہوں جتنے خرچ کرنے پڑجاتے ہیں۔ آدھی سے زیادہ تنخواہ تو سرکاری خزانے میں چلی جاتی ہے (امی)۔ باقی میں سے پیٹرول کا خرچا، روز کا چائے پانی، ہائے!! نہیں کھڑا ہوا جارہا بجو! پیاری بہن۔“ کوئی دہائی اثر انداز ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔

BOOKSPK

”ابھی تو شاہ نور کی برتھ ڈے آرہی ہے اس کے لیے گفٹ لینا ہے پھر آپ دونوں کو سوٹ گفٹ کرنے ہیں، پروموشن کی خوشی میں۔ اب اتنے اخراجات کے بعد پیسے کہاں بچتے ہیں؟“ اس جملے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

”اچھا تو ہمارے سوٹ بھی پلان میں شامل ہیں۔“ تزئین کے کان کھڑے ہوئے۔ مہرین کے تاثرات میں بھی کچھ لچک پیدا ہوئی۔

”چلو، اٹھو، کیا یاد کرو گے تم بھی۔ کھانا تمہیں میں بنادوں گی۔“ یہ آفر تزئین کی طرف سے آئی تھی۔

”اُف......“ عثمان جلدی سے سیدھا ہوا۔

”میرا دماغ پلپلا ہوگیا۔“ سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولا۔

”یہ پہلے سے ہی پلپلا تھا۔“ مہرین نے جملہ اچھالا۔

”اچھا چلو بتاؤ، بنانا کیا ہے‘ آج ہی بناؤں گی۔ کل بازار جانا ہے مجھے، پرسوں احمر واپس آجائیں گے تو گھر جاؤں گی۔“

”چکن بریانی ود سلاد اینڈ رائتہ۔“ عثمان نے مینیو بتایا۔

”اوکے، میں کھانا بناؤں گی اور تم اتنی دیر شاہ نور کو سنبھالو گے، ڈن ہوگیا۔“ تزئین نے فوراً منصوبہ بندی کی۔

”آں، آں...... آپ کھانا بنائیے گا، شاہ نور کو بجو سنبھالیں گی۔“

”اور تم کیا کرو گے؟“ مہرین نے آنکھیں دکھائیں۔

”یار جن لوگوں کو ٹریٹ دینی ہے ان سب کو فون کرکے شام کو اکٹھا ہونے کا کہنا ہے۔“

”اور یہ اتنی پبلک کہاں آئے گی؟“ سوال مہرین کی طرف سے آیا تھا۔

”ہمارے تین چار دوستوں نے مل کر ایک فلیٹ کرائے پر لیا ہوا ہے، وہیں اکٹھے ہوں گے سب۔“

”چلو، کھانا وانا تو ہم مل کر کرلیں گے، تم یہ بتاؤ سوٹ دلانے کب لے کر جاؤ گے۔“

”جب آپ کہیں۔“ عثمان نے فوراً رضا مندی ظاہر کی۔

”ٹھیک پھر کل چلیں گے، کیوں مہرین!“ مہرین نے سر ہلایا۔

”بھئی کہاں جارہے ہو تم لوگ؟“ فرحانہ اندر داخل ہوئیں۔

”بازار جائیں گے کل، آپ بھی چلیں۔“ عثمان بولا۔

”نہیں بھئی، میں نہیں جارہی۔“

”اچھا امی! آپ کو کچھ منگوانا ہے تو بتائیں، میں بازار جارہا ہوں۔ آپی آپ سامان لکھ دیں جو لے کر آنا ہے۔“ عثمان کہہ کر کھڑا ہوا۔

☆❁☆

شاہ نور کو فرحانہ بیگم کے حوالے کرکے تزئین، مہرین اور عثمان بازار آئے تھے۔

”آپی! بجو‘ آپ لوگ سوٹ پسند کریں۔ میں ذرا سامنے سے یہ ڈاکومنٹس فوٹو کاپی کروا کر لاتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ سے سڑک پار دوسری جانب اشارہ کیا۔ ساتھ ہی ہزار، ہزار کے چند نوٹ تزئین کے ہاتھ میں تھمائے۔ اس سے پیشتر کہ دونوں دکان میں داخل ہوتیں، ایک خواجہ سرا نے ان کا راستہ روکا۔

”اے باجی! پری کی دعائیں لیتی جا، اللہ تجھے چاند سا دولہا دے۔“ اس کی مخاطب تزئین تھی اور نظریں تزئین کے ہاتھ میں دبے ہزار ہزار کے نوٹوں پر تھیں۔

”ارے بھئی چاند سا دولہا مل گیا تو پہلے والے کا کیا کروں گی؟“ تزئین کا قطعی کوئی موڈ نہیں تھا اس کو کچھ دینے کا۔

‘‘اے باجی!’’ پری اس کے راستے میں آئی۔

‘‘اللہ سر کا سائیں سلامت رکھے، اللہ بیٹوں کے بیٹے گودوں میں کھلانے کا موقع دے۔’’ پری اس کی جاں بخشی پر آمادہ نظر نہیں آرہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ دونوں دکان میں قدم رکھتیں، مہرین نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

‘‘خالی ہاتھ تو نہ لوٹاؤ بے چاری کو۔’’

تزئین نے منہ بنا کر بہن کو دیکھا پھر رک کر پرس کھولا۔ پری کی آنکھیں چمکنے لگیں، تزئین نے پرس کھول کر پہلے تسلی سے ہزار ہزار کے نوٹ ہاتھ سے پرس میں منتقل کیے، پھر پرس کھنگالنا شروع کیا۔ تلاشی کا عمل طویل ہوتا گیا، پری اشتیاق اور مہرین بے زاری سے اس عمل کو دیکھ رہی تھی۔ کافی دیر بعد آخرکار تزئین نے پرس سے ہاتھ باہر نکالا اور پانچ کا ایک سکہ پری کے ہاتھ پر رکھا۔

‘‘اف میرے اللہ۔’’ مہرین نے بے یقینی سے بہن کو دیکھا (پانچ روپے کا سکہ)۔

‘‘ہاہ، ہائے باجی! اتنا چھوٹا دل، پاس رکھو اس کو۔ کام آئے گا برے وقت میں۔’’ پری پیر پٹختی، سکہ واپس کر کے چلتی بنی۔

‘‘کچھ تو شرم کریں آپی! اتنی دیر لگا کر یہ سکہ نکال کر دیا آپ نے۔ اس سے بہتر تھا خالی ہاتھ ہی لوٹا دیتیں۔’’

‘‘ارے بھئی ڈھونڈ رہی تھی کوئی چھوٹا نوٹ مل جائے، نہیں ملا تو کیا کرتی۔ اب ہزار روپے تو نہیں پکڑا سکتی تھی نا۔’’ تزئین نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

مہرین نے جواباً کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

سوٹ پسند کرنے اور خریدنے میں زیادہ وقت نہیں لگا، باہر آکر دونوں عثمان کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھیں، جب تزئین کو ایک گارمنٹ شاپ پر شاہ نور کے سائز کے بڑے خوب صورت کپڑے نظر آئے۔

‘‘مہرین آؤ، شاہ نور کے لیے شاپنگ کرتے ہیں۔’’ تزئین، مہرین کا ہاتھ پکڑے اس جانب لپکی۔

مہرین کو چھوٹے بچوں کی شاپنگ کا نہ تجربہ تھا نہ دلچسپی، سو بے زاری سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی تب ہی اسے عثمان باہر ایک شاپ پر شرٹس پسند کرتا نظر آیا۔ مہرین اور تزئین کی طرف اس کی پشت تھی، فاصلہ بھی کافی تھا درمیان میں۔

‘‘آپی! وہ دیکھیں، عثمان۔’’ اس نے تزئین کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ تزئین کی ساری توجہ شاہ نور کی شاپنگ کی طرف تھی سو بے دھیانی سے اس کی بات سنی۔

‘‘اچھا، ایسا کرو مہرین! تم عثمان کے پاس جاؤ۔ میں تھوڑی دیر تک آتی ہوں، کہیں دوبارہ نہ آگے پیچھے ہو جائے یہ لڑکا۔’’ اس نے ایک کے بعد ایک سوٹ دیکھتے ہوئے مہرین سے کہا۔

مہرین سر ہلاتے ہوئے دکان سے باہر آئی اور عثمان کی طرف لپکی، مبادا وہ پھر سے نہ کھو جائے۔ وہ ایک کارنر پر اسٹینڈ پر لگی شرٹس نکال نکال کر دیکھ رہا تھا۔

‘‘ہوں...... تو جناب ہمیں کہہ رہے تھے فوٹو کاپی کا اور ادھر شاپنگ کر رہے ہیں۔ بچو، اب تو چاٹ کھلاؤ گے۔’’ مہرین دل ہی دل میں خود سے مخاطب ہوتی عثمان کے سر پر جا پہنچی۔ عثمان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کو اپنی طرف گھمایا۔

‘‘کیا ہو رہا ہے یہ......؟’’ اس اچانک افتاد پر عثمان بوکھلا کر مڑا۔

اس کے مڑتے ہی مہرین کو کرنٹ لگا۔ وہ اچھل کر دو فٹ دور ہوئی۔ وہ عثمان نہیں تھا۔

‘‘اس بے تکلفی کی وجہ جان سکتا ہوں محترمہ؟’’

وہ جو عثمان نہیں تھا، پوری طرح گھوم کر اس کے مقابل آیا، اب کمر پر ہاتھ ٹکائے اس سے پوچھ رہا تھا۔

مہرین خفت سے سرخ پڑ گئی۔

‘‘مجھے لگا آپ میرے بھائی ہیں۔’’ عجیب بے ربط سا جملہ زبان سے پھسلا۔

پہلی مرتبہ کسی لڑکی نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہاج خاصا اچھا محسوس کر رہا تھا (اونہہ، بھائی، کڑوا بادام سا آ گیا منہ میں)۔

‘‘کیوں، آپ کو کیوں لگا کہ میں آپ کا بھائی ہوں۔ کیا آپ کا بھائی بچپن میں کسی میلے میں گم ہو گیا تھا؟’’ وہاج نے خاصی دلچسپی سے گورے رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا۔ چہرے کا رنگ دھوپ کی تمازت سے گلابی پڑ رہا تھا یا شرمندگی سے، وہ صحیح اندازہ نہ کر سکا۔

‘‘دیکھیے، میں معذرت چاہتی ہوں۔’’ مہرین نے کھسکنا چاہا۔ (اگر اس وقت یہاں عثمان یا آپی پہنچ گئے تو کیسی عجیب صورت حال ہو گی۔ وہ کیا وضاحت دے گی، یہاں ایک اجنبی کے ساتھ باتیں کرنے کی، سوچ کر ہی مہرین کے پسینے چھوٹ گئے)۔

‘‘اور اگر میں نہ قبول کروں، آپ کی معذرت۔’’ (اتنی حسین ملاقات، اتنی مختصر تو نہیں ہونی چاہیے)۔

‘‘دیکھیے مسٹر!’’ مہرین نے حواس قابو میں رکھ کر اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔

‘‘وہاج...... وہاج تیمور کہتے ہیں مجھے۔’’ اس نے جھٹ سے اپنا تعارف کرایا۔

‘‘جی وہاج صاحب! مجھے سخت افسوس ہے کہ اپنے بھائی کے دھوکے میں، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ اس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔’’ مہرین نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا اور قدم واپسی کے لیے بڑھائے۔

‘‘سنیے مس......’’ دانستہ ذرا توقف کیا۔

(امید تھی اب حسینہ ایک ادا سے مڑ کر اپنا تعارف کروائے گی) پر اس کا انتظار، انتظار ہی رہا۔ مہرین دو چار قدم مزید آگے بڑھی۔ وہ بھی بڑھ کر اس کے برابر ہوا۔

‘‘آپ کا یہ جرم ناقابل معافی ہے، مجھے بھائی سمجھنے والا۔’’ ساتھ ہی مسکراہٹ اچھالی۔ (اب اس کی بعد تو سیل نمبرز کا تبادلہ بنتا ہے)۔

مہرین گھبراہٹ میں تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی (اُف اللہ یہ کیا مصیبت پیچھے لگا لی میں نے)۔

‘‘دیکھیے، سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔’’ وہاج نے اس کے سنگ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

‘‘کیسا معاملہ؟’’ مہرین لحظہ بھر کو ٹھٹکی۔

‘‘یہ ہی کہ آپ نے مجھے دیکھا، میں آپ کو پسند آ گیا اور آپ نے بہانہ بنا کر مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔’’ وہاج نے فٹافٹ ساری گتھی سلجھا لی۔

‘‘کیا......؟’’ مہرین اتنی زور سے چیخی کہ آس پاس چلتے لوگوں نے مڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔ مہرین کو فوراً اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

‘‘اصل میں قصور آپ کا بھی نہیں ہے، میری پرسنالٹی ہی کچھ ایسی ہے......’’ بات ابھی آدھی ادھوری اس کے منہ میں ہی تھی کہ مہرین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

‘‘ہوش میں تو ہیں آپ، شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں۔’’ آواز اب کے ذرا دھیمی رکھی۔ ‘‘ایک ذرا سی غلط فہمی کیا ہو گئی آپ تو سر پر چڑھے چلے جا رہے ہیں۔ جائیے، اپنا راستہ ناپیے اور اب اگر آپ نے میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گی۔’’ اس نے انگلی اٹھا کر دھمکایا۔ یہ سب کہنے کے بعد وہ رکی نہیں، تیز تیز قدم اٹھاتی ناک کی سیدھ میں آگے بڑھتی گئی۔

وہاج افسوس کے عالم میں گھرا کھڑا کا کھڑا رہ گیا (سیل نمبر تو لے جاتی، بعد میں بات کر لیتے)۔

‘‘بجو، بجو...... کیا ہو گیا ہے؟ کہاں بھاگی جا رہی ہیں؟’’ عثمان تیزی سے اس کی طرف آیا۔ مہرین نے رک کر اسے دیکھا۔

‘‘کہاں چلے گئے تھے تم، کتنی دیر انتظار کیا، کچھ احساس ہے تمہیں۔’’ مہرین نے اس پر غصہ نکالا۔

(اسی کی وجہ سے تو وہ لفنگا پیچھے لگا تھا)۔

’’کیا ہو گیا ہے؟ غصہ کیوں کر رہی ہیں۔ بتایا تو تھا فوٹو کاپی کروانے جا رہا ہوں۔‘‘ اس نے ہاتھ سے کاغذوں کے پلندے کی جانب اشارہ کیا۔

’’آپی اور میں، آپ کو آواز دے رہے تھے، آپ نے سنی ہی نہیں۔ ایسے بھاگی جا رہی تھیں جیسے کوئی پیچھے لگا ہوا ہو۔‘‘

اب کے مہرین نے غور سے آگے پیچھے دیکھا، وہ اس جگہ سے کافی آگے آ چکی تھی جہاں ان کو عثمان کا انتظار کرنا تھا۔ گھبراہٹ میں تیز تیز چلتے ہوئے اس کو احساس ہی نہیں ہوا کہ عثمان اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

’’کیا ہوا بجو......؟‘‘

’’کچھ نہیں، چلو۔‘‘ وہ دونوں تزئین کے پاس جانے کو مڑے۔

☆❁☆

تیمور صاحب انتہائی انہماک سے خبریں سننے میں مصروف تھے جب وہاج انتہائی ڈرامائی انداز میں ان کے قریب آیا۔

’’بابا! پتا ہے آج ایک لڑکی مجھ پر فدا ہو گئی۔‘‘

’’ہیں...... کیا ہو گئی؟‘‘ تیمور صاحب کو لگا انہیں سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔

’’بھئی فدا ہو گئی‘ مطلب مر مٹی۔‘‘ وہاج نے کہتے ہوئے فخریہ انداز میں گردن اکڑائی۔

’’اس کی آنکھوں میں یقیناً کچھ مسئلہ ہو گا۔‘‘ تیمور صاحب نے مشکوک نظروں سے وہاج کو دیکھتے ہوئے پیشن گوئی کی۔

’’ام کو پورا یقین ہے‘ باجی کا دماغ میں بھی کچھ نہ کچھ مسئلہ ہو گا۔‘‘ جگو ہر بات میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

’’تُو تو اپنی شکل گم کر لے۔‘‘ وہاج نے ہاتھ سے دفع دور کا اشارہ کیا۔ جگو عقل مند تھا سو اس کے لیے یہ اشارہ کافی ثابت ہوا، فٹ سے کچن میں غائب ہوا۔

’’میں مال میں شاپنگ کر رہا تھا، غالباً وہ بھی ونڈو شاپنگ کے لیے آئی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ میں کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ جوں ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، پلٹنا بھول گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کے بعد جوں ہی حواسوں میں واپس آئی، میرا کندھا تھام لیا۔ یقیناً وہ چاہ رہی تھی‘ میں اس کا ہاتھ تمام عمر کے لیے تھام لوں۔‘‘

’’تو تھام لیتے۔‘‘ تیمور صاحب ٹی وی بند کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

’’جی نہیں، میں ایک شریف اور مشرقی لڑکا ہوں، خاندانی بھی ہوں اور میری تربیت آپ جیسے عظیم انسان کے ہاتھوں ہوئی ہے لہٰذا میں نے وہ ہی کیا جو میری تربیت کا تقاضا تھا۔‘‘

تیمور صاحب ابھی تک مشکوک نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔

’’میں نے وہی کیا جو ایسے موقع پر ایک خاندانی نوجوان کو کرنا چاہیے۔‘‘

’’ایک منٹ، ایک منٹ......‘‘ تیمور صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ ’’اس جملے سے ’نو‘ نکال دو۔‘‘

’’جی بہتر۔ میں نے وہ ہی کیا جو ایک خاندانی جوان کو کرنا چاہیے۔‘‘

’’اگر برا محسوس نہ کرو تو جوان کو انسان سے بدل دو، جملہ مزید مناسب ہو جائے گا۔‘‘

’’آپ اگلے واقعات سننا چاہتے ہیں یا نہیں؟‘‘ وہاج سخت بے مزا ہوا۔

’’تصحیح کے بغیر تو ہرگز نہیں۔‘‘

’’اوکے۔‘‘ وہاج نے ہاتھ گرائے۔

’’میں نے وہ ہی کیا جو ایک خاندانی انسان کو کرنا چاہیے۔‘‘ تیمور صاحب نے سر ہلایا۔

’’میں نے اس لڑکی کا ہاتھ جھٹکا، اس کو معاشرتی و اخلاقی اقدار پر مفصل لیکچر دیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے سیل نمبر مانگتی یا مجھے اپنا نمبر دینے کی کوشش کرتی، میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سی سر جھکائے واپس چلی گئی۔‘‘ بات مکمل کر کے وہاج نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے باپ کو منتظر نظروں سے دیکھا یوں جیسے مقرر بہترین تقریر کرنے کے بعد داد و تحسین کا طلب گار ہوتا ہے۔

’’تالیاں بجاؤں یا تھپکی چاہیے۔‘‘

’’جو آپ کی مرضی۔‘‘

’’اس سے پہلے سوال و جواب کا سیشن ہو جائے۔‘‘

’’ضرور۔‘‘ وہاج نے سر کو تھوڑا سا خم کرتے ہوئے کہا۔

’’اوکے۔‘‘ تیمور صاحب نے ذہن میں سوال نامہ ترتیب دیا۔ ’’اس قصے میں مبالغہ آرائی کتنے فی صد ہے؟‘‘

’’اسّی فیصد۔‘‘ وہاج برا مانے بغیر بولا۔

’’آہم......ممم......‘‘

’’جھوٹ؟‘‘ نظریں وہاج کے چہرے کا ایکسرے کر رہی تھیں۔

’’پندرہ فی صد۔‘‘ بغیر کسی شرمندگی کے جواب دیا۔

’’اور سچ؟‘‘

’’پانچ فی صد۔‘‘ وہاج نے ٹیک لگائی۔

’’ہوں......ں۔‘‘ تیمور صاحب نے ہنکارا بھرا۔ ’’یعنی کہ واقعہ محض اتنا ہے کہ تم مال میں شاپنگ کر رہے تھے اور ایک لڑکی تمہارے پاس سے گزر گئی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس نے تمہیں دیکھا ہو گا بالکل ویسے ہی جیسے وہ مال میں موجود باقی چیزیں دیکھ رہی ہو گی۔‘‘ تیمور صاحب نے خود ہی معمہ حل کر لیا۔

’’جی نہیں، یہ محض دو فیصد ہے، باقی کا تین فیصد سچ یہ ہے کہ اسے مجھ پر اپنے بھائی کا گمان ہوا اور اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے مخاطب کرنے کی کوشش بھی کی۔‘‘ زندگی میں اتنی سی رنگینی نے بھی وہاج کا موڈ خاصا خوش گوار کر دیا تھا۔

’’سوری بیٹا! اس کارکردگی پر نہ تالیاں نہ تھپکی۔‘‘

’’نو پرابلم۔‘‘

’’یار وہاج!‘‘

’’جی۔‘‘

’’میں تو ہوں ہی سست اور تھوڑا آرام طلب، تم خود ہی کوشش کر کے کسی لڑکی سے علیک سلیک کر لو اور مجھے اس کے گھر کا راستہ دکھا دو، باقی کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔‘‘

’’واہ بھئی واہ، بڑا آسان کام میرے ذمے لگا رہے ہیں آپ، ابھی تو بتایا ہے میں ایک شریف اور مشرقی لڑکا ہوں۔‘‘

’’آں، ہاں......انسان۔‘‘ تیمور صاحب نے ٹوکا۔

’’ہاں ہاں وہی، میں ایک شریف اور مشرقی انسان ہوں اس لیے یہ لڑکیوں، وڑکیوں کے چکر...... نہ بابا نہ...... میرے بس کی بات نہیں ہے یہ۔‘‘

’’تو پھر یہ معاملہ اپنے منطقی انجام تک کیسے پہنچے گا، مجھے کوئی حل تو بتاؤ۔ تمہاری پھپھو تو اگلے تیس سال بھی ایسے ہی ٹرخاتی رہیں گی جیسے پچھلے تین سال سے کرتی آ رہی ہیں۔‘‘ تیمور صاحب بے چارگی سے بولے۔

’’یہ جو اتنے میرج بیوروز کھلے ہوئے ہیں ہمارے ملک میں، یہ آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ آپ ٹرائی تو کر کے دیکھیں۔‘‘ وہاج نے کئی بار کا دیا ہوا مشورہ ایک بار پھر دیا اور اس کا حسب توقع جواب سننے کے لیے خود کو تیار کیا۔

’’یار! یہ سب فراڈ ہوتا ہے، پیسے لوٹ لوٹ کر بندے کو کنگال کر دیتے ہیں، آخر میں فائدہ بھی کوئی نہیں ہوتا۔‘‘

’’یہ ہی سب کچھ آپ کی بہن محترمہ بھی کر رہی ہیں، ان کے ہاتھوں تو خوشی خوشی لٹتے رہتے ہیں آپ، اس بارے میں کیا کہیں گے۔‘‘

اب کے تیمور صاحب سر پر ہاتھ پھیر کے رہ گئے، زبردستی تھوڑی سی بے چارگی بھی طاری کرلی چہرے پر۔

‘‘ویسے میرے پاس ایک اور حل بھی ہے اس مسئلے کا۔’’ وہاج کی آنکھیں شرارت سے چمکیں۔

تیمور صاحب ہمہ تن گوش ہوئے۔

‘‘جی؟’’

‘‘میں کوئی بیوہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر آپ کی شادی کروادیتا ہوں، بس پھر میری شادی کا معاملہ میری نئی نویلی اماں سنبھال لیں گی۔’’

‘‘بلکہ ایسا کرو، بیوہ کوئی ایسی ڈھونڈنا جس کی جوان بیٹی بھی ہو، ماں سے تم میری شادی کروادو۔ بیٹی سے میں تمہاری شادی کروادوں گا۔’’

بیل کی آواز پران دونوں کا مکالمہ ادھورا ہی رہ گیا۔ چند سیکنڈ بعد جگو نے آکر اطلاع دی۔

‘‘صاحب! پھوپھی اماں آئی ہے۔’’

‘‘گیٹ کھولو جاکر۔’’ انہوں نے اشارہ کیا۔

‘‘لگتا ہے پیسے ختم ہوگئے ہیں پچھلی بار والے، آپ ذرا اپنی جیب ڈھیلی کرلیجیے۔’’

‘‘وہاج! بری بات۔’’ انہوں نے تنبیہہ کی۔

‘‘کبھی کوئی نصیحت اپنی بہن کو بھی کرلیا کیجیے۔’’ وہاج نے برا سا منہ بنایا۔

‘‘السلام علیکم پھپھو!’’ وہاج نے اندر آتی پھپھو کو بہ آواز بلند سلام کیا۔

‘‘وعلیکم السلام! جیتا رہ میرا بچہ۔’’ پھپھو نے دعا دی، ساتھ ہی بھائی کا حال احوال دریافت کیا۔ پھر مطلب کی بات پر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

‘‘بھئی ایک بڑی اچھی لڑکی بتائی ہے ثمرہ نے، وہ ہی لڑکی دیکھنے سرگودھا جانا ہے۔’’

‘‘سرگودھا والی کو تو چھوڑو، تم پچھلے ہفتے جس لڑکی کا تذکرہ کررہی تھیں اس کا بتاؤ۔’’ تیمور صاحب بھی اس ڈرامے سے بے زار ہوچکے تھے۔

‘‘ارے، وہاں نہیں بنی بات، اب تو یہاں سرگودھا میں اپنے بچے کی بات پکی کرکے ہی واپس آؤں گی، بس دو دن میں نکل رہی ہوں تیری خاطر۔’’ روئے سخن وہاج کی جانب کیا۔

تب ہی جگو نے مداخلت اپنا فرض سمجھا۔

‘‘مبارک ہو پھوپھی اماں۔’’

‘‘ہاں ہاں، اللہ مبارک کرے۔ اس بار تو بات بن ہی جائے گی۔’’

‘‘نہیں پھوپھی اماں! ام آپ کو مبارک ایک بار پھر نانی بننے کے واسطے دے رہا ہے۔ آپ جب بھی چھوٹا صاب کا واسطے لڑکی دیکھنے سرگودھا جاتا ہے، واپسی میں اپنا بیٹی کا بچہ، بچی کی خوش خبر لے کر آتا ہے۔ ام آپ کو اس کی مبارک باد دے رہا ہے۔’’

(وہاج کا دل چاہا، اٹھ کر جگو کا منہ چوم لے۔ وہ بات جو وہ محض سوچ کر رہ جاتا تھا، جگو نے کرڈالی تھی)۔

(زہرہ خاتون کو زور کا اچھو لگا۔ دل ہی دل میں ہزار صلواتیں سناڈالیں، اتنے درست اندازے پر)۔

تیمور صاحب نے جگو کو چائے بنانے کا کہا، دوسرے الفاظ میں شکل گم کرنے کا کہہ دیا۔

جگو عازم سفر ہوا تو زہرہ خاتون بولیں۔

‘‘بھائی جان! اس کم بخت جگو کو تو فارغ ہی کردیں، خواہ مخواہ ہی اس نامراد کو ہزاروں روپے بھرتے ہیں۔’’ (زہرہ خاتون کو جگو کی تنخواہ کی مد میں دیے جانے والے پیسے ہمیشہ ہی کھٹکتے تھے)۔

‘‘پھپھو! جگو کو فارغ کردیا تو ہمارے گھر کا نظام کیسے چلے گا؟’’ وہاج دور کی کوڑی لایا۔

‘‘ارے بیٹا کسی کے آنے جانے سے دنیا کا نظام نہیں رکتا۔ سچ کہتی ہوں بھائی جان، اس کو نکال باہر کریں، میں دو ماہ کے اندر اپنے بچے کی شادی کروادوں گی۔ ایسی سگھڑ لڑکی لاؤں گی کہ زمانہ مثالیں دے گا۔’’ اب کے اچھو لگنے کی باری وہاج کی تھی۔

‘‘پھپھو آپ بسم اللہ کریں، ادھر میری دلہن

اس گھر میں داخل ہوگی اُدھر اس کو باہر کا راستہ دکھا دوں گا۔’’

جگو کے کان ان ہی کی گفتگو کی طرف لگے ہوئے تھے، اسے وہاج سے اس بے مروتی کی توقع نہیں تھی۔

‘‘چھوٹے صاب! اگر امارا جانا تمارا شادی کے ساتھ مشروط ہے پھر تو امارا نوکری چھوڑ پنشن بھی آپ کا گھر پکا ہے۔’’

‘‘تجھے تو بچو، کل ہی فارغ کرتا ہوں۔’’ وہاج نے جوابی حملہ کیا۔

‘‘ہاں تو بھائی جان! میں آپ کو سرگودھا والی لڑکی کے بارے میں بتارہی تھی۔ ثمرہ بتارہی تھی لڑکی بہت اچھی ہے۔’’ انہوں نے ایک مرتبہ پھر لڑکی نامہ شروع کیا۔

اچانک ہی وہاج کو کچھ یاد آیا، وہ تیر کی سی تیزی سے اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا۔ ادھر زہرہ خاتون کی بات ابھی درمیان ہی میں تھی کہ وہاج کی ایک صدماتی چیخ بلند ہوئی۔

‘‘بابا...... آپ اپنی نئی قمیص پر استری رکھ کر بھول گئے ہیں۔’’

تیمور صاحب بھاگم بھاگ کمرے میں پہنچے، استری ایک سائیڈ پر دھری تھی۔ کسی نئی، پرانی قمیص کا کوئی نام ونشان نہیں تھا، وہاج استری اسٹینڈ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

‘‘کیا جل گیا؟’’ انہوں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہاج سے پوچھا۔

‘‘میرا دل جل رہا ہے۔’’

‘‘کیا بدتمیزی ہے وہاج! یہ کون سا وقت ہے مسخری کرنے کا۔’’

‘‘آپ اس بار پھپھو کو ایک روپیہ بھی نہیں دیں گے۔’’

‘‘یار، ہمیں کمی ہے کسی چیز کی؟’’ آواز دانستہ دھیمی رکھی۔

‘‘اللہ کا شکر ہے ہمیں کوئی کمی نہیں اگر آپ ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں، ضرور کریں، بہن ہیں آپ کی۔ مگر اب رشتے کے نام پر ہم مزید بے وقوف نہیں بنیں گے۔’’ وہاج نے بے لچک انداز میں اپنا موقف واضح کیا۔

تیمور صاحب اس کو دیکھ کر رہ گئے۔ دونوں باپ بیٹا باری باری واپس آکر بیٹھ گئے۔

‘‘کیا زیادہ نقصان ہوگیا؟’’ زہرہ خاتون بھائی کو دیکھتے ہوئے فکرمندی سے بولیں۔

‘‘نہیں، شکر ہے بچت ہوگئی۔’’ جواب وہاج کی طرف سے آیا۔

‘‘چلو شکر ہے۔’’

‘‘بھائی جان! میں آپ کو سرگودھا والی لڑکی کا بتارہی تھی۔’’ کتنی بار بات شروع کرچکی تھیں، پر مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

‘‘بھئی زہرہ! ایسا ہے کہ تم ثمرہ کو منع کردو۔’’

‘‘منع کردوں؟’’ وہ تو حیران ہی رہ گئیں۔

‘‘مگر کیوں؟’’

تیمور صاحب کو کوئی مناسب بہانہ سوجھ نہیں رہا تھا۔ تو وہاج نے بروقت محاذ سنبھالا۔

‘‘اصل میں پھپھو، ہمارا پلان چینج ہوگیا ہے۔’’

‘‘ہیں...... کیا ہوگیا ہے؟’’ انہوں نے کچھ نا سمجھی سے وہاج کو دیکھا۔

‘‘بات دراصل یہ ہے پھپھو۔’’ اس نے انگلی سے سر کھجایا۔ ‘‘ہم نے فیصلہ کیا ہے۔’’ انگلی سے پہلے اپنی پھر تیمور صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ ‘‘کہ پہلے ہم بابا کی شادی کریں گے اس کے بعد یہ نیا نویلا جوڑا میری شادی کے لیے بھاگ دوڑ کرے گا۔’’

زہرہ خاتون کے سر پر کوئی دھماکا ہوا تھا۔

‘‘یہ...... یہ کیا کہہ رہا ہے بھائی جان۔’’ وہ بھائی سے مخاطب ہوئیں۔ تیمور صاحب نے بڑی مشکل سے خود کو سنجیدہ رکھا۔

‘‘پھپھو! آپ کے بھائی شرما رہے ہیں، آخر کو ان کی شادی کا معاملہ ڈسکس ہورہا ہے۔ آپ مجھ سے بات کریں نا اور مزے کی بات بتاؤں، ہم نے

بابا کے لیے دلہن بھی ڈھونڈ لی ہے۔ بابا کے آفس کی ہی نہایت خوب صورت اور فیشن ایبل بیوہ ہیں۔''

(یااللہ اس کو معاف کردینا) تیمور صاحب نے دل ہی دل میں دعا کی۔ وہاج کے سفید جھوٹ ہضم نہیں ہو رہے تھے انہیں اور ہضم تو یہ بات زہرہ خاتون کو بھی نہیں ہو رہی تھی۔

''یہ کیسی باتیں کر رہا ہے بھائی جان!'' زہرہ خاتون بالکل ہی ڈھے گئیں۔

''بھئی یہ تمہارا اور تمہارے بھتیجے کا آپس کا معاملہ ہے، آپس میں ہی ڈسکس کرو۔'' تیمور صاحب نے سوچ سمجھ کر جملے کا انتخاب کیا۔

''پھپھو! میں نے بتایا تو ہے آپ کو، بابا شرما رہے ہیں، انہوں نے سارا معاملہ میرے سپرد کر دیا ہے۔''

''لیکن اس عمر میں...... لوگ کیا کہیں گے۔'' ان کی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''لوگوں کو چھوڑیں پھپھو! لوگ تو پتا نہیں کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔ اب یہ ہی دیکھ لیں' لوگ آپ کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔'' زہرہ خاتون نے حیرت سے وہاج کو دیکھا۔

''میرے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں؟''

''یہ ہی کہ آپ جان بوجھ کر میرا رشتہ نہیں کروا رہیں بلکہ آپ تو کبھی کوئی رشتہ دیکھنے گئی ہی نہیں ہیں۔'' وہاج نے دل میں آنے والے خیالات کو لوگوں کی باتیں کہہ کر زبان دی۔

اور پھر وہاج جو بولنا شروع ہوا تو زہرہ خاتون کو بھاگتے ہی بنی۔ کہاں تو وہ اس بار بھی سرگودھا کا سارا خرچ بھائی کے سر ڈالنا چاہتی تھیں (ثمرہ پورے دنوں سے تھی۔ انہیں آج کل میں ہی اس کے پاس جانا تھا) اور کہاں یہ ہوا کہ ٹیکسی کا کرایہ تک بھی نہ لے سکیں۔

☆❁☆

''بھابھی! یہ دیکھیں، یہ سوٹ کیسا ہے؟ شاہ نور کی برتھ ڈے کے لیے۔'' نغمہ ہاتھ میں سوٹ پکڑے تزئین کے سر پر کھڑی اس کی رائے جاننا چاہ رہی تھی۔

''اونہوں، اتنا سادہ سوٹ، بالکل بھی نہیں۔'' تزئین نے فوراً رد کیا۔

''یہ نیا ہے نا، باقی سب پہلے پہنے ہوئے ہیں میں نے۔'' اس اکیس سال کی کامنی سی گڑیا نے اپنی پریشانی بتائی۔

''رہنے دو اس کو، تمہارے بھائی جان کی جیب ڈھیلی کرواتی ہوں۔''

''ہرگز نہیں، ان پر کسی صورت بار نہیں ڈالنا، ابھی اسی مہینے انہوں نے میرے آخری سمسٹر کی فیس بھری ہے۔''

''اوکے، پھر شام تک صبر کرو۔ میں کچھ اور بندوبست کرتی ہوں، پر اس سوٹ کو سائیڈ پر رکھو، یہ نہیں چلے گا۔''

شام میں تزئین شاہ نور کو اٹھائے باہر آئی تو سامعہ بھابھی اور آنٹی کو محو گفتگو پایا۔

شاہ نور دادی کو دیکھ کر ان کی طرف جانے کو مچلنے لگا، شاہ نور نے نیا نیا چلنا شروع کیا تھا۔ تزئین نے نیچے اتارا تو چھوٹے چھوٹے قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا دادی کی طرف بڑھا۔ دادی نے بھی آگے بڑھ کر فٹافٹ پوتے کو گود میں بھرا۔

''اطہر بھائی اور بچے کہاں ہیں بھابھی؟'' اطہر عموماً اس وقت تک آفس سے آجاتے تھے سو ان کو نہ پا کر تزئین نے پوچھا۔

''مارکیٹ تک گئے ہیں۔'' تزئین نے سر ہلایا۔

''نغمہ یقیناً چائے بنا رہی ہوگی۔'' اس نے کچن میں کھٹر پٹر کی آوازوں سے اندازہ لگایا۔

''صرف چائے نہیں کچھ بیکنگ ویکنگ بھی ہو رہی ہے۔'' آنٹی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''گڈ۔'' یہ بات تزئین کو پسند آئی۔

''تزئین ڈیئر! تم نے آکر ساری گفتگو کا رخ موڑ دیا، اتنی ضروری باتیں کر رہی تھیں ہم ساس بہو۔''

اس بات پر آنٹی نے تزئین کو بھی شریک گفتگو کیا۔

''تزئین! ابھی جو میں اور نغمہ فیصل آباد گئے تھے نا سائرہ کے ہاں......'' انہوں نے بہن کا نام لیا۔ ''وہاں سائرہ کی نند اپنی دیورانی کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ نغمہ اس کی دیورانی کو اپنے بیٹے کے لیے پسند آئی ہے، وہ لوگ باقاعدہ رشتہ مانگنے آنا چاہ رہے ہیں۔

لڑکا پڑھا لکھا ہے، اچھا کھاتا کماتا ہے۔ سائرہ بہت تعریف کر رہی تھی ان لوگوں کی۔ رات کے کھانے پر سب ہی ہوں گے، مشورہ وغیرہ کر کے پھر ان کو جواب دیتے ہیں۔'' آنٹی کا مطمئن چہرہ تزئین کو پریشان کر گیا، اس کے ذہن میں عثمان کی تصویر گھومی۔

کیسے بھاگ بھاگ کر وہ اس کے گھر آتا ہے اور یہاں آکر بھی اس کی نظریں ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں جب تک نغمہ نہ دکھائی دے جائے۔

''امی سے بات کروں، نہیں وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ اول تو وہ وٹے سٹے کے حق میں نہیں' دوسرے مہرین کی شادی سے پہلے تو وہ عثمان کے بارے میں سوچیں گی بھی نہیں لیکن رشتہ تو ڈالا جاسکتا ہے نا۔ منگنی، نکاح، کوئی رسم تو کی جاسکتی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھی، جب نغمہ کی آواز پر ہوش میں آئی۔

''بھابھی! یہ کیک میں نے کھانے کے لیے بنایا ہے۔ مراقبہ بعد میں کرلیجیے گا۔''

''جی، جی ضرور۔'' اس نے پلیٹ میں کیک کا پیس رکھ کر کھانا شروع کیا۔ دماغ ابھی بھی عثمان اور نغمہ کے رشتے میں الجھا ہوا تھا۔

یوں ہی غائب دماغی کی سی کیفیت میں کھاتی رہی۔ نغمہ منتظر نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''کیا ہوا؟'' تزئین نے پوچھا۔

''صرف آپ رہ گئی ہیں۔''

''کھا تو رہی ہوں۔''

''صرف کھانا نہیں ہے، تعریف بھی کرنی ہے۔''

''واہ بھئی واہ، انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کا کیک بنایا ہے۔'' تزئین نے تعریف کی۔

''ہوں' ہوں، اتنی لمبی لمبی چھوڑنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔'' سامعہ بھابھی نے ٹوکا۔

''اوکے، بہت اچھا کیک بنا ہے، بہت سافٹ، بہت مزے دار۔''

''بہت شکریہ۔'' نغمہ نے سر کو ہلکا سا خم کر کے تعریف وصول کی۔ تب ہی تزئین کو کچھ یاد آیا۔

''نغمہ! وہ میں نے تم سے سوٹ کے لیے کہا تھا نا، آجاؤ۔ تمہیں دکھادوں۔'' چائے پی کر دونوں کمرے میں چلی گئیں۔

''یہ دیکھو۔'' تزئین نے پیازی کلر کا بہت خوب صورت سوٹ اس کی طرف بڑھایا، جس پر اسٹونز کا کام ہوا تھا۔

''اُف اللہ، بھابھی کتنا پیارا سوٹ ہے۔'' نغمہ نے ہاتھ میں لے کر کپڑے کی نرماہٹ اور خوب صورتی محسوس کرنے کی کوشش کی۔

''میرے جہیز کا سوٹ ہے، شادی سردیوں میں ہوئی تب اس وجہ سے نہ پہن سکی پھر شاہ نور کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اب تو میرے واپس اس فٹنگ پر آنے کے کوئی آثار ہی نہیں ہیں۔'' اس نے اپنے صحت مند وجود پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''پر بھابھی! آپ کی گھر والوں نے دیکھا ہوا ہوگا، برا لگے گا۔'' وہ ہچکچائی۔

''اونہوں، اتنے سوٹ تھے جہیز میں، کسی کو یاد نہیں ہوگا پھر میں نے تو ایک مرتبہ بھی نہیں پہنا۔ بس یہ پکڑو بلکہ ٹھہرو، میچنگ جیولری بھی ہے وہ بھی نکالتی ہوں۔''

نغمہ خوشی خوشی چیزیں لے کر کمرے سے نکلی۔

☆❁☆

آئے تو وہ دونوں باقاعدہ طور پر شاہ نور کی سالگرہ کا دعوت نامہ دینے تھے، پر درحقیقت تزئین امی کو نغمہ کے رشتے کی بابت بتا کر عثمان اور نغمہ کے رشتے کے لیے قائل کر رہی تھی۔ صدیقی صاحب اور عثمان' احمر کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

''نہیں تزئین! مہرین کے رشتے سے پہلے تو میں عثمان کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی اور

عثمان کی کون سی عمر نکلی جا رہی ہے جو مہرین سے پہلے اس کو بیاہنے کا سوچنے لگوں۔‘‘

وہ بھی اپنے طور پر ٹھیک ہی سوچ رہی تھیں، فکر تو بیٹی کی تھی، بیٹے کے لیے ابھی سے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔

مہرین چائے رکھ کر ادھر ہی بیٹھ گئی۔

’’امی! اگر میرا رشتہ ہو ہی نہ سکا تو کیا آپ عثمان کی شادی بھی نہیں کریں گی؟‘‘ مہرین نے ڈائریکٹ امی سے سوال کر دیا۔

’’خیر کی باتیں منہ سے نکالو بیٹا! اللہ نہ کرے جو تمہارا رشتہ نہ ہو۔ اللہ تزئین کی طرح تمہارا گھر بھی آباد کرے، انسان کو ہمیشہ اچھا گمان کرنا چاہیے۔‘‘

’’امی جی، یہ ساری فکریں صرف میرے لیے ہیں۔ عثمان کے لیے کچھ نہیں سوچیں گی آپ۔‘‘ مہرین کا لہجہ پہلے ناراض پھر دکھی ہوا۔

’’کیوں نہیں سوچوں گی بیٹا! سوچوں گی اس کے لیے بھی، پر وہ تم سے بہت چھوٹا ہے پھر ایسی کوئی عمر بھی نہیں گزری جا رہی اس کی۔‘‘

مہرین نے درمیان سے ہی ان کی بات اچک لی۔ ’’تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس کی عمر گزار کر اس کے لیے سوچا جائے۔ اتنا چھوٹا نہیں رہا امی وہ، پچیس سال کا ہو رہا ہے پھر برسر روزگار ہے۔‘‘

’’ہاں تو میں کون سا کہہ رہی ہوں کہ خدانخواستہ اس کی شادی ہی نہیں کروں گی۔ تمہاری کہیں بات بن جائے تو اس کی بھی ساتھ ہی کر دوں گی۔‘‘

’’اور تب تک نغمہ کی شادی کہیں اور ہو گئی تو......؟‘‘ مہرین نے سوال ادھورا چھوڑ کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

’’تو کیا......؟‘‘ انہوں نے ناسمجھی سے مہرین کی شکل دیکھی۔ ’’لاکھوں میں ایک ہے میرا بیٹا لڑکیاں ہزار اس کے لیے۔‘‘

’’ان لڑکیوں میں کوئی اس کے دل کی خوشی تو نہیں ہو گی نا امی! اس کے دل کی خوشی تو نغمہ ہے۔‘‘

اس کی بات پر جہاں فرحانہ بیگم حیران ہوئیں، وہیں تزئین نے بھی چونک کر بہن کی شکل دیکھی تو گویا مہرین واقف تھی اس راز سے۔

تزئین جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی، وہ جتنی کوشش کر سکتی تھی اس نے کر لی تھی، اب آگے عثمان کی قسمت تھی۔

☆❀☆

’’جگو......او جگو۔‘‘ وہاج نے زوردار آواز لگائی۔

’’ام بہرا نہیں ہے صاب! آرام سے بھی سن لیتا ہے۔‘‘ وہ فوراً بوتل کے جن کی طرح کہیں سے حاضر ہوا۔

وہاج نے استری کیے ہوئے بہت سے کپڑوں کے درمیان سے ایک سوٹ باہر نکالا۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘

’’یہ......یہ......‘‘ جگو تھوڑا سا گڑبڑایا۔ ’’یہ امارا سوٹ ہے۔‘‘

’’وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے، تم یہ بتاؤ یہ میرے کپڑوں میں کیا کر رہا ہے؟‘‘

’’غلطی سے آ گیا ہو گا صاب! لاؤ ام کو دے دو۔‘‘ جگو نے کہتے ہوئے سوٹ اچکنا چاہا۔ وہاج نے سوٹ جلدی سے پیچھے کیا۔

’’یہ سوٹ تجھے تب واپس ملے گا جب تو اس کے پیسے دے گا مجھے۔‘‘

’’پیسے......؟‘‘ جگو نے تھوک نگلا۔

ان کپڑوں کے پیچھے چھپی کہانی یہ تھی کہ جگو صاحب مشین لگا کر کپڑے دھوتے تو تھے پر اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے کہ دھلے ہوئے اور بغیر دھلے کپڑوں میں زیادہ فرق محسوس نہ ہو۔ استری کرتے تو کوئی نہ کوئی محبت کی نشانی اس پر بھی ثبت کر دیتے۔ تقریباً ہر سوٹ ہی کہیں نہ کہیں سے جلا ہوا ہوتا۔

تنگ آ کر وہاج نے اپنے اور بابا کے آفس پہننے والے کپڑے لانڈری بھجوانے شروع کر دیے تھے، جو وہیں سے دھل کر استری ہو کر آتے تھے۔

آج کا تازہ ترین واقعہ یہ تھا کہ ان کپڑوں میں سے جگو کا سوٹ برآمد ہوا تھا۔

’’صاب! جمعہ کا نماز کا واسطے رکھا ہوا ہے یہ سوٹ، غلطی سے آپ کا کپڑوں میں مکس ہو گیا ہو گا۔‘‘

’’اچھ...... چھ...... چھا۔‘‘ اس نے اچھا پر خاصا زور ڈالا۔

’’تیرے نماز کے کپڑے غلطی سے ہمارے آفس کے کپڑوں میں مکس ہو گئے اور غلطی سے دھل کر استری ہو کر آ گئے۔‘‘ چبا چبا کر جملہ مکمل کیا۔ ’’بچو اب تو اس غلطی کی سزا بھگتے گا۔ لا پیسے نکال، دھلائی اور استری کے......اس کے بعد تجھے یہ سوٹ واپس ملے گا اب۔‘‘

’’صاب! کتنا چھوٹا دل ہے تمارا، دیکھ لینا تم بہت جلدی بڈھا ہو جائے گا۔‘‘

’’تجھ سے ایک سوٹ کے پیسے لے لوں گا تو جلدی بڈھا ہو جاؤں گا، چل...... بڑا آیا نجومی۔‘‘

’’ام سے پیسہ لے کر تم بڈھا نہیں ہو گا۔ ام سے پیسہ لے کر تو تم بڑا امیر کبیر آدمی بن جائے گا، مالا مال ہو جائے گا۔ بڈھا تو تم ام پر غصہ کرنے کا وجہ سے ہو گا۔ اور یہ سوٹ تم اپنا پاس رکھو، ام کوئی پیسہ ویسہ نہیں دے گا۔ جمعہ کا نماز کا واسطے ام کوئی اور سوٹ رکھ لے گا۔‘‘

جگو اپنی سنا کر واپس ہو لیا، جاتے جاتے کچھ خیال آیا تو رک کر بولا۔ ’’صاب! ام پر غصہ تھوڑا کم کیا کرو۔‘‘

’’تجھ پر تو انسان جتنا بھی غصہ کرے، کم ہی ہو گا۔‘‘

اس معرکے کے محض آدھے گھنٹے بعد جگو نے الٹی میٹم دے دیا۔

’’گھر کا سارا راشن ختم ہوا پڑا ہے، آج ام کچن کو تالا لگا دے گا، کل سے آپ لوگ ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھا لینا۔‘‘

وہ پورے ہفتے سے ان کو یاد دہانی کروا رہا تھا کہ سودا سلف ختم ہو رہا ہے پر دونوں باپ بیٹے کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔

’’چلیے، گروسری لے کر آتے ہیں جا کر۔‘‘ وہاج نے ٹی وی پر نظر جمائے بیٹھے باپ کو مخاطب کیا۔

’’تم لے آؤ۔‘‘ بغیر ٹی وی سے نظر ہٹائے جواب دیا۔

’’میں اکیلا نہیں کھاتا اناج اس گھر میں، نہ میں اکیلا جاؤں گا۔‘‘ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹی وی بند کیا۔

’’جگو کو لے جاؤ ساتھ۔‘‘ نظریں ہنوز ٹی وی پر مرکوز رکھیں۔

’’یہ جو کر مجھ سے گھر میں برداشت نہیں ہوتا کجا کہ اس کو بازار میں اپنے ساتھ گھماتا پھروں۔‘‘

’’وہ کوئی بندر ہے نہ تم مداری، جو رسّی باندھ کر اس کو ساتھ ساتھ گھماؤ گے۔ میگا مارٹ سے گروسری لینی ہے یا گلی گلی دکانیں چھاننی ہیں تمہیں۔‘‘

وہاج دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کر ان کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ ’’معاف کر دیں نا اب، کب تک ناراض رہیں گے۔‘‘

تیمور صاحب ہنوز ناک کی سیدھ میں دیکھتے رہے گویا روبوٹ ہوں۔

زہرہ پھپھو کے جانے کے بعد سے تیمور صاحب وہاج سے ضرورتاً بھی بات نہیں کر رہے تھے گویا ناراضی کا کھلم کھلا اظہار تھا یہ۔ وہاج کوئی بات کرتا تو جواب دے دیتے ورنہ خاموش۔

’’بابا!‘‘ اس نے ان کا گھٹنا ہلایا۔ ’’آپ سے بات کر رہا ہوں میں۔‘‘

’’تم نے بہت زیادتی کی وہاج! رشتے داروں کے نام پر ہمارے پاس ہے ہی کون؟‘‘ ان کی آواز میں دکھ تھا۔

’’تمہاری ماں اکلوتی تھی، ہم فقط دو بہن بھائی، جو دور پرے کے رشتے ہیں بھی، تمہاری ماں کی زندگی تک تو پھر ان کا آنا جانا تھا کہ یہ رشتے ناتے عورتیں ہی نبھاتی ہیں۔ اس کے بعد سے تو کوئی جھانکتا بھی نہیں ہے آ کر۔

ایک تمہاری پھپھو ہی بچتی ہے جس کے آنے سے دوسراہٹ کا احساس ہو جاتا ہے، تم نے اسے بھی ناراض کر دیا۔ کیا ہے جو ہماری خاطر نہیں آتی،

پیسوں کے لیے آتی ہے۔ ہمارا دل تو اس میں بھی خوش ہو جاتا ہے، روپے پیسے کی کوئی کمی تو نہیں ہے ہمیں۔“ بڑے دنوں کا غبار تھا آخر نکل ہی گیا۔

”خدا کی قسم بابا! ایک ہی نشست میں اتنی لمبی گفتگو آپ کے منہ سے میں نے پہلی مرتبہ سنی ہے۔“

یہ اثر ہوا تھا اس پر اتنی پر اثر تقریر کا۔ تیمور صاحب نے دوبارہ ناک کی سیدھ میں گھورنا شروع کر دیا۔

”یار! آپ میرا پوائنٹ آف ویو بھی تو سمجھیں نا۔ آپ کی بہن ہیں، آپ بے شک جتنے مرضی روپے دیں، بغیر حساب کتاب کے دیں مگر کم سے کم انہیں احساس تو ہو کہ وہ ہمیں بے وقوف بنا کر رقم نہیں بٹور سکتیں۔ وہ آپ کی اکلوتی بہن ہیں، پیسے سے زیادہ آپ کو یہ رشتہ عزیز ہے اور وہ......؟“ وہاج خاموش ہوا۔ ”آپ بھی ان کے اکلوتے بھائی ہیں، ان کو آپ سے زیادہ......“

”وہاج بس۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر اس کو تنبیہ کی۔

کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، تیمور صاحب نے ایک مرتبہ پھر ٹی وی کی بند اسکرین کو گھورنا شروع کر دیا۔

”آپ کے پاس رشتے کے نام پر صرف آپ کی بہن ہیں اور میرے پاس رشتے کے نام پر صرف آپ ہیں۔“ اس نے دونوں گھٹنوں کو زمین پر ٹکا کر سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

”آپ پھپھو کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں، میں ان سے معافی مانگ لوں گا، پر آپ یہ ناراضی ختم کریں اب۔“

وہاج کو اپنے بالوں میں باپ کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا، وہ تھوڑی دیر اس کے بالوں کو سہلاتے رہے۔

”چلو، اٹھ جاؤ اب، رات زیادہ ہو گئی تو مارکیٹ بند ہو جائے گی۔“ وہ تابعداری سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆❀☆

صدیقی صاحب نے آئی سی سی میگا مارٹ کے سامنے گاڑی روکی۔

”سنو مہرین! بریانی مسالا اور حلیم کے پیکٹ یاد سے لے لینا۔“

”جی امی۔“

”ہم کوشش کرتے ہیں کہ رپورٹس لے کر جلدی واپس آ جائیں۔“

”ابو جی! آپ احتیاطاً مجھے پیسے دے دیں۔“

صدیقی صاحب نے والٹ نکالا تو فرحانہ بیگم نے ٹوک دیا۔

”ارے بھئی، بس رپورٹس لینی ہیں اور واپس آنا ہے، تم ابھی خریداری کر رہی ہو گی کہ ہم پہنچ بھی جائیں گے۔“

”نہیں، مہرین ٹھیک کہہ رہی ہے، راستے میں ٹریفک کی وجہ سے دیر سویر ہو گئی تو بچی پریشان ہوتی رہے گی۔ لو بیٹا! یہ پیسے رکھ لو۔“ صدیقی صاحب نے ہزار ہزار کے اچھے خاصے نوٹ مہرین کی طرف بڑھائے۔

مہرین پیسے لے کر مارٹ میں داخل ہوئی، صدیقی صاحب گاڑی بڑھا لے گئے۔

”بابا...... وہ دیکھیں، وہی لڑکی۔“ وہاج نے خوشی اور جوش کی ملی جلی کیفیت میں تیمور صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔

”کون سی لڑکی؟“ انہوں نے ناسمجھی سے وہاج کی صورت دیکھی جو آنکھوں سے ایک سمت اشارہ کر رہا تھا۔

”وہی جو اس دن بازار میں مجھ پر مر مٹی تھی۔“ وہاج نے یاد دلایا۔

تیمور صاحب نے وہاج کی بتائی ہوئی سمت دیکھا، ان سے قدرے فاصلے پر ایک دراز قد گورے رنگ کی لڑکی کریمز اور شیمپو کی مختلف بوتلیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھی، پشت پر گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی جھولتی نظر آ رہی تھی۔

”اوں ہوں، تم پر مر نہیں مٹی تھی، اس نے صرف تمہیں دیکھا تھا۔“ تیمور صاحب نے تصحیح کی۔

”جی نہیں، اس نے مجھے مخاطب بھی کیا تھا۔“

”بھائی سمجھ کر۔“ تیمور صاحب دوبدو بولے۔

”یادداشت تو آپ کی اس عمر میں بھی بہت اچھی ہے، لڑکیوں کے معاملے میں۔“ وہاج جل کر بولا۔

”معاملہ لڑکی کا نہیں صاحب زادے آپ کا ہے۔“

”میں اس سے بات کرنے جا رہا ہوں۔“ وہاج نے باپ کے کان میں گھس کر دوبارہ سرگوشی کی۔

”جب تمہیں مار پڑے گی، میں تمہیں پہچاننے سے انکار کر دوں گا، ٹیکسی کر کے گھر آ جانا۔“

”اور یہ سامان کون اٹھائے گا؟“ وہاج نے دھمکی آمیز انداز میں ٹرالی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”پبلک سے پٹنے کے بعد تم ویسے بھی سامان اٹھانے کے لائق نہیں رہو گے۔“

”آپ کو ہر صورت میرا ساتھ دینا ہو گا۔ گاڑی کی چابی میرے پاس ہے۔“ اس نے جیب سے چابی نکال کر ان کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

”اُف......“ وہ کراہ کر رہ گئے۔

مہرین اپنے دھیان میں مگن مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کر ٹرالی میں رکھ رہی تھی جب کسی نے پیچھے سے آ کر سلام کیا۔ وہ اچھل ہی پڑی۔

”میں وہاج ہوں، آپ کو یاد ہے ہم میزرب میں ملے تھے۔ آپ نے مجھ سے میرا اسیل نمبر مانگا تھا۔“

مہرین کی جان ہی جل کر رہ گئی اس سفید جھوٹ پر، اسے یاد بھلا کیوں نہ ہوتا ابھی ہفتہ ہی تو ہوا تھا اس بات کو۔

”حد ہوتی ہے غلط بیانی کی، میں نے کب آپ سے نمبر مانگا تھا۔ میں نے صرف آپ کو اپنے بھائی کے دھوکے میں مخاطب کیا تھا اور بس۔“

”یعنی کہ آپ کو یاد ہے، بس یہ ہی چیک کر رہا تھا۔“

مہرین کلس کر رہ گئی اس کی چالاکی پر۔

”چلیں، آج مجھ سے نمبر لے لیں، اس دن تو بہت جلدی میں تھیں آپ۔“

”دیکھیے مسٹر......“ مہرین انگلی اٹھا کر بولی۔

”وہاج...... وہاج کہہ سکتی ہیں آپ مجھے۔“ وہاج نے جلدی سے بات کاٹی۔

”جی وہاج صاحب۔ اپنے پاس رکھیے اپنا نمبر اور چلتے پھرتے نظر آئیں یہاں سے۔“

”دیکھیے میں صرف اس لیے آپ کو نمبر دینا چاہ رہا تھا کہ مجھے لگا آپ مجھ سے رابطہ رکھنا چاہیں گی۔“

”ویسے بھی میں تو آپ سے نمبر مانگ نہیں سکتا۔ عموماً خواتین ناراض ہو جاتی ہیں نا اس طرح کی بے تکلفی پر۔ ویسے خاتون اگر آپ اپنا نمبر مجھے دینا چاہیں تو میں ہرگز مائنڈ نہیں کروں گا۔“

”خاتون......“ وہ زور سے چیخی۔ ”خاتون کس کو کہا ہے آپ نے؟“ چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔

”اوہ...... یعنی...... اپنے والا معاملہ ہے۔“ دل میں سوچتے، نظر اس خفا خفا سی لڑکی پر ڈالی۔

صاف شفاف گول چہرہ، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں پھر اس پر یہ غصہ، وہاج کو لگا اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔

”دیکھیے! یہ جو قدرت بار بار ہماری ملاقات کروا رہی ہے، تو یہ بے سبب تو نہیں ہو سکتی نا، یقیناً تقدیر کسی خاص مقصد سے ہم دونوں کو ملوا رہی ہے۔“ بے خود سا ہو کر بولا۔

”آپ حد سے بڑھ رہے ہیں، میرا خیال ہے میں بلواتی ہوں کسی کو۔“

”آپ کے ساتھ تو مجھے آج بھی کوئی نظر نہیں آ رہا، ہاں میرے فادر ہیں میرے ساتھ۔ آپ کہیں تو ان کو بلوا لیتا ہوں، آپ مل لیجیے۔“

”کیوں نہیں ضرور، میں خود بھی ملنا چاہوں گی آپ کے فادر سے اور اپنی شوہر کو بھی ملوانا چاہوں گی۔ وہ بچوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھے ہیں، اصل میں بچے شاپنگ نہیں کرنے دیتے نا، ٹھیک سے۔ میرا خیال ہے قدرت اسی لیے بار بار ہمیں ملوا رہی ہے تاکہ آپ اور آپ کے والد صاحب میرے شوہر سے ملنے کا شرف حاصل کر لیں۔“ مہرین نے دونوں ہاتھ ٹرالی پر رکتے سکون سے کہتے وہاج کا سارا سکون درہم برہم کیا۔

”شوہر...... بچے......“ دھڑ دھڑ دھڑ...... کوئی

ملامت سی اس پر آ کر گری۔ وہ ارمان جو ابھی بے دار ہونا شروع ہوئے تھے، اپنی موت آپ مر گئے۔ جواب تک دینے کی ہمت نہ رہی، شکوہ کناں نظر اس پر ڈالتا واپسی کے لیے مڑ گیا۔

مہرین نے بمشکل اپنے حلق سے ابلتے قہقہے کا گلا گھونٹا، امید تھی اب یہ لفنگا کہیں دیکھ بھی لے گا تو پہچاننے کی غلطی نہیں کرے گا۔

وہاج منہ لٹکائے واپس آیا۔

’’ارے!! تم تو ثابت سالم واپس آ گئے۔‘‘ تیمور صاحب نے غور سے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔

’’وہ شادی شدہ ہے، بچے بھی ہیں اس کے۔‘‘ ایسے بولا جیسے اس کے شادی شدہ ہونے کی نہیں فوت شدہ ہونے کی خبر دے رہا ہو۔

’’اوہ......‘‘ انہوں نے ہونٹ سکیڑے۔ ’’میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔‘‘

’’میرے غم میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا، یہ دکھ مجھے اکیلے ہی سہنا ہوگا۔‘‘

دونوں آگے پیچھے سامان کی ٹرالی لیے باہر آئے۔ خاموشی سے سامان گاڑی میں شفٹ کیا۔ ڈرائیونگ سیٹ وہاج نے سنبھالی، تیمور صاحب برابر والی سیٹ پر بیٹھے۔

’’ہاں تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟‘‘ بات تیمور صاحب نے شروع کی۔

’’ہم کوئی بات نہیں کر رہے تھے، ہم خاموش تھے۔‘‘ انتہائی سنجیدہ لہجے میں وہاج نے جواب دیا۔

’’ارے بھئی خاموشی سے پہلے ہم کیا بات کر رہے تھے۔‘‘

’’خاموشی سے پہلے میں آپ سے نہیں، آپ کی نہ ہونے والی بہو سے بات کر رہا تھا۔‘‘

’’بالکل غلط، تم مجھ ہی سے بات کر رہے تھے اور تم مجھے بتا رہے تھے کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔‘‘

اب کی بار وہاج کی طرف سے خاموشی رہی۔ تھوڑی دیر تک تیمور صاحب وہاج کی طرف سے کسی بات کے منتظر رہے۔ آخر خود ہی خاموشی توڑی۔

’’ویسے یار! اگر وہ شادی شدہ نہیں بھی ہوتی تو کیا واپسی میں اس نے ہمارے ساتھ آنا تھا۔‘‘

’’میں نے ایسا کب کہا؟‘‘

’’منہ تو ایسے ہی لٹکا کر بیٹھے ہو جیسے ہم گروسری لینے نہیں، دلہن لینے آئے تھے اور اب خالی ہاتھ واپس جا رہے ہیں۔‘‘

’’میں تھوڑی دیر خاموش رہ کر غم منانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کیا میں گاڑی سے چھلانگ لگا دوں؟‘‘

’’آپ کی مرضی۔‘‘

’’میری مرضی۔‘‘ انہوں نے سر کھجایا۔ ’’اگر بات میری مرضی کی ہے تو میں تمہیں دھکا دینا پسند کروں گا۔‘‘

’’میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔‘‘

’’میں بھی تمہارا اکلوتا باپ ہوں۔‘‘

’’آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟‘‘

’’تمہارا غم بانٹنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’اوکے، سنیں پھر...... زندگی میں پہلی بار قدرت نے اتفاقاً ایک لڑکی سے بات بلکہ ملاقات کا موقع دیا تھا۔‘‘ اس نے افسوس سے سر جھٹکا۔

’’پہلی بار نہیں، دوسری بار۔ آج اس سے تمہاری دوسری ملاقات تھی۔‘‘

’’میں اپنی بات پر قائم ہوں، معاملہ لڑکی کا نہیں میرے اکلوتے بیٹے کا ہے۔‘‘

’’مجھے لگا تھا قدرت آخرکار مجھ پر مہربان ہو ہی گئی ہے، میری بے رنگ زندگی میں بہار آخرکار آنے ہی والی ہے، پر نہیں۔‘‘ صدمے سے سر دائیں بائیں ہلایا۔

’’کوئی دکھی سا گانا لگا لو، وہ لگا لو...... ’’یہ دنیا، یہ محفل میرے کام کی نہیں۔‘‘

’’ٹیپ خراب ہے۔‘‘

’’میں سنا دوں۔‘‘

’’میں چلتی گاڑی سے کود جاؤں گا اگر آپ نے ایسی کوئی بھی کوشش کی۔‘‘ اچانک ہی تیمور صاحب کو کچھ خیال آیا۔

’’یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟‘‘

’’آپ کو اغوا کر کے کسی ویرانے میں لے جا رہا ہوں کیونکہ آپ ہیں الہڑ، نوخیز دوشیزہ اور میں شہر کا نامی گرامی غنڈہ۔‘‘

’’یار! اس کے شادی شدہ ہونے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھ پر کس بات کا غصہ نکال رہے ہو۔‘‘

’’آپ اپنا سوال ملاحظہ فرمائیں، ہم کہاں جا رہے ہیں؟‘‘ گھر جا رہے ہیں اور کہاں جانا ہے۔‘‘

’’گھر میں کچھ بھی پکا ہوا نہیں ہوگا۔‘‘ تیمور صاحب نے یاد دلایا۔

’’کیا کریں؟‘‘ گاڑی کی رفتار تھوڑی سی کم کرتے ہوئے پوچھا۔

’’کسی ریسٹورنٹ کی طرف موڑو گاڑی۔‘‘

’’اور جگو کا کیا ہوگا؟‘‘

’’پیک کروالیں گے اس کے لیے۔‘‘

’’اوکے، اور واپسی میں پھپھو کی طرف بھی چلتے ہیں۔‘‘ تیمور صاحب نے سر ہلایا۔

☆❁☆

’’کیسی لگ رہی ہوں بھابھی؟‘‘ نغمہ تیار ہو کر تزئین کے پاس آئی۔

تزئین اس وقت میک اپ میں مصروف تھی، میک اپ چھوڑ کر دھیان سے اپنی مومن موہنی سی نند کو دیکھا۔ پیچ کلر کے سوٹ کے ساتھ میچنگ جیولری پہنے، پاؤں میں نازک سی سینڈل، گھنے سیاہ بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ لائٹ سے میک اپ میں، وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

’’بہت پیاری لگ رہی ہو۔‘‘ تزئین نے دل سے تعریف کی۔

’’بھابھی! سوٹ مانگے کا تو نہیں لگ رہا۔‘‘ اس نے کچھ پریشانی سے اپنا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

’’نہیں بے وقوف، اور اب مانگے وانگے کو بھول جاؤ، بس تمہارا ہی ہے یہ سوٹ۔‘‘

تقریب زیادہ بڑے پیمانے پر نہیں تھی، بس گھر گھر کے ہی لوگ تھے۔ تزئین کی فیملی کو مدعو کیا گیا تھا، اس کے علاوہ احمر، اظہر کے چچا کی فیملی کو بلایا گیا تھا۔ احمر، اظہر اور نغمہ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ میں مصروف تھے، جب مہرین، عثمان اور فرحانہ بیگم کی آمد ہوئی۔

اظہر بھائی غبارے پھلا پھلا کر احمر اور نغمہ کو دیتے جا رہے تھے، دونوں بہن بھائی رنگ برنگے غباروں سے دیواروں کو سجا رہے تھے۔

عثمان نے بڑے جوش سے حاضرین محفل کو سلام کیا۔ اظہر اور احمر اپنا اپنا کام چھوڑ کر ان سے ملنے میں مصروف ہو گئے۔ مہرین اور فرحانہ بیگم، نغمہ سے گلے ملیں۔

’’بہت پیاری لگ رہی ہو نغمہ!‘‘ مہرین نے اس کی تعریف کی۔

ادھر عثمان بہنوئی سے مل رہا تھا، دھیان سارا ان کے پیچھے رکھے شوکیس پر تھا جہاں شیشے میں نغمہ کا عکس ابھر رہا تھا۔ دل زور و شور سے مہرین کی بات کی تائید کر رہا تھا، سادگی میں بھی قیامت ڈھاتی ہے۔ آج تو جان ہی جائے گی۔

’’عثمان، میرے بھائی! یہ تمہارا بہنوئی ہے، محبوبہ نہیں ہے جس سے الگ ہونے کا تمہارا دل ہی نہیں کر رہا۔‘‘ اظہر بھائی کے جملے نے آخری اسے پوزیشن بدلنے پر مجبور کیا حالانکہ دل بالکل نہیں کر رہا تھا اس دشمنِ جاں پر سے نظر ہٹانے کو۔

مہرین اور فرحانہ نے تزئین کے کمرے کی راہ لی جب کہ عثمان ادھر ہی ٹک گیا۔ بہن سے ملاقات تو ہوتی ہی رہے گی اس منظر کو چھوڑنے کا فی الحال قطعی ارادہ نہیں ہو رہا تھا۔

’’یار، کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ تم آ جاؤ تو یہ ڈیکوریشن وغیرہ سنبھالو، پر تم نے اتنی دیر لگا دی۔‘‘ احمر، عثمان کو دیکھتے ہوئے بولے۔

’’تو آپ مجھے پہلے بتاتے نا، میں صبح سے ہی آ جاتا۔‘‘

’’انکل کیوں نہیں آئے؟‘‘ اب کے اظہر کی

جانب سے سوال آیا۔

”ابو کو ایک ضروری میٹنگ میں جانا پڑ گیا، بس اسی وجہ سے۔“

”چلیں مجھے بتائیں کرنا کیا ہے۔“ عثمان نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس سے پہلے کہ احمر کچھ بولتے، اطہر نے اپنا سامان اس کے حوالے کیا۔

”یہ غبارے ذرا بھر کر ان کو پکڑاتے جاؤ، میں تیار ہو کر آتا ہوں۔“ کہہ کر چلتے بنے۔

”حد ہی ہوگئی، پہلے مجھے جانے دیتے۔“ احمر منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔ عثمان نے بڑی دل جمعی سے کام کیا۔ دھیان کام پر کم نغمہ پر زیادہ تھا، احمر بھائی کی نظر بچا کر ہر تھوڑی دیر بعد وہ کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لیتا۔ ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ تزئین کچھ بولتی ہوئی اندر آئی۔

”بات سنیں ذرا، ادھر آئیں۔“ احمر کو آواز دی۔

”السلام علیکم آپی!“ بیٹھے بیٹھے سلام جھاڑا، تزئین کچھ جلدی میں تھی سو فٹافٹ جواب دے کر میاں کو لے کر واپسی کی راہ لی۔

اب وہاں نغمہ تھی اور عثمان تھا۔ عثمان نے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا اور اپنی نشست تھوڑی تبدیل کی تاکہ نظر کی چوری پکڑی نہ جاسکے۔ کرسی کا رخ کچھ اس طرح کرلیا تھا کہ نغمہ اب براہ راست اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔ اب کے عثمان نے ذرا فرصت سے اسے دیکھا، یہ رنگ تو لگ رہا تھا بنا ہی اس کے لیے ہے، دوپٹے پر لگے موتیوں کا عکس اس کے چہرے پر بھی محسوس ہو رہا تھا۔

گھنی سیاہ پلکیں، پشت پر پھیلی بالوں کی آبشار، چہرے سے ہوتی اس کی نظر نغمہ کے ہاتھوں تک آئی، لمبی مخروطی انگلیاں، رنگ فنگر خالی تھی۔

”اس میں تو میں اپنی پسند کی انگوٹھی پہناؤں گا۔“ وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوا۔

”یار! ایک بار بجو کا رشتہ ہوجائے تاکہ اپنی نیا بھی پار لگے۔“

”یوں ہی الٹا سیدھا سوچتے عثمان نے ذرا غور کیا، وہ اس کی نظروں کے ارتکاز سے خاصی کنفیوز ہو رہی تھی۔ بڑی دیر سے ایک ہی غبارے سے جنگ کرنے میں مصروف تھی۔

”میرے خیال میں، میں اندر جا کر کام دیکھتی ہوں۔“ نغمہ اس کی نظروں کی تپش سے خائف ہوئی۔

اس کی آواز پر وہ ہوش میں آیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بڑی دیر سے بغیر پلکیں جھکائے اسے گھور رہا تھا۔

”ارے نہیں بھئی، میں اکیلا یہ سب کیسے کروں گا۔“ (یوں ہی بیٹھی رہو میرے سامنے، اچھی لگ رہی ہو)۔

”پھر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا کہ میزبان بہانے بہانے سے کھسکتے جائیں اور مہمان بے چارا اکیلا بیٹھا کام کرتا رہے۔“

وہ بے چاری مارے مروت کے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ آپ مجھے گھورنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کررہے۔

مگر اب کچھ تو کہنا ہی تھا۔

”وہ اصل میں احمر بھائی گائیڈ کرتے جارہے تھے تو میں یہ کررہی تھی، اکیلے مجھ سے نہیں ہو رہا۔“

”تو آپ مجھے بتائیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اس کی مدد کرنے۔

”نہیں نہیں...... میں کرلوں گی پلیز۔“ وہ دو قدم پیچھے ہوئی۔

عثمان کو اس کی گھبراہٹ مزا دے رہی تھی، وہ واپس اپنی جگہ سنبھال کر بیٹھ گیا۔

”یہ سوٹ بہت اچھا لگ رہا ہے آپ پر۔ لگتا ہے جیسے یہ کلر تو بنا ہی آپ کے لیے ہے۔“ بے ساختہ ہی دل کی بات زبان پر آ گئی۔

ایک دم ہی نغمہ کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے، گھبراہٹ کی جگہ غصے نے لے لی۔ (کم ظرف کہیں کا، پہچان ہی لیا ہے بہن کا سوٹ تو طنز کرنے کی کیا ضرورت ہے)۔

”انسان کا ظرف اس کی زبان کے نیچے ہوتا ہے، کچھ باتیں جتا کر بس انسان اپنی اوقات ظاہر کرتا ہے اور کچھ نہیں۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں، تیز تیز قدم اٹھاتی غصے میں بھری اندر چلی گئی۔

عثمان اس کی باتوں پر غور ہی کرتا رہ گیا، مفہوم سمجھ میں ہی نہ آسکا اتنی مشکل باتوں کا۔ مگر اس کو غصہ کس بات پر آ گیا؟ لڑکیاں تو خوش ہوتی ہیں تعریف پر بلکہ لڑکے بھی خوش ہوتے ہیں۔ ابھی جو وہ مجھے کہہ جاتی کہ آپ بھی بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں، کس قدر خوشی ہوتی مجھے۔ ناحق تعریف کی، کم سے کم نظروں کے سامنے موجود تو تھی۔

سجا، سجایا کمرا ایک دم ہی ویران ہوا۔

☆❁☆

”یہ ہی ڈر تھا مجھے، کتنا منع کیا تھا نا میں نے آپ کو کہ مجھے نہیں لینا آپ کا سوٹ۔ آپ کے گھر والوں نے دیکھا ہوا ہوگا، کروادی نا بے عزتی میری۔“ نغمہ تزئین کے سامنے شکایت کا دفتر کھولے کھڑی تھی، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے تھے۔ تزئین حیران پریشان اس کی بات سن رہی تھی۔

BOOKSPK

”آپ کے بھائی نے مجھے مانگے کے سوٹ کا طعنہ مارا ہے۔“ اس کا صدمے سے برا حال تھا۔

”انہوں نے مجھے میرے منہ پر جتادیا کہ میں نے ان کی بہن کا سوٹ پہنا ہوا ہے۔“

”عثمان نے ایسا کہا......؟“ تزئین جتنا حیران ہوتی کم تھا۔ عثمان کو بھلا کیا خبر کہ یہ میرے جہیز کا سوٹ ہے، اس کا کب ان معاملات میں دھیان ہوتا ہے۔

پر اس وقت مسئلہ بے تحاشا روتی نغمہ تھی ابھی جو آنٹی یا احمر میں سے کوئی آجاتا، کس قدر بدمزگی ہوجاتی۔

”اچھا، تم چپ ہوجاؤ پلیز، آؤ میں تمہارے سامنے اس سے پوچھتی ہوں۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر نغمہ کو اٹھانے کی کوشش کی۔

”نہیں بھابھی! مجھے اس تقریب میں شامل نہیں ہونا۔“ رو رو کر سارا میک اپ خراب کرلیا تھا۔

اس مسئلے کو فوری حل کرنا ضروری تھا۔ وہ عثمان کے پاس آئی، صد شکر کہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

”عثمان! تم نے کیا کہا ہے نغمہ سے؟“ وہ چہرے پر سخت تاثرات سجائے اس سے باز پرس کررہی تھی۔

”میں نے......“ اس نے شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھ کر کہا۔ ”میں نے کیا کہا ہے؟“ الٹا وہ اس سے پوچھنے لگا۔

”تم نے نغمہ سے کہا ہے کہ اس نے میرا سوٹ پہنا ہوا ہے۔“ پہیلیاں بجھوانے کا وقت نہیں تھا سو براہ راست سوال کیا۔

عثمان کا تو حیرت کے مارے منہ کھل گیا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا آپی! میں تو بس یہ کہہ رہا تھا......“ تزئین نے اس کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔

”تمہیں کچھ بھی کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی آخر، تھوڑی دیر منہ بند کرکے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔“ بالکل ان ہی الفاظ میں وہ اپنے دل کو ڈانٹ رہا تھا جس کی وجہ سے سارا معاملہ خراب ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کی تعریف کرنے کی کوشش کی تھی جو مہنگی پڑ گئی تھی۔

”میری توبہ، میری محبت خاموش ہی اچھی۔ میں گونگی محبت کرلوں گا، شادی کے بعد بھی کبھی تعریف نہیں کروں گا۔“ وہ دل کو ڈپٹ رہا تھا، سارا قصور اسی کا تھا، یہ ہی تو بے اختیار ہوا تھا۔

”آپی! میری وجہ سے وہ ناراض ہوگئی ہے، اوکے، میں سوری کرلیتا ہوں۔“ تزئین نے سر ہلایا، اس کو خاموشی سے نغمہ کے پاس لے آئی۔

تزئین اور عثمان آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے، تزئین نے اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا تاکہ یہاں ہونے والی کارروائی کا اندازہ اور کسی کو نہ ہوسکے۔

عثمان نے نغمہ کی طرف نگاہ کی تو نظر پلٹنا ہی بھول گئی۔ گالوں پر بہتا ہوا کالے رنگ کا پانی، جس

کو پونچھ پونچھ کرنغمہ نے پورا منہ کالا سیاہ کرلیا تھا۔ آئی لائنر، مسکارا، کاجل سب ہی کچھ پورے منہ پر لیپا ہوا سا لگ رہا تھا۔

یا اللہ! یہ نغمہ ہی ہے، اس قدر ہیبت ناک، خوف ناک اور پتا نہیں کون کون سے الفاظ ذہن میں آرہے تھے (نغمہ پلیز یار! تم شادی کے بعد میک اپ مت کیا کرنا، ایسے ہی بہت اچھی لگتی ہو بلکہ ایسا ہے کہ میک اپ کرلیا کرنا پر میک اپ کرکے رونا نہیں۔ وہ دل ہی دل میں نغمہ سے مخاطب تھا)۔

خاموشی کا وقفہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔

''یا اللہ یہ معذرت کرے اور بات ختم ہو۔'' تزئین جھنجلائی۔

''عثمان تمہیں کچھ کہنا تھا۔'' تزئین نے بے زاری سے یاددہانی کروائی۔

''ہاں، آں...... وہ میں کہہ رہا تھا نغمہ! تم میک اپ مت کرنا بلکہ میک اپ کرلینا مگر رونا نہیں۔'' وہ کچھ غائب دماغی کی سی کیفیت میں بولا۔

نغمہ رونا بھول بھال کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

تزئین الگ حیران و پریشان ہوئی۔

''عثمان! کیا اول فول بول رہے ہو؟'' تب ہی عثمان کو احساس ہوا وہ یہاں کچھ کہنے آیا تھا۔ مگر ''کیا؟'' ذہن سے نکل گیا۔

''وہ آپی! مجھے لگ رہا ہے میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' کچھ بے چارگی سے بہن کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارا دماغ بھی جگہ پر نہیں لگ رہا مجھے۔''

''اچھا میں باہر جا کر بیٹھتا ہوں۔'' اور کچھ نہ سُوجھا تو سر کھجاتے ہوئے بولا۔

تزئین نے دل ہی دل میں بھائی کو چند نازیبا القابات سے نوازا۔

''عثمان! تمہیں نغمہ سے معذرت کرنی ہے۔''

''اوہ ہاں۔'' تب ہی اسے یاد آیا، اس نے نغمہ کے سوٹ کی تعریف کی تھی جس پر وہ ناراض ہوکر غصے میں بھری چلی آئی تھی۔

''دیکھیے نغمہ! مجھے غلط فہمی ہوگئی تھی، مجھے لگا کہ یہ کپڑے آپ پر بہت اچھے لگ رہے ہیں مگر آئی ایم ویری سوری، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ یہ کپڑے آپ پر ذرا بھی اچھے نہیں لگ رہے۔'' عثمان نے اپنی دانست میں انتہائی مناسب الفاظ کا چناؤ کرکے معذرت کی۔

تزئین کا دل چاہا سر پیٹ ڈالے، اپنا نہیں عثمان کا۔ نغمہ ناسمجھی سے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ تزئین نے آگے بڑھ کر نغمہ کا ہاتھ پکڑا۔

''اٹھو شاباش۔'' نغمہ کچھ خفا خفا سی کھڑی ہوئی، بھابھی کے ساتھ جانے کو قدم بڑھائے۔

''منہ دھولیں۔'' بے ساختہ ہی عثمان کی زبان پھسلی، ساتھ ہی دانتوں تل داب لی۔

تزئین نے خشمگیں انداز میں اسے گھورا۔

''اچھا، بے شک مت دھوئیں۔'' کہہ کر باہر کو دوڑ لگائی۔

''بھابھی! آپ چلیے، میں چہرہ ٹھیک کرکے آتی ہوں۔''

☆❀☆

کیک کٹنے کے بعد تمام مہمانانِ گرامی لوازمات سے پورے پورے طریقے سے انصاف کررہے تھے۔ عثمان کی نگاہیں ادھر اُدھر بھٹکتی اس دشمنِ جان کو تلاش کررہی تھیں' آخر ایک کارنر پر وہ اسے نظر آگئی۔ وہ بے نیازی سے ادھر اُدھر دیکھتا، وہاں پہنچ گیا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کوئی متوجہ نہیں ہے۔ پوری تسلی کے بعد آہستہ سے اسے مخاطب کیا۔

''آپ یوں ہی اتنا ناراض ہوگئیں اور جا کر آپی سے شکایت بھی کردی۔ میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا جو آپ نے اپنی آنکھوں (میک اپ بھی کہنا چاہ رہا تھا) پر اتنا ظلم کرلیا رو رو کر۔''

''اگر آپ کو پتا چل ہی گیا تھا کہ یہ سوٹ آپ کی بہن کا ہے تو کم از کم آپ کو جتانا تو نہیں چاہیے تھا۔''

''ہیں......'' حیرت سے عثمان کا منہ کھل گیا۔

ایک نظر اس دبلی پتلی حسینہ پر ڈالی جو سوٹ میں فٹ آئی ہوئی تھی، دوسری نظر وہیں سے اپنی موٹی تازی بہن پر ڈالی۔

''یہ سوٹ آپی کا ہے۔ وہ اس میں پوری کیسے آتی ہیں؟''

نغمہ نے غور سے اسے دیکھا' یہ جانچنے کو آیا وہ مذاق کررہا ہے یا سنجیدہ ہے۔ اس کے تاثرات سچ مچ کی حیرت لیے ہوئے تھے۔

''ان کے جہیز کا سوٹ ہے، اب نہیں آتا ان کو تب ہی مجھے دے دیا۔''

''یہ سوٹ آپی کا ہے، یہ بات مجھے ابھی آپ سے پتا چلی ہے۔''

''تو پھر آپ نے کپڑوں کے متعلق بات کیوں کی؟''

''آپ کی تعریف کرنا چاہ رہا تھا، سوچا برا نہ مان جائیں' اس لیے بات کپڑوں سے شروع کی۔ ویسے مائنڈ نہ کیجیے گا، یہ سوٹ، یہ کلر سچ میں آپ پر بہت جچ رہا ہے۔''

نغمہ کے گال گلابی ہوئے، پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں۔

''آپ نے یوں ہی مجھے میری بہن کے سامنے شرمندہ کروادیا۔''

بات وہ نغمہ سے کررہا تھا پر نظر گردوپیش پر تھی کہ کوئی متوجہ تو نہیں ہے، سب اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''آئی ایم سوری۔'' نغمہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ایک بات کہوں، ناراض تو نہیں ہوں گی؟'' اجازت طلب کی۔

''جی، کہیں۔'' نغمہ کا دل کوئی خوب صورت سا جملہ سننے کا متمنی ہوا۔

(یا اللہ! تعریف کرنی تھی، جملہ ہی ذہن سے نکل گیا) وہ یادداشت پر زور ڈالنے لگا، کون سا جملہ منتخب کیا تھا، بولنے کے لیے۔

''کیا کہہ رہے تھے آپ؟'' نغمہ کو اس کی خاموشی نے بے چین کیا۔

''وہ میں کہہ رہا تھا......'' (کیا کہوں، کچھ تو یاد آجائے)۔

''آپ کو کچھ کہنا ہے یا میں جاؤں؟''

''ہاں، نہیں...... وہ میں کہہ رہا تھا کہ آپی سے تعلقات تو ٹھیک ہیں نا آپ کے۔'' زبان دانتوں تلے دبائی۔ (پتا نہیں کہنا کیا چاہ رہا تھا نکل کیا گیا منہ سے)۔

''جی......؟'' نغمہ نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا (وہ تو کچھ اور ہی سننا چاہ رہی تھی)۔

''مطلب کیا ہے آپ کا؟'' کچھ غصے سے استفسار کیا۔ عثمان اس کے تاثرات دیکھ کر گھبرا گیا۔

''وہ میرا مطلب تھا، نند بھاوج میں عموماً جھگڑے وغیرہ ہوجاتے ہیں تو آپ دونوں تو ٹھیک سے رہتی ہیں نا۔'' (غلطی در غلطی، توبہ میرے اللہ توبہ)۔

''بہتر ہوگا، یہ بات آپ اپنی آپی سے پوچھ لیں۔'' وہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

عثمان سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا (پھر غلط ہوگیا)۔

☆❀☆

''ابو جی! یہ تین کتابیں لی ہیں۔ ان کا بل بنوالیجیے۔''

تیمور صاحب بک شاپ پر کسی اچھی کتاب کی تلاش میں آئے تھے' جب نسوانی آواز پر گردن گھما کر دیکھا۔ وہ لڑکی جو اپنے ابو سے مخاطب تھی کچھ دیکھی بھالی سی لگی، ساتھ ہی اس کے ابو پر نظر پڑی تو کچھ چونکے۔ اتنی دیر میں ان کی نظر بھی تیمور صاحب پر پڑ چکی تھی۔

''ارے تیمور صاحب! آپ یہاں؟'' دونوں بڑے جوش و خروش سے وہ ملے۔

تیمور صاحب اور صدیقی صاحب ایک ہی فرم میں کام کرتے تھے۔ تیمور صاحب' صدیقی صاحب سے سینئر تھے۔ صدیقی صاحب نے مہرین کا تعارف کروایا۔

''سر! یہ میری بیٹی ہے۔''

''السلام علیکم انکل!'' مہرین نے فوراً سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! جیتی رہو بیٹا۔'' تیمور صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''تیمور صاحب، گھر چلیے، چائے گھر چل کر پیتے ہیں۔ یہاں قریب میں ہی گھر ہے، بس دو گلیاں چھوڑ کے۔''

تیمور صاحب تو خود بھی یہ ہی چاہ رہے تھے سو تھوڑی سی پس و پیش کے بعد مان گئے اور دو گھنٹے کی اس نشست میں تیمور صاحب ان لوگوں کے بارے میں کافی کچھ جان چکے تھے۔

گھر پہنچے تو وہاج کا موڈ سخت خراب تھا۔

''آپ کتابیں خریدنے گئے تھے یا چھپوانے۔''

''بس یار! شاپ پر ایک لڑکی مل گئی تھی، اپنے والد صاحب کے ساتھ تھی۔ وہ لوگ مجھے اپنے گھر لے گئے، بس وہیں پر ٹائم لگ گیا۔'' تیمور صاحب نے انتہائی خوش گوار موڈ کے ساتھ بتایا۔

''ہیں......؟'' وہاج نے آنکھیں پھاڑ کر اور منہ کھول کر انہیں گھورا۔

''بابا! یہ آپ کی عمر ہے، لڑکیوں کے پیچھے ان کے گھروں میں جانے کی۔''

''کیا کریں بھئی، جس کی عمر ہے وہ تو گھر میں جگو کے ساتھ ٹائم پاس کرتا رہتا ہے۔ اب مجبوراً مجھے ہی جانا پڑے گا لڑکیوں کے پیچھے۔'' مسکراہٹ لبوں سے جدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اپنا نام سن کر جگو، بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

''صاب! آپ کے واسطے چائے لے آئے؟''

''نہیں، ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے منع کیا۔ ''بلکہ میرے لیے روٹی بھی مت بنانا۔''

جگو واپس چلا گیا۔ اب روئے سخن واپس وہاج کی جانب کیا۔

''ایسی مزے دار چائے تھی کیا بتاؤں اور ایسے ایسے لوازمات انہوں نے سامنے ڈھیر کر دیے، مانو میں تو پھٹنے کے قریب ہو گیا۔'' انہوں نے انتہائی خوش گوار موڈ کے ساتھ وہاج کو بتایا، جو آنکھیں چھوٹی کیے ماتھے پر بل ڈالے باپ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''اکلوتا بیٹا یاد نہ آیا، اتنی چیزوں سے انصاف کرتے ہوئے، میں یہاں جگو کے ہاتھ کے چائے نما جوشاندے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔''

''بس تھوڑے دن کی بات ہے، اللہ نے چاہا تو جلد ہی اس گھر میں چائے بنانے والی آ جائے گی۔ سمجھو اس چائے نما جوشاندے سے جان بس چھوٹنے ہی والی ہے۔'' وہ اندر کمرے کی طرف بڑھے۔

''ارے سنیں تو۔'' وہاج نے آواز دی۔

''بولو۔'' وہ رکے۔

''اس ساری اسٹوری میں جھوٹ کتنے فی صد ہے؟''

''صفر فی صد۔'' وہ کہہ کر رکے نہیں۔

وہاج حیران و پریشان بیٹھا رہ گیا۔

''یا اللہ! میری نئی امی تو نہیں آنے والی کہیں؟''

☆ ✿ ☆

احمر، ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے انہیں تسلی دے رہا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں' اللہ بہتر کرے گا۔ اسی میں کوئی بہتری ہو گی نغمہ کے لیے۔''

صبح سائرہ خالہ کا فون آیا تھا، کہہ رہی تھیں کہ فیصل آباد والوں نے آنے سے معذرت کر لی ہے۔ ان کے لڑکے کی مرضی کہیں اور تھی، ماں، بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہو گئیں۔

صبح سے امی اسی بات کا غم منا رہی تھیں، بہوئیں، بیٹے ہر ممکن طریقے سے انہیں بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس بات کے ختم ہونے سے دو افراد بہرحال بہت مطمئن تھے، ایک تزئین اور دوسری نغمہ۔

☆ ✿ ☆

''یہ آپ میرا رشتہ لے کر جا رہے ہیں یا اپنا نکاح پڑھوانے جا رہے ہیں؟''

تیمور صاحب کوئی تیسری بار آئینے کے سامنے کھڑے اپنا جائزہ لے رہے تھے۔ کبھی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرنا شروع کر دیتے، کبھی پہلے سے سیٹ بالوں کو مزید سیٹ کرتے، آخر وہاج سے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھا۔

''برخوردار! آخر کو، کوئی عزت ہے میری بھی۔'' انہوں نے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے وہاج کو جواب دیا۔

''مطلب یہ کہ اگر آپ کی تیاری میں خدانخواستہ انیس بیس کی کسر رہ گئی تو آپ کو بے عزت کر کے نکال دیا جائے گا۔''

''بھئی سمجھا کرو نا، امپریشن اچھا پڑے گا۔ وہ لوگ سوچیں گے باپ اتنا ہینڈسم اور ڈیشنگ ہے تو بیٹا نہ جانے کتنا خوبرو ہو گا۔''

''صاب! اس کے بعد جب چھوٹے صاب کو دیکھ کر ان پر بجلی گرے گا تب آپ کیا کرو گے؟''

ایسے موقع پر جگو کی زبان میں کھجلی نہ ہو یہ تو ممکن ہی نہیں تھا مگر آج، وہاج کو جگو کی کوئی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔

''بابا! آپ غالباً بھول رہے ہیں کہ آپ اپنے کولیگ کی صاحب زادی کا رشتہ مانگنے جا رہے ہیں۔ اور یہ کولیگ دن میں پچاس بار تو ضرور ہی آپ کی صورت ملاحظہ کرتے ہوں گے لہٰذا یہ اتنی تیاری میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''صاحب زادے، آپ بھی غالباً یہ بھول رہے ہیں کہ میں آفس میں ان کولیگ سے روز کسی اور حیثیت سے ملتا ہوں۔ آج ان کے ہاں کسی اور حیثیت میں جا رہا ہوں۔'' ذرا بھی برا مانے بغیر بولے۔

''ویسے بابا! اگر آپ کے کولیگ کی بیٹی مجھے پسند نہ آئی تو......؟''

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا، یاد ہے تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ میری یادداشت لڑکیوں کے معاملے میں بہت اچھی ہے۔''

''اس بات کا یہاں کیا ذکر؟''

''اسی بات کا تو ذکر ہے یہاں۔'' انہوں نے زیرلب مسکراتے، وہاج کو دیکھا۔

''یہ آپ کی پُراسرار حرکتیں کم سے کم میری سمجھ سے تو باہر ہیں۔''

''یار جہاں بتیس سال گزار لیے وہاں چند دن اور سہی، سب سمجھ میں آ جائے گا۔''

''ویسے ایک تصویر تو میرا حق ہے، کم سے کم میں ایک نظر تو لڑکی کو دیکھ لوں۔''

''تم نے لڑکی کو دیکھا ہوا ہے۔'' وہ کہہ کر باہر کی جانب بڑھے۔

''ہیں...... میں نے لڑکی کو دیکھا ہوا ہے، کہیں صبا قمر کا تو رشتہ لے کر نہیں جا رہے۔''

☆ ✿ ☆

تزئین نے تیسری بیل پر امی کی کال ریسیو کی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ بولیں۔

''تزئین، مہرین کا بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ تمہارے ابو کے آفس کے ساتھی ہیں، انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا ہے۔'' اب وہ اسے لڑکے کے کوائف بتا رہی تھیں۔ خوشی ان کی آواز سے چھلک رہی تھی۔ ''ان لوگوں کو جلدی ہے' اسی ماہ شادی کے لیے کہہ رہے ہیں' پر میں نے کم سے کم دو ماہ کا وقت مانگا ہے۔'' وہ جلدی جلدی سب کچھ بتا دینا چاہ رہی تھیں۔

''اچھا تزئین! تمہیں یہ بتانا تھا کہ کل ہم لوگ تمہاری طرف آ رہے ہیں، عثمان کے لیے نغمہ کا ہاتھ مانگنے۔''

تزئین تو خوشی کے مارے گنگ رہ گئی۔ ''سچ امی!''

''ہاں تو اور کیا، میرے بچے کی خوشی میری خوشی۔ بس اللہ خیر سے دونوں کے فرض سے ایک ساتھ ہی فارغ کر دے۔''

''اتنی ڈھیر خوشیاں ایک ساتھ، شکر واجب ہے۔'' تزئین اپنی خوشی میں احمر کو شریک کرنے چل دی۔

☆ ✿ ☆

''صاحب زادے سوچا تو یہ تھا کہ سرپرائز کو آخر دم تک سرپرائز ہی رکھا جائے پر ایسا ہے کہ یہ راز پیٹ میں رکھ رکھ کر اب پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے ہیں۔'' تیمور صاحب کالی شیروانی میں ملبوس وہاج کے سر پر گولڈن کلاہ رکھتے ہوئے بولے۔

''دوسرے یہ کہ اچانک ملنے والی خوشی کہیں تمہیں ہوش و خرد سے بیگانہ ہی نہ کر دے، سو یہ راز

افشا کیے دے رہا ہوں۔“

”کیا اس بات کا اندازہ مجھے خود لگانا ہے کہ بات کس تناظر میں کی جا رہی ہے؟“ وہاج نے بابا کے کندھے پر سے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

”میاں، تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جو تم پر مرمٹی تھی۔“

”اس نے صرف مجھے دیکھا تھا۔“ وہاج کے منہ سے کراہ کی صورت یہ جملہ نکلا۔

”اس نے تمہیں مخاطب بھی کیا تھا۔“

”بھائی سمجھ کر۔“ وہاج نے منہ بنایا۔

”اور اس کے بعد وہ تمہیں آئی سی سی میگا مارٹ میں ملی تھی۔“

”اس وقت جب کہ میری بارات کی روانگی میں محض چند منٹ رہ گئے ہیں، یہ جو آپ میرے زخموں پر نمک پاشی کر رہے ہیں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

”نمک پاشی نہیں کر رہا بیٹا! تمہارے دل پر لگے زخموں پر مرہم رکھنے جا رہا ہوں۔“

”اس لڑکی نے تم سے جھوٹ بولا تھا، نہ وہ شادی شدہ ہے نہ بچوں والی۔“

”آپ کو کیسے پتا؟“ وہاج کو کرنٹ لگا۔

”مجھے ملی تھی وہ......“

تیمور صاحب نے دھماکا کیا۔

”کب، کہاں......؟“ وہاج کے لہجے کی بے چینی محسوس کر کے تیمور صاحب مسکرائے۔ ”اسی دن، جب میں کتابیں لینے گیا تھا اور اپنے کولیگ کے گھر سے بہت اچھی سی چائے پی کر واپس آیا تھا۔

”ہاں، مگر یہاں پر اس لڑکی کا کیا ذکر؟“

”اب تو اسی لڑکی کا ذکر ہوگا صاحب زادے! فی الحال تو بس اتنا جان لو کہ اس کا نام مہرین ہے۔ آج سے پہلے تک مہرین صدیقی تھا، آج کے بعد مہرین وہاج ہوگا۔ باقی کی تفصیلات اسی سے پوچھ لینا، بس چند گھنٹے ہی کی تو بات ہے۔

چلو، اب نکلو...... دیر ہو رہی ہے۔ ارے جگو! دروازے ٹھیک طرح سے لاک کر دینا۔“ تیمور صاحب بولتے بولتے باہر کی طرف بڑھے۔

ان کے نکلنے کے بعد سکتے میں کھڑے وہاج کو ہوش آیا۔

”ارے رکیے تو بابا...... بات تو سنیں۔“ وہ ان کے پیچھے لپکا۔

☆ ☆

”تم دلہن بن کر اس قدر حسین لگو گی، یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یار! ایمان سے، کمال کرتے ہیں یہ پارلر والے بھی۔“ عثمان نے اپنی دلہن کو دیکھ کر جو پہلی بات کی وہ یہ تھی۔

اب دلہن کا پارہ چڑھنا تو یقینی تھا۔

”آپ مجھے یہ بتا رہے ہیں کہ میں جو اس قدر حسین لگ رہی ہوں سب پارلر والوں کا کمال ہے۔“ اس نے بھی شرمانا ورمانا ترک کر کے دوبدو مقابلے کا فیصلہ کیا۔

”ہاں...... نہیں۔“

دلہن کے تیور خاصے جارحانہ تھے۔

”وہ...... میں تو بس یوں ہی ایک بات کر رہا تھا، اصل میں مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم میری راتوں کی نیندیں اڑانے والی حسینہ، مجسم ہو کر میرے ہی کمرے میں، میرے سامنے، میرے اس قدر قریب بیٹھی ہو۔“ آواز سرگوشی میں ڈھلی۔

”ایک چٹکی کاٹ لوں، یقین آ جائے گا۔“ اس کی آواز بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس بات پر عثمان کا جان دار قہقہہ حلق سے برآمد ہوا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، تمہاری بات چیت ہی مجھے چٹکیوں کی طرح محسوس ہو رہی ہے۔“

”کیا آپ آج کی رات بھی بس بونگیاں ہی مارتے رہیں گے۔“ نغمہ نے اپنے ہاتھوں کی مہندی کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

عثمان نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کیا۔

”ادھر دیکھو میری طرف۔“

نغمہ نے نظریں اٹھائیں، وہ اسی کو دیکھ رہا تھا، جلدی سے پلکیں گرائیں۔ ساری طراری ہوا ہوئی۔

”نہیں، آج کی رات بونگیاں نہیں ماریں گی آج کی رات کا پلان کچھ اور ہے۔“ وہ کچھ شریر ہوا، کھسک کر تھوڑا سا مزید اس کے قریب ہوا۔

وہ اپنے آپ میں مزید سمٹی۔

وہ رات قطرہ قطرہ رحمت بن کر محبت کرنے والوں پر برستی رہی، یہ رات بہت سے دلوں پر شکر بن کر اتری تھی۔

☆ ☆

”مہرو! چھ ماہ ہو گئے ہماری شادی کو۔“

”صرف چھ ماہ۔“ سارا زور صرف پر تھا۔

”اب تو مان جاؤ کہ تم مجھ پر مرمٹی تھیں اور تم نے مجھے جان بوجھ کر مخاطب کیا تھا۔“ وہاج نے اس کی ایک چھوٹی سی لٹ کو اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے پھر سے وہی موضوع چھیڑا جو مہرین کی چڑ تھا۔

”ہرگز نہیں، یہ جھوٹی بات آپ مجھ سے کبھی نہیں منوا سکتے۔ مجھے آپ پر عثمان کا گمان ہوا تھا۔“

”دیکھو مہرین!“ وہ کھسک کر اس کے قریب ہوا۔ ”پہل تمہاری طرف سے ہوئی تھی، یہ تو مانتی ہو نا۔“ اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ پہل آپ کی طرف سے ہوئی تھی۔ آپ حد درجہ کنفیوز تھے۔ بڑی ہمت کر کے آپ نے میرا ہاتھ تھاما تھا اور انگوٹھی پہنائی تھی۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔

”اُف...... میں شادی والی رات کی بات نہیں کر رہا، میں اپنی پہلی ملاقات کی بات کر رہا ہوں۔“ اس کے وجود سے اٹھتی کولون کی مہک مہرین کو بے خود کر رہی تھی۔

”میری پہلی یادداشت تو شادی والی رات سے شروع ہوتی ہے، اس سے پہلے کا سب ڈیلیٹ ہو گیا۔“ مہرین نے اس کے بال خراب کیے۔

”تمہیں پتا ہے مہرو!“ وہاج نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب کیا۔ ”میں نے واپس آ کر بابا کو بھی بتایا تھا کہ آج ایک لڑکی مجھ پر مرمٹی۔“

”کیا......؟“ وہ اتنے زور سے چیخی کہ وہاج نے کان پر ہاتھ رکھا۔ ”آپ نے بابا کو وہ فضول سی بات بتائی۔“

وہاج نے اس کا بازو پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچا۔

”پاس رہ کر بات کرو، دور جانے کا مذاق نہیں ہے۔“ مہرین کچھ مغرور ہوئی۔

”پتا ہے مہرو! مجھے تم سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی۔ دل نے بے اختیار خواہش کی تھی تمہیں اپنا شریک سفر بنانے کی۔ دوسری ملاقات میں شاید میں اظہار محبت کر بھی دیتا جو تم شوہر اور بچوں والا بم نہ گرا دیتیں مجھ پر۔“

کمرے میں مہرین کا نقرئی قہقہہ گونجا۔

”مجھے بھی آپ سے......“ اس نے وقفہ دیا۔

”بات مکمل کرو نا۔“ وہاج نے اس کی چھوٹی چھوٹی لٹوں کو سائیڈ پر کیا۔

”مجھے بھی آپ سے شدید محبت ہو گئی تھی شادی کی رات۔“ اس نے جملہ مکمل کر کے طمانیت سے اپنے شریک سفر کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہاج نے بے ساختہ ایک آہ بھری۔

زندگی انہیں دیکھ کر مسکرا دی۔

☆

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول
یہ گلیاں یہ چوبارے
فائزہ افتخار
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

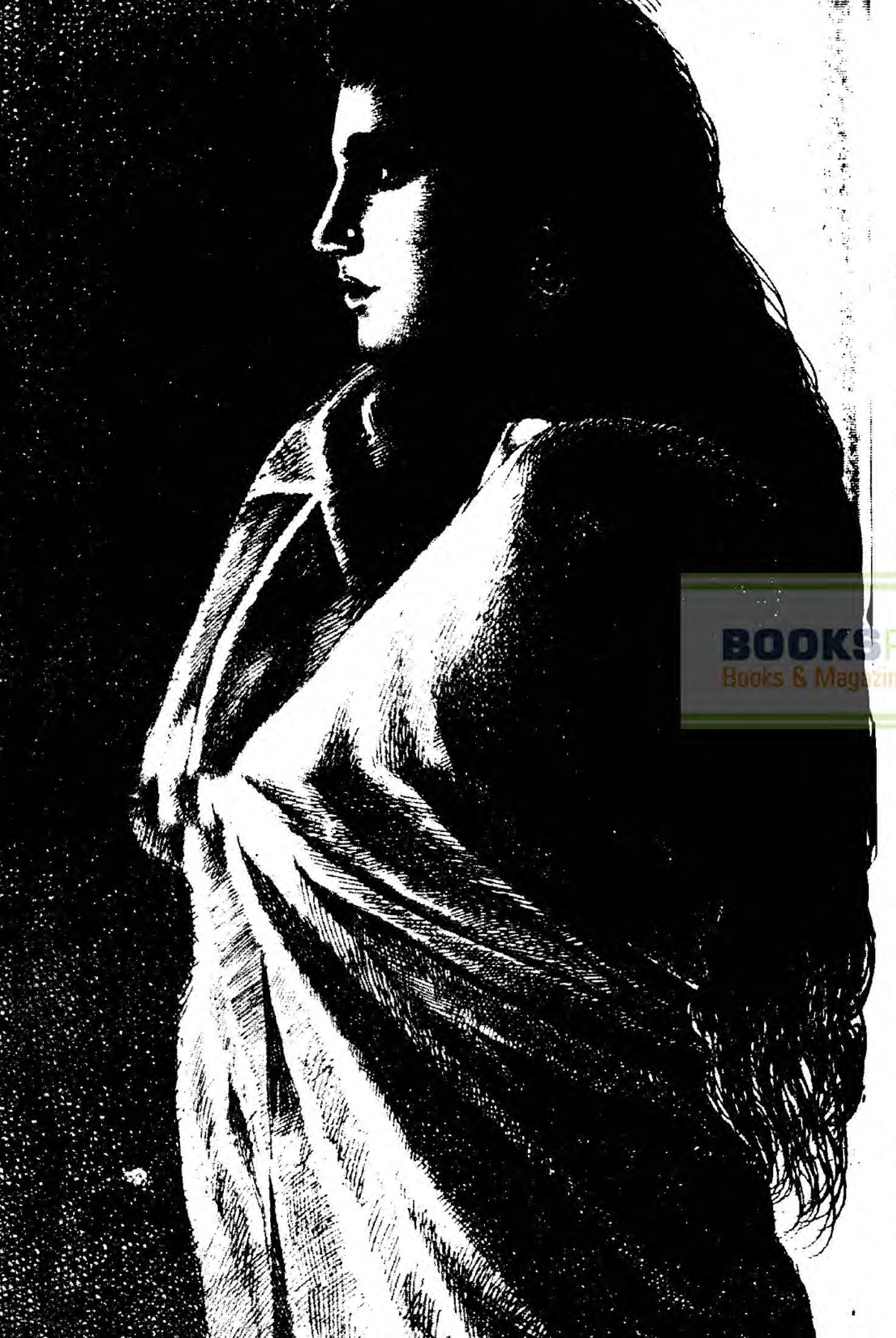

ایمل رضا

بڑی بی

وہ اس گھر کی بڑی تھیں اور ‘‘بڑی’’ کی جتنی قسمیں ہوسکتی تھیں وہ ان کے ساتھ منسلک تھیں۔ بڑی بہن، بڑی بھابھی، بڑی بہو، بڑی بیٹی، بڑی سمجھدار، بڑی سلیقے والی، بڑی عقل مند، غرض کوئی ایک بھی ‘‘بڑائی’’ ایسی نہیں تھی جو ان کے ساتھ لگنے سے رہ گئی ہو۔

ایک ہی گھر میں ان کے ابا اور چچا رہتے تھے۔ ایسے وہ بڑے بھائی کی بڑی بیٹی ہوئیں۔ پھر چچا کے گھر کی بڑی بہو بن گئیں۔ گھر کے مشترکہ نو بچوں کی بڑی ماما، دو دیوروں اور ایک نند کی بڑی بھابھی، اپنے تین چھوٹے بھائیوں کی بڑی بہن، ماں کی لاڈلی بڑی بیٹی، اور ساس کی لاڈی بڑی بہو۔ آسان الفاظ میں اس بڑے سارے خاندان کی ہر طرح سے، ہر طرف سے وہ ‘‘بڑی بی’’ تھیں۔

درخت کے پتے تو ان سے پوچھے بغیر ہوا سے ہل سکتے تھے لیکن اس گھر کا نظام ان کے بغیر گھڑی بھر نہیں چل سکتا تھا۔ اسکول میں وہ بڑی نالائق رہی تھیں (کہا ہے نا ‘‘بڑی’’ ان کے ساتھ ہمیشہ نتھی رہا ہے) اسکول کی نالائقی کو انہوں نے گھر میں ‘‘بڑی لیاقت’’ دکھا کر حساب برابر کرلیا۔ کیا نندیں، کیا دیورانیاں اور کیا ان کے بچے بچیاں، سب ہی ان کے بغیر زنگ لگے تالے تھے۔ ان کی چابی نہ لگتی تو ٹھس پڑے رہتے۔ جہاں دیکھو انہیں آواز پڑ رہی ہوتی اور وہ بھی مورنی بن کر ادھر ادھر خراماں خراماں پھرتیں۔

سسرال اور میکہ ایک ہی تھا تو ابا، اماں، ساس سسر، سب ہی ان کے سہارے پر تھے۔ نہ ماشہ نہ تولہ، یہ گھر رتی بھر کے لیے ان کے بغیر سانس نہیں لیتا تھا۔ کسی کو کپڑے لینے ہیں تو بازار وہ ہی جائیں گی، کسی کا رشتہ ہے تو بس وہی جا کر لڑکی، لڑکا پسند کریں گی۔ گھر میں کوئی تقریب ہے تو انتظامات تک ان کی زیر نگرانی ہوتے تھے۔ مرد تک ہاتھ جھاڑ کر کہہ دیتے تھے۔

‘‘ہم نہیں جانتے بھئی! بی آپا سے پوچھو۔’’

بی آپا کا سینہ پھول جاتا۔ سوچتیں جو اگر ‘‘میں’’ نہ ہوتی تو یہ سب کارخانہ خاندان کیسے چلتا۔

کھانے وہ ایسے بناتیں کہ کیا کوئی بناتا ہوگا۔ خاص کر بریانی تو ایسی کہ کیا مجال کسی نائی، شیف یا باورچی کی کہ اُن کی بریانی کی برابری کرنے کی گستاخی کرلیتا۔ گھر کے سب مرد — عورتیں اور بچے تک، کہیں سے بھی بریانی کھا آتے، ان کی بریانی کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔

‘‘بریانی تو بڑی بھابھی بناتی ہیں بس......’’

ایسا نہیں تھا کہ سب نے مل ملا کر یا چالاکی سے زبردستی ان پر سارے گھر کا بوجھ ڈال دیا تھا یا وہ ان کی خوشامد کرکے ان سے کام نکلواتے تھے۔ بس سب نے گھر کا یہ نظام شروع سے ایسے ہی چلتے ہوئے دیکھا تھا کہ سب ‘‘بڑی بی’’ ہی کر رہی ہیں۔ وہی اس خاندان کی اصل بڑی ہیں۔ ان کی کرتا دھرتا اور یہ ایسے ہی ہوگا، جیسے ہو رہا ہے۔

ہر طرح سے بڑی بی نے یہ نظام ایسا کیوں بنا دیا تھا، وہ خود بھی نہیں جانتی تھیں۔ وہ بس اب تک اتنا جان پائی تھیں کہ دنیا کی کسی نہ کسی شے کو ان کے تابع ہونا چاہیے۔ جو ان کے بغیر حرکت نہ کرسکے۔ ہل نہ سکے۔ وہ نہ ہوں تو سب رُک جائے، ختم ہوجائے۔ برباد نہ ہو لیکن ویسا آباد بھی نہ رہ سکے۔

بس...... اتنی سی خواہش تھی ان کی...... کہ کچھ تو

ایسا ہو جوان کے بغیر ''ہضم'' جائے۔

اجاڑ......ویران، بے آباد......وہ نہ ہوں تو......

تھوڑی سی کمینی سی خواہش تھی لیکن ایسی ناجائز بھی نہیں تھی۔ اس گھر کو انہوں نے اپنی ذات کا مرکز بنا لیا تھا۔ یہ گھر سارا جہاں تھا اور وہ اس جہاں کی ''جہاں آرا''۔

☆☆☆

وہ صبح سویرے اٹھتیں اور گھر بھر میں ہوا کی طرح پھیل جاتیں۔ جہاں دیکھو انہیں محسوس کیا جا سکتا۔ جدھر جاؤ، انہیں پاؤ والا حساب بڑی آسانی سے ہو گیا۔ ویسے وہ یہ نہ کرتیں تو اور کیا کرتیں۔ چھوٹی دیورانی کو تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ آلو گوشت اور قورمے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ فریج میں جگہ کیسے بنائی جاتی ہے۔ سالن کو کن ڈبوں میں نکال کر رکھا جاتا ہے۔ روٹی کے ہاٹ پاٹ کو دھو کر دھوپ لگوالی جاتی ہے، بساند نہیں آتی۔ پر وہ کیسے جانے کہ......

اور وہ سب سے چھوٹے دیور کی پڑھی لکھی بیوی، وہ تو بس یہ جانتی تھی کہ پیزا ڈلیوری کیسے کروائی جاتی ہے۔ وہ سارے گھر والوں کو گھر بیٹھے ٹیکسیاں بک کروا کر دیتی رہتی تھی۔ اسے بس یہی دو کام آتے تھے۔

باقی بچے گھر کے سارے مرد، تو انہیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ مستری اور مزدور میں کیا فرق ہوتا ہے۔ پلمبر سے نلکوں اور پائپوں کے علاوہ، کھڑکیوں کے چوکھٹے بھی ٹھیک کروائے جا سکتے ہیں۔ ڈرائیور سے گیٹ کو پینٹ کروایا جا سکتا ہے۔ مالی سے کچن کی سبزیاں کٹوائی جا سکتی ہیں۔ رہ گئیں بچی ساس اور سگی والی اماں! انہیں تو بس ایک ہی بات آتی تھی۔

''بڑی سے پوچھ لو...... بڑی جانیں اور تم جانو۔''

بڑی کو ایسے وقت میں بڑی زور سے ہنسی آتی تھی۔ ''میں نہ ہوتی تو یہ میری مائیں، کیسے اپنے کاموں کے لیے راہ دیکھا کرتیں۔''

دیور بولائے بولائے پھرتے۔

''بڑی بھابھی! یہ دیکھیں، یہ شرٹس کیسے تنگ ہو گئیں، اتنی مہنگی لی تھیں۔ اس کا تو دیکھیں، سارا رنگ ہی اڑ گیا۔''

''بھائی! سوتی شرٹیں تھیں، دھلیں تو تنگ ہو گئیں اور اس والی کا رنگ نہیں اڑا، کسی دوسرے کپڑے کا رنگ چڑھ گیا ہے اس پر۔ کس سے دھلوائی تھیں تم نے؟''

''یہ سلمٰی نے دھوئی تھیں۔ جو یہ تنگ ہو گئی ہے، یہ اس نے گفٹ کی تھی۔

اے سلمٰی! ایسے سستے گفٹ دیتی ہو مجھے۔ دو دن نہیں چلیں یہ شرٹیں۔ مجھ سے تو سونے کی چین مانگ رہی تھیں۔''

سلمٰی بڑی بھابھی کے سامنے بہت شرمندہ ہوئی۔ بڑی بھابھی نے اپنی ہنسی بمشکل روک کر رکھی۔

''تو کیا کروں بڑی بھابھی؟'' سلمٰی منمنائی۔

''تم رہنے دو، میں خود ہی دیکھ لوں گی انہیں۔''

انہوں نے بڑی حلاوت سے کہا جیسے ان کے پاس جادو کی چھڑی ہے اور وہ جادو کی چھڑی تقریباً تقریباً سب کچھ ہی ٹھیک کر سکتی ہے۔

''میرے کمرے میں پینٹ تو کروا دیں۔ سچی بڑا گندا سا لگنے لگا ہے کمرہ۔''

دوسرا دیور شور مچاتا تو وہ ایسے بزرگانہ انداز سے سر ہلا دیتیں کہ جیسے وہ مسکرا کر کمرے کی دیواروں کی طرف دیکھیں گی اور ساری دیواریں جگمگ جگمگ شیشے کی طرح چمکنے لگیں گی۔ ویسے کون کہہ سکتا ہے، ان کے پاس یہ ہنر بھی ہو، لیکن انہوں نے کبھی آزمایا ہی نہ ہو۔

غرض گھر کا ایسا کون سا فرد تھا جو ان کا محتاج نہیں تھا۔ ان کے بغیر جس کا کام چل رہا تھا۔ جس کے دل میں ان کے نام کی ''بڑی بی بڑی بی'' نامی دھڑکن فٹ نہیں تھی۔ حتیٰ کہ چھوٹے بچے تک اسکول میٹنگ میں انہیں گھسیٹ کر لے جاتے تھے۔

''نہیں بڑی ماما! بس آپ ہی جائیں گی ہمارے ساتھ، ماما کو ٹھیک سے بات کرنا نہیں آتی۔''

وہ بڑی خوشی سے جاتی تھیں۔ وہ نہیں جائیں گی تو کون جائے گا۔ اس اتنی بڑی حویلی کا کاروبار کیسے چلے گا۔

''مالی سے کون کہے گا کہ کوئی گلاب، چنبیلی، موتیا لا کر لگاؤ اور دیکھو انگلی برابر گھاس کاٹنا، سارا لان ٹنڈ منڈ نہ کر دینا۔''

اور دھوبی کو ہر تین مہینے بعد گھر بھر کے پردے اتروا کر کون دے گا کہ ''دیکھو بھائی! تین ہزار کا ایک پردہ ہے، ایسے نرم ہاتھوں سے دھونا کہ پردے پھول کی طرح کھل اٹھیں، مسل نہ جائیں یہ کلیاں۔''

ہر مہینے، سارے کچن کے سارے خانے کھلوا کر، مسالے باہر دھوپ میں رکھوا کر کون کچن کا کونا کونا صاف کروائے گا۔ رزق کی جگہ تھی بھئی، صفائی ستھرائی ہونی چاہیے۔ سردی گرمی میں بستر نکالنا، دھلوانا، دھوپ لگوانا، پھر ایک ایک کے کمرے میں بھجوانا، کون کرے گا یہ سب، کس میں ہے اتنی ہمت۔ کون ہے اتنا جی دار......؟

☆☆☆

''بڑی بھابھی! گیٹ کے باہر کچھ گملے وغیرہ رکھوا دیں۔ سچی بڑے اچھے لگتے ہیں۔''

''بھئی اپنی بیوی سے کہو۔'' وہ تھوڑا سا اترا گئیں۔ اپنی بیوی کو چھوڑ کر دیور نے آفس سے آتے ہی بڑی بھابھی سے کہا تھا۔ اترانا تو بنتا تھا۔

''یہ اس لائق ہوتیں تو آپ سے کہتا......'' دیور نے بڑی بھابھی سے بڑے لاڈ سے کہا۔

بڑی بھابھی تو بس اتنا خوش ہوئیں کہ اسی وقت مالی بابا کو فون کھڑکایا اور گملوں کا کہا۔

''لو اب کہتے ہیں کہ نرسری آجائیں اور خود پسند کر لیں۔'' انہوں نے فون بند کر کے ذرا بلند آواز سے کہا۔

دو سال کا دودھ پیتا بچہ بھی جانتا تھا کہ نرسری صرف وہی جا سکتی ہیں۔ اس گھر کی کسی عورت، مرد، لڑکے اور بچے میں اتنی سمجھ بوجھ بھی نہیں ہے کہ وہ نرسری جا کر گملا پسند کر کے لے آتا یا یہی طے کر لیتا کہ گیٹ سے باہر کس پھول کا پودا رکھا جائے گا۔

''ہائے، میں نہ ہوتی تو بھئی پتا نہیں میرے اماں باوا کے اس خاندان کا کیا بنتا......'' تھک کر وہ رات کو بیڈ پر سوتیں تو آپوں آپ ہی یہ سوچ ان کے ذہن میں آ جاتی تھی۔ وہ کوئی احسان نہیں جتاتی تھیں۔ گردن اکڑا کر اس کا اعلان بھی نہیں کرتی تھیں۔ بس یہ ذرا سی سوچ ان کے دل میں سما جاتی تھی۔ یہ چھوٹا موٹا تکبر ہو سکتا ہے۔ لیکن جو بھی تھا، یہ ان کا کل اثاثہ تھا۔

''میں نہ ہوتی تو......سارا گھر الٹ پلٹ جاتا......'' یہ احساس ان کی ساری خوشی تھا۔

☆☆☆

انہیں یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی وہ اتنی بیمار ہوئی ہوں کہ دو دن سے زیادہ بستر پر رہی ہوں۔ وہ ہر وقت گھر کے نظام میں کچھ ایسے دخل دیتی رہتی تھیں کہ ہر انسان کو لگتا تھا کہ وہ ہر وقت، ہر جگہ موجود ہیں۔ بورڈ کی تیاری کرنے والا حماد جب رات کو دو بجے اپنے لیے چائے بنانے اٹھا تو اس نے کچن میں بڑی تائی کو پایا۔ چائے کا کپ بڑی تائی نے ہی اسے بنا کر دیا۔

سعود اسلام آباد میٹنگ سے صبح چار بجے لوٹا تو گھر کے لاؤنج میں اس نے بڑی آپا کو اخبار پڑھتے ہوئے دیکھا۔ ناشتہ بڑی آپا نے ہی اسے بنا کر دیا اور تو اور چچا کراچی سے رات گئے لوٹے تو گھنٹی بجانے کی نوبت ہی نہیں آئی، سامنے ہی ان کی بڑی بہو کھڑی تھیں۔

اگر وہ نہ ہوتیں تو جانے کب تک چچا گھنٹی بجاتے رہتے، گیٹ پیٹتے رہتے۔

وہ کچھ ہر جگہ، ہر ایک کے لیے اتنی حاضر تھیں کہ انہیں لگتا تھا کہ خدانخواستہ اگر انہیں کبھی کچھ ہو گیا تو اس گھر کے ہر فرد کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

سارے بچے بورڈ میں فیل ہو جائیں گے۔ حج عمرہ پر جانے والے اپنی فلائٹیں مس کر دیں گے۔ دوسرے شہروں سے میٹنگ بھگتا کر آنے والے گیٹ پیٹ پیٹ کر تھک جائیں گے۔ شوگر والوں کی شوگر شوٹ کر جائے گی۔ بی پی والوں کا بی پی انہیں ہارٹ

اٹیک کے کنارے لے جائے گا۔ نومولود مناسب خوارک نہ ملنے کی وجہ سے کمزور ہو کر بیمار ہو جائیں گے۔

احمد کی شادی کسی زبان دراز عورت سے ہو جائے گی۔ سدرہ کسی کم حیثیت کی بہو بن کر چلی جائے گی۔ ابا کا تازہ اخبار ردّی کی ٹوکری میں چلا جائے گا۔ چچا کی کتابیں' پینٹ کرنے والے اٹھا کر لے جائیں گے اور کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیں گے۔ لکڑیوں کی الماریوں کو دیمک کھا جائے گی۔ لان کی گھاس ٹنڈ منڈ میدان بن جائے گی۔

یا اللہ...... اگر انہیں کچھ ہو گیا تو وہ ساری حویلی ویران کر دیں گی...... اپنے پیچھے وہ بہار کو خزاں کر جائیں گی۔

☆☆☆

گھر میں پہننے کے لیے وہ نئے سلیپرز لائی تھیں۔ وہ تو انہیں پہننے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پھسلتے بہت تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ انہیں بدلتیں' وہ سیڑھیوں سے پھسلیں اور اوپر سے دس سیڑھیاں نیچے آ کر گریں۔ کولہے کی ہڈی پر ایسی ضرب آئی کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں اور ان کی چیخوں سے سارا گھر ہل کر رہ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا کہ اگر تین مہینے سے پہلے بیڈ سے پیر نیچے اتارا تو انہیں ساری زندگی کی معذوری سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ ذرا سے دباؤ سے ٹانگ کی ہڈی کھنچ گئی تو وہ چل ہی نہیں سکیں گی یا لنگڑا کر چلیں گی۔ وہ اتنا ڈر گئیں کہ چپ چاپ بستر پر پڑ گئیں۔

وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگیں کہ اب دیکھو کیا حال ہوتا ہے ان کا بھی اور گھر کا بھی۔ وہ دل ہی دل میں فقرے ترتیب دیتی رہتیں کہ صبح وقت پر ناشتہ نہ ملا تو کیسی دھما چوکڑی مچے گی۔ تو وہ کہیں گی۔

''بس تھوڑے دن صبر کر لو میں اٹھ کر کھڑی ہو جاؤں تو سب کچھ پھر سے وقت پر ہونے لگے گا۔''

شجاع خستہ پراٹھوں کے لیے چلاّئے گا' اور پھر بچے لنچ بکس کا ڈھکن کھول کھول کر بدکیں گے۔ اور اماں! اُف ان کا دلیہ! جو ذرا زیادہ پک جائے یا پتلا ہو جائے تو وہ نہیں کھاتیں۔

''دیکھو تو چھوٹی بہو! ایسے پکاتے ہیں دلیہ؟ حلیم کی طرح گھوٹا لگایا ہے اسے؟ دلیہ بھی پکانا نہیں آتا؟''

''اماں! آج بھی ٹھیک نہیں پکا؟''

''ٹھیک بنتا تو میں شکایت کرتی بھلا۔ یا اللہ میری بڑی بہو کو ٹھیک کر دے' کہ مجھ بے چاری کو ناشتہ تو نصیب ہو۔''

''یہ دلیہ کھائیں گی آپ۔'' شجاع کی دلہن پیالہ ہاتھ میں لیے ان کے پاس آئی۔ وہ زیرلب ہنس دیں۔ اماں نے پھر انکار کر دیا ہوگا کھانے سے۔

''اماں نے نہیں کھایا۔''

''اماں تو آج کچھ زیادہ ہی کھا گئیں۔ تھوڑا سا بچ گیا تھا، سوچا آپ سے بھی پوچھ لوں۔''

وہ حیران شجاع کی دلہن کی شکل دیکھنے لگیں۔ جمعہ جمعہ چار دن نہیں ہوئے تھے اسے اماں کے لیے دلیہ بناتے ہوئے اور یہ ان کے برابر کا دلیہ بنانے لگی تھی کہ اماں پیالہ بھر کر کھا گئی تھیں...... جھوٹی۔

''بچوں کو لنچ میں کیا دیا ہے یا وہ آج بھی بدکتے ہوئے گئے ہیں؟'' دلیہ پر تبصرہ چھوڑ کر انہوں نے اس جھوٹی عورت سے اگلا جھوٹ سننے کی ٹھان لی۔

دروازے کے پاس سے گزرتی فاروق کی بیوی رکی۔ ''وہی بھابھی! جو آپ بنا کر دیتی ہیں' ابلے انڈوں اور چکن کے آمیزے کا سینڈوچ۔ کل پراٹھا رول بنا کر دیا تھا۔''

وہ پھر سے زیرلب ہنس دیں۔ کتنا جھوٹ بولتی ہیں یہ۔ بھئی بچے تو آرام سے ان کے پھس پھسے سینڈوچ ڈبوں میں ڈال کر لے گئے ہوں گے...... مکاّر عورتیں......

''واہ چچی، چچی واہ! کیا سینڈوچ بنایا ہے۔'' ان کا چھوٹا بیٹا جو انٹری ٹیسٹ کی تیاری کر رہا تھا' ایک ہاتھ میں کافی کا مگ اور سینڈوچ کی پلیٹ تھامے کمرے میں آیا اور ماں کے سرہانے بیٹھ کر کھانے لگا۔ انہوں نے تیکھی نظروں سے سینڈوچ دیکھا۔ ہو بہو ان کے سینڈوچ جیسا تھا۔ آج دسواں دن تھا انہیں بستر پر اور

یہ...... سینڈوچ ہو بہو ویسا کیسے بن گیا تھا؟؟

''تم نے آج پراٹھا نہیں کھایا؟'' وہ نقاہت سے بولیں۔ (طنز چھپا کر)

''دو پراٹھے کھائے ہیں میری پیاری ماں! صبح فجر کے وقت کا اٹھا ہوا ہوں۔ مامی جی اٹھیں' نماز پڑھی اور مجھے ناشتہ بنا دیا۔ کیا پراٹھے بناتی ہیں وہ چچی! بالکل آپ جیسے۔''

وہ حیران اپنے بیٹے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ کیسا مکار بیٹا تھا ان کا۔ جس عورت کو ٹھیک سے روٹی بیلنی نہیں آتی تھی، وہ ان جیسے بل والے خستہ مزیدار پراٹھے کیسے بنا سکتی تھی۔ دیکھو بھلا آج کی نسل کو۔ کیسے آنکھوں میں دھول جھونکتی ہے۔

سارا گھرانہ ہی ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا۔ دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں اور وہ کہہ ہی نہیں پائیں کہ......

''ارے شرجیل کیوں چلاّ رہے ہو بھئی! دو بٹن ہی ٹانکنے ہیں نا، لاؤ میں ٹانک دوں اور تم نعمان ایسے منہ نہ بناؤ' اگلی بار میں تمہیں تیاری کرواؤں گی، پھر دیکھنا ٹیسٹ میں فرسٹ آؤ گے۔

اماں آپ نے کیا کھا لیا جو شوگر اتنی بڑھ گئی۔ اب کیا انسولین لگوائیں گی آپ۔ توبہ ہے۔

یہ پھر تم گھٹیا لان اٹھا لائیں، سارا رنگ ڈھل کر نکل گیا۔ مجھے ٹھیک ہو لینے دو' جاتی ہوں تمہارے ساتھ اور کرواتی ہوں تمہیں شاپنگ۔

فوزیہ! بھئی ہٹ جاؤ' ایسی کھیر اپنے شوہر کو کھلاؤ گی تو جھٹ اس کے دل سے اتر جاؤ گی۔ دو مہینے ٹھہر جاؤ بنا کر بھجوا دوں گی۔ جتنی جی چاہے کھلانا۔''

☆☆☆

دو مہینے گزر چکے تھے' لمحہ لمحہ ان کا جی جلتا رہا تھا۔ سارا گھر' پورا خاندان خوش باش تھا۔ دونوں دیورانیاں صبح اُٹھ جاتیں اور کاموں میں لگ جاتیں۔ پہلے دو کام والیاں آتی تھیں' اب تین آنے لگی تھیں۔ شجاع مالی کے سر پر کھڑا ہو کر کام کروا لیتا تھا۔ اماں اور چچی ساس نے اپنی نگرانی میں دھلے ہوئے پردے لگوا لیے اور پرانے دھوبی سے دھلوا کر رکھ دیے۔ پیزا ڈلیوری والی نے دو دن میں' چھت کی ٹنکی کو ٹھیک کروا دیا۔ فون کیا، پلمبر گھر آ گیا۔

وہ تین مہینے بستر پر پڑی رہیں' گھر کا نظام پوری آب و تاب سے چلتا رہا۔ سب کے سب جھوٹے مکار۔ کسی نے نہ کہا۔

''بریانی میں وہ بات نہیں۔''

''ارے گھر کیسا گندا ہو رہا ہے' ٹھیک سے صفائی نہیں کروائی۔''

''اری او جمیلہ! یہ فریج کی حالت دیکھی ہے' کیسی بدبو آ رہی ہے۔ تم سارا دن بیٹھ کر کیا کرتی رہتی ہو۔''

''بھئی! گیٹ سے باہر کی صفائی بھی کروا لیا کرو۔ کیسا اجاڑ گھر بنا دیا، بڑی بھابھی ہی کی ہمت تھی جو پھول کی طرح کھلا کھلا رہتا تھا گھر......''

بڑی بھابھی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے' چھڑی کے سہارے سے اٹھیں اور گھر بھر کا جائزہ لینے لگیں۔ دس نئے گملے آ چکے تھے جن میں بڑے تازہ تازہ پھول مہک رہے تھے۔ پورچ کی سیلن اب ختم ہو چکی تھی' ڈلیوری میڈم نے وہاں واٹر پروف پینٹ کروا دیا تھا۔ لان کی گھاس بڑی ہری بھری اور کارپٹ کی طرح ملائم تھی...... اور کچن...... وہاں سے بریانی کی خوشبو آ رہی تھی۔

دیوار کا سہارا لے کر کھڑے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ ان کے بغیر یہ گھر ویران ہو جائے گا۔ خالی خانے تو ویسے ہی بڑی جلدی پُر ہو جاتے ہیں۔ لوگ مر جاتے ہیں اور زندہ لوگ بڑی جلدی ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔

انہوں نے زندگی کو ''کاموں'' میں کیوں لگا دیا۔ کام تو کوئی بھی کر لیتا ہے۔ کام تو ہو ہی جاتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو عبادت میں کیوں نہ لگایا۔ فرض نمازوں کو قضا کیوں کیا۔ کاموں کی قضا تو ہو گئی' اب عبادت کی قضا کون کرے گا؟

انہیں انسانوں کی خوشنودی کی چاہ تھی۔ خدا کی خوشنودی کی چاہ کیوں نہیں......

☆

سمیرا حمید

ٹیولپ

مکمل ناول

”زندگی ایک ساحر ہے اور ہم اس کا جادو“۔

وہ زندگی میں کوئی عظیم کارنامہ انجام نہیں دینا چاہتی تھی، وہ تو بس اپنے شہر شکاگو سے ”نیویارک“ شفٹ ہو جانا چاہتی تھی۔ اسے نیویارک میں رہنے (ذلیل ہونے) اور پڑھنے (آوارہ گردی) کا شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے گدھوں کی طرح کام کیا تھا۔ آندھی، طوفان، بارش، برف باری، بیماری، اس نے کبھی ایک بھی دن جاب سے چھٹی نہیں لی تھی۔ وہ نیوز پیپر ڈالا کرتی تھی۔ ایک سال چھ ماہ اس نے فوڈ بھی ڈلیور کیا تھا۔ ایک ریسٹورنٹ میں وہ ڈش واشر بھی رہی تھی۔ ہفتے میں ایک دن، ایک بلڈنگ کی صفائی کا کام بھی کرتی تھی۔ ویک اینڈ پر تو وہ ڈبل شفٹ میں کام کرتی رہی تھی۔

وہ اپنے گھر کے اس تہہ خانے سے نکل جانا چاہتی تھی جس میں وہ پچھلے پندرہ سالوں سے رہائش پذیر تھی۔ نہیں، وہ کوئی ایسی بے چاری اور مظلوم سی لڑکی نہیں تھی۔ وہ تہہ خانے میں اس لیے بھی رہائش پذیر نہیں تھی کہ اس کی سوتیلی ماں نے اسے اُوپر کوئی کمرہ نہیں دیا تھا اور وہ اس سے دن بھر گھر بھر کے کام کرواتی تھی، کھانے کے لیے بچا ہوا کھانا دیتی تھی اور فارغ وقت میں اسے خوامخواہ مارتی پیٹتی رہتی تھی۔

وہ وہاں اس لیے تھی کہ وہ اپنی چھوٹی سگی بہن کے ساتھ کمرہ شیئر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بھائی سے لڑ جھگڑ کر اس سے اس کا کمرہ لینا نہیں چاہتی تھی۔ سگے ماں باپ اس کے لیے نیا گھر خرید نہیں سکتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے خوابوں کو سینے سے لگا کر، سامان اٹھا کر نیچے آ گئی تھی اور وہاں اپنا جہاں آباد کر لیا تھا۔

اس جہاں میں معمولی نوعیت کا زلزلہ اس وقت آیا جب اس کا چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوا اور اس

کا پیر فریکچر ہو گیا تھا۔

"تم جا نہیں رہیں نیویارک؟"

ماما نے اپنی ہنسی چھپا کر اس سے پوچھا تو اس نے غصے سے اپنا منہ تکیے میں دے لیا تھا۔

ہر بندہ اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ جیسے اس نے کوئی انہونا ہی خواب دیکھ لیا ہو۔

دس دن کے بیڈ ریسٹ کے بعد وہ لنگڑا کر کالج تو جانے لگی تھی، لیکن اپنی جاب پر نہیں جا سکی تھی۔ وہ فکر مند تھی۔ اگر وہ یونیورسٹی کی فیس کے پیسے جمع نہیں کر سکی، تو وہ کیا کرے گی۔ اسے گیپ دینا ہوگا۔ گیپ کا مطلب تھا کہ اسے اس گھر، اس تہہ خانے میں ایک اور سال گزارنا ہوگا۔ باہر دنیا کہاں کی کہاں پہنچ جائے گی اور وہ یہاں اکیلی سڑتی رہے گی...... لوگ کیا کہیں گے...... دنیا کیا سوچے گی......

"تمہارے دماغ کے پرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں، وقت نکال کر انہیں فکس کروالو۔"

لوگ یہ کہہ رہے تھے۔ یعنی اس کے گھر والے۔ اس کے سگے والے پاپا۔

"پتا نہیں کس طرح کے خوابوں کی دنیا میں رہتی ہو تم۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ کوئی جادو ہوگا اور تمہارے سب خواب پورے ہو جائیں گے۔ تم بے وقوف بھی ہو اور نکمی بھی......"

دنیا یہ سوچ رہی تھی۔ اس کی سگی والی ماں......

ویسے جتنی باتیں اس بے چاری نے سن لی تھیں، چھوٹے موٹے "جادو" کو اس کی زندگی میں آ جانا چاہیے تھا۔

خیر۔ دو ماہ بعد اس نے جیسے تیسے پھر سے جاب شروع کر دی تھی۔ پاپا نے کہا بھی تھا کہ وہ خود کو ہلکان نہ کرے، وہ اس کی فیس دے دیں گے۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت غیرت مند تھی، اور باپ سے پیسے لینا اسے گوارا نہیں تھا۔ بلکہ اس لیے کہ پاپا اسے پیسے دیتے تو دوسرے شہر جانے سے روک بھی لیتے۔ وہ جذباتی طور پر اچھی طرح سے بلیک میل کر لیتے تھے۔ وہ جذباتی طور پر بری طرح سے بھی بلیک میل نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اس کہانی کا ہیرو "نیویارک" نہیں ہے۔ نہ کہانی کا تعلق اس کے پیر کے فریکچر ہونے سے۔ فی الحال اس کہانی میں ایک عدد جپسی آ رہی ہے، آپ اس پر توجہ دیں......

☆☆☆

"اوہ! تم آ گئیں۔ بہت انتظار کروایا تم نے؟"

دروازہ کھول کر وہ دو، تین سیکنڈ تو حیران ہی کھڑی رہی پھر لہک کر بولی۔ وہ کچھ اتنا زیادہ ٹھمکی تھی کہ اس کے گلے میں پڑے موتی، منکے اور پتھر جھولنے لگے تھے اور جھنکار پیدا ہوئی تھی۔

"آپ کا آرڈر......" اس نے پیزا باکس اس کے سامنے کیا۔ وہ صرف تین منٹ لیٹ تھی اور میڈم کہہ رہی تھیں کہ بہت انتظار کروایا۔ اس کا منہ بن گیا۔ اب یہ جپسی کھلے پیسے لینے اندر جائے گی تو پورے تیس منٹ لگائے گی۔

"اندر آ جاؤ......"

وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور بہت بڑی ساری مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اسے دیکھا۔ اسے اندر جانا تو نہیں تھا لیکن اس کا زخمی پیر ابھی پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوا تھا، اور وہ کچھ دیر بیٹھ بھی جانا چاہتی تھی۔ دل تو اس کا یہ بھی تھا کہ اس کو اپنا ہاتھ دکھائے اور پوچھے کہ "کہ میں کب تک بیس پچیس کروڑ ڈالرز کی مالکن بن جاؤں گی؟ بس میں پیسے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہتی ہوں تاکہ دل کھول کر انسانیت کی خدمت کر سکوں۔

"میرا خیال ہے، جلد ہی تمہیں انسانیت کی خدمت کا ایک موقع ملنے والا ہے۔ یہ لو...... یہ اب تمہارا ہے......"

جپسی نے ایک چھوٹا سا رول اس کے سامنے کیا، جو کہ پرپل ربن سے بندھا ہوا تھا۔ وہ جیسے کانووکیشن پر ڈگری ملتی ہیں، ویسے۔ چونکہ وہ جپسی تھی اور اس کے گھر میں ادھر ادھر کچھ جادوئی چیزیں بھی بکھری ہوئی تھیں، تو اس نے بہت شوق سے اس رول کو پکڑا، ربن کھولا اور اسے دیکھا۔ وہ چھوٹے سائز کا موٹا، کھردرا، ہلکے بھورے رنگ کا موٹا سا کاغذ تھا۔ پہلی نظر میں وہ اڑے ہوئے رنگ کا چمڑا لگتا تھا۔ ہاتھ لگانے پر محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی قدیم سا کاغذ ہے، جو فرعون کے مقبرے میں سے برآمد ہوا ہے۔ یعنی فرعون کی ممی کے پہلو میں سے۔ اسے مایوسی سی ہوئی۔

"یہ سنبھال کر رکھ لو......" جپسی اس کے سامنے بیٹھ گئی اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"مجھے آرڈر کے پیسے چاہئیں...... یہ تم مجھے کیا دے رہی ہو......" اس کی مسکراہٹ غائب کر کے جپسی کیسے مسکرا سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رول کھولے گی اور کسی جادوئی دنیا میں پہنچ جائے گی۔ لیکن وہ تو وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

جپسی کچھ دیر تک اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتی رہی۔ "تمہیں لگتا ہے کہ میں تم سے کوئی مذاق کر رہی ہوں؟"

"تم میرا مذاق بنا رہی ہو۔ تم شاید بہک گئی ہو...... کیا تم نشے میں ہو......؟"

وہ ہنسی۔ "اچھا اس پر اپنا ہاتھ رکھو...... ہتھیلی کھول کر پوری......"

"اوہ اچھا! میں جیسے ہی اس پر اپنا ہاتھ رکھوں گی، اس میں سے ایک الہ دین کا چراغ ابھر آئے گا پھر میں اسے رگڑوں گی، اور ایک جن برآمد ہوگا اور میری ہر خواہش پوری کر دے گا...... ہے نا؟" وہ جپسی کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"جن لوگوں کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے، وہ بہت بدنصیب ہوتے ہیں۔ خوش نصیب تو وہ ہے، جو کہیں نہ کہیں سے ادھورا ہے۔"

الف لیلہ
ہزار داستانیں

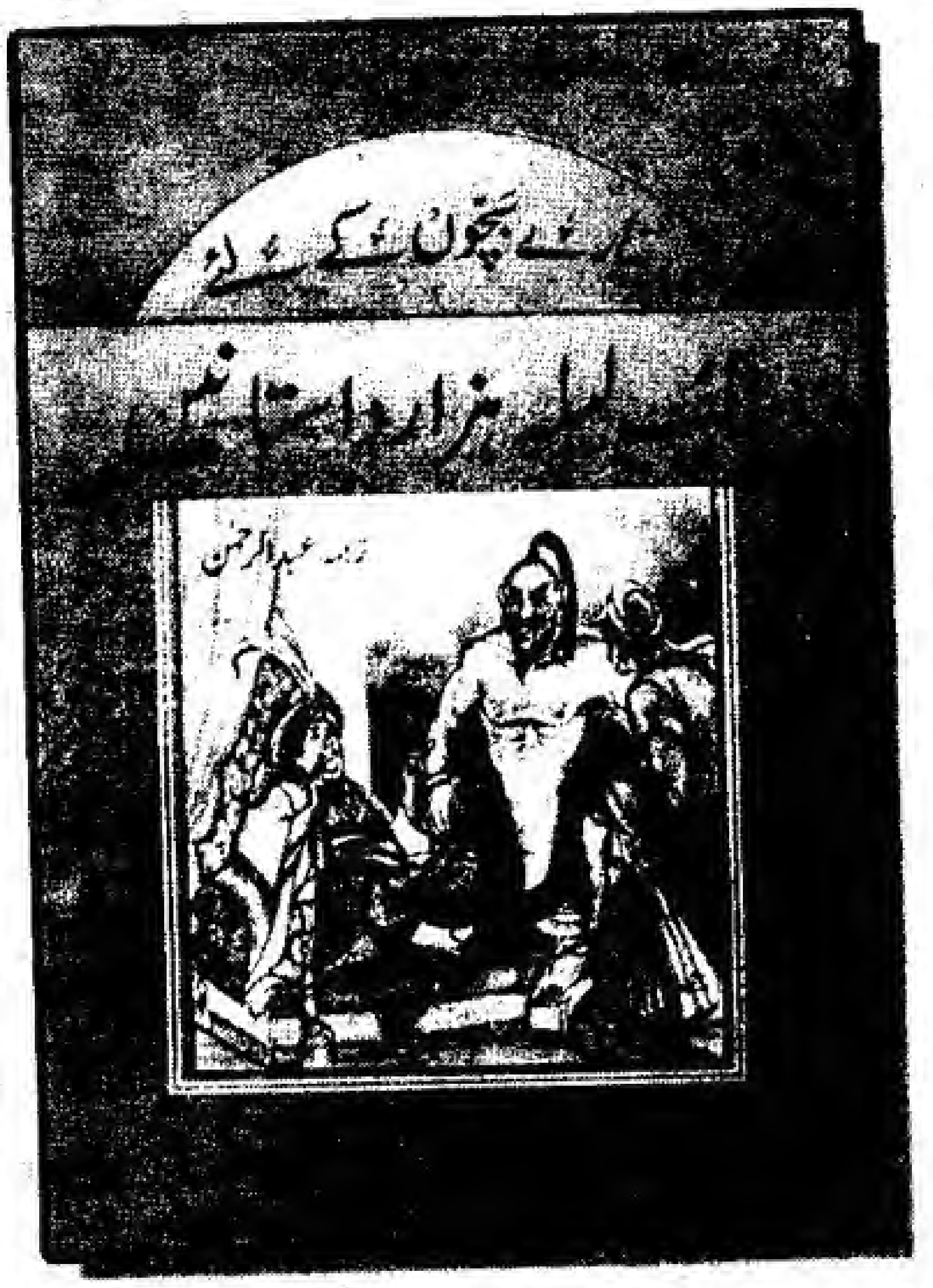

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر
بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں
جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب 1200/- روپے
ڈسکاؤنٹ 300/- روپے
آج ہی 950/- روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہء عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”تم یہ بد رنگا کاغذ مجھے کیوں دے رہی ہو؟ کس خوشی میں؟“

”کیونکہ اس کاغذ کی مالک اب تم ہو......“

”اور یہ تمہیں اس کاغذ نے بتایا ہے؟“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”ہاں...... میں پچھلے نو دنوں سے اپنے گھر میں بند ہوں۔ مجھ سے جو بھی پہلا انسان ملتا‘ یہ کاغذ اس کا ہوتا۔ ویسے میں اس کاغذ کو ٹیولپ کہتی ہوں۔ مجھے یہ پھول بہت پسند ہے۔ چاہو تو تم بھی اسے یہی کہہ لو......“

”تم نے خود مجھے فون کر کے بلایا ہے میڈم! میں پیزا ڈیلیور کرنے آئی ہوں۔“

”اپنا نوٹ پیڈ نکالو اور ایڈریس پڑھو......“ جپسی نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور پانچ انگلیوں میں موجود سات انگوٹھیوں کو دیکھنے لگی۔

گردن کو تمسخر سے ہلکا سا جھٹکا دے کر اس نے نوٹ پیڈ نکالا۔ ایڈریس پڑھا اور ایک دم سے اس کے منہ سے نکلا۔ ”اوہ“۔

وہ ایڈریس ساتھ والی بلڈنگ کا تھا۔ ”زیرو ٹو فور“ فلیٹ کا ایڈریس تھا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے تک جا کر فلیٹ کا نمبر پڑھا جو ”فور زیرو ٹو“ تھا۔

جپسی نے سوالیہ آنکھ اچکائی کہ ہاں ہو گئی تسلی پھر جپسی نے اس کے ہاتھ سے ٹیولپ لے کر اسے رول کیا۔ ایسے ہی دو تین قدم وہ مٹک مٹک کر چلی...... پھر اس کے منہ کے سامنے لا کر اس رول کو کھول دیا۔

ٹیولپ پر اس کی تصویر بنی ہوئی تھی......

”تم کوئی شعبدہ باز ہو...... جادوگر ہو...... تم جیسے لوگوں کو ایسے گر بہت آتے ہیں۔“ وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

”میں ایک معمولی سی عورت ہوں۔ جس کا دل اور نیت دونوں صاف ہیں۔ اب یہ ٹیولپ تمہارا ہے‘ اسے ساتھ لے جاؤ۔“

”میں اس کا کروں گی کیا؟ یہ کیا کیا کر سکتا ہے؟ کون کون سے جادو ہیں اس کے پاس؟“ اصل فکر بس اسے جادو کی تھی۔

جپسی نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”یہ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ میں نے اسے بیمار روحوں کو شفا دینے کے لیے استعمال کیا تھا۔ بیمار اور بھٹکے ہوئے لوگ میرے پاس آتے تھے اور میں ان کا نام لے کر اسے فولڈ کر دیتی تھی۔ جب کھولتی تھی تو کوئی نہ کوئی حل لکھا ہوا نظر آ جاتا تھا۔“

”ٹویٹر کی دنیا میں تم کیسی ٹوٹی پھوٹی باتیں کر رہی ہو؟“ اس نے منہ بنایا۔

”فیس بک کی دنیا میں تم کیسے عجیب و غریب فیس بنا رہی ہو۔“ جپسی نے قہقہہ لگایا۔

”اگر یہ تمہارے کام کا ہے تو تم کسی اور کو کیوں دینا چاہتی تھیں۔“

”کیونکہ اس نے میرے لیے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے‘ اب یہ کسی اور کے کام آنا چاہتا ہے۔“

”اچھا؟ ایسی جادوئی چیزیں بھی ہڑتال وغیرہ کرتی ہیں۔ ریزائن دیتی ہیں۔ جاب کو لات مار دیتی ہیں؟“

جپسی کا منہ بن گیا۔ ”تم اس کی توہین کر رہی ہو لڑکی!“

”تم مجھے ڈرا رہی ہو جپسی! مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں؟“

”جو چیز انسان کی عقل سے بالاتر ہوتی ہے‘ وہ اس پر یقین نہیں کرتا۔ یہ پکڑو اور اس کا جو چاہے کرو۔ چاہو تو اسے جلا دو‘ چاہو تو پھینک دو۔ میں نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔“

”تمہیں یہ کیسے ملا تھا؟“ اس نے رول پکڑ لیا تھا۔ اب ٹھوڑی کھجا رہی تھی۔

”ایسے ہی جیسے تمہیں مل رہا ہے۔“

”تو کیا یہ خزانہ ہے...... یا خزانے تک جانے کا نقشہ......“

وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ جپسی نے اس کے پیچھے دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ سہانے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مستقبل کی چکا چوند سے چمک رہی تھیں۔

وہ بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ ٹیولپ اسے کچھ نہیں دینے والا۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہونے والے ہیں۔ آنکھوں کی چمک دھندلی پڑ جائے گی‘ اور کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگے گی۔

ہر جادوئی چیز...... خزانے تک لے کر نہیں جاتی......

کچھ چیزیں ابوبکر تک بھی لے جاتی ہیں...... جو گونگا ہے...... اور...... اور......

BOOKS
Books & Magazines

☆☆☆

ٹیولپ اس کے سامنے رکھا ہوا تھا‘ اور وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اُسے بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔ پیچھے آتش دان روشن تھا۔ کھڑکی سے باہر دھند کا بسیرا تھا۔ اسے پیسے چاہیے تھے اور وہ ہزار بار اس پر دس ملین ڈالر لکھ چکی تھی۔ پھر وہ پانچ ملین ڈالر پر آئی‘ آخر کار وہ ایک ہزار ڈالر سے ایک سو ڈالر تک آ گئی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید پیپر ڈالر نہ دے سکے‘ پونڈ دے سکے‘ ورنہ ین‘ دینار‘ ریال‘ وغیرہ۔ لیکن وہ ایسا ڈھیٹ ثابت ہوا تھا کہ چونی اٹھنی‘ سکہ‘ کھوٹا سکہ تک دینے پر تیار نہیں ہوا تھا۔

”شاید اسے روپے پیسے سے نفرت ہے۔“

اس نے خود سے کہا اور اس پر برانڈڈ چیزوں کے نام لکھنے شروع کر دیے۔ اس نے ڈائمنڈ اور قیمتی پتھروں سے شروعات کی اور آخر کار ڈیزائنر ڈریسز پر آ کر رک گئی۔ پھر جوتوں‘ بیگ‘ اور میک اپ پر آئی۔ لیکن اسے پھر سے مایوسی ہوئی۔

رات کے دو بج چکے تھے‘ اسے سو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا اس رات کی صبح‘ ایک نئی صبح کے ساتھ ہو گی۔ ایسی صبح جب سب کچھ بدل چکا ہو گا۔ وہ سب کچھ حاصل کر چکی ہو گی۔ لیکن فی الحال تو وہ ایک ٹافی بھی حاصل نہیں کر پائی تھی۔

پھر اسے خیال آیا کہ شاید یہ ٹیولپ لکھے ہوئے الفاظ نہ پڑھ سکتا ہو‘ بلکہ تصویروں کی زبان سمجھتا ہو۔ تو اس نے ربڑ پنسل لے کر بڑی مہارت اور جانفشانی سے اس پر ”ڈالر“ کا اسکیچ بنا دیا۔ اور بریکٹ میں لکھ دیا کہ مجھے یہ ڈالر ڈھیروں کے حساب سے دے دو۔ لیکن پیپر شاید گونگا تھا یا شاید اندھا...... ورنہ یقیناً ”سنگ دل“۔

(وہ عقل مند تھا)

ساری رات ایسے ہی گزر گئی۔ وہ پھر بھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ ٹیولپ کو سوچنے‘ سمجھنے کے لیے وقت چاہیے ہو گا۔ پہلے وہ جپسی کے ساتھ رہا تھا۔ وہ اس کی نئی نئی دوست بنی ہے۔ نئی دوست کو اس کی ضرورتوں کو سمجھنے میں کچھ وقت تو لگے گا نا۔ جو وہ اسے دے رہی تھی اور خود وہ سیدھی‘ الٹی‘ ترچھی‘ ہر پوز میں ساتویں آسمان پر اڑانیں بھر رہی تھی اور مشکل سے ہی زمین پر واپس آنے والی تھی۔

وہ ساتویں دن بھی ساتویں آسمان پر ہی رہی تھی......

پنسل سے ٹیولپ پر ڈالر بناتی رہی تھی......

”کیا بات ہے، آج کل بہت خوش رہتی ہو؟“ ماما کو اس کی بے وجہ خوشی پر بڑی حیرت تھی۔

”بس وہ وقت آنے والا ہے کہ آپ کو مجھ پر فخر ہو گا...... گردن اکڑا کر چلا کریں گی آپ۔“

”دھیان سے بیٹا...... ذرا دھیان سے...... خواب میں بھی اتنا زیادہ اونچا نہیں اڑتے کہ انسان دھڑام سے زمین پر آگرے تو پاش پاش ہو جائے......“

ایک ایک کر کے اس کے سارے خواب پاش پاش ہو رہے تھے۔ ٹیولپ ضدی تھا۔ وہ ڈالر دینے پر تیار نہیں ہوا تو اس نے پنسل سے اپنی مطلوبہ چیزیں اس پر بنانی شروع کر دیں۔ پہلے اس نے ایک بڑا سا گھر بنایا' پھر کار...... یعنی کاریں...... پھر گھر کی ضروریات کی چیزیں...... اس نے ایک عدد جام کی بوتل تک بنا کر دیکھ لی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ایک بار وہ اسے پھولوں کی دکان پر بھی لے گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ ٹیولپ اصلی ٹیولپ پھولوں میں گھرا رہے تو کام کرنے لگے گا۔ جیسے فون بجلی سے چارج ہونے کے بعد کام کرتا ہے۔ گاڑی ایندھن ڈالنے کے بعد چلتی ہے۔ یہ بھی پھولوں کی خوشبو سے چارج ہو کر کام کرنے لگے گا۔

وہ اس کے سب خوابوں کا کام تمام کر رہا تھا لیکن اس نے ابھی بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید ٹیولپ یہ سب افورڈ نہیں کر سکتا تو اس نے کچھ چھوٹی چیزیں بنانی شروع کر دیں۔ جیسے ایک عدد انڈا۔ چاکلیٹ۔ ایک عدد ہیر برش۔ سردی بہت تھی تو گرم جرابیں' سویٹر' کوٹ...... اور...... اور...... ٹشو...... آنسو پونچھنے کے لیے۔

وہ مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر ٹیولپ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بنا بنا کر دینے لگا تو بھی ٹھیک ہے۔ وہ رات دن اس پر اسکیچ بنا بنا کر بہت کچھ اکٹھا کر لے گی اور ایک چھوٹی سی شاپ کھول لے گی پھر وہ چھوٹی سی شاپ ایک عدد بڑے اسٹور میں بدل جائے گی۔ پھر ملک کے مختلف شہروں میں اس اسٹور کی ایک ایک برانچ کھل جائے گی پھر دنیا کے ہر ملک میں اس کے اسٹور کی ایک شاخ ہو گی......

پھر آہستہ آہستہ......

آہستہ آہستہ وہ آسمان سے زمین پر واپس آنے لگی تھی۔ سیدھی' الٹی' ترچھی' ہر پوز میں اور یہ ماننے لگی تھی کہ جیسی کا دماغ کھسکا ہوا تھا' وہ اول فول بک گئی تھی اور اس نے اس کا یقین بھی کر لیا تھا۔ تھوڑی بہت ہاتھ کی صفائی دکھا کر وہ اسے پاگل بنا چکی تھی۔

وہ پاگل تھی۔ وہ ایک سادہ سا کاغذ تھا...... بس...... تھوڑا سا سخت سا تھا۔ اس نے اسے پھاڑنے کی کوشش کی تو وہ پھٹا نہیں۔ آتش دان میں جھونکا تو وہ غبارے کی طرح اُڑ کر باہر آ گیا۔ اس جدید سائنسی دور میں' ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کا جی تو چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ ساری دنیا کو اکٹھا کر لے...... دہائیاں دے...... ہنگامہ برپا کر دے...... بھلا یہ کیا بات ہوئی...... ایک مہینہ وہ کیسے کیسے خواب دیکھتی رہی تھی۔ کیسی کیسی پلاننگ نہیں کر لی تھی اس نے...... لو بھلا...... یہ کیا بات ہوئی...... اس کے خوابوں پر نمک چھڑکنے کے لیے یہ ٹیولپ کہاں سے آ گیا تھا۔ ویسے ہی زندگی میں شوگر کی کمی تھی۔

امیدوں پر پانی پھر گیا۔ خوابوں کا گلستان اجڑ گیا...... ٹیولپ' ٹیولپ' ٹیولپ...... وہ چپ چاپ سارا تماشا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

وہ نیویارک آ چکی تھی' پاپا نے اسے پیسے دے دیے تھے اور جذباتی طور پر بلیک میل بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن اتنا ضرور کہا تھا۔

”فون کر کر کے بار بار ہم سے پیسے نہ منگوانا۔ اتنے مہنگے شہر میں رہنے کے لیے جا رہی ہو۔ قرض لینا یا بھیک مانگنا' لیکن ہمیں تنگ نہ کرنا کہنا۔“

اس کا منہ بن گیا لیکن وہ کیا کرتی۔ اب کیا انسان خواب بھی نہ دیکھے......

”کسی نہ کسی کو تو اس گھر سے باہر نکلنا ہی تھا۔ پہلا قدم اٹھانا ہی پڑتا ہے پاپا!“

پاپا نے اس کے سر پر چپت لگائی۔ ”تم کوئی پہاڑ سر کرنے نہیں جا رہیں۔ نہ ہی تم ہجرت کر رہی ہو یا سرحدوں پر قوم ملک کی بقا کے لیے جنگ لڑنے جا رہی ہو۔ اپنے یہ لمبے لمبے ڈائیلاگ بولنا بند کرو۔“

اس نے لمبا سا سانس لیا اور چھوٹی سی آہ بھری۔ بارش ہو رہی تھی۔ وہ نیویارک کی سڑک کے اس طرف کھڑی ٹریفک سگنل کے بند ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ سر پر چھاتا تھا لیکن پھر بھی وہ تھوڑی سی بھیگ گئی تھی۔ نیویارک واقعی میں ایک مہنگا شہر تھا۔ اور پرہجوم بھی۔ یہاں لوگ بہروں کی طرح چلتے ہیں۔ اور اندھوں کی طرح بھاگتے ہیں۔

وہ کراسنگ پر تیزی سے بھاگ رہی تھی کہ ایک اندھے سے ٹکرا گئی...... جی ہاں! اس کے سخت شانے سے ٹکرا کر وہ ایک پورا چکر گھوم کر دُور جا گری...... اس کے چھاتے نے دور جا گرنے میں اس کا بھی ریکارڈ توڑ دیا تھا...... شاید اس کا ٹخنہ بھی ٹوٹ چکا تھا...... جس نے توڑا تھا، وہ جاسوسی فلموں کے جاسوسوں کی طرح کالے کوٹ میں ملبوس اس کے سر پر کھڑا تھا۔ بارش ہو رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں کوئی چھتری نہیں تھی۔ اس کے بال گیلے ہو کر اور سیاہ ہو چکے تھے...... بارش کی بوندیں اس کے بالوں اور پلکوں سے جھڑ رہی تھی۔ سامنے اور پیچھے...... گاڑیوں کا اژدھام کھڑا اس پر سے گزر جانے کے لیے اشارے کے کھل جانے کے انتظار میں تھا...... وہ اسے روند کر گزر بھی جائے گا۔ کل کے اخبار میں بس ایک چھوٹی سی خبر آ جائے گی۔

”ٹریفک سگنل پر ایک لڑکی دل کا دورہ پڑنے سے دم توڑ گئی۔“

وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ایک عدد ”دم“ ہو۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ نہ منہ سے سوری کہا' نہ مدد کے لیے ہاتھ آگے کیا اور نہیں تو اس کا چھاتا ہی اٹھا کر اسے دے دیتا۔

”اندھے ہو تو گھر میں بیٹھو، مجھ جیسوں کو زخمی کر کے تمہیں کیا ملے گا؟“ اس نے غصے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ سارے کپڑے خراب ہو چکے تھے۔

وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اسے دیکھتا رہا۔ ہاں البتہ اس کے چہرے پر ترحم نظر آنے لگا تھا۔

”کس قدر ظالم ہو تم۔ مدد نہیں کر سکتے تو شرمندہ ہی ہو جاؤ۔ ورنہ میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔“

اس نے کچھ ایسے چلا کر کہا تھا کہ وہ سہم گیا اور واقعی میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ (دفع ہو گیا)۔ سگنل کھلا تو اس نے ہاتھ بلند کر کے ایک اور چیخ مار دی۔ ”اسٹاپ...... اسٹاپ......“ اسے فلموں والے سین کریئیٹ کرنے میں بہت مزا آتا تھا۔ اب وہ زخمی تھی' تو وہ اس کا بھرپور فائدہ کیوں نہ اُٹھاتی۔ وہ لنگڑا لنگڑا کر چلتی ہوئی' سگنل کراس کر گئی۔ اس نے اپنے لیے ٹریفک کو روک کر رکھا ہوا تھا۔ یہ موقعہ بھی بار بار نہیں ملتا۔ اب وہ آئندہ زندگی میں بہت فخر سے کہہ سکتی تھی کہ اس کے لیے نیویارک کی ٹریفک پورے ”پانچ سیکنڈ“ تک رُکی رہی تھی۔

اگلے پانچ منٹ تک وہ لنگڑا کر چلنے کی اچھی مشق کرتی رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر اس منحوس انسان پر غصہ آ رہا تھا' جس کی وجہ سے وہ گر گئی تھی۔ اس کے کپڑے گندے ہو گئے تھے۔ اس کا اکلوتا پاکستانی کرتا مسک ہو گیا تھا اور چھاتا تھوڑا سا پھٹ گیا تھا۔ کتنے نقصانات کا سبب بنا تھا وہ شخص...... ہونہہ......

”تم کیا بچوں کی طرح کسی سے لڑتی رہی ہو۔“ یونیورسٹی کی ڈاکٹر نے اس کا زخم دیکھا تو ہنس دیں۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ وہ ہنس نہیں سکی۔

وہ اور زیادہ ہنسنے لگیں۔ ”اتنی سی چوٹ پر بھی کوئی ڈاکٹر کے پاس آتا ہے؟؟“

وہ گھور کر ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ ”میں نیویارک کی سڑک پر، یعنی مصروف ترین سڑک پر گری ہوں۔ وہ بھی تب جب سب اپنے اپنے کاموں پر جانے کے لیے مرے جا رہے تھے۔ یہاں کی اندھی ٹریفک کو آپ نہیں جانتیں کیا؟“

”اوہاں...... پھر تو تمہیں دوا کے ساتھ ساتھ ایک عدد ایوارڈ بھی دینا چاہیے۔“ ڈاکٹر پھر کھی کھی کرنے لگیں۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے بعد وہ گھر واپس آئی، تو آتے ہی سو گئی۔ کالے کوٹ والا اس کے خواب میں آیا تو وہ چونک کر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی شکل کچھ کچھ فٹ بالر میسی سے ملتی تھی۔ کیا میسی ساری دنیا سے چھپ کر نیویارک کی سیر کے لیے نکلا ہوا ہے۔ وہ کچھ بولا نہیں تھا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ کیا اس کے ساتھ یہ عظیم واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ اب میسی کا سیکڑیری آئے گا اور اسے ایک بلینک چیک دے کر کہے گا کہ وہ جتنی چاہے رقم بھر کر، اس تکلیف کا مداوا کر لے، جو میسی کی وجہ سے اُسے پہنچی تھی...... وہ اس پر دس ملین ڈالر لکھ دے گی...... جیسے خوشیوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، ویسے ہی تکلیف کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے تو دس ملین ڈالر ہوتی ہے...... کیا سمجھے......

سب سمجھ کر، کافی بنا کر وہ کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے موبائل پر کال آ رہی تھی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ اسے ٹون سنائی دے رہی تھی لیکن موبائل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے بیگ، سائیڈ ٹیبل سب دیکھ لیا تھا۔ کچن کے کیبنٹ تک کھول کھول کر دیکھ لیے تھے لیکن موبائل نہیں ملا تھا۔ سارے کمرے کی چیزیں ادھر ادھر ہو چکی تھیں۔ وہ بری طرح سے حیران ہو رہی تھی۔ تین منٹ کے وقفے کے بعد اس کے فون پر پھر سے کال آئی تھی۔ اسے ٹون سنائی دے رہی تھی لیکن فون تھا کہاں......

دس منٹ کے اندر اندر اس نے سارا کمرا ادھیڑ ڈالا تھا، لیکن فون ہاتھ نہیں آیا تھا۔ فون کی میسج ٹون، واٹس ایپ ٹون، فیس بک نوٹیفکیشن ٹون، سب سنائی دے رہی تھیں لیکن فون دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کوفت کا شکار ہو چکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اسے واقعی میں اپنے دماغ کا علاج کروا لینا چاہیے۔ یہ بہک چکا ہے۔ سب کچھ الٹا پلٹا سنا اور دکھا رہا ہے۔

جب وہ سر پر ہاتھ رکھ کر، کارپٹ پر اپنے بکھرے ہوئے سامان کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی، تو پھر سے موبائل پر ٹون سنائی دینے لگی تھی۔ اس بار فون اس کے بہت قریب تھا...... بہت ہی زیادہ قریب...... جتنا پرانی ڈائری سے نکل کر اس کے پیر کے قریب پڑا ہوا ٹیولپ پیپر تھا......

اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیولپ ہاتھ میں پکڑا اور اسے کچھ غصے اور کچھ نفرت سے کھولا۔ اگلا منظر دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

کالے کوٹ والے جاسوس انسان کے سامنے میز پر اس کا فون رکھا ہوا تھا۔ فون پر بیل ہو رہی تھی اور وہ چپ چاپ اس فون کو دیکھ رہا تھا۔

جس وقت وہ روڈ کراس کر رہی تھی، تو وہ فون پر بات کر رہی تھی، جس وقت وہ گری تھی، اس وقت فون کہاں گیا، اسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن اب اسے معلوم ہو گیا تھا، وہ فون اس جاسوس کے پاس تھا۔ اس نے اسے چھاتا تو اٹھا کر نہیں دیا تھا لیکن جھک کر اس کا فون اٹھا لیا تھا۔ چور...... اچکا...... پاپا نے ٹھیک کہا تھا، نیویارک میں رہنے کا شوق ہے تو آنکھیں کھلی رکھنا، ورنہ گردن پر چھری پھرے گی اور یہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔

اس نے دوبارہ ٹیولپ کی طرف دیکھا تو وہ خالی تھا۔ یعنی یہ کیا بات ہوئی؟ ایک منظر دکھا کر ٹیولپ پھر سے سفید ہو چکا تھا۔ اس کا دل چاہا کہیں سے اس جیسی کو ڈھونڈ کر لائے اور شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ کر پوچھے۔ ”یہ کیا واہیات چیز دی ہے تم نے مجھے۔“

”تم سے پہلے ہی کہا تھا، یہ الہ دین کا چراغ نہیں ہے۔“ اسے کہیں سے جیسی کی آواز سنائی دی۔

”کیوں نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے۔ اس دنیا میں غریبوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کیا الہ دین کے جن کا فرض نہیں بنتا کہ وہ آئے اور آ کر غربت مٹا دے......“

”دنیا میں غربت نہیں لالچ زیادہ ہے۔ غربت تو مٹ جائے گی لیکن لالچ کبھی نہیں مٹے گا۔“

”میری غربت کا مذاق نہ اڑاؤ میڈم جیسی!“

”تمہیں کھانے کے لیے کھانا نہیں، عیش کے لیے ڈالرز چاہییں، اس لیے الہ دین کا چراغ تم جیسے لوگوں سے دُور بھاگتا ہے۔“

”چپ کرو...... مجھے لیکچر نہ دو......“

”کیوں اتنا چلا رہی ہو؟ تم اپنے باپ کے گھر میں نہیں، کرائے کے اپارٹمنٹ میں بیٹھی ہوئی ہو۔ کچھ ہم جیسے الو کے پٹھے بھی یہاں پڑھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں پرنسز آف ویلز!“

اس کے ساتھ والے اپارٹمنٹ کی الو...... یعنی لڑکی نے اس کے دروازے پر غصے سے دستک دیتے ہوئے چلا کر کہا۔ اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اس سے موبائل لے کر اپنے نمبر پر کال کرنے لگی۔ فون اب بند ہو چکا تھا۔

”چور، اچکا...... میسی......“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور ٹیولپ کو غصے سے پٹخ دیا۔

☆☆☆

چور اچکا میسی چپ چاپ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بول نہیں سکتا، لیکن سن سکتا ہے۔ جو کافی وہ پی رہا ہے اس میں اسٹرا ہے، کیونکہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت نہیں دے سکتا۔ ایک بازو پورا ہی مفلوج ہے اور ایک کہنی تک کٹا ہوا ہے جس کیفے میں وہ کافی پینے آیا ہے، یہاں کا اسٹاف اسے جانتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اسے کیا چاہیے۔

ایک بار فون پر بیل ہوئی تھی تو ویٹر نے اس کا فون جیب سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا، وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ کال اوکے کر دے۔ لیکن اس نے ناں میں سر ہلا دیا تھا۔ وہ فون اس کے سامنے رکھا رہا تھا۔ فون پر پھر سے کال آئی تھی۔ وہ یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ فون اس کے پاس کیسے آیا۔

اس کا اپنا فون اس کی دوسری جیب میں تھا۔ اس پر صرف ماں کی کال اور میسج آتے تھے۔ میسج خود کار طریقے سے ایک منٹ کے وقفے کے بعد مشینی آواز کے ذریعے پڑھے جاتے تھے اور کال بھی تین سیکنڈ کے وقفے سے اوکے ہو جاتی تھی۔ ماں اسے کچھ ضروری ہدایتیں دیتی تھی اور بس۔ جسے وہ کان پر فکس بلوٹوتھ آلے کی مدد سے بآسانی سن لیتا تھا۔

دس منٹ بعد اس نے بہت مشکل سے ویٹر کو یہ بات سمجھائی تھی کہ وہ فون کو آف کر کے اس کے کوٹ کی جیب میں واپس رکھ دے۔ اس کی کافی ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ آج دو ہفتے بعد گھر سے باہر نکلا تھا۔ ماں نے اسے زبردستی بھیجا تھا۔ اگر ماں نے موسم کا حال سن لیا ہوتا تو وہ کبھی اسے نہ بھیجتیں۔ وہ بھیگ چکا تھا۔ لیکن وہ خوش تھا۔ کیونکہ اس کا بخار اتر چکا تھا۔ اس کے سن بازو کے علاج کے سلسلے میں اس کے لیے دوا تبدیل

کی گئی تھی جس سے اسے الرجی ہو گئی تھی۔ وہ بیمار ہو گیا تھا۔

وہ کیفے سے باہر نکلا تو بدستور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بارش پھر سے تیز بھی ہو سکتی تھی لیکن وہ رکا نہیں اور باہر نکل آیا۔ کیونکہ کبھی کبھی کالے سیاہ بادلوں میں کڑکتی ہوئی بجلی میں تیز یا ہلکی بارش میں بھیگ جانا بھی اچھا ہوتا ہے۔ زندگی ہمیشہ بہار کی طرح لہلہاتی ہوئی سرسبز و شاداب تو نہیں رہتی۔ کبھی کبھی چلچلاتی ہوئی دھوپ سر پر سایہ فگن ہو جاتی ہے اور کسی بدتمیز سے بیچ سڑک پر ٹکر ہو جاتی ہے……

دس سال کی عمر میں اس کی زبان اور تالو کا پہلا آپریشن ہوا تھا تو وہ تھوڑا بہت بولنے لگا تھا۔ آپریشن کامیاب رہا تھا، لیکن ابھی بھی وہ نارمل لوگوں کی طرح نہیں بول سکتا تھا۔ ایک چھوٹے سے جملے کی ادائیگی میں اسے کافی وقت لگ جاتا تھا۔ اس کا جبڑا تھک جاتا تھا، زبان میں تکلیف ہونے لگتی تھی۔ ڈاکٹر پر امید تو تھے لیکن اسپیچ تھراپی کے بعد بھی وہ روانی سے بولنے میں ناکام رہا تھا۔

سترہ سال کی عمر میں اس کا دوسرا آپریشن ہوا تھا، جو زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اسے زبان کو حرکت دینے میں بہت زیادہ تکلیف ہونے لگی تھی کہ اس نے بولنے کے خیال کو ہی ترک کر دیا تھا۔ وہ اشاروں سے اور لکھ لکھ کر باتیں کرتا تھا لیکن دو سال پہلے، وہ دونوں ہاتھوں سے بھی تقریباً معذور ہو چکا تھا۔ وہ جتنا ذہین تھا، اب اتنا ہی بے کار ہو چکا تھا۔ وہ جتنا ایکٹیو تھا اب اتنا ہی ساکت ہو چکا تھا۔

وہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کے لیے وہ ایک مکمل انسان تھا۔ کبھرو جوان، خوبصورت اور صحت مند۔ وہ چلتا پھرتا، کام کاج کرتا، کالج جاتا تو کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ بول نہیں سکتا۔ ٹیکنالوجی نے ترقی کی تو وہ موبائل ایپ کے ذریعے بات کرنے لگا تھا۔ بس اسے سب کچھ موبائل پر ٹائپ کرنا پڑتا تھا، پھر اسپیکر سے اپنی بات سنانی پڑتی تھی۔ زندگی اتنی مشکل نہیں تھی، یہ تب مشکل ہوئی تھی جب اس کے دونوں ہاتھ بھی بے کار ہو گئے تھے۔ وہ موبائل پر ٹائپ نہیں کر سکتا تھا، وہ اشارے نہیں کر سکتا تھا، وہ پین تک پکڑ کر کچھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ پہلی بار رویا بھی تب ہی تھا، جب وہ ایک چمچ تک اٹھا کر اپنے منہ تک نہیں لے جا سکتا تھا اور تب ہی اس کی راتوں کی نیند مختصر ہونے لگی تھی۔ اس کے خواب جو ابھی پورے ہونے تھے، وہ ادھورے ہی رہ گئے تھے۔ ساری دنیا کے سائنس دان اپنا کام چھوڑ کر اس کے لیے کوئی ایسا فیچر نہیں بنا سکتے تھے جو اسے کارآمد بنا سکتا۔ وہ بول نہ سکتا لیکن اپنی بات سمجھا سکتا۔ وہ ہاتھوں کو حرکت دیے بغیر اپنے کام کر سکتا۔

دو سال پہلے ہائکنگ کے دوران پہاڑ سے گر کر جسم مفلوج ہو گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر شدید ضرب لگی تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا تھا۔ وہ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ ہاتھ نہیں ہلا سکتا تھا۔ چھ ماہ ماں کی جان توڑ کوششوں کے بعد وہ چلنے پھرنے لگا تھا۔ اس کی صحت بہتر ہونے لگی تھی لیکن اس کا ہاتھ سن اور بے کار ہو کر جسم سے جھول رہا تھا۔ دوسرا کہنی سے ہاتھ تک کٹ چکا تھا۔

مکمل انسانوں کی دنیا میں ادھورے انسانوں کو بہت ہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ اپنی ہمت کھو رہا تھا۔ ماں کو پورا یقین تھا کہ اس کا لکڑی کے تختے کی طرح سخت ہو چکا بازو ایک دن ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے تالو کی سرجری ہو گی اور وہ بولنے لگے گا۔ پہلے اسے بھی یقین تھا، لیکن اب یہ یقین کمزور پڑ رہا تھا۔

خوش امید رہنے کے لیے چھوٹی موٹی خوشیاں ملتی رہنا چاہییں۔ اگر وہ نہ ملیں تو انسان امید چھوڑ دیتا ہے۔

اسے بولنے کی حسرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی بہت سی باتیں کرے۔ بے سری ہی سہی، اپنی آواز میں گانے گائے۔ وسل بجائے۔ کسی کے کان کھائے۔ نارمل لوگوں کی طرح پھس پھسے لطیفے سنائے اور خود ہی قہقہے لگائے۔ لیکن جب اس کا پہلا آپریشن ہوا تو وہ صرف چند لفظ بولنے کے قابل ہو سکا تھا۔ وہ تھک جاتا تھا۔ ہانپ جاتا تھا۔ تکلیف سے کراہنے لگتا تھا۔

اسے لکھ لکھ کر باتیں کرنے کی روٹین کو جاری رکھنا پڑا۔ لیکن لکھی ہوئی باتیں پڑھنے کا کس کے پاس وقت ہوتا ہے۔ یعنی دوستوں کے گروپ میں، جب سب بیٹھے، گپیں اور قہقہے لگا رہے ہوں۔ اور وہ پین سے لکھ رہا ہو اور پھر مطلوبہ شخص کو دے رہا ہو، اور مطلوبہ شخص کے پاس ان چند حروف کو غور سے پڑھنے کا وقت ہی نہ ہو۔ زبان والوں کی دنیا میں ”بے زبانوں“ کے ان کہے، کہے الفاظ کی ویلیو ہی کتنی ہوتی ہے۔ ہم اتنے مصروف ہو چکے ہیں، اور ہمارے پاس وقت کی اتنی کمی ہو چکی ہے کہ ہم جو بول سکتے ہیں انہیں نہیں سن سکتے، جو بول ہی نہیں سکتا اسے کیسے سنیں گے……

دنیا کا المیہ خود غرض ہونا نہیں، بے حس ہونا ہے……

دنیا میں کتنی بھی ٹیکنالوجی آ جائے، وہ زبان کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ پہلے آپریشن کے بعد ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اسے اتنے کو ہی بہت سمجھنا چاہیے کہ وہ کچھ لفظ بول سکے گا۔ ڈاکٹر ساری بیماری جانتے تھے لیکن جان لینا اور علاج کرنا دو الگ چیزیں ہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا، ڈاکٹر کہتے تھے، کب ہو گا، اور کتنا وقت لگے گا وہ نہیں جانتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ جان گیا تھا کہ وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ وہ بول نہیں سکے گا، اپنے ہاتھوں کو حرکت نہیں دے سکے گا۔ وہ ناامید ہو رہا تھا……تب ہی……

چور چور چلاتی ہوئی ایک لڑکی آئی……وہ کچھ عجیب و غریب تھی……

☆☆☆

”مسٹر عجیب و غریب، ایکس وائے زی! بیسی کی بگڑی ہوئی کاپی! تم اپنے منہ سے بتاؤ گے کہ تم چور ہو یا میں تم سے اقرار کرواؤں؟“

کرسی کی پشت سے کمر لگا کر وہ ”ساری دنیا جائے بھاڑ میں، مجھے اب اس سے کچھ لینا دینا نہیں رہا“ کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک میگزین پر پیپر ویٹ رکھا ہوا تھا، جسے وہ پڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی، وہ کافی کے مگ پر جھک گیا اور اسٹرا کو منہ میں لے لیا۔

”میں پاگل ہوں جو ایسے چلا رہی ہوں، فون دو میرا۔“ اس نے ہاتھ آگے کیا کہ موبائل دو۔

اس نے اسٹرا سے کافی پیتے پیتے سر اٹھا کر اسے دیکھا……آنکھیں ذرا ترچھی ہو گئیں……پیشانی پر بال آ گرے……اگر وہ چور نہ ہوتا تو اسے بڑا اچھا لگتا……لیکن خیر……

”اور دیکھو، یہ نہ پوچھنا کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ میرا فون تمہارے پاس ہے۔ تمہاری سوچ بھی وہاں تک نہیں جا سکتی، جہاں سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تین دن پہلے، اس کیفے میں، اسی میز پر میرا فون سامنے رکھ کر تم میرا مذاق اڑا رہے تھے، پھر تم نے فون آف کر دیا۔ اب تک تو بیچ بھی دیا ہو گا۔ واپس لاؤ میرا فون، اور سن لو، میں ہرگز ہرگز کوئی اور فون نہیں لوں گی……وہ کتنا بھی مہنگا اور جدید کیوں نہ ہو۔ کبھی نہیں……“

سنا ہے جب لڑکیاں جھوٹ بولتی ہیں، تو دنیا بھر میں پھیلے سچے پکے مسافروں کی ٹرینیں چھوٹ جاتی ہیں۔ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر وہ بے چارے اپنا سر کھجاتے رہ جاتے ہیں۔ اور یہاں یہ لمبی لمبی چھوڑتی رہ جاتی ہیں۔ ان کی بلا سے ٹرین چھوٹ جائے یا سر پر سے ہی گزر جائے۔ یہ اپنا

کام جاری رکھیں گی۔

لمبی سی اسٹرا کا کونا دانتوں میں دبا کر اس نے ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ آج کافی بڑی کڑوی تھی۔ پھر ایسے ہی ذرا سا سہم کر اسے چور نظروں سے دیکھا۔ اس نے سفید ٹی شرٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کی اونچی، لیکن چھوٹی سی پونی طیش کی وجہ سے ہلکورے لے رہی تھی۔ بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ بالوں کی لٹیں یہاں وہاں سے نکلی ہوئی تھیں۔ اگر وہ ایسے چلا نہ رہی ہوتی تو اسے بڑی اچھی لگتی...... لیکن خیر...... اب وہ پھر سے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر بیٹھ چکا تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور غصہ بھی۔ لب سختی سے بھنچے ہوئے اور تیوری پر بل۔

''تم چاہتے ہو کہ میں پولیس میں شکایت کروں؟ یا یہاں کھڑی ہو کر چور چور چلاؤں؟''

عجیب انسان تھا کچھ بول ہی نہیں رہا تھا۔ الٹا بار بار جھک کر کافی پی رہا تھا...... وہ بھی اسٹرا سے...... اسے کافی اور جوس میں فرق نہیں معلوم؟ کتنا بدتمیز، جاہل انسان تھا وہ۔

''میں کچھ بول (بھونک) رہی ہوں......''

آگے بڑھ کر اس کے اسٹرا کو چٹکی سے دبا دیا۔ یعنی اب پیو کافی۔

''پہلے میرا فون، پھر کافی۔ میں جل بھن رہی ہوں، تم کافی پر کافی چڑھا رہے ہو۔''

وہ غصے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاید اب غصہ اس کے دماغ کو چڑھ گیا تھا۔

''جیب میں ہے یا کہیں اور رکھا ہے۔''

انگلیوں میں دبے اسٹرا کو کھینچ کر اس نے پرے پھینکا اور خود کافی کے مگ کو اٹھا لینا چاہا لیکن پھر رُک گئی۔

''اوہ سوری! میں دوسرا اسٹرا لے آتی ہوں......'' سامنے والے کا چہرہ خوفناک ہو چکا تھا۔ وہ تھوڑا سا ڈر گئی۔

وہ تیزی سے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ علیزہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ یعنی یہ کیا بات ہوئی، چوری اور سینہ زوری پھر ایسے بھاگا دوڑی۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے آئی۔

''تم بہرے ہو کیا؟ سنائی نہیں دے رہا۔ میرا فون واپس کرو، ورنہ میں ابھی پولیس کو فون کر دوں گی۔''

وہ رکا نہیں اور تیزی سے روڈ کراس کر گیا۔ جب تک وہ اس کے پیچھے بھاگی وہ بس میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھی اور ڈرائیور کو بس کا پیچھا کرنے کے لیے کہا۔

بس آگے اور اس کی ٹیکسی پیچھے...... وہ باقاعدہ ٹیکسی کی کھڑکی سے آدھی باہر نکل کر بس کی طرف دیکھ کر چلا رہی تھی۔

''یہ چور ہے، اس نے میرا فون چرایا ہے۔ پکڑو اسے، روکو اسے۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے گردن موڑ کر پیچھے اس کی طرف دیکھا۔ بس کے مسافر بھی اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ چور سیدھا بیٹھا سامنے دیکھ رہا تھا۔

''تم بھی سب کے سب بہرے ہو کیا؟''

جب کسی ایک بھی مسافر نے گردن موڑ کر کالے کوٹ والے کو گھور کر نہیں دیکھا اور اس سے یہ نہیں کہا کہ ''بھائی چور! وہ کب سے آپ کو چور چور کہہ کر بلا رہی ہے۔ چلا رہی ہے۔ کیا ماجرا ہے؟'' تو وہ غصے سے بھڑک اٹھی۔

وہ اسٹاپ پر اترا تو وہ بھی ٹیکسی سے اتر گئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ تین چار سو آدمیوں کے گلے دبا دے۔ چار پانچ سو کو پھانسی پر چڑھا دے۔ چھ سات سو کو سمندر میں دھکا دے دے۔ اس کا دنیا پر سے اعتبار اٹھ چکا تھا۔ اس دنیا میں انسانیت نام کی کوئی چیز کہیں نہیں بچی تھی...... نیویارک میں تو بالکل نہیں......

''سنو! خدا کے لیے میرا فون واپس دے دو۔'' وہ اس کے سامنے جا کر ہانپتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ سامنے والا کسی بھی بات سے ڈر ہی نہیں رہا تھا، تو اس نے ''منت سماجت، ترلے واسطے'' ٹرائی کرنے کے بارے میں سوچا۔

''میں جانتی ہوں وہ فون تمہارے ہی پاس ہے۔ میرے پاس ایک مسٹری ٹیولپ پیپر ہے۔ مجھے اس میں دکھائی دیا ہے۔ دیکھا اب تم چونک گئے نا۔ ہاں، مجھے یہ بھی دکھائی دیا ہے کہ تم آج کل ایک بینک لوٹنے کی تیاری کر رہے ہو۔ تم اور تمہارا گینگ، میں سب کو جانتی ہوں۔ میں پولیس کو سب کچھ بتا دوں گی۔ بہتر ہے کہ میرا فون دے دو۔ میرے پاس ابھی اتنے پیسے نہیں کہ نیا فون لے سکوں۔ میں امیر دکھائی دیتی ہوں لیکن ہوں نہیں۔''

پہلی بار وہ زیرِ لب ہنس دیا۔ (تم جو ہو وہی دکھائی دے رہی ہو۔ مس غریب!)

''دیکھا! تم ڈر گئے۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی، تم بس یہ بتا دو میرا فون کہاں ہے؟''

وہ پھر سے چلنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''تم بہرے ہو؟''

اس نے ناں میں سر ہلایا۔

''چور ہو؟''

اس نے پھر سے ناں میں سر ہلایا۔

''تو مجھے کیا پاگل سمجھا ہے......'' وہ چلائی۔

اس نے ہاں میں سر ہلایا اور ایک گھر کی طرف مڑ گیا۔ گھر کے دروازے پر ایک عورت کھڑی تھی، وہ اسے دیکھتے ہی مسکرا کر اس کی طرف لپکی۔

''آ گئے تم ابوبکر! میں تمہارا انتظار کر رہی تھی اور یہ لڑکی کون ہے؟''

''یہ چور لڑکا آپ کا کون ہے؟''

ماں کا منہ بن گیا۔ ''میرے بیٹے کو چور کہہ رہی ہو؟''

''اس نے میرا فون چرایا ہے، میں سب جانتی ہوں۔ میرے پاس ثبوت ہیں۔''

''یہ تمہارا فون کیسے چرا سکتا ہے؟ اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے اور دوسرا حرکت نہیں کر سکتا۔ دکھاؤ اپنے ثبوت۔ میں بھی دیکھوں کہ اس نے کس جادو کے زور پر یہ سب کیا ہے۔''

وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

''کیا یہ معذور ہے؟ گونگا بہرا، لنگڑا لولا؟'' وہ بدلحاظی سے بولی۔

ماں نے بہت تحمل سے اس کے جملے سہے۔

''بس گونگا......''

اب تک ماں نے اس کا کوٹ اتار دیا تھا اور وہ اندر جا کر سامنے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ سامنے دہلیز پر کھڑی رہ گئی تھی۔ ماں نے ایسی بد اخلاق لڑکی کو گھر کے اندر آنے اور بیٹھنے کی دعوت نہیں دی تھی۔

''یہ گونگا ہے......'' وہ خود ہی اندر آ چکی تھی اور گھوم پھر کر اس کا جائزہ لے رہی تھی جیسے سمندر سے وہیل مچھلی باہر نکل آئی ہو۔

گونگے نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ماں کچن کی سمت جا چکی تھی۔ صوفے کی سائیڈ ٹیبل پر اس کا فون رکھا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے وہ فون اٹھا لیا۔ فون بند تھا۔ اس نے آن کرنا چاہا تو وہ بیٹری کی وجہ سے آن نہیں ہوا۔ جس وقت وہ اپنا فون لے کر واپس جا رہی تھی، اس وقت ماں ٹرے میں سوپ رکھ کر لا رہی تھی۔ ماں نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے اس جیسی بدتمیز، جاہل، بے رحم لڑکی کو دیکھا ہی نہیں۔

لیکن وہ دیکھ چکی تھی...... ''سوپ'' کو...... اور ابوبکر کی آنکھوں کو جو بہت گہرائی سے

BOOKSPK

اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

☆☆☆

رات کو وہ سونے کے لیے لیٹی تو تھوڑی سی شرمندہ تھی۔ رات کا پہلا پہر گزر گیا تو وہ بے انتہا شرمندہ ہو چکی تھی۔ وہ بار بار بیڈ پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بے چینی الگ تھی۔ دیوار کے دوسری طرف سے جینا مینا نے اپنے اپارٹمنٹ سے چلا کر کہا۔

’’سو مر جاؤ‘ یا پھر اپنا یہ بیڈ بدل لو۔ کتنی دیر سے چوں چوں کر رہا ہے۔ چھوٹے گھروں میں رہنے کا یہی نقصان ہوتا ہے۔ کاش میں امیر ہوتی۔ خدا کسی کو غریب پیدا نہ کرے۔‘‘

وہ غریب اپنی غربت پر رونے لگی اور یہ غریب بیڈ سے اٹھ کر راکنگ چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ سارا راستہ چور چور چلاتی آئی تھی۔ اس نے اس بے چارے کا دل دُکھا دیا تھا۔ اسے تکلیف پہنچائی تھی۔ اس کے جسمانی نقائص کا مذاق اڑایا تھا۔ ایک فون ہی تو تھا‘ بھول جاتی اسے۔ سمجھ لیتی کہ کوئی چور اچکا لے گیا۔ بس۔

اگلے دن یونیورسٹی کے بعد وہ اس کے گھر چلی گئی۔

’’میں آپ کے بیٹے سے سوری کہنے کے لیے آئی ہوں۔ سچی والی سوری۔‘‘ جیسے ہی اسے اس کی ماں کا چہرہ دکھائی دیا‘ اس نے فوراً سوری کہا۔ ہاتھ بھی جوڑ دیے کہ ماں پر اچھا اثر پڑے۔

’’سچی والی سوری کیا ہوتی ہے؟‘‘ ماں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا یا اس کی نیت میں کھوٹ تھا یا شاید اداکاری میں۔

’’سچے دل سے سوری......‘‘ اس نے کہنا چاہا لیکن اس کی ماں نے بات کاٹ دی۔

’’بدتمیز لوگوں کا دل سچا نہیں ہوتا۔ سمجھیں......؟‘‘

وہ سمجھ چکی تھی۔ سر ہلاتی ہوئی ان کے پیچھے پیچھے اندر آ چکی تھی۔ اس بار اسے بیٹھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ ابوبکر کے سامنے جا کر بیٹھ گئی تھی‘ جو ایکشن مووی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے شاید اس نے کچھ کھایا تھا‘ اس کی ٹی شرٹ کے گول گلے پر کیچپ کا ایک چھوٹا سا داغ تھا۔ وہ ٹشو اٹھا کر اس داغ تک کو صاف نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سہمی سی بیٹھی رہی۔ وہ اس سے بات کرنے کی ہمت پیدا کر رہی تھی۔ ایک بار ابوبکر نے اسے دیکھا تھا۔ ہائے ہیلو کے انداز میں مسکرایا بھی تھا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ اسے کچھ طنزیہ لگی تھی۔

’’ٹھیک ہے، تم چور نہیں ہو‘ لیکن میں بھی اتنی بری لڑکی نہیں ہوں۔ شکل سے تم بھی کچھ ایسے شریف نہیں لگتے‘ پھر تمہارا حلیہ دیکھ کر کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے‘ کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ یعنی جیسے تم کالا سا کوٹ پہن کر‘ جاسوسوں کی طرح گھومتے پھرتے رہتے ہو‘ کوئی بھی تمہیں ’’کچھ بھی‘‘ سمجھ سکتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا......‘‘ یہ اس کی سچی سوری والی سوری تھی۔ سچے دل سے نکلے سچے الفاظ۔

اسکرین سے نظریں اٹھا کر اس نے اس کی طرف دیکھا......اور دیکھتا ہی رہا......

’’مجھ سے غلطی ہوئی تھی‘ لیکن قصور تمہارا بھی تھا۔ مجھے کیا خواب آنا تھا کہ تم بول نہیں سکتے۔ بندہ کوئی اشارہ ہی کر دیتا ہے کہ میں بول نہیں سکتا۔‘‘

’’اور وہ اشارہ کیسے کرتے ہیں؟‘‘ اس کی ماں اس کے سر پر کھڑی غصے سے پھنکارتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ’’ذرا کر کے دکھاؤ وہ اشارہ۔ ہاتھ نہ ہلانا۔‘‘

وہ ہکا بکا ماں کی شکل دیکھنے لگی۔

’’ایک بازو مفلوج ہو اور ایک کٹا ہوا ہو۔ زبان تالو سے چپکی ہوئی ہو‘ تو بتاؤ کہ کیسے اشارہ کر کے بتائے گا کہ میں گونگا ہوں۔ بول نہیں سکتا۔ تمہارا فون میری جیب میں گر گیا تھا۔ سوری۔ یہ لو

اپنا فون واپس۔‘‘

وہ پھر سے شرمندہ وہ گئی۔ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا کہ اسے اپنی زبان کو زحمت نہیں دینی چاہیے‘ ورنہ اس کے سر پر کھڑی ماں اس کا کچومر بنا کر چیل کووں کو کھلا دے گی۔

’’تم مجھے جانے کے لیے کہہ رہے ہو اور یہ لڑکی تمہاری بے عزتی کرتی جا رہی ہے۔‘‘ جاتے جاتے ماں بڑبڑائی تو اس نے سر اٹھا کر پہلے ماں اور پھر ابوبکر کو دیکھا۔

’’آئی ایم سوری مسٹر ابوبکر! میرے الفاظ بھی سخت تھے اور انداز بھی۔ لیکن سچی میں بہت معصوم بھولی بھالی سی لڑکی ہوں۔ میں نے آج تک کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ کسی کو دکھی دیکھتی ہوں تو رات رات بھر روتی (سوتی) رہتی ہوں۔ میرا دل تو سمجھو کہ سونے کا ہے (کھوٹا سونا)۔ میں تو ایسی درد دل رکھنے والی اور......میں وہ......اچھا خیر......‘‘

اس کے بعد دونوں کے درمیان پورے تین منٹ تک خاموشی رہی۔ وہ تو بول نہیں سکتا تھا‘ اور وہ بول رہی تھی تو بس اپنی ہی تعریف میں بول رہی تھی۔ جو کہ موقع کی مناسبت اور نزاکت کے حساب سے کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اب اٹھ جانا چاہیے۔

’’مجھے اب چلنا چاہیے......‘‘ اسے افسوس تو تھا کہ ان لوگوں کو مہمان نوازی وغیرہ نہیں آتی لیکن وہ اس افسوس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بس جانے ہی والی تھی کہ چائے کا ایک کپ اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے چائے کے کپ کو دیکھا پھر ابوبکر کو۔ لیکن ابوبکر ماں کو دیکھ رہا تھا......

’’اچھا ٹھیک ہے، لا رہی ہوں وہ بھی۔‘‘ وہ بڑبڑاتی ہوئی گئیں اور اس بار واپسی میں کچھ نگٹس بھی لے آئیں۔

اس نے چائے بھی پی اور نگٹس بھی کھائے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی‘ جو غصے اور شرمندگی میں اپنے پیٹ پر لات مارتے ہیں۔ لڑائی‘ غصہ‘ ناپسندیدگی اپنی جگہ‘ اور ’’پیٹ‘‘ اپنی جگہ......مطلب سب سے اچھی جگہ......

’’میں سچ میں بہت شرمندہ ہوں‘ ایک بار پھر سے سوری کہتی ہوں۔ ہاں مجھے یاد آیا‘ تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا کہ میرا فون تمہارے پاس ہے۔‘‘ بیگ میں سے ٹیولپ نکال کر وہ اس کے ساتھ صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ چائے اور نگٹس نے اس کے اندر توانائی بھر دی تھی۔ وہ تر و تازہ ہو چکی تھی۔

’’یہ دیکھو! کوئی اس پر یقین نہیں کرتا۔ میں نے اپنی فرینڈز کو بتایا تو وہ ہنسنے لگیں۔ خیر ہنسی تو مجھے بھی بہت آئی تھی جب یہ مجھے ملا تھا۔ اور پھر رونا بھی جی بھر کر آیا تھا‘ جب اس پیپر سے مجھے ’’کچھ بھی نہیں‘‘ ملا تھا۔ سوچا تمہیں بھی بتا دوں تم کون سا کسی کو بتاؤ گے۔ ہی ہی......نہیں نہیں میں تمہارے گونگے ہونے کا مذاق نہیں اڑا رہی ہے۔ بس ویسے ہی......اچھا سوری......زبان سے پھسل گیا۔ دیکھو اس میں نا یہاں......تمہاری تصویر بن گئی تھی......‘‘

اس نے فائل کی طرح کھول کر ٹیولپ کو ابوبکر کے سامنے پھیلا دیا اور حیرت سے اس کا اپنا منہ کھل گیا۔

’’اتنی بدلحاظی سے مجھے گونگا کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔ بار بار سوری کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگلی بار سوری کہنے کے بجائے تمہیں اپنے منہ پر ایک عدد طمانچہ مار لینا چاہیے۔ اس ایک عدد کو تین سے ضرب دے دینا چاہیے اور اپنا کام جاری رکھنا چاہیے۔‘‘

ٹیولپ پر لکھا تھا۔ جیسے کتاب کے صفحے پر لفظ چھپے ہوتے ہیں۔ جیسے موبائل پر میسج لکھا ہوتا ہے۔

صاف صاف...... ابو بکر حیرت سے ٹیولپ کی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ دونوں ٹیولپ پر تھوڑا سا جھک گئے تھے۔

”یہ تم نے مجھ سے کہا ہے؟؟“ اس نے پہلے سر اٹھایا اور اس سے پوچھا

”بالکل!“ جواب اس کے ہاتھ میں پکڑے ٹیولپ پر آیا۔

دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

”تو تم یہاں بول رہے ہو...... اس ٹیولپ پیپر پر۔ وہ بھی ایسے...... طمانچہ اور تین سے ضرب...... یہ سب؟“ وہ چلا اٹھی۔

”چلانا بند کرو، بد لحاظ لڑکی! میں تمہیں کل سے برداشت کر رہا ہوں۔“

”اور میں بھی......“ ٹیولپ کو رول کر کے اس نے ابو بکر کے سر پر دے مارا۔ یہ اس نے عادتا کیا تھا لیکن کچن سے برتن دھو کر نکلتی ماں کو یہ منظر اچھا لگا تھا، نہ یہ عادت اور انہوں نے آگے بڑھ کر ایک موٹا میگزین اس کے سر پر دے مارا تھا۔ ماں نے یہ عادتا نہیں کیا تھا۔

علیزہ کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ اس لیے نہیں کہ اسے ابو بکر کی ماں سے مار پڑی تھی بلکہ اس لیے کہ اس کا جیک پوٹ، اس کا ٹیولپ ایسا پھس نکل آیا تھا۔

میں نے کہا تھا نا! ہر جادوئی چیز ”جادو“ نہیں کر سکتی۔ کبھی کبھی وہ بس چھوٹے موٹے کام ہی کر سکتی ہے۔ ایک مترجم کا کام۔ ایک بے زبان کی زبان کا کام۔ ایک دوست کی طرح مددگار کا کام...... بس......

☆☆☆

اس کا الہ دین کا چراغ صرف ایک ٹرانسلیٹر تھا۔ جس ٹیولپ پیپر کو وہ کوئی بہت ہی خاص، توپ نما چیز سمجھ رہی تھی، وہ بس اتنی سی چیز نکلا تھا کہ ایک عدد گونگے لڑکے کی زبان بولنے لگا تھا بس یعنی وہ اس لڑکے کی مترجم تھی...... وہ بولے گا اور وہ پڑھے گی۔

اس نے گھر آتے ہی ٹیولپ کو دیوار پر دے مارا تھا۔ یہ جپسی کا کیا ایک عدد گھٹیا مذاق تھا۔ اسے اب ایسے پیپر کی کوئی ضرورت نہیں تھی جو نہ پیسے دے، نہ کھانا، نہ کوئی اور جادوئی طاقت...... دے تو بس ایک عدد سہولت کہ آپ کسی بے زبان کی زبان سمجھ سکیں۔ وہ بھی اس جیسے اکھڑ اور بدتمیز انسان کی۔ جو نہ فٹ بالر تھا، نہ ہی کسی فلم کا ہیرو۔ جس کے پاس کوئی گولڈ میڈل تھا اور نہ ہی کوئی ٹرافی۔ اس کی تو شکل بھی پوری طرح سے میسی سے نہیں ملتی تھی۔

کتنے ہی دن اسے دُکھ ہوتا رہا تھا۔ شروع میں ٹیولپ سے ناامید ہونے کے باوجود اسے پوری امید تھی کہ ایک دن ضرور کچھ نہ کچھ نکلے گا۔ جیسے کوئی ہیرے کی کان...... سونے چاندی کی دکان...... ضرور کچھ بڑا سا ہوگا......

بیڑا غرق ہو تو گیا تھا...... اس کی خواہشات اور خوابوں کا...... خوشحالی آئی نہیں تھی کہ ہر طرف تباہی چھا گئی تھی......

تباہی نے اُداسی سے، ٹھوڑی کو ہاتھ کی ہتھیلی پر جما کر کھڑکی سے بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھا۔ وہ اداس تھی کہ اسے کوئی خاص فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ اس کے سب خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ اسے، اس لڑکے کا مترجم بننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور اس میں بھلا اس کا فائدہ ہی کیا تھا۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ ہوگی وہی جینا، مینا، شینا، کافی مانگ رہی ہوگی۔ وہ ویسے ہی ڈھیٹ بن کر بیٹھی رہی۔ دستک پھر سے ہوئی۔ وہ بے زاری سے اٹھی، کچن سے کافی اٹھائی اور دروازہ کھول دیا۔

”یہ لو! اور خدا کے لیے یا اپنی کافی لینا شروع کر دو یا میری جان چھوڑ دو۔ میرا باپ لارڈ ہے نہ میری ماں مسز لارڈ، جو تمہیں اپنے کچن کی چیزیں اٹھا اٹھا کر دیتی رہوں۔“

”السلام علیکم! کیسی ہو علیزہ بیٹا؟“ مسٹر لارڈ آف دی رنگز کی والدہ محترمہ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ وہ مسکرا بھی سکتی ہیں یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔

”آپ؟“

”اندر آ جاؤں نا؟“

اب کیا وہ اسے گھر کے اندر گھس کر بھی ماریں گی۔ وہ بھی ایسے باقاعدہ، مسکرا کر، ہاتھ کو چینی عورتوں کی طرح سینے پر باندھ کر۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ اس کے سرسری انداز سے بتائے گئے ایڈریس پر وہ پوری طرح سے آموجود ہوئی تھیں۔

”اندر آ جائیں...... میں اور یہ......“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی باسکٹ کو اس کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔ باسکٹ میں سے کھانے کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے سر ہلا دیا۔ وہ اندر آ گئیں۔

”تم دوبارہ آئیں ہی نہیں۔ ابو بکر تمہیں یاد کر رہا تھا۔“

وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ ابو بکر اسے کیسے یاد کر سکتا تھا۔ اوہ! یہ کہیں یہ تو کہنے نہیں آئیں کہ تم ابو بکر سے شادی کر لو، اس کا خیال رکھو۔ میں بوڑھی ہو چکی ہوں، مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں رہی...... وغیرہ وغیرہ......

”میں یہ شادی نہیں کروں گی...... سوری آنٹی!“ ایک دم سے اس کے منہ سے پھسل گیا۔

وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اداس سی ہو گئیں۔ آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

”دراصل میں نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔ وہ جو تم کہہ رہی تھیں نا کہ وہ جو بولتا ہے، وہ تم سن لیتی ہو۔ وہ سب۔“

”اچھا وہ...... وہ میں مذاق کر رہی تھی...... ایسا کچھ نہیں ہے......“

”مجھے اپنے بیٹے کی بات سمجھنے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی علیزہ! میں جان جاتی ہوں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، تو کیا میں یہ نہیں جان سکتی کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ تم تب سچ بول رہی تھیں لیکن اب جھوٹ بول رہی ہو۔ ایک ماں کا دل سب جانتا ہے۔“

وہ گڑبڑا گئی۔ ماں کے دل نے اسے سہا دیا تھا۔ کیا یہ خاتون اس سے ٹیولپ پیپر لینے آئی تھیں۔ اچھا تو وہ اس کے بھی بھلا کس کام کا تھا۔ وہ اٹھی اور اس نے وہ لا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

”وہ جو بولے گا، وہ یہاں لکھا جائے گا۔ آپ یہ لے جائیں۔ میرے یہ کسی کام کا نہیں ہے۔“

”اچھا......“ خوشی سے وہ رو پڑیں۔ ”حادثے سے پہلے وہ ایک کتاب لکھ رہا تھا، جو نامکمل ہی رہی۔ اب میں اس کی مدد کر سکتی ہوں۔ وہ جو جو کہتا جائے گا، میں وہ نوٹ کرتی جاؤں گی۔ ایسے اس کی کتاب مکمل ہو جائے گی۔ پھر وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔ وہ بھی عام لوگوں کی طرح خوش باش رہا کرے گا۔“

”ایک کاپی مجھے بھی دیجیے گا۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔ (اس کی کتاب مکمل ہو جائے گی اور میرے خواب ادھورے رہ جائیں گے)

اسے دعائیں دیتے ہوئے وہ چلی گئیں۔ جس کی چیز تھی اسے مل گئی، پھر جپسی نے یہ کیوں کہا تھا کہ یہ اس کا ہے۔ کیا خاک اس کا تھا۔ اسے کیا فائدہ ہوا۔ صرف خواری اور سہانے خوابوں کی تباہی۔

☆☆☆

پاپا نے کہا تھا کہ اتنی دور جا کر، اتنے مہنگے شہر میں نہ پڑھو۔ لیکن وہ کیا کرتی، اسے نیویارک کا لچا لفنگا پن بڑا پسند تھا۔ یہ ایک بدمعاش شہر تھا۔ جہاں خالی جیب گھومنا بڑا برا سمجھا جاتا تھا۔ اُسے پسند تھا کہ اس

شہر میں انسانوں سے زیادہ ٹیکسیاں ہیں' اور جو ہاتھ کے اشارے پر رکتی ہیں نہ منہ کی سیٹی پر۔ ٹیکسی ڈرائیور خود کو بڑی توپ چیز سمجھتے ہیں۔ اور ٹیکسی پر سواری کرنے والے کو اس توپ کا گولہ بننا پڑتا ہے۔ وہ پاپا کو کیسے سمجھاتی کہ نیویارک کی اونچی بلڈنگوں کو دیکھ دیکھ کر اسے کیسی خوشی حاصل ہوتی ہے......

خوشی خاک میں مل چکی تھی۔ اسے اچھی جاب نہیں مل سکی تھی اور وہ بہ مشکل اپنے خرچے پورے کر رہی تھی۔ پاپا اور ماما نے صاف ہاتھ اٹھالیا تھا۔ وہ تو بار بار اس پر طنز کرتے تھے۔ ''اور جاؤ اتنی دور۔''

وہ دُور تک' دیر تک واک کرتی رہتی تھی۔ سوچتی رہتی تھی کہ کاش ٹیولپ کسی کام کا نکل آتا تو آج صبح چائے کے لیے دودھ ساتھ والی سے ادھار نہ لینا پڑتا۔ لانڈری کے لیے واشنگ پاوڈر تک ختم ہو چکا تھا۔

''تم نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا کیا؟ یہ تو خالی رہتا ہے۔'' اگلے دن وہ یونیورسٹی سے آئی تو اسے اپارٹمنٹ کے دروازے کے پاس ابوبکر کی ماں کھڑی ہوئی ملیں۔ شاید وہ کافی دیر سے وہاں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولنے لگیں۔

''اچھا...... اوہ...... شاید اس نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔'' اسے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ اس نے کام کیا یا نہیں۔ اس کی بلا سے۔

''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ صرف تمہارے ہاتھ سے کام کرتا ہو۔ تم ایسا کرو، میرے ساتھ چلو۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔''

''میں...... لیکن میں کیوں جاؤں؟ ویسے بھی میں بہت مصروف ہوں۔'' اس نے سنگ دلی سے شانے اچکائے اور لاک کھولنے لگی۔

''میں اندر آ کر ایک کپ چائے پی سکتی ہوں۔ دراصل میں کافی دیر سے یہاں کھڑی ہوں۔'' انہوں نے لجاجت سے کہا۔ وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں اپنے ساتھ اندر لے آئی۔ وہ بیٹھ گئیں تو وہ فریش ہونے کے لیے چلی گئی۔

''آ جاؤ' پہلے کھانا کھا لو۔ چائے بھی بس تیار ہے۔''

وہ فریش ہو کر باہر نکلی تو وہ فریج میں سے کھانا نکال کر گرم کر چکی تھیں اور اب اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

''یہ سب آپ نے کیوں کیا؟'' وہ بے حد شرمندہ ہوئی۔

''سچ بتاؤں تو میں اپنے بیٹے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ تمہیں راضی کرنے کے لیے بھی۔''

وہ خاموش رہی اور ان کی پلیٹ میں کھانا نکال کر ان کے آگے پلیٹ سرکا دی۔ ''آپ یہ کھائیں پھر بات کرتے ہیں۔''

انہوں نے فرماں برداری سے کھانا' کھانا شروع کر دیا۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ ابوبکر کی ماں کے لیے کھانا حلق سے اتارنا کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ وہ جلد سے جلد اس کا جواب سننا چاہتی تھیں۔

''تم میرے بیٹے کی مدد کرو گی نا؟'' جیسے ہی پلیٹ صاف ہوئی، انہوں نے بڑی آس سے پوچھا۔ وہ پھر سے صاف انکار کر دینا چاہتی تھی لیکن ماں کی محبت نے اس کے لب سی دیے تھے۔

''میں مجبور ہوں' مجھے یونیورسٹی جانا ہوتا ہے' پھر جاب پر۔ میں ادھر ادھر ٹائم ویسٹ نہیں کر سکتی۔''

''تم جتنا وقت اس کے ساتھ رہو گی میں تمہیں اس کے لیے پے کروں گی۔ تمہیں تنخواہ دوں گی۔ میں بہت زیادہ امیر نہیں ہوں' لیکن اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔ اس آخری حادثے نے اسے بالکل ناامید کر دیا ہے۔ وہ ہنسنا' مسکرانا بھول گیا ہے۔ اگر وہ پیدائشی ایسا ہوتا تو اور بات تھی۔ معذروی اتنی تکلیف دہ نہیں ہے' جتنی خاموشی۔ شروع میں اس نے حالات کا مقابلہ کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ اسے پوری اُمید تھی کہ اس کا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا۔ دو آپریشن ہو چکے ہیں لیکن نہ زبان ٹھیک ہو رہی ہے نہ ہاتھ۔ تمہیں اللہ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تم چاہو تو اس کی مدد کر سکتی ہو۔''

''لیکن میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''تم اس کاغذ کے ذریعے اس کی زندگی میں تبدیلی لا سکتی ہو۔ تم اس سے بات چیت کر سکتی ہو۔ اسے سن سکتی ہو۔ وہ کیا کہنا اور کیا کرنا چاہتا ہے' اس سلسلے میں تم اس کی مددگار بن سکتی ہو۔''

''لیکن مجھے اس سے بات چیت میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں پلیز۔''

''میں سب سمجھ چکی ہوں، اسی لیے تو تمہارے پاس کچھ بھی کرنے آئی ہوں۔ دیکھو ایک ماں اپنی اولاد کی خوشی کے لیے کسی کے پاس بھی جانے سے نہیں چوکتی۔ تم جو کہو گی میں وہ سب کروں گی۔ میرے پاس کچھ جیولری ہے۔ ابوبکر کے فادر تیس سال پہلے یہاں کام کے لیے آئے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے بھی یہاں بلا لیا تھا۔ ابوبکر یہیں پیدا ہوا تھا۔ ہم نے ایک مشقت بھری زندگی گزاری ہے۔ میں اور ابوبکر کے فادر رات دن کام کیا کرتے تھے۔ ابوبکر سترہ سال کا تھا جب' رحمان کی ڈیتھ ہو گئی۔ پھر میں نے اکیلے ہی اس کی دیکھ بھال کی۔ گھر لیا۔ اس کے آپریشن کے لیے پیسے جمع کیے۔ ہم اپنی زندگی سے خوش تھے۔ لیکن اب میں جب جب ابوبکر کو ایسے دیکھتی ہوں تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ موت کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ شاید اسے اپنی زندگی میں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔''

موت کا سن کر وہ ٹھٹکی تھی۔

''وہ کچھ نہ بھی کہے تو میں سب جان جاتی ہوں۔ زندگی میں اس کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔'' بیگ سے ایک لفافہ نکال کر انہوں نے اس کے سامنے رکھا۔ ''اس میں کچھ پیسے ہیں۔ یہ میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔''

وہ ہکا بکا ان کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ پیسہ چاہتی تھی، اس کی وارڈروب خالی تھی۔ اسے ایک عدد گرم کوٹ' نہیں ایک عدد ڈیزائنر' فیشن ایبل کوٹ کی ضرورت تھی۔ نئی جینز اور اسنیکرز کی بھی۔ لیکن پھر بھی......

''لیکن یہ سب...... یہ کیا ہے؟'' وہ ہکلا سی گئی۔ پیسوں کو انکار کرنا ہمت والوں کا کام ہوتا ہے۔

''یہ میری طرف سے چھوٹا سا تحفہ ہے۔ میری زندگی کی کل پونجی صرف اور صرف میرا بیٹا ہے۔ باقی دنیا کی دولت سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تم میرا سب کچھ لے لینا' لیکن میرے بیٹے کے دل کی بات سن لیا کرو۔ اس کے چند فرینڈز تھے۔ اچھے تھے وہ بھی۔ ایک تو آسٹریلیا چلا گیا ہے' وہ ویڈیو کال پر کبھی کبھی بات کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہی بولتا رہتا ہے' ابوبکر یا مسکرا سکتا ہے' یا سر کے اشاروں سے ہاں ناں کر سکتا ہے۔ دوسرے فرینڈز پہلے تو آ جاتے تھے لیکن اب نہیں آتے۔ شاید انہیں بھی میرے بیٹے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں جانتی ہوں کہ ابوبکر جیسے انسان سے دوستی نبھانا آسان نہیں ہوتا لیکن جب مجھ جیسی ماں ''محبت'' نبھا سکتی ہے تو تم جیسے لوگ تھوڑی بہت دوستی اور انسانیت تو نبھا ہی سکتے ہو نا؟'' پھر سے لفافے کو اس کے آگے کیا۔

''نہیں......'' اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ پیسے پکڑ لیے' اور انہیں اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ ہر کام کی اجرت ہوتی ہے' تو اس کام کی بھی کیوں نہیں۔ خود غرض اور لالچی ہونا بہت دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ جو بندہ نیویارک شہر میں رہے گا' وہ بندہ تھوڑا بہت خود غرض تو ہو گا ہی۔ کیونکہ نیک اور شریف

ہونے سے ‘‘کھانا نہیں ملتا’ شاپنگ نہیں ہوتی۔ زارا کے ٹاپ اور گوچی کی جیکٹ نہیں آتی۔ ہم انسانوں کی ضرورتیں اتنی نہیں ہیں، جتنی خواہشیں ہیں۔ انسان کو ضرورت نہیں خواہش بے رحم بناتی ہے۔

‘‘آپ اصرار کر رہی ہیں تو کیوں نہیں۔’’ اس نے چالاکی اور مکاری سے کہا۔

(کبھی کبھی کہانی کی ہیروئن بھی بری بن سکتی ہے)

☆☆☆

اگلے دن یونیورسٹی کے بعد ابوبکر کے پاس جانے سے پہلے اس نے تھوڑی سی تیاری کر لی تھی۔ یہ اب اس کی جاب تھی تو اسے تھوڑا بہت اہتمام کر لینا چاہیے تھا۔ اس نے ٹیولپ کو کھول کر، پھیلا کر، موبائل کی پشت پر چپکایا اور اُوپر ٹرانسپیرنٹ کور چڑھا لیا تھا۔ اب وہ ٹیولب کو موبائل اسکرین کی طرح پڑھ سکتی تھی۔

وہ مسز مطلوبہ کے پاس پہنچی تو آنٹی نے اسے خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔

‘‘آج سے میں روز تم سے ملنے آیا کروں گی۔’’

اس نے خوش ہو کر ابوبکر سے کہا۔ ٹیولپ کو پڑھا تو بلینک تھا۔ اگلے ایک گھنٹے تک وہ بلینک رہا تھا۔ آنٹی اس کی شکل دیکھ رہی تھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کچن میں لے کر جا کر پوچھ رہی تھیں۔

‘‘آج اس نے کیا کہا؟’’

آج وہ تو پتا نہیں کیا کیا کہتا رہا تھا’ لیکن اس کا ٹیولپ گونگا بنا رہا تھا۔ اس نے کام کرنا بند کر دیا تھا’ یا وہ ٹک کر کام کرنے کا عادی نہیں بن پا رہا تھا۔ اسے بے روزگاری کی عادت ہو چکی تھی یا وہ نکما اسے کچھ کما کر دینے پر تیار نہیں ہو پا رہا تھا۔ یا وہ ہڑتال پر تھا۔ یہ جیسی لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایسی بے کار چیز اسے پکڑا دی۔ اچھی بھلی گھر بیٹھے بٹھائے جاب ملی تھی۔ وہ بھی ہاتھ سے گئی۔ اگلے دو دن وہ ابوبکر کے پاس جاتی رہی لیکن ٹیولپ خاموش رہا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرتی رہتی۔ آنٹی سے جھوٹ بول دیتی تھی کہ آج یہ یہ باتیں ہوئی ہیں۔ وہ یہ یہ کہہ رہا تھا۔ اس دوران ابوبکر اسے مشکوک نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی وہ پہلو بدلتا۔ کبھی ایسا لگتا کہ وہ اپنا بازو ہلانا چاہتا ہے اور گھما کر ایک مکا اس کے جبڑے پر دے مارنا چاہتا ہے۔

‘‘گیٹ لاسٹ......’’ وہ چلا کر یہ کہنا چاہتا ہے۔

اس نے بڑی ترکیبیں لڑائیں کہ ٹیولپ پہلے کی طرح کام کرنا شروع کر دے لیکن نہیں جی۔ آخر کار وہ سب سمجھ گئی۔ اس نے ایک گہری آہ بھری۔ تو اس کی جیبیں خالی ہی رہیں گی۔ وہ امیر نہیں ہو گی۔ نہ ٹیولپ سے ڈالر ملیں گے اور نہ ہی ٹیولپ کے ذریعے۔ اگلے دن وہ ابوبکر سے ملنے کے لیے آئی تو آنٹی کا دیا لفافہ ساتھ لیتی آئی۔

‘‘میں یہ پیسے نہیں رکھ سکتی۔ تھوڑی دوستی اور زیادہ انسانیت’ کے لیے میں ابوبکر سے ملتے رہنا چاہتی ہوں۔’’ دل اور جیب پر پتھر رکھ کر اس نے کہا۔ آنٹی تو خوشی سے کھل اُٹھیں۔ اس لیے نہیں کہ پیسے واپس مل گئے تھے۔ اس لیے کہ ابوبکر کو ایک انسان دوست’ ساتھی مل گیا تھا۔

وہ ابوبکر کے پاس آ کر بیٹھی تو ٹیولپ نے دھڑا دھڑ کام کرنا شروع کر دیا۔ دل تو اس کا چاہا کہ اس کا گلا دبا دے ورنہ آگ میں جھونک دے۔ پر کیا کرتی، بے جان چیزوں پر انسان کتنا بھی غصہ نکال لے’ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

‘‘یہ تم کیا جوکر کی طرح تماشہ کرتی رہتی ہو؟ کیوں اتنا جھوٹ بولتی ہو میری ماں کے ساتھ؟’’ ابوبکر کے چہرے کے عضلات غصے سے کھنچے ہوئے تھے۔

اس نے منہ بنا کر اسے چڑایا۔ ‘‘تو اس نیویارک جیسے بھوت شہر میں رہنے کے لیے تمہارا کیا خیال ہے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ الٹا لٹک جاؤں تو بھی اتنے پیسے نہیں ملتے۔ ایک تو گھر کا کرایہ اتنا ہے’ اوپر سے ساری دنیا کا قرض دینا ہے مجھے۔’’

‘‘اب دفع ہو جاؤ یہاں سے اور دوبارہ نہ آنا۔’’ وہ کامل ترین سنجیدہ تھا

اسے غصہ آیا لیکن وہ پی گئی۔ ‘‘کافی پینے چلیں؟’’ اس نے قدرے بلند آواز سے کہا۔ آنٹی باہر آئیں’ ابوبکر کو کوٹ پہنایا اور کافی کے لیے علیزہ کے ہاتھ میں پیسے دیے۔

‘‘ہاں لے جاؤ اسے۔ بہت دنوں سے یہ بھی باہر نہیں نکلا۔’’ وہ بہت خوش تھیں اور وہ کمینگی سے مسکرا رہی تھی۔

جب وہ سڑک پر چل رہے تھے تو وہ اپنے ناخن کتر رہی تھی۔ اس نے جو جوگر پہنے ہوئے تھے، وہ ایڑی سے تھوڑے سے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کی پینٹ بھی کافی گھسی ہوئی تھی’ جو سویٹر اس نے پہنا تھا وہ بدرنگ سا تھا۔ (واشنگ پاؤڈر نہیں تھا تو وہ دھلا نہیں تھا)

‘‘لگتا ہے کافی غریب ہو تم۔’’

‘‘تمہیں تو صرف لگتا ہے نا...... مجھے تو غربت ملی ہوئی ہے۔ بری طرح سے’ پوری طرح سے۔ ٹھپہ۔ ٹھاں۔’’

اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی کمر کی طرف ‘‘غربت کا خیالی ٹھپہ’’ لگایا تو ابوبکر نے قہقہہ لگایا۔ جن لوگوں کی زبان تالو سے لگی ہوئی ہو’ وہ جب قہقہہ لگاتے ہیں تو...... تو وہ کسی بچے کی طرح لگتے ہیں۔ معصوم اور بے ضرر۔

‘‘غریب ہونا برا نہیں ہوتا’ معذرو ہونا برا ہوتا ہے۔’’ جلد ہی اس کا قہقہہ دم توڑ گیا۔

وہ چونک گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ واقعی جیب خالی ہو تو چلتا ہے’ لیکن اگر جسم کا کوئی حصہ ناکارہ ہو تو......

‘‘ماما نے تم سے کیا کہا ہے کہ میں بس مرنے والا ہوں؟’’

‘‘ہاں...... ان کا کہنا ہے کہ تم زندگی سے بےزار ہو چکے ہو۔ مایوس ہو۔’’

‘‘مائیں پتا نہیں یہ سب کیسے جان جاتی ہیں۔ کون سا آلہ فٹ ہوتا ہے ان کے دلوں میں۔’’ اس نے کہا۔

‘‘اور تم میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟’’ وہ بڑے سنجیدہ سوال کر رہا تھا۔

‘‘میں اسکول میں تھی’ جب پیسوں کے لیے جھوٹ موٹ تاش کے پتوں سے فیوچر بتایا کرتی تھی۔ میری دُور کی نظر کمزور ہے، مجھے دس فٹ سے آگے صاف دکھائی نہیں دیتا تو کسی کا فیوچر کیسے دکھائی دے سکتا ہے۔ لیکن پتا نہیں کیسے’ میں جو جو بتاتی تھی’ وہ وہ تیں چالیس فیصد درست ثابت ہو جاتا تھا۔ میرے بارے میں یہ مشہور ہو چکا تھا کہ میری بتائی باتیں سچ ہوتی ہیں۔ ایک دن میری کلاس فیلو اپنی ایک کزن کو لے کر میرے پاس آئی۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ فیوچر میں کیا بنے گی۔ یہ مشکل وقت ہوتا ہے۔ کئی بار میرے تکے فیل ہو جاتے تھے۔ مجھے احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی کو عینک لگی ہوئی ہے۔ وہ دیکھنے میں بھی ذہین نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ سائنس کے شعبے میں کوئی کمال دکھائے گی۔ ڈاکٹر یا سائنس دان بنے گی۔ میرے جواب پر لڑکی خاموش ہو گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

‘‘کیا تمہیں یقین ہے؟’’ اس نے بڑی مسکین سی صورت بنا کر پوچھا۔

مجھے خاک یقین ہونا تھا لیکن اب میں اپنے الفاظ واپس نہیں لے سکتی تھی۔ اس بزنس میں الفاظ

واپس نہیں لیے جا سکتے۔ ساکھ تباہ ہو جاتی ہے۔ خیر میں نے سر ہلا دیا کہ ہاں۔ اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ ایک مہینے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ میوزک اسکول جانا چاہتی تھی لیکن اس کے ڈاکٹر فادر اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ میرے منہ سے بھی سائنس کو سن کر اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہی بنے گی۔"

"تو اس نے مرنا پسند کیا؟" ابوبکر نے طنزیہ پوچھا۔

"ہاں......"

"اس کے بعد بھی تم لوگوں کی جانوں کے ساتھ ایسے ہی کھیلتی رہیں؟"

"مجھے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔"

"اس لڑکی کی وجہ سے؟"

"نہیں...... ایک معمولی سی غلطی پر...... میں نے ایک چھوٹے قد کی لڑکی پر مذاقاً کچھ طنز کیے تھے۔ جو اسکول میں اتنے مشہور (بدنام) ہو گئے کہ مجھ پر "نسل پرست" ہونے کا الزام لگ گیا۔ اسٹوڈنٹس کے والدین نے مطالبہ کیا کہ مجھے اسکول سے نکال دیا جائے۔ آخر کار مجھے خارج کر دیا گیا۔ پھر میرے ساتھ سب کچھ برا ہی ہوتا چلا گیا۔ دو بار میرا ایکسیڈنٹ ہوا۔ ایک بار میرا اپنڈکس کا آپریشن ہوا۔ اگر میں بروقت ہاسپٹل نہ پہنچتی تو اپنڈکس پھٹ جاتا۔ میں مر جاتی اور اس وقت تمہاری باتیں سننے کے لیے کوئی موجود نہ ہوتا۔ تم تنہا رہ کر تھک جاتے۔ اور پھر تنہائی کی موت مر جاتے...... اوہ...... میرا مطلب...... خیر......"

"تو یہ تمہاری سزا ہے......؟" ابوبکر نے منہ بنا کر پوچھا۔ وہ اتنا غیر ضروری بولتی تھی کہ شدت سے ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ اس کی زبان کو تھوڑا بہت کاٹ دیا جائے۔

"نہیں...... میری سزا تم ہو...... اگر تم واقعی میں زندگی سے مایوس ہو چکے ہو تو مجھے تمہیں زندگی کی طرف واپس طرف لانا ہے۔" اس نے ایسے کہا جیسے رومی، رومن اکھاڑے میں ہاتھ لہرا کر کہتا ہے۔ "میں ہوں تمہارا نجات دہندہ۔"

"تو پھر میری ماں سے ڈالر کیوں لیے تھے......؟" وہ دانت پیس کر بولا۔

"اب ایسی بھی فرشتہ نہیں بن گئی میں۔ ابھی بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں مجھ سے۔ پھر میں غریب بھی تو ہوں۔ اس ٹیولپ نے میری روزی روٹی پر لات مار دی۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہاری مدد کروں گا۔" اگر وہ ایک رومن کی طرح "نجات دہندہ" کا نعرہ لگا سکتی تھی تو کم وہ بھی نہیں تھا۔ گاڈ فادر کی طرح اس نے بھی سر ہلا کر کہا۔ "میں ہوں نا! تمہارا گاڈ فادر!"

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ مدد وہ کر رہی تھی اس کی۔ لیکن چلو بے چارہ خوش فہمی میں رہ لے، کوئی بات نہیں۔ پھر وہ گونگا بھی تو ہے۔

"میرا ایک دوست ہے، بلکہ تھا...... اچھی دوستی تھی ہماری...... پھر اس نے دوستی ختم کر دی۔"

"وہ تو اس نے اچھا کیا......" اس کی زبان سے پھسلا۔ اس نے اپنی زبان دانت میں دبا لی۔

"تو آج ہم اس سے ملنے جائیں گے...... چلو آجاؤ۔" وہ مارچ کرنے کے انداز سے قدم اٹھانے لگا۔

اس نے سر ہلا دیا اور ٹیکسی کو ہاتھ دینے لگی۔

"یہ تم ٹیکسی کیوں روک رہی ہو؟ اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔ بس ہے نا، بیٹھو اس میں......"

وہ خاموشی سے بس اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ غریب کی کہاں اتنی جلدی سنی جاتی ہے۔ بسوں کے دھکے، پھٹی جینز، بچے ہوئے پیزا، برگر، گھونٹ گھونٹ مانگی ہوئی کوک، اور گھنٹوں کی خالی خولی ونڈو شاپنگ...... یہ ٹیکسیاں، ہوم ڈیلیوری، آن لائن شاپنگ، یہ تو امیروں کے چونچلے تھے...... آہ...... کوئی غریب نہ ہو......

وہ اس کے ساتھ بس میں جا کر بیٹھ گئی۔ منہ لٹکا لیا۔ بیگ میں سے ببل گم نکال کر کھانے لگی۔

"ساتھ بیٹھے ہوئے کو بھی پوچھ لیتے ہیں۔" اس نے طنز کیا۔

"تم ببل کھا لیتے ہو؟" وہ خواہ مخواہ حیران ہوئی۔ (ببل تھی یا بیل جو کوئی کوئی کھا سکتا ہے۔)

"گونگا ہوں، بول نہیں سکتا لیکن زبان ہے، دانت بھی ہیں، سب کھا سکتا ہوں۔ کس دنیا میں رہتی رہی ہو تم؟"

"زبان والوں کی دنیا میں۔ کسی گونگے کے ساتھ رہنے کا یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔ اس لیے سب کچھ بدلا بدلا، یعنی عجیب و غریب...... اوہ...... یعنی سمجھ سے بالاتر لگ رہا ہے۔ ویسے بھی لڑکے ببل گم کھاتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ لڑکیوں پر سوٹ کرتا ہے یہ۔" اس نے غبارہ پھلایا اور اشارہ کر کے اترا کر کہا۔

"اور لڑکوں پر یہ سوٹ کرتا ہے۔" اس نے سر کو ٹکر مارنے کے انداز سے جھکایا اور کوٹ کے کالر سے غبارہ پھوڑ دیا۔ ببل بڑی تھی، اس کا غبارہ بھی بڑا تھا۔ پھٹا تو منہ پر نقش و نگار بنا گیا۔ پہلے غبارہ پھولا تھا، اب اس کا منہ پھول گیا۔

"کہنا کیا ہے تمہارے فرینڈ سے؟"

وہ اسے بتانے لگا کہ اس سے کیا کہنا ہے۔ وہ اس کی یونیورسٹی پہنچ چکے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اس نے اسے ڈھونڈ بھی لیا تھا۔

"تم نے ابوبکر کا کچھ قرض دینا ہے، وہ دے دو پلیز۔" رسمی تعارف کے بعد اس نے کہا۔ وہ ابوبکر کی شکل دیکھنے لگا۔

"میں نے تمہارا قرض دینا ہے...... کیا مذاق کر رہے ہو یار!"

"جب ہم آخری بار ملے تھے تو تم نے مجھ سے پورے تین سو ڈالر لیے تھے۔ پھر میرے ساتھ یہ حادثہ ہو گیا۔ میں کسی کو بتا ہی نہیں سکا کہ میں نے تمہیں اتنے پیسے دیے ہیں۔ تم نے بھی واپس نہیں کیے۔ اب میرے پیسے واپس کر دو۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "مس کیا بات کر رہی ہیں آپ! مجھے کسی سے پیسے لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو پاگل ہو گیا ہے اور پھر کیا ثبوت ہے اس کے پاس کہ میں نے پیسے لیے تھے؟ وہ بھی پورے تین سو ڈالر......"

ہاں اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ایک گونگا انسان کیا ثبوت دے گا۔ نہ وہ بول سکتا تھا نہ ہاتھ سے گریبان پکڑ کر جھنجوڑ سکتا تھا۔ تین سو ڈالر اتنی بڑی رقم نہیں تھی۔ لیکن ایسی معمولی بھی نہیں تھی۔ بات نفع نقصان سے زیادہ بے حسی کی تھی۔

"اب میرا یہ قرض لینا تمہاری ذمہ داری ہے کیونکہ میں تمہاری ذمہ داری ہوں۔" تیس منٹ کی بحث و تکرار کے بعد بھی اس کا دوست فہد نہیں مانا تو وہ اس کی طرف رخ موڑ کر کہنے لگا تھا۔

"اب تم ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو......" وہ چڑ گئی۔

"ہاں...... شاید...... لیکن تم دیکھ رہی ہو کہ دوسروں نے بھی میرا کتنا ناجائزہ فائدہ اٹھایا ہے۔" اس کے الفاظ میں اتنی تلخی تھی تو اس کے لہجے میں کتنی ہوگی۔ اگر وہ بول سکتا تو۔

"تم یہ سمجھ لو کہ تم نے کسی کو کوئی قرض دیا ہی نہیں۔"

"تو تم ہمت ہار رہی ہو۔ تمہارے پاس زبان ہے۔ دو ہاتھ ہیں اور تم ہمت ہار رہی ہو۔"

وہ چپ اس کی شکل دیکھنے لگی تھی۔ "میں اس طرح کے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

BOOKSPK

”یہ جھگڑا نہیں انصاف ہے۔ بات تین سو ڈالر کی نہیں ہے' بات حق کی ہے۔ تمہیں حق کے لیے لڑنا چاہیے۔“

وہ حیرانی سے آنکھیں جھپک کر اس گاڈ فادر کو دیکھنے لگی۔ اب وہ سمجھ گئی تھی کہ جب وہ پاپا کے سامنے ایسے بڑے بڑے ڈائیلاگ بولتی تھی تو وہ کیسا محسوس کرتے تھے۔

”باتیں بنانا آسان ہوتی ہیں۔“ اس نے اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کی۔

”تم باتیں نہ بناؤ نا...... کام بناؤ...... میرے پیسے لاکر دو مجھے واپس...... آسانی سے یا مشکل سے۔ کیسے بھی۔ وہ میں نہیں جانتا۔“

چلتے چلتے وہ رک گئی۔ مڑ کر اسے دیکھا۔

”سارے برے حادثے میرے ساتھ ہونے ضروری تھے۔“ طنزیہ کہا۔

”تم ایک لڑکی کی جان لے چکی ہو۔ میں تمہاری سزا ہوں اور سزائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بری اور تکلیف دہ۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

سزائیں ایسی بھی ہوتی ہیں...... ابوبکر جیسی...... معصوم اور بے ضرر......

☆☆☆

وہ ٹیولپ کو پھاڑ کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ وہ کسی کی ملازم تھی جو خوار ہوتی پھرے۔ وہ ابوبکر کے پاس انسانیت کے ناتے گئی تھی تاکہ تھوڑا بہت اسے سن سکے۔ دوستی کر سکے۔ اس کی ماں کو اس کے دل کی بات بتا سکے۔ کبھی کبھار اس کے ساتھ باہر جا سکے تاکہ وہ بہل جائے اور ناامید نہ ہو۔ یہ سب وہ تھوڑی سی دوستی اور زیادہ ہمدردی میں کر رہی تھی لیکن اب وہ اس کے لیے یہ سب کام نہیں کر سکتی تھی۔ کل وہ اس سے کہے گا کہ میرے لیے کسی پہاڑ سے کود جاؤ...... تو...... کیا اسے کود جانا چاہیے......؟

وہ بری طرح سے تھکی ہوئی تھی۔ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اسے بہت بھوک لگی تھی اور کچھ بنانے کی ہمت نہیں تھی۔ دودھ پی کر وہ سونے لگی تو اطلاعی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو ساتھ والے اپارٹمنٹ کی جینا مینا شینا کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”تم گھر پر نہیں تھیں تو کوئی آیا تھا اور یہ دے گیا تھا۔“

اس نے ایک بڑا سا ڈبہ اس کے آگے کیا۔ اس نے کھولا تو اندر چکن رائس تھے لیکن ڈبہ آدھا خالی تھا۔ کیوں؟ کیونکہ جس نے اسے دو گھنٹے اپنے فریج میں رکھنے کی زحمت کی تھی، اس نے اسے آدھا کھا لینے کی زحمت بھی کر لی تھی۔ چور اور ڈاکو صرف سڑکوں پر ہی نہیں گھومتے پھرتے' وہ گھروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میک اپ کرتے ہیں' یونیورسٹی جاتے ہیں' اور ڈھٹائی سے مسکراتے ہیں۔

”بہت مزے کے ہیں۔“ اس نے چٹخارہ سا لیا تو اس نے منہ بنا کر اس کے منہ پر دروازہ بند کر دیا۔

وہ ابوبکر کی ماں تھیں جنہوں نے اس کے لیے یہ چاول بھیجے تھے۔ چاول کھاتے کھاتے اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ وہ ماں تھیں اور اپنی پوری کوشش کر رہی تھیں کہ وہ ابوبکر سے ملتی رہے۔ بیٹے کو زندگی کی طرف واپس لے آئے۔

”ابوبکر آج رات جلدی سو گیا تھا' وہ خراٹے لے رہا تھا۔ تمہارا شکریہ۔“ ڈبے میں نوٹ بھی آیا تھا۔

”اوہ......“ اس نے آہ بھری۔

چاول کھا کر اس نے باقی فریج میں رکھ دیے۔ اب اسے وہ قرض واپس لینا تھا جو ابوبکر کے دوست کے پاس پھنسا ہوا تھا۔ وہ قرض کیسے لینا ہے وہ نہیں جانتی تھی لیکن شاید ٹیولپ بھائی جانتے تھے۔ اس نے اسے کھولا تو اس پر ایک ڈائری کی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ دن' تاریخ اور ”ابوبکر تین سو ڈالرز“ کے نوٹ کے ساتھ۔

”یہ ڈائری کس کی تھی......؟؟“

اگلے دن وہ شام کو فہد کے گھر پہنچ گئی۔ اس کے والد سیاسی پروگرام دیکھ رہے تھے اور امی جان کونے میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اس نے بہت مؤدب انداز سے سب کو سلام کیا۔ اسے بٹھایا گیا اور اندر سے فہد کو بلایا گیا تھا۔ فہد باہر آیا تو اسے دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔

”تم...... تم مجھے تنگ کرنے یہاں بھی آ گئی ہو۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے عادت ہے جھوٹ بولنے کی۔“ اس کے سامنے بیٹھ کر وہ آواز دھیمی رکھ کر کہنے لگا۔ وہ بار بار اپنے باپ کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے سر ہلا دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ تمہاری ایک ڈائری ہے نیلے رنگ کی' وہ مجھے دکھا دو پلیز۔“

اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ”میری ڈائری نیلے رنگ کی ہے، یہ تمہیں کیسے پتا؟“

”مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔ تم بس وہ ڈائری لا دو۔“

فہد کی امی اس کے لیے چائے اور لوازمات لائی تھیں۔ وہ کپ اسے پکڑا رہی تھیں کہ ڈائری والی بات پر چونک کر علیزہ کو دیکھنے لگیں۔

”کیا معاملہ ہے فہد؟“ انہوں نے کڑی نظروں سے بیٹے کو گھورا۔

”دراصل فہد نے ابوبکر سے کچھ قرض لیا تھا' اب یہ واپس نہیں کر رہا۔“ اس نے دبنگ انداز اور بلند آواز سے کہا کہ سیاسی پروگرام دیکھتے اس کے والد نے گردن موڑ کر فہد کو دیکھا۔ ٹی وی کی آواز کم کی اور پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”تم نے ابوبکر سے پیسے کیوں لیے تھے۔ کہاں خرچ کرنے تھے؟“

فہد کا رنگ فق ہو چکا تھا لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ ”پاپا! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے ابوبکر سے قرض لینے کی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ابوبکر کے اپنے حالات کتنے خراب رہتے ہیں۔ وہ تو مجھ سے پیسے مانگ رہا تھا...... ویسے تم ابوبکر کی کون ہو؟“

باپ سے بات کرنے کے بعد وہ اپنا غصہ دباتے ہوئے اس کی طرف مڑا۔

”اس نے مجھے اپنا سیکرٹری رکھا ہے۔“

وہ طنز سے ہنس دیا۔ ”جو انسان دونوں ہاتھوں سے معذور اور جیب سے کنگال ہے' وہ سیکریٹری کیوں رکھے گا؟“

”وہ ہاتھ سے معذور اور جیب سے کنگال ضرور ہے لیکن وہ جھوٹا، بے ایمان اور دوسروں کا حق مارنے والا نہیں ہے۔ جاؤ اور جا کر اپنی نیلی ڈائری لاؤ' جس میں تم نے اس قرض کے بارے میں ایک نوٹ لکھا ہوا ہے۔“ اس نے کچھ ایسے تحکم سے کہا کہ لاونج میں سناٹا پھیل گیا۔

”جاؤ جا کر ڈائری لاؤ۔“ اس کے باپ نے بھی تیز آواز سے کہا۔

وہ گیا' ڈائری لایا اور اس کی سمت اچھال دی۔ ظاہر ہے اس میں سے وہ صفحہ غائب تھا' جس پر قرض کی یادداشت لکھی ہوئی تھی۔

”تم صفحہ پھاڑ کر پھینک آئے ہو؟ ہے نا؟“ اسے ڈائری کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتا' وہ جلدی سے اٹھ کر اس کے کمرے میں گئی اور اسے اسٹڈی ٹیبل کی دراز میں سے وہ پھٹا ہوا صفحہ مل گیا۔ اس نے وہ صفحہ فہد کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو وہ تمسخر سے ہنس دیا۔

”تم یہ کیسے ثابت کرو گی کہ میں نے اسے یہ قرض واپس نہیں کیا۔ میں یہ بھی تو کہہ سکتا ہوں کہ میں اسے پیسے واپس دے آیا تھا۔ اب وہ مجھ پر جھوٹا دعوا کر

رہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس کے حالات خراب ہیں۔ اسے اپنے علاج کے لیے پیسے چاہئیں۔ سب میری بات کا آسانی سے یقین کرلیں گے۔‘‘

وہ اس انسان کی کمینگی پر حیران رہ گئی۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن ابھی اس کے پاس ایک عدد ترپ کا پتا موجود تھا۔

’’تمہارے ماں باپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تم نے وہ تین سو ڈالر کہاں خرچ کیے ہیں اگر میں یہ جان سکتی ہوں کہ تمہارے پاس ایک نیلے رنگ کی ڈائری ہے۔ اس کے ایک صفحے پر تم نے قرض کا نوٹ لکھا ہوا تھا تو میں اور بھی بہت کچھ جان سکتی ہوں۔ جیسے کہ تم نے اس وارڈروب میں سگریٹ کیس چھپایا ہوا ہے۔‘‘ وہ چلتی ہوئی وارڈوب کے پاس گئی اور اسے انگلی سے اسے ٹھونکا۔

’’تم روکس اِن کلب جاتے ہو۔ جس کے بارے میں یقیناً تمہارے ماں باپ کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ اس کلب میں جوا بھی کھیلا جاتا ہے‘ یہ تو ان بے چاروں کے گمان میں بھی نہیں ہوگا۔ میں ان سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ تم نے ان پیسوں سے اس کلب کی ممبر شپ حاصل کی ہے۔ وہ وہاں جائیں گے‘ پوچھیں گے اور جان جائیں گے کہ تمہارے پاس کلب کی ممبر شپ موجود ہے۔ اب اگر وہ ممبر شپ تم نے اپنے پیسوں سے بھی لی ہوگی‘ تو بھی تمہاری زندگی اس گھر میں بہت مشکل ہو جائے گی۔ تمہاری ماں تو تمہارا گلا ہی دبا دے گی۔ اور ہاں وہ غیر ملکی لڑکی...... اسے تو میں بھول ہی گئی...... یہاں...... وار ڈروب کے اس خانے میں تم نے اپنی اور اس کی مشترکہ تصویر کی ایک ٹی شرٹ چھپا کر رکھی ہوئی ہے...... یونو لورز ٹی شرٹ......‘‘ وہ وارڈروب کے دوسرے خانے کو انگلی سے ٹھونک کر کہہ رہی تھی۔

اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ جتنا کمینہ نظر آرہا تھا‘ اب اتنا ہی، ’’کم آن تم تو سیریس ہی ہوگئیں۔‘‘ نظر آرہا تھا۔

’’مجھے کچھ وقت دو‘ میں پیسے واپس کردوں گا۔‘‘ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اتنی جلدی کامیابی کی اسے امید نہیں تھی۔ جس وقت وہ اس کے گھر سے باہر نکل رہی تھی‘ اس وقت وہ زیرلب مسکرا رہی تھی۔ وہ اپنے شانے پر ایک تھپکی دینا چاہتی تھی۔ دراصل...... وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے وہ تین سو ڈالر کہاں خرچ کیے ہیں۔ یہ تو اس نے بس ایک عدد تکا مارا تھا۔ رہی بات باقی کی باتوں کی‘ تو جب وہ ٹیولپ پیپر کو دیکھ رہی تھی تو ایک ایک کر کے وہاں کچھ تصویریں بن ابھر رہی تھیں۔ بس وہ ان تصویروں کا مطلب سمجھ گئی تھی اور بروقت ان کا استعمال کرلیا تھا۔

’’تو یہ ٹیولپ سچویشن کے حساب سے بھی کام کرتا ہے۔‘‘ وہ آج پہلی بار ٹیولپ کی کارکردگی سے خوش ہوئی تھی۔

☆☆☆

’’یہ پکڑو اپنے پیسے......‘‘ اس نے ابوبکر کے سامنے پیسے رکھے تو وہ خوش ہونے کے بجائے حیران ہوا۔

’’تم نے تو واقعی یہ سب کردکھایا۔ واہ......‘‘

’’جب کسی کو قرض دیتے ہیں تو لکھوا لیتے ہیں اور دو گواہوں کی موجودگی میں دیتے ہیں۔ مسلمان ہو تو تھوڑا سا مذہب کا مطالعہ بھی کرلو۔‘‘ وہ اسے لیکچر دینے لگی۔

اس نے گہری سانس لی۔ ’’دوست ’’کسی‘‘ نہیں ہوتے۔ جب اسے پیسے چاہیے تھے تو وہ میری بہت منتیں کررہا تھا۔ میں یہ پیسے اپنے علاج کے لیے جمع کررہا تھا‘ پھر بھی میں نے اسے دے دیے۔ حادثے کے بعد میں اس کے پاس گیا کہ شاید وہ مجھے میرے پیسے واپس کردے لیکن وہ ایسے بن گیا جیسے مجھے جانتا ہی نہیں۔ مجھے اس کے رویے پر دکھ ہوا۔‘‘

’’اب تم ان پیسوں کا کیا کرو گے......؟‘‘

’’تم کیوں پوچھ رہی ہو......؟‘‘

’’کیونکہ عقل اور اخلاق کا تقاضا ہے کہ تم اس میں سے مجھے میری فیس کے پیسے نکال کردے دو۔‘‘ اس نے ڈھیٹ بن کر کہہ ہی دیا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ڈھیٹ ہونا آسان نہیں ہوتا۔ انسان کو پوری طرح سے بے شرم ہونا پڑتا ہے۔

’’او ہاں......‘‘ وہ مسکرایا اور اسے اس کی فیس دے دی۔

’’کافی کے ساتھ ایک چھوٹی سی پیسٹری اور دوے فیر۔‘‘

☆☆☆

اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ انسان پر برا وقت آتا ہے تو ہر طرف سے آتا ہے۔ اگلے دن وہ اسے اپنی دوسری فرینڈ کے گھر لے گیا۔ وہ ایک مریل سی لڑکی تھی ٹیلر۔ جو ذرا سی ہوا چلنے پر اڑ سکتی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے کافی سارے سویٹر پہنے ہوئے تھے۔ ہوا سے جنگ کرنے‘ اور جیت جانے کے لیے۔ ہر بار یقیناً ہوا ہی جیت جاتی ہوگی کیونکہ اس کے چہرے پر زخموں کے کافی نشانات تھے۔ جیسے کوئی انسان کھمبوں اور دیواروں سے ٹکراتا رہا ہو۔ وہ جیسی چپس کے خالی پیکٹ کی شکل نہیں ہو جاتی۔ ویسی اسے دیکھ کر بے ساختہ ابوبکر کی طرف دیکھنے کو جی چاہتا تھا کہ......

’’تمہیں اور کوئی نہیں ملا تھا دوست بنانے کے لیے‘ جو تم نے اسے دوست بنایا...... لو بتاؤ بھلا......‘‘

وہ تینوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تو لڑکی نے پانچویں بار ابوبکر کو ’یہاں کیوں آئے ہو‘ کی سوالیہ نظر سے دیکھا۔ ابوبکر کیا بولتا‘ اسے ہی بولنا پڑا۔

’’ابوبکر اپنی کتاب کا مسودہ واپس لینے آیا ہے۔ اس کی موٹی سی ڈائری جس پر وہ اپنی تخلیق لکھ رہا تھا۔‘‘

’’کیسی ڈائری؟ کون سی کتاب بھئی؟‘‘ وہ کمزور دبلا تو اں ضرور تھی لیکن اداکاری بہت کمال کی کررہی تھی۔

’’وہ کتاب جو یہ چند سالوں سے لکھ رہا تھا اور تم اس کے کمرے سے چرالائی تھیں۔‘‘

لڑکی کا چہرہ زرد پڑ گیا لیکن وہ مکمل اداکارہ بنی بیٹھی رہی۔ ’’تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابوبکر کی کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے۔ پتا نہیں تم کیا بات کررہی ہو۔‘‘

’’میں وہی بات کررہی ہوں جو مجھے ابوبکر نے بتائی ہے۔‘‘

’’ابوبکر تمہیں کیسے بتا سکتا ہے‘ یہ تو بول ہی نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھ بھی کام نہیں کرتے۔‘‘ اس نے ہاتھ لہرا لہرا کر ابوبکر کے جسمانی نقائص کی طرف اشارہ کیا۔

’’میں آنکھوں کی تحریر پڑھ لیتی ہوں۔‘‘ محترمہ علیزہ کو فلمی ڈائیلاگ بولنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کوئی موقعہ جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

’’آنکھوں کی تحریر......‘‘ لڑکی کو بڑی زور سے ہنسی آئی اور وہ دیر تک ہنستی رہی۔ اس کی ہڈیوں کا پنجر چوں چاں‘ ہلتا رہا۔

’’لگتا ہے، تم دونوں کو علاج کی ضرورت ہے۔ تم تو بالکل پاگل لگتی ہو اور یہ بے چارہ...... خیر...... چائے پی لی ہے تو اب اٹھ کر چلنے کی کوشش کرو...... وہ سامنے دروازہ ہے اور اس کے باہر سڑک ہے۔ نظر آرہا ہے یا میں اٹھ کر دکھاؤں؟‘‘

علیزہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی جبکہ ابوبکر چپ بیٹھا علیزہ کو دیکھتا رہا۔ دراصل وہ اس کی پرفارمنس سے خوش ہورہا تھا۔

’’اگر میں نے پولیس کو شکایت کردی تو وہ تمہارے گھر کی تلاشی لیں گے۔ پھر کتاب نکل آئی تو......؟‘‘

''تو کر دو شکایت......اگر واقعی میں ایسی کوئی کتاب ہے تو ابوبکر یہ دعوا کیسے کرسکتا ہے کہ یہ اسی کی ہے۔ اگر میں دھوکے باز ہوں تو اب تک میں نے کتاب کو کمپوز کرلیا ہوگا۔ اس کے ہاتھ سے لکھے مسودے کو ضائع کر دیا ہوگا۔ پھر کیسے ثابت کرو گے؟''

علیزہ نے گردن موڑ کر ابوبکر کی طرف دیکھا۔ ابوبکر نے شانے اچکا دیے کہ تم ہی اس کی چرب زبانی سے نپٹو۔ یہ محاذ اب تمہارا ہے۔ جنگ جیت جاؤ یا شہید ہو جاؤ۔

''کچھ خدا کا خوف ہی کرلو......'' اس نے چڑ کر کہا اور ابوبکر کو ساتھ لے کر اس کے چڑیا گھر سے باہر آ گئی۔

''وہ کتاب تمہاری ہے؟'' دونوں فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔

''ہاں......میں اپنی بیماری اور محسوسات پر لکھ رہا تھا۔ یہ بات ٹیلر جانتی تھی۔ اسے وہ کتاب بہت پسند تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کہتی تھی کہ یہ کتاب بہت کامیاب ہوگی۔ میں جلد ہی بہت امیر ہو جاؤں گا۔''

''تو حادثے سے پہلے چھپوا لیتے۔ اب تک امیر ہو چکے ہوتے' میری جان بھی چھوٹتی۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

''میں کتاب لکھ رہا تھا نوڈلز نہیں بنا رہا تھا جو دس منٹ میں تیار ہو جاتے۔'' اس نے بھی چڑ کر ہی کہا۔

''چھوڑو پھر......اسے ہی چھپوا لینے دو......تم یہ سمجھ لو کہ تم نے کبھی کچھ لکھا ہی نہیں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''تم اتنی جلدی ہمت ہار جاتی ہو......تم زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔''

''مجھ پر طنز نہ کرو۔ سمجھے۔ ابھی تمہیں تمہارے پیسے واپس لے کر دیے ہیں میں نے......''

''تو بس ٹھیک ہے...... یہ کتاب بھی لے دو......اس میں میرے بچپن کی یادداشتیں بھی ہیں۔ ویسے بھی وہ ادھوری ہے' اگر مکمل ہوتی تو ٹیلر اب تک اسے چھپوا چکی ہوتی۔ اب یہ سب تمہاری ذمہ داری ہے بس......''

''تم بس پکڑو اور اپنے گھر جاؤ۔ نوڈلز کھاؤ اور ٹی وی دیکھو۔ مجھے کیا سمجھا ہوا ہے تم نے......جواب دو؟''

''قاتل......تم نے ایک لڑکی کو خودکشی پر مجبور کر دیا تھا......''

''کتنے ظالم ہو تم۔ مجھ پر طنز کر رہے ہو۔'' انگلی کو تلوار کی طرح لہرا کر وہ غصے سے چلائی۔

''کتنی بے حس ہو تم' ایک انسان کی مدد نہیں کرسکتیں۔'' وہ پرسکون کھڑا رہا۔

''مدد کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ تم چاہتے ہو میں رات گئے اس کے گھر چھپ کر جاؤں اور تمہاری کتاب کا مسودہ چرا لاؤں؟''

BOOKSPK

''ہاں......کیوں نہیں......تم چور بن سکتی ہو۔ اچھے کام کے لیے چوری کرنا برا نہیں ہوتا۔''

''اچھائی کے سارے فلسفے اب تمہیں یاد آنے لگے ہیں۔ تمہاری کتاب تمہیں مل جائے گی تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

''تمہیں دعائیں دوں گا۔ یہ فائدہ کیا کم ہے؟''

وہ خاموشی سے اس سے دو قدم آگے چلتی رہی۔

''ایک بہت بڑے ڈاکٹر سے میری بات چیت چل رہی ہے۔ وہ میری سرجری کرنے کے لیے تیار ہے لیکن ظاہر ہے مجھے اس کے لیے بہت پیسے چاہیے ہوں گے۔ میری ماں ایک معمولی سی جاب کرتی ہے اور میں کوئی جاب نہیں کرسکتا۔ میں حکومتی فنڈ کے انتظار میں ساری زندگی نہیں بیٹھ سکتا۔

میں بولنے لگوں گا تو میری زندگی بدل جائے گی۔''

ٹیولپ اس کے سامنے کھلا ہوا تھا' وہ اس کی بات پڑھ رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ رک گئی۔ اور پلٹ کر اس کے پاس آئی۔

''تم واقعی میں بولنے لگو گے؟''

''میری ماں کو یقین ہے کہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ دیکھو، وہ کتاب بہت قیمتی ہے۔ وہ ایک گونگے انسان کی کہانی ہے۔ اس میں میری یادیں' میرے جذبات ہیں۔ وہ میری ڈائری ہے۔''

''اب وہ ڈائری کسی اور کو پیاری ہو چکی ہے اور میری مانو تو اسے اس مریل سی لڑکی کے پاس رہنے دو۔ اس سال بہت ریکارڈ توڑ سردی پڑنے والی ہے۔ وہ لڑکی درجہ حرارت گرتے ہی' اوپر اٹھ جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ پھر آرام سے وہ ڈائری تمہیں واپس مل جائے گی۔''

اس نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپتھپایا۔ تو وہ آنکھیں ترچھی کر کے اپنے شانے کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ زیرلب مسکرا دیا۔ زندگی میں ساری قیمتی چیزیں صرف پیسوں سے ہی حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ ایک عدد ''دوستانہ تھپکی'' بھی بہت قیمتی ہوتی ہے۔

''ٹھیک ہے میں فکر نہیں کرتا۔ لیکن تم فکر کرنا نہ چھوڑنا۔ تمہیں ہر حال میں اسے واپس لینا ہے۔''

ٹیولپ نے مسکراتے ہوئے اس تک ابوبکر کا پیغام پہنچایا تو اس نے پیر پٹخے تھے۔

☆☆☆

ڈائری کتنی بھی قیمتی تھی' اسے واپس نہیں ملی تھی۔ اس نے ایک اور بار جا کر اس لڑکی کی منت کی تھی کہ وہ ایک بے بس انسان کی چیز پر قبضہ کر کے اپنی خواہشات پوری نہ کرے۔ اس کی زندگی تو ویسے ہی مشکل ہے' اسے اور مشکل نہ بنائے۔ اس کی واحد چیز وہ ''کتاب'' اسے واپس لوٹا دے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔

''ہائے داوے! تمہیں اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟'' اپنے بالوں میں برش کرتے اور ان میں پنیں ٹھونکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''یہ تم نہیں سمجھو گی......جو لوگ دوسروں کی چیزیں غصب کرتے ہوں، وہ اور کچھ نہیں سمجھ سکتے۔''

''تم ہمیشہ ایسی فلسفیانہ باتیں کرتی ہو' یا میری شکل دیکھ کر ابھی ابھی یہ فلسفہ گھڑا ہے؟''

''تمہاری شکل دیکھ کر تو صرف دانت ہی رگڑ سکتی ہوں' وہ بھی آپس میں۔ دیکھو، میں پھر کہہ رہی ہوں، کتاب واپس کر دو۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا یار!'' وہ روہانسی ہو گئی۔ کیونکہ ٹیولپ بھی کوئی مدد نہیں کر رہا تھا۔

''میں بھی پھر کہہ رہی ہوں کہ بار بار یہاں آنا بند کرو۔ سمجھیں۔''

وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ مریل نہیں سمجھے گی۔ گھی سیدھی کیا ٹیڑھی انگلیوں سے بھی نہیں نکلے گا۔ لاتیں گھونسے مار کر' غنڈہ گردی دکھا کر بھی نہیں۔

''ٹھیک ہے پھر ہم ایک معاہدہ کر لیتے ہیں۔ تم کتاب واپس کر دو۔ اگر کتاب کامیاب ہو گئی تو اس کے فائدے کا پچاس پرسنٹ شیئر ملے گا......بولو منظور ہے......''

''نامنظور ہے۔ جب میں پورا سو فیصد لے سکتی ہوں تو پچاس پرسنٹ کیوں لوں؟'' اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔

''تو کتاب تمہارے ہی پاس ہے......؟'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور ہاتھ سینے پر باندھ کر اسے گھورنے لگی تھی۔

''ہاں......'' اس نے تمسخر سے ہنس کر کہا اور ہاتھ کو اس کے سینے پر رکھ کر اسے دھکا دیا۔ ''ناؤ گیٹ لاسٹ۔''

دھکا لگنے سے وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ انسان کتنا ظالم اور بے رحم ہو سکتا

ہے۔ ایک معذور انسان کی کل متاع پر قبضہ کر کے اسے اپنا بناتے ہوئے وہ لڑکی کتنی خوش اور مطمئن تھی۔

”تم جانتی ہو کہ ابوبکر کی زندگی کتنی مشکل ہو چکی ہے؟“

”زندگی کسی کی بھی آسان نہیں ہوتی۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

☆☆☆

وہ اس کی بلڈنگ سے باہر نکلی تو بہت بدمزہ ہو چکی تھی۔ یہ سارا معاملہ اس کے لیے پہلے سنجیدہ نہیں تھا‘ لیکن اب ہو چکا تھا۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ اس سے ابوبکر کی کتاب لے کر ہی رہے گی۔ ٹیولپ کو بار بار دیکھنے پر بھی کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ابوبکر سے ملنے گئی تو اسے بھی کوئی تسلی نہیں دے سکی۔

”تم اب تک کیسے صبر کر کے بیٹھے ہوئے تھے؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

اس نے ایک سرد سانس اندر کھینچی۔ ”مجھ جیسے لوگ‘ پیدا ہوتے ہی صبر کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ قدم قدم پر ہمارے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ ہم ان کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں اچھے برے سب لوگ ہیں لیکن برے لوگ زیادہ ہیں اور وہ ہمیں بار بار ملتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں‘ تکلیف دیتے ہیں۔ سچ کہوں تو میں پہلے بہت خوش امید تھا‘ کہ آہستہ آہستہ میرا ہاتھ کام کرنے لگے گا اور میں ایک ہاتھ سے کافی کچھ کر لوں گا۔ میں اپنی کوشش کے بل بوتے پر معجزے کے انتظار میں تھا۔ میری ڈگری مکمل ہونے والی تھی جب یہ حادثہ ہوا تھا۔ میں ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ میرے پاس سب کچھ نامکمل ہے۔ ایک نامکمل خاندان‘ ایک نامکمل جسم اوار نامکمل ڈگری۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک موبائل ایپ پر کام کر رہا تھا‘ جو گونگے بہرے لوگوں کے لیے بہت مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔“

”کیا واقعی؟ تو کیا بنا اس ایپ کا؟“ اس نے بہت جوش سے پوچھا۔

”تین ہفتے پہلے میرا دوست وہ موبائل ایپ لانچ کر چکا ہے۔ اسے بہت اچھا رسپانس ملا ہے۔ ایپ کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ ایک بڑی کمپنی اس سے معاہدہ کر چکی ہے۔ اسے حکومتی گرانٹ بھی مل چکی ہے۔ نیوز پیپرز میں اس کے انٹرویو آ رہے ہیں۔ وہ تو ترقی پر ترقی کرتا جا رہا ہے۔“

”اور تم؟“ اس نے افسوس سے ایک گہرا سانس کھینچا۔

”ایپ کا آئیڈیا میرا تھا۔ اس ایپ پر میں نے اس کے ساتھ کام کیا تھا۔ آج صبح میں نے اسے ایک ٹی وی شو میں دیکھا تو وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی ایک میڈ گونگی بہری تھی‘ جسے دیکھ کر اسے یہ ایپ بنانے کا خیال آیا تھا۔“

وہ حیران اسے دیکھ رہی تھی۔ ”مجھے ایڈریس دو اس فرینڈ کا۔ ایک عدد منہ توڑ مکا اس کا حق بنتا ہے۔“

”مجھ جیسے لوگ صبر کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم جان جاتے ہیں کہ ہمیں اپنی معذوری ہی نہیں“ لوگوں کی ذہنی معذوری اور لالچ کو بھی جھیلنا ہے۔ ہم ہنس کر ”لیٹ اٹ گو“ کرتے ہیں۔ اپنی یادداشت کمزور کر لیتے ہیں تاکہ نارمل لوگوں کے ابنارمل رویے کو بھول سکیں۔ ہمیں معاف کرنا آتا ہے۔ ہم دوستی کرتے ہیں تو پیٹھ پر وار نہیں کرتے۔“

”تم مایوس ہو چکے تھے اور خودکشی کرنے لگے تھے۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ ہنس دیا۔ ”ماما کو پتا نہیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ میں یہ سب کرنے لگا تھا۔ وہ ہر وقت ایسی کتابیں پڑھتی رہتی ہیں جو انہیں مجھ جیسے انسان کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد دے سکے۔ یا پھر ایسی فلمیں اور ڈاکومنٹریاں دیکھتی رہتی ہیں۔ کہیں کسی فلم میں مجھ جیسے انسان نے خودکشی کر لی تھی۔ بس تب سے انہیں لگنے لگا ہے کہ کسی دن میں بھی پانی کے پول

English
سر نہ کھجائیں..
Healthy ہو جائیں!
English
ANTI - LICE SHAMPOO
PRO-V CONDITIONER
جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات
English
ANTI - LICE SHAMPOO
PRO-V CONDITIONER
اصل کی پہچان HOLOGRAPHIC PRINT
5 منٹ میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات
SnScares
A Quality Product of
Sarwana & Sohzsihm

میں کود کر خود کو ختم کرلوں گا۔‘‘

’’تو تم اپنی اس موجودہ حالت سے خوش ہو؟‘‘

’’میں خوش نہیں ہوں‘ میں مایوس بھی نہیں ہوں اور ایسا پرامید بھی نہیں ہوں۔ میں ایک عام انسان ہوں۔ کمزور ہوں۔ ناتواں ہوں۔ تکلیف میں ہوتا ہوں تو کراہتا ہوں۔ خوش ہوتا ہوں تو مسکراتا ہوں۔ میں پہاڑ یا چٹان نہیں ہوں۔ میں ہمیشہ مضبوط نہیں رہ سکتا۔ میں بھی ٹوٹ جاتا ہوں لیکن پھر خود کو جوڑ لیتا ہوں۔ میں بھی ہر طرح کے جذبے سے گزرتا ہوں۔ میرے بھی خواب ہیں اور میں ان خوابوں کی تعبیر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

وہ اس سے پہلی بار متاثر ہوئی تھی۔ آج اسے معلوم ہوا تھا کہ ’’مشکل زندگی‘‘ کسے کہتے ہیں۔ آج اس نے جانا تھا، پیسوں کی کمی غربت نہیں ہوتی۔ اچھی خوبیوں کی کمی ’’غربت‘‘ کہلاتی ہے۔ اصل بدصورتی جسم کی نہیں روح کی ہوتی ہے۔ اچھا کھانا نہ ملنا‘ اچھے کپڑے نہ خرید سکنا اور رہنے کے لیے مناسب چھت کا میسر نہ ہونا‘ مشکل حالات نہیں ہوتے۔ زیادتی پر چلا نہ سکنا‘ زیادتی کرنے والوں کی طرف انگلی نہ اٹھا سکنا ’’مشکل حالات‘‘ ہوتے ہیں۔

’’ویسے میرے آنے سے تمہاری زندگی میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں نا۔‘‘ اس نے شوخی سے پوچھا۔ وہ اسے ہنسانا چاہتی تھی۔

’’ہاں...... بہت......‘‘ وہ دیر تک ہنستا رہا۔

’’مذاق اڑا رہے ہو میرا؟‘‘

وہ اور زیادہ ہنسنے لگا۔ پہلے اس کا دل چاہا کہ منہ پھلا کر چلی جائے۔ اسے اس کی ہنسی بری لگ رہی تھی۔ لیکن پھر وہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ وہ ہنس ہی تو رہا تھا...... اس پر ہی سہی۔ جس انسان کی ہنسی اس جیسے کتنے ہی لوگوں نے چھین لی تھی‘ اسے ہنسنے دیا جائے، خوش ہونے دیا جائے۔ کچھ دیر کے لیے اسے یہ بھول جانے دیا جائے کہ وہ ابنارمل ہے۔ معذور ہے۔ اسے بھول جانے دیا جائے کہ یہ دنیا تو ایک اچھی جگہ ہے لیکن برائی سے بھری پڑی ہے۔

☆☆☆

ٹیولپ نے فی الحال اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ وہ ہر دس پندرہ منٹ بعد اسے دیکھ لیتی تھی۔ عاجز آ کر اس نے اس پر لکھ دیا۔

’’مجھے وہ کتاب حاصل کرنی ہے‘ میری مدد کرو ٹیولپ یار!‘‘

ٹیولپ یار نے یاری نبھائی اور کچھ نمبرز اور حروف لکھ دیے۔ وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ اٹھ کر وہ اپنے لیے کھانا گرم کرنے لگی اور جب اس نے میکرو کے بٹن کو پش کیا تو اسے جھٹکا سا لگا اور اس نے جوش سے بلند آواز سے کہا۔

’’اوہ اچھا! یہ پاس ورڈ ہے...... پر کس چیز کا؟‘‘

بدقسمتی سے ٹیولپ بول نہیں سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ بے وقوف نہیں تھی۔ کھانا کھا کر وہ اپنا بیگ اٹھا کر اس ٹیلر کے چڑیا گھر آ گئی۔ وہ بیل دینے ہی والی تھی کہ اس کی نظر الیکٹرک لاک پر نظر پڑی۔ وہ چونک گئی۔ تو یہ پاس ورڈ دروازے کا لاک کھولنے کے لیے تھا۔ یعنی ٹیولپ چاہتا تھا کہ وہ گھر کے اندر گھس جائے۔ آگے کی نشان دہی بھی ٹیولپ ہی کر دے گا۔

’’دیکھو پھنسوا نہ دینا۔‘‘ اس نے ٹیولپ کو تھپک کر کہا۔

’’دیکھو، پھنس نہ جانا۔ اب ساری ذمہ داری میری تھوڑی ہے۔ کچھ تم بھی عقل کا استعمال کرو۔‘‘ ٹیولپ نے کہا۔

وہ واپس آ گئی اور اگلے دن اس وقت اس کے گھر گئی جب ٹیلر یونیورسٹی کے لیے جا چکی تھی۔ پاس ورڈ لگایا تو لاک کھل گیا۔ اندر جا کر اس نے

جلدی سے چیزوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کافی کچھ اس نے کھنگال لیا تھا لیکن اسے کچھ نہیں ملا۔ اس نے بیڈ کا میٹریس‘ چینی‘ کافی کی شیشیوں‘ لانڈری مشین‘ حتی کہ اس کے بدبودار جوتوں تک میں جھانک لیا لیکن اسے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ پھر ایک دراز میں جرابوں کے ڈھیر کے نیچے دبا ہوا ایک چھوٹا سا لکڑی کا باکس پڑا ہوا ملا۔ اس نے بڑی خوشی سے اسے باہر نکالا۔ اس پر چھوٹا سا تالا لگا ہوا تھا۔

’’اس کی چابی کہاں ہو سکتی ہے......‘‘ وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

’’چابی میرے پاس ہے۔‘‘

اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی تو خوف سے باکس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جسے اس وقت یونیورسٹی میں ہونا چاہیے تھا‘ وہ اس وقت اس کے پیچھے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اس کے ہاتھ سے باکس چھین لیا۔ پھر وہ پولیس کو فون کرنے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے فون چھین لیا۔

’’پولیس سے کیا کہو گی؟‘‘ وہ ڈر تو گئی تھی لیکن اتنی جلدی ہار بھی نہیں ماننا چاہتی تھی۔

’’تم میرے گھر میں چوری کرنے آئی ہو۔ تم نے میرا پاس ورڈ تک توڑ دیا۔ پولیس کو فون نہ کروں تو تمہاری مہمان نوازی کے لیے پیزا ڈیلیوری والوں کو فون کروں؟‘‘ وہ اتنے غصے میں تھی کہ اس کے چہرے کی کھال کھینچ کر رہ گئی تھی۔

’’لیکن تم یہ کیسے ثابت کرو گی کہ میں پاس ورڈ توڑ کر اندر آئی ہوں۔ کیونکہ میں نے پاس ورڈ توڑا نہیں کھولا ہے۔ کوریڈور میں سی سی ٹی وی کیمرہ نہیں لگا ہوا۔ اور اس وقت تم بھی یہاں موجود ہو۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ اندر آئی ہوں اور تم مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہی ہو۔‘‘

’’ہونہہ...... وہ بھی دیکھ لیں گے۔‘‘

’’اچھا چلو، میں مان جاؤں گی کہ میں چوری کرنے آئی ہوں‘ تو میں کہہ دوں گی کہ میں اپنی بک لینے آئی ہوں۔‘‘

’’وہ مان جائیں گے کہ تمہاری بک میرے ہی پاس ہے۔‘‘

’’وہ نہیں مانیں گے تو عدالت مانے گی۔ وہ ابوبکر کو دیکھے گی۔ اس کی کتاب کو پڑھے گی‘ اور یہ جان جائے گی کہ ایک گونگا انسان ہی ایسی کتاب لکھ سکتا ہے کیونکہ اس میں بہت سی ذاتی باتیں بھی لکھی ہوئی ہیں۔ جیسے ایک یادگار عید کا احوال۔ ماں کی سالگرہ کے دن کی بابت۔ اسکول ٹیچر کی باتیں۔ ایگزمز کے گریڈز۔ تم کس کس بات کو غلط ثابت کرو گی۔ ایک اور بات‘ تم نے کتاب کی کوئی کاپی نہیں کی۔ ابوبکر کا کہنا ہے کہ تم تو اتنی سست ہو کہ اپنی اسائنمنٹ پر کام نہیں کر سکتی تھیں‘ تم اس کتاب کی کاپی کیسے کر سکتی تھیں۔ تم نے اسے اسکین بھی نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو مجھے دکھائی دے جاتا۔ تمہارے پاس ایک ہی کاپی ہے اور وہ اس وقت‘ اس گھر میں موجود نہیں ہے۔ اس گھر میں کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں جو تمہاری نہیں ہیں۔‘‘

ٹیولپ نے پھر سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک ایک کر کے فلم سی چلا رہا تھا۔ جیسے سی سی ٹی وی فوٹیج چلاتا ہے اور سب معلوم ہو جاتا ہے۔ اسے بات کو سمجھنے میں چند سیکنڈز لگے تھے۔

’’ابوبکر کی کتاب کی طرح‘ تم نے کچھ اور فرینڈز کی چیزیں بھی چرائی ہیں۔ جیسے کہ......‘‘ وہ چلتے ہوئے اس کے قریب آئی اور اس کی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک آئی فون نکال لیا۔ ’’جیسے کہ یہ...... جو تم ابھی چرا کر لا رہی ہو......‘‘

’’یہ میرا ہے......‘‘

’’جو تمہارا ہے‘ وہ تمہارے کوٹ کی دوسری جیب میں پڑا ہے۔ یہ باکس جو تم نے چھپا کر رکھا

تھا' اس میں ایک قیمتی گھڑی' اور کچھ جیولری ہے...... ہاں پولیس آئے گی تو میں ایک ایک کر کے ان سب چیزوں کی طرف اشارہ کروں گی' جو یہاں موجود ہیں' لیکن تمہاری نہیں ہیں۔ لیکن تمہاری چرائی ہوئی ضرور ہیں۔"

اس نے ایڑی کے بل گھوم کر' ہاتھ لہرا کر اس چڑیا گھر کی کچھ چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اور ان کے بارے میں بھی بتاؤں گی جنہیں تم بیچ کر ہڑپ کر چکی ہو۔ پھر جانتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟"

اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اس نے سختی سے لب بھینچ لیے اور پھر وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ اس کے رونے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

علیزہ پہلے تو چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر وہ اس کے فریج تک گئی اور ایک سیب نکال کر کھانے لگی۔ وہ اس پر ترس نہیں کھانا چاہتی تھی اس لیے "سیب" کھانے لگی تھی۔

"دراصل مجھے چھوٹی موٹی چوریاں کرنے کی عادت ہے۔"

جب اس کے رونے کا سیشن مکمل ہو گیا تو دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنے لگیں۔

"چوری چھوٹی موٹی کیسے ہوتی ہے' وہ تو بس چوری ہوتی ہے؟" اس نے اس چور کو ٹیولپ کے ہاتھوں پکڑ لیا تھا تو انعام کے طور پر وہ کچن سے کاجو اور بادام کی پلیٹ بھر کر لے آئی تھی اور مزے سے کھا رہی تھی۔ ٹیلر اسے روکنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔

"مجھے جہاں تھوڑی بہت کام کی چیز نظر آتی ہے' وہ میں اٹھا لیتی ہوں۔"

"یہ عادت ہے یا لعنت......؟" اس نے جل کر پوچھا۔ وہ اپنے چور ہونے کے بارے میں کتنے آرام سے بتا رہی تھی۔

"میں ایک گھر میں تہہ خانے میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتی تھی۔ کرایہ کم تھا، اس لیے میں وہاں رہنے لگی تھی۔ تہہ خانے کے کونے میں لینڈ لیڈی کا کچھ بے کار سامان رکھا ہوا تھا۔ جب وہ مجھے جگہ دکھا رہی تھی تو اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر میں اس سامان کی موجودگی میں رہ سکتی ہوں تو ٹھیک ہے' ورنہ وہ مجھے رہنے کے لیے جگہ نہیں دے سکتی۔ میں نے فوراً ہاں میں سر ہلا دیا۔ اکثر جب بھی مجھے تھوڑے بہت پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی تو میں کچھ سامان نکال کر بیچ دیتی تھی۔ وہ کافی موٹی تھی تو کم ہی نیچے آتی تھی۔ اسے سانس کا مسئلہ بھی تھا۔"

"اور تمہیں ہاتھ کی صفائی کا مسئلہ تھا......"

"لیکن ایک دن میرا راز کھل گیا۔" وہ پھر سے سوں سوں کرنے لگی تھی۔

"بھانڈا پھوٹ گیا...... ایسے بولو......" اس نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

"میں یونیورسٹی میں تھی' وہ نیچے آ گئی۔ وہ اپنے باپ کی نشانی ہاتھی کی کھال کا لیمپ ڈھونڈ رہی تھی۔ جسے پچھلے ہفتے ہی میں نے بیچ دیا تھا۔ جب وہ اسے وہاں نہیں ملا تو اس نے ادھر ادھر اور چیزوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ بالآخر اسے اپنی ایک ایک چیز کی گمشدگی کے بارے میں معلوم ہو گیا۔"

"ایک ایک چیز کی چوری کے بارے میں......" اس نے اس کی تصحیح کی۔

"ہاں چور اور چوری دونوں کا...... اس نے اسی وقت مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ اس نے میرا سارا سامان ضبط کر لیا۔ میرے اسی سامان میں ابوبکر کی کتاب تھی۔ تم دونوں جس دن میرے گھر آئے تھے' میں ایک بار پھر اس کے گھر گئی تھی۔ اس کی منت کی تھی کہ میرا سامان مجھے واپس کر دے۔ جواباً اس نے کہا کہ میں پہلے اسے اس کا سامان واپس کروں۔ اس کا سامان تو میں بیچ کر کھا گئی ہوں۔ وہ کہاں سے واپس کروں اب۔ اس کے باپ کی نشانی ہاتھی کی کھال کا لیمپ اور دادی کی شادی کا یادگار شادی کا لباس۔"

"تم نے اس کی دادی کا شادی کا ڈریس بھی پار کر دیا؟"

"ہاں ...... وہ بہت اچھی قیمت پر بکا تھا۔ دکاندار کا کہنا تھا کہ اس کپڑے کے بہت اچھے کشن بن جائیں گے۔ آج کل تو ایسا کپڑا ملتا بھی نہیں۔"

پتا نہیں اسے اپنی کارکردگی پر خوشی تھی یا اپنی قابلیت پر۔ وہ ہنس بھی رہی تھی۔ بے حس بننے کے لیے بس بے شرم ہی تو بننا پڑتا ہے۔

"کشن...... اس بے چاری کی دادی کے ڈریس کو تم کشن بننے کے لیے دے آئیں۔ تمہیں تو ڈوب مرنا چاہیے۔ دادی کی روح کتنی بے چین ہوئی ہوگی۔"

"وہ تو دادی کی روح ہوئی ہوگی' تمہاری روح کو اتنی بے چینی کس بات کی ہے۔" دادی کی روح کو بیچ کھانے والی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اب وہ کتاب اس لینڈ لیڈی کے پاس ہے۔ تمہیں وہ کتاب چاہیے تو تم اس کے پاس جاؤ کیونکہ میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔"

سب کچھ کر کے وہ کہہ رہی تھی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ مر تو سکتی تھی نا۔ ایسے زندہ رہ کر' سب کو زندہ درگور کیوں کر رہی تھی۔

"تمہیں میرے گھر کے لاک کا پاس ورڈ کیسے معلوم ہوا؟"

علیزہ زیر لب ہنس دی۔ جیسے وہ کوئی بہت ہی اونچی چیز ہو۔ شرلاک ہومز یا عینک والا جن۔ ورنہ کرنانی چڑیل۔

"میرے پاس جادو ہے......"

"اچھا کہاں ہے......؟"

"کیوں اسے بھی چرانا ہے...... اپنی عادتیں ٹھیک کرو' ورنہ جیل میں سڑتی مر جاؤ گی۔ چوہے تمہاری لاش کھائیں گے۔ مچھر تمہاری بوٹیاں نوچیں گے۔ کاکروچ تمہارے ناک میں گھسیں گے۔ مکھیاں تمہارے منہ پر بھنبھنائیں گی...... سمجھیں......؟"

وہ سمجھ چکی تھی' اسی لیے اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی میں کچھ بھی حاصل کر لینا آسان نہیں ہوتا۔ جو چیز اس مریل کے پاس تھی' اب وہ کہیں اور جا چکی تھی۔ سڑک پر چلتے چلتے وہ رک گئی۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں اس سارے مسئلے میں پھنسوں۔" اس نے خود سے کہا۔ وہ پریشان ہو چکی تھی

"نہیں، یہ ضروری نہیں ہے۔ لیکن انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" ٹیولپ نے اس سے کہا۔

"کیا ساری انسانیت میرے اندر ہی چوکڑی مار کر بیٹھ گئی ہے؟ باقی لوگوں نے اپنے دل کے فرش' بے رحمی کے پٹرول سے دھلوا لیے ہیں۔"

اس بار ٹیولپ خاموش رہا۔ لیکن چلتے چلتے وہ گر گئی...... کیسے؟ اس کے تسمے کھل چکے تھے' اور وہ اس کے اپنے ہی پیروں تلے آ گئے تھے۔ اسے جھٹکا لگا اور وہ منہ کے بل گری۔ ناک میں سے خون نکلنے لگا تھا۔ ایک بوڑھی عورت نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا اور اپنے پاؤچ میں سے گلابی رومال نکال کر اس کا خون صاف کرنے لگی۔

"تم اکیلی انسانیت کی ٹھیکے دار نہیں بچی تھیں۔" ٹیولپ نے طنزیہ کہا۔ اشارہ فون کی طرف تھا۔

"بیٹا! دھیان سے چلتے ہیں اور اس "آکسیجن کے آلے' دل کی دھڑکن" کو تھوڑی دیر

کے لیے جیب میں رکھ لیتے ہیں۔" گلابی رومال دینے والی نے کہا۔ اشارہ فون کی طرف تھا۔

"آکسیجن کے آلے، دل کی دھڑکن" فون کو جیب میں رکھ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ابوبکر کے پاس پہنچی۔

"دیکھو، وہ کتاب اس کی لینڈ لیڈی کے پاس ہے، جس کا سامان ٹیلر چوری کر کے بیچ کر کھا چکی ہے۔ اب باقی کا کام تم کرو۔ اس کے پاس جاؤ اور اس کی منت کرو کہ وہ ٹیلر کے سامان میں سے تمہاری کتاب نکال کر تمہیں دے دے۔"

"میں منت کس منہ سے کروں گا؟ میرے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"اف...... میں تو بھول ہی گئی تھی۔" اس نے سر کھجایا۔

"تم نے اتنی معلومات بھی حاصل کر لی ہیں، یہ بھی بہت ہے۔" ابوبکر نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"مکھن نہ لگاؤ۔ بہتر ہے کہ تم مجھے کچھ رشوت لگا دو۔" اس نے جل کر کہا تو ابوبکر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ اس لینڈ لیڈی سے ملنے کے لیے چلی گئی۔ اس کے گھر کے باہر ایک چھوٹا سا نوٹ چپکا ہوا تھا کہ کرایہ کے لیے کمرہ دستیاب ہے۔ اس نے وہ نوٹ پڑھا اور اندر چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ منت سماجت سے کام بننے والا نہیں ہے، کرایہ دار بن کر ہی کوئی کام دکھانا ہوگا۔

"تم نے شاید وہ نوٹ غور سے نہیں پڑھا۔ میں نے لکھا ہے کہ کرایہ کے لیے کمرہ خالی ہے۔ "صرف لڑکوں کے لیے۔" وہ بے زاری سے بولی۔ اس سے پہلے وہ گہری نظر سے اس کا جائزہ لے چکی تھی۔

"اوہ اچھا! میں پوری کوشش کروں گی کہ کسی لڑکے سے کم نہ رہوں۔ میرا مطلب، میں اپنا رویہ مردانہ رکھوں گی......"

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ "مردانہ رویہ؟ تم زنانی ہو کر مردانہ رویہ کیسے رکھ سکتی ہو؟"

"اوہ...... میرا مطلب کہ آپ اس لیے لڑکے کو کرایہ دار رکھنا چاہتی ہیں نا کہ وہ آپ کے اسٹور کی چیزیں نہ بیچے؟"

اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا کہا تم نے...... چیزیں...... تمہیں کیسے پتا کہ میرے گھر کی چیزیں......"

اس نے اپنی زبان کاٹی۔ "وہ دراصل میں...... وہ...... وہ میں پہلے بھی تین چار گھر دیکھ چکی ہوں۔ ایک لینڈ لیڈی بتا رہی تھیں کہ یونیورسٹی کی لڑکیاں بہت تنگ کرتی ہیں۔ میک اپ چرا لیتی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں اٹھا لیتی ہیں۔ ایک لڑکی اس کی دادی کا شا...... ان کی دادی کی شال اٹھا کر لے گئی۔ تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ لڑکیاں یہ سب کرتی ہیں اور اس لیے انہیں کوئی نہیں رکھنا چاہتا۔"

"اچھا...... باقی سب کے ساتھ بھی لڑکیاں یہی کرتی ہیں۔" اس کے زخموں پر شاید تھوڑا سا مرہم لگ گیا تھا۔

"لیکن میں ایسی نہیں ہوں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ان فیکٹ میں آپ کی گھر کے کاموں میں مدد بھی کر دیا کروں گی۔"

"اور پھر گھر کا صفایا بھی کر دیا کروں گی۔" لینڈ لیڈی نے جل بھن کر کہا۔

اس کا منہ بن گیا۔ "ہر انسان ایک جیسا نہیں ہوتا میڈم!"

"ہر انسان کے منہ پر بھی نہیں لکھا ہوتا کہ وہ چور اچکا نہیں ہے۔"

"آپ میری بے عزتی کر رہی ہیں...... بے شک تھوڑی سی اور کر لیں، لیکن مجھے رہنے کے لیے جگہ دے دیں۔ میرے ایگزامز شروع ہونے والے ہیں، اور برف باری بھی۔ تو مجھے تو تہہ خانے میں بہت سکون ملے گا۔ مجھے تہہ خانوں میں رہنے کی بہت اچھی پریکٹس ہے۔ میں پورے پندرہ سال رہی ہوں۔"

"تمہیں کیسے پتا کہ میرے گھر میں ایک تہہ خانہ ہے، اور میں وہ کرائے پر دینے والی ہوں؟"

"وہ ہر گھر میں تہہ خانہ ہوتا ہے نا......" اس کے حلق میں پھندا پڑا۔

"نہیں...... ہمارے پڑوس کے کسی گھر میں نہیں ہے۔"

"وہ میں شگاگو میں رہتی ہوں نا...... تو شگاگو میں مشہور ہے کہ نیویارک کے ہر گھر میں ایک تہہ خانہ ہوتا ہے۔ بس اسی لیے۔"

"اور کیا کیا مشہور ہے شگاگو میں؟" لینڈ لیڈی نے شکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہی کہ نیویارک کی عورتیں بہت سلیقہ شعار اور خوش گفتار ہوتی ہیں۔ خوب صورت اور نازک سی۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"لیکن میں تو موٹی ہوں......" لینڈ لیڈی کے شکوک کم ہی نہیں ہو رہے تھے۔

"خوب صورت اور نازک جذبات کی حامل......" اس نے فقرہ ادل بدل کر کے لینڈ لیڈی کے سپرد کیا۔

اسے تہہ خانہ دے دیا گیا۔ جہاں ایک عدد سنگل بیڈ تھا۔ کونے میں ایک لکھنے پڑھنے کی میز اور اس پر ایک لیمپ۔ وہ اپنا سجا سجایا اپارٹمنٹ چھوڑ کر اس چھوٹے سے تہہ خانہ میں آ چکی تھی۔ انسان کا ماضی گھوم پھر کر اس کے سامنے آ ہی جاتا ہے...... آہ......

وہاں کوئی اور سامان موجود نہیں تھا۔ فی الحال وہ گھر میں گھوم پھر کے ڈائری نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ لینڈ لیڈی اس پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ پہلے اسے اپنا اعتماد بحال کرنا تھا۔ پھر لینڈ لیڈی سے بات کرنی تھی۔

"آپ کا گھر بہت صاف ستھرا ہے، کوئی کاٹھ کباڑ وغیرہ نہیں ہے۔" اس نے ایک دن اصل مقصد پر بات شروع کی۔

لینڈ لیڈی نے ایک آہ سی بھری۔ "بہت کچھ تھا، سب چلا گیا۔"

"کہاں......؟" اس کی نظروں کے سامنے ٹیلر کا چڑیا گھر گھوم گیا۔

"چور کے ہاتھوں، چور بازار......"

"اوہ...... بہت دکھ ہوا......"

"میری سالگرہ پر پاپا نے مجھے ایک لیمپ گفٹ کیا تھا۔ ہاتھی کی کھال کا تھا...... بہت پیارا اور نازک سا تھا۔"

"ہاتھی کی کھال اور نازک۔" اس کے منہ سے پھسل گیا۔ (اف پھر سے لیمپ کا قصہ)

"تم کیا جانو......"

"اتنا ہی پیارا تھا وہ لیمپ تو اسے تہہ خانے کے کاٹھ کباڑ میں کیوں پھینکا ہوا تھا۔ سنبھال کر رکھتیں نا۔"

وہ آہیں بھرتے بھرتے چونک گئیں۔ "تمہیں کیسے پتا کہ وہ تہہ خانے کے کاٹھ کباڑ میں پڑا ہوا تھا؟"

اس کا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اتنا اوپر رہ گیا کہ وہ سیدھے سیدھے اوپر نکل سکتی تھی۔ "میرا اندازہ ہے۔"

"جب سے تم آئی ہو، تمہارے سارے اندازے بالکل ٹھیک ثابت ہو رہے ہیں، کون ہو تم؟"

"وہ...... میں...... وہ دراصل......" وہ ایک دم سے رو دی۔ آنکھیں رگڑنے لگی۔ "میری ماں کے پاس بھی میرے نانا کا دیا ایک لیمپ تھا۔

خرگوش کی کھال کا۔ میری ماں نے اسے تہہ خانہ میں رکھا ہوا تھا۔ ماں سے ایک بار پوچھا کہ وہ اسے ایسے چھپا کر کیوں رکھتی ہیں تو انہوں نے کہا کہ جب جب میری نظر اس پر پڑتی ہے تو مجھے تمہارے نانا یاد آتے ہیں۔ بس اسی لیے...... تو میں نے سوچا، ہر عورت ایک جیسا سوچتی ہے۔ آپ نے بھی اس لیے اسے......“

اس نے گہری آہ بھری...... ”ہاں ہر عورت کا ایک ہی غم ہے۔ مجھے اسے دیکھ کر پاپا یاد آتے تھے۔ میں نے اسے اچھی طرح سے پیک کر کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ لیکن اگر اب وہ مجھے کہیں سے مل جائے‘ تو میں اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھوں گی۔ کاش وہ مجھے مل جائے۔“

وہ علیزہ کو مل چکا تھا‘ ٹیولپ پر۔ ایک آکشن شاپ پر پڑا ہوا تھا۔ پورے ستر ڈالر کا تھا۔ وہ ابوبکر کے ساتھ گئی اور لیمپ خرید کر لے آئی۔ پھر لا کر لینڈ لیڈی کو دیا اور کہا ”کہ ایسے ہی چلتے چلتے یہ پسند آ گیا تھا تو سوچا آپ کے لیے لے لوں۔“

لینڈ لیڈی تو سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔ پھر وہ رونے لگی۔ ”یہ تو میرے پاپا والا ہے۔“ اسے اٹھا کر‘ نشانیاں چیک کرنے کے بعد وہ سسکتے ہوئے بولی۔

علیزہ نے مسکراہٹ دبائی۔ ”اچھا...... کیا واقعی...... کیا حسین اتفاق ہے......“

پھر وہ دیر تک اسے سینے سے لگا کر روتی رہی۔ علیزہ کو دادی کے کشن بھی نظر آئے تھے‘ لیکن وہ کچھ زیادہ ہی مہنگے تھے۔ وہ اتنا کچھ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ پیسے بھی ابوبکر نے دیے تھے۔ لینڈ لیڈی کچھ اتنی خوش تھی کہ اسے رات کے کھانے کی دعوت دے ڈالی۔

”وہ ایک لڑکی آپ کی کرایہ دار رہی تھی۔ ٹیلر نام تھا اس کا۔ وہ...... وہ...... اس کا سامان آپ نے رکھا ہوا ہے۔ پلیز وہ دے دیں۔ اس سامان میں اس کے فادر کی کچھ تصویریں ہیں اور کچھ پرانی یادیں...... تو......“

کھانا کھانے کے بعد اس نے بات شروع کی۔

”تو تم اس چورنی کی فرینڈ ہو...... تمہیں اس نے بھیجا تھا......“ لینڈ لیڈی کا موڈ بگڑ گیا۔

”نہیں نہیں...... میں اس کی فرینڈ نہیں ہوں لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ اپنے سامان کے لیے پریشان ہے۔ بس میرا دل اس کے آنسو دیکھ کر نرم پڑ گیا۔ میں دوسروں کے درد محسوس کرنے والی لڑکی ہوں۔ کسی کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے سوچا کہ آپ سے بات کر کے دیکھوں۔ آپ جیسی رحم دل خاتون ضرور اسے معاف کر دیں گی۔“

رحم دل خاتون نے اسے بے رحمی سے گھورا۔

”تمہیں اس نے بھیجا ہے نا...... یہ لیمپ بھی اس نے دیا ہوگا۔ یعنی میری چیزیں اس نے چھپا کر رکھی ہوئی تھیں۔ میری دادی کا ڈریس بھی اس کے پاس ہی ہوگا۔“

کہانی الٹی پڑ گئی تھی۔ دادی کا ڈریس قینچی اور سوئی دھاگے سے گزر کر کٹ پھٹ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے دُکان کی رسید نکال کر اسے دکھائی۔

”یہ دیکھیں۔ یہ لیمپ میں آج ہی خرید کر لائی ہوں۔ آپ دکان پر جا کر بھی پوچھ سکتی ہیں۔ ورنہ فون کر کے پوچھ لیں۔ پورے ستر ڈالر کا آیا ہے۔“

لینڈ لیڈی نے دکان پر فون کیا۔ پھر کہیں جا کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر ایک لکڑی کی الماری کے پاس آئی۔ لاک کھولا اور سامان کی طرف اشارہ کیا۔

”میں غصے میں تھی تو میں نے بھی اس کا سامان بیچ دیا تھا۔ بس یہ تھوڑا بہت بچا ہے‘ یہ کسی نے خریدا ہی نہیں تھا۔“

وہ ہکا بکا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ایک پرانا کمبل‘ کچھ عمر رسیدہ‘ غم زدہ سویٹر‘ کچھ ٹوٹے پھوٹے مگ وغیرہ۔ بس۔

”اور ڈائری کہاں ہے......“ وہ چلا اٹھی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔

”ڈائری؟“ وہ یاد کرنے لگیں...... ”اس چورنی کے بعد ایک لڑکا کرایے دار بن کر رہا تھا یہاں۔ میں نے اسے چورنی کی بکس دکھائی تھیں کہ جس کی ضرورت ہے، وہ آدھی قیمت پر لے لے۔ اس نے پانچ چھ بکس لے لی تھیں...... کوئی ڈائری بھی تھی ان میں......؟“ وہ پوچھ رہی تھیں

وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ ہاتھی کی کھال سے بنے لیمپ کو اٹھا کر اپنے اور لینڈ لیڈی کے سر پر دے مارے۔

☆☆☆

”بہت دنوں سے تم ملنے نہیں آئیں۔“

ابوبکر پہلی بار اس کے گھر آیا تھا۔ اس نے سر کی جنبش سے بیل دی تھی۔ شاید اس کا سر کچھ زیادہ ہی زور سے بیل اور دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔

”تم مجھے بلا لیتے...... میں آ جاتی......“ اس کی حالت دیکھ کر اسے افسوس سا ہوا۔

”ماما نے کہا کہ مجھے چلنا پھرنا چاہیے۔“ اس نے نظریں چرا کر کہا۔

”تو تم بس واک کرنے کے خیال سے آئے ہو۔“ اس کے بے لوث سے جذبات پر پانی پڑ گیا تھا۔

وہ اپارٹمنٹ کی واحد کھڑکی میں سے پورا سر‘ اور آدھا دھڑ نکال کر باہر دیکھ رہا تھا۔ ”ہاں......“ وہیں سے کہا۔

”کھڑکی کے باہر سر نکالو‘ دھڑ نہیں۔ نیچے گر گرا گئے‘ تو کون اٹھائے گا تمہیں۔ سب اس وقت اپنی اپنی جاب پر ہوتے ہیں۔“

”اتنی اونچائی سے گرنے پر انسان نیچے نہیں اُوپر جاتا ہے۔“ سر کو کھڑکی سے باہر رکھتے ہوئے‘ اس نے مڑ کر اسے دیکھا اور زیر لب ہنس دیا۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس رکھی واحد چیئر پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔ بالکل بچوں کی طرح‘ جیسے وہ کبھی راکنگ چیئر پر بیٹھا ہی نہ ہو۔

”اچھا لگ رہا ہے یہاں آ کر۔ پر یہاں شور بہت ہے۔ تمہارا گھر بھی اچھا ہے‘ چھوٹا سا ڈربہ۔ شروع بھی نہیں ہوتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے اپارٹمنٹ کو کیا کہتے ہیں مائکرو اپارٹمنٹ...... تم تو واقعی میں بہت غریب ہو بھئی...... یہ راکنگ چیئر کتنے کی لی تھی؟“

”یہ پہلے کرایے دار کی تھی‘ فری ملی ہے۔“

وہ ہنس دیا۔ ”تمہاری قسمت کافی اچھی لگتی ہے۔“

”اچھی ہوتی تو تم سے ملتی......“ وہ طنز کر رہا تھا تو اس نے بھی کر دیا۔

اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ ”سوری“ کہنے ہی والی تھی کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا‘ اور گردن کو سیدھا کر کے باہر کی طرف جانے لگا۔ اس کی چال میں اتنی تیزی تھی کہ وہ بھی تیزی سے اس کی سمت لپکی اور عین اس کے منہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ زیادہ فاصلہ نہیں رہا تھا دونوں میں۔ پیچھے کچن کاؤنٹر تھا‘ آگے صوفہ...... گھر چھوٹا تھا......

”آئی ایم سوری...... میں مذاق کر رہی تھی۔“

کوئی اتنا قریب ہو کر ایسے سوری کہے‘ تو وہ جو دل ہوتا ہے نا‘ اس کے آس پاس گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں۔ ابوبکر ہنس دیا اور پہلے دایاں پیر پیچھے کیا۔ پھر بائیں کو بھی شرم دلائی اور ایک قدم دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹے گھر اس لیے بھی اچھے ہوتے ہیں۔

”اور میں بھی مذاق میں ہی جا رہا تھا۔ ماما کہتی ہیں، بے وقوفوں کی باتوں کا برا نہیں مانتے

بلکہ انہیں ہاتھ سے مار لیتے ہیں۔"

"گھومنے چلیں؟" اس نے ایسے چٹکی بجا کر کہا جیسے کھڑکی سے باہر اس کا ہیلی کاپٹر تیار کھڑا ہو۔

شام تک دونوں ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ ایک پارک میں بیٹھ کر انہوں نے آئس کریم کھائی۔ وہ خود بھی کھاتی رہی، اور چمچ سے اسے بھی کھلاتی رہی۔ ٹشو سے اس کا منہ صاف کرتی رہی۔ جب اس کا ہاتھ تھک گیا، تو اس نے اس کی باقی ماندہ آئس کریم خود کھالی۔

"میرے آنے سے پہلے تمہاری زندگی بڑی بے رنگ سی ہوگی۔ ہے نا؟" وہ ایک جھولے پر بیٹھ کر گول گول گھوم رہی تھی۔

"تمہارے آنے سے پہلے میری زندگی بلیک اینڈ وائٹ تھی، اب صرف بلیک ہے...... ہی ہی ہی......" وہ بھی ویسے ہی جھولے پر بیٹھ کر گھوم رہا تھا۔

"تم ناشکرے ہو، اسی لیے تمہاری کتاب نہیں مل رہی۔ اب وہ کسی اور کے پاس جا چکی ہے۔"

"وہ جس کے پاس بھی جائے، تم اس کے پاس جاؤ، اور اسے میرے پاس واپس لاؤ۔ ورنہ میرے علاج کا خرچ تم برداشت کرو۔ ہیں تمہارے پاس اتنے پیسے؟"

"ہاں، میرے پاس بہت کچھ ہے۔ تین فرینڈز کو قرض واپس کرنا ہے اس کی رسیدیں۔ لانڈری کا بل، نیکسٹ منتھ کے کرایے کی فکر، اور تیسرے سمسٹر کی فیس کا بھوت...... کیا لینا پسند کرو گے تم؟"

اس نے جل کر کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

اب وہ دونوں روڈ ریسٹورنٹ میں بیٹھے پزا کھا رہے تھے۔

"تو بس پھر! پوری جان لگا دو اور میری ڈائری واپس لے لو۔"

"تم میری جان ویسے ہی نکال لو نا اور بات سنو! تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ ڈائری جب کتاب کی شکل میں چھپے گی تو ضرور ہی کامیاب ہوگی؟ اور تمہیں بہت سارا پیسہ مل جائے گا۔"

اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

وہ سنجیدہ ہوگیا۔

"علیزہ! مجھے زندگی میں کوئی ایک آدھ یقین تو اپنے پاس رکھنا ہی ہے نا؟ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میری کتاب کامیاب رہے گی...... اگر یہ دو یقین بھی میرے پاس نہیں ہوں گے تو اور کیا بچے گا۔ میں تو بالکل خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔ پھر میرے لیے ایک بھی اور دن زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اسے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ وہ کسی بند غار میں کھڑا ہوا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ ایک مضبوط اونچے لمبے جوان انسان کو جب اس جیسا انسان چمچ بڑھا کر آئس کریم کھلاتا ہے تو وہ کتنا آکورڈ فیل کرتا ہے۔ اسی لیے اپنا شخص گھر میں بند رہتا ہے۔ وہ لوگوں کو یہ نہیں بتانا چاہتا کہ دیکھو، میں تمہاری طرح نارمل نہیں ہوں۔ تمہیں میرے منہ میں نوالے بھی ڈالنے پڑتے ہیں اور میرا منہ بھی پونچھنا پڑتا ہے۔

"تم ٹھیک بھی ہو جاؤ گے اور تمہاری کتاب بھی کامیاب رہے گی۔ ان شاء اللہ۔" اس نے پورے یقین سے کہا۔

"میں تمہیں اچھا لگتا ہوں۔" اس نے ٹیولپ پر ابوبکر کا یہ سوال پڑھا تو ٹیولپ فولڈ کر دیا اور مسکرا کر ابوبکر کی طرف دیکھا۔

"کم بولا کرو اور زیادہ سنا کرو۔ سمجھے اور اب اٹھو۔ پیسے ویسے تم ساتھ لائے نہیں تھے اور آگئے تھے سیر کرنے۔ پورے پندرہ ڈالر کے پڑے ہو تم مجھے۔ کتاب کامیاب ہو جائے تو کچھ میرا بھی حساب کتاب کر دینا پلیز۔ اٹھ جاؤ اب......"

وہ کرسی سے اٹھ کر اس سے چار قدم آگے جا چکی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ اگر وہ ٹیولپ کھولتی تو دیکھ لیتی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"کہ لڑکی مشرق کی ہو یا مغرب کی...... دل کے سوال پر، جواب دیتے ہوئے بوکھلا جاتی ہے۔"

جب وہ رات کو سونے کے لیے لیٹی تو اس نے ڈرتے ڈرتے ٹیولپ کھولا۔ اس پر ایک چھوٹا سا دل بنا ہوا تھا۔ اس نے حیرت سے دل کو دیکھا۔ پھر آنکھیں مسلیں۔ ٹیولپ بلینک تھا۔ تو پھر کیا دل اس کی آنکھوں میں بنا ہوا تھا۔ جو اسے ہر جگہ نظر آرہا تھا۔

ہاں...... کیونکہ ٹیولپ عشق محبت کے کاموں میں نہیں پڑتا۔ وہ جانتا ہے کہ جوان کاموں میں پڑ گیا، وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا اور ابھی اسے بہت سے لوگوں کے بہت سے کام کرنے تھے......

☆☆☆

لینڈ لیڈی سے اسے اس لڑکے کی ایک تصویر اور فون نمبر مل گیا تھا۔ اس نے فون کیا تو فون بند ملا۔ شاید وہ نمبر بدل چکا تھا۔ سوشل سائٹس پر ڈھونڈا تو وہاں بھی نہیں ملا۔ وہ ملک سے باہر ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے غلطی سے ڈائری لے لی ہو پھر بعد میں غیر دلچسپی سے یہاں وہاں پھینک دی ہو۔ بلکہ ضائع ہی کر دی ہو۔ ٹیولپ بھی خاموش تھا۔ ابوبکر بھی چپ چپ رہتا تھا۔

"تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ ہمیں وہ ڈائری نہیں ملتی تو پھر؟" ابوبکر اس سے ملنے یونیورسٹی آیا تھا۔ لنچ کے بعد، واک کرتے ہوئے، اس نے اس سے پوچھا تھا۔

"تمہیں برا لگا؟" جواب میں وہ خاموش رہا تو اس نے پوچھا۔

"نہیں......"

"تم ڈائری کے خیال کو دل سے نکال نہیں سکتے؟ وہ ڈائری تمہاری کل متاع نہیں ہے۔ وہ بس تمہاری ایک کوشش ہے۔ انسان کا سب کچھ تباہ ہو جائے تو بھی بہت کچھ سلامت رہتا ہے۔ اس کی ہمت اور آگے بڑھنے کا جذبہ۔"

"نارمل لوگوں کے لیے ایسی باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔"

"ابنارمل صرف وہی نہیں ہوتا ابوبکر جس میں جسمانی نقائص ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ زندگی کی جنگ صرف تمہارے لیے مشکل ہے؟ کیا یہ مجھ جیسے...... چلو مجھے چھوڑو...... کیا یہ دوسرے مکمل انسانوں کے لیے آسان ہے؟ غربت کی چکی میں پسنے والا ہر وہ انسان جو رات دن جان توڑ محنت کرتا ہے پھر بھی اسے دو وقت پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ کیا وہ ابنارمل زندگی نہیں گزار رہا؟ ملک بدر ہوئے سارے ریفوجی جو کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں، اور صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں خانہ جنگی ختم جائے اور وہ واپس اپنے گھروں کو جائیں، کیا وہ ابنارمل زندگی نہیں گزار رہے؟ جو بچے یتیم ہو چکے ہیں، جن نومولودوں کی مائیں مر چکی ہیں، جن کے سروں پر سائبان نہیں، جن کا کوئی سہارا نہیں، جو سالوں سے مہلک بیماریوں سے لڑ رہے ہیں، کیا وہ ابنارمل زندگی نہیں گزارتے؟؟ تمہیں کیا لگتا ہے، گونگا بہرا، اندھا، یا ہاتھوں سے معذور ہونا ہی ابنارمل ہونا ہوتا ہے؟ ہم سب انسانوں کی زندگیاں کہیں نہ کہیں سے نامکمل ہیں۔ لیکن ہاں جہاں بہت سی کمیاں ہوتی ہیں وہاں بہت کچھ موجود بھی ہوتا ہے۔"

ابوبکر یک ٹک اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ دونوں چلتے چلتے رک چکے تھے۔

"تم گونگے بہرے نہیں ہو، بلکہ چند وجوہات کی بناء پر تم صرف بول نہیں سکتے۔ تم نے ان لوگوں کے بارے میں سوچا ہے جو سرے سے سن ہی نہیں سکتے۔ سرجری کے ذریعے تمہاری زبان کے ٹھیک

ہونے کے چانسز ہیں، لیکن ان کے بارے میں کیا کہو گے جو کسی بھی طرح کے علاج سے کوئی بھی آواز سننے کے لیے قابل ہی نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی آواز سنی ہی نہیں۔

زندگی تم پر بہت مہربان رہی ہے، کیونکہ اس زندگی نے تمہیں اپنی ہر آواز سنائی ہے۔ بارش کی بوچھاڑ، ٹریفک کا شور، ماں کی لوری اور لاڈ، بچوں کے مترنم قہقہے، پرندوں کی چہکار...... اور یہ دیکھو...... مجھے......" دونوں پیر جوڑ کر وہ اچھلی، اور پیروں کو فٹ پاتھ پر زور سے رگڑا۔

"ایسی اوٹ پٹانگ آوازیں بھی۔ جو مفت ہیں، جن پر تمہارا پورا حق ہے۔ زندگی نے تم سے کچھ چھپا کر نہیں رکھا۔ تمہیں سب دیا ہے۔ تمہارا ایک ہاتھ مفلوج ہے، لیکن ایک کے ٹھیک ہونے کے چانسز ہیں، آج نہیں تو کل یہ بھی ٹھیک ہوجائے گا۔"

"اتنی جلدی سب کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"ہاں...... جلدی نہیں. ہوتا کوشش سے ہوتا ہے اور یہ کوشش تمہیں کرنا ہے۔ ہیلن کیلر نے پہلا جملہ کیا بولا تھا؟ جانتے ہو؟ اس نے کہا تھا۔ "میں گونگی نہیں ہوں۔" اس جملے کا مطلب جانتے ہو کیا تھا؟ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میرے پاس آواز ہے، اس کا مطلب تھا کہ میرے پاس طاقت ہے۔ میں فتح مند ہو چکی ہوں۔ میں اپنی کمزوری کو مات دے چکی ہوں۔ میں ہیلن کیلر "میں ایک مکمل انسان ہوں۔" بیس سال اس نے اپنا ہاتھ اپنی ٹیچر کے ہونٹوں اور حلق پر رکھا تھا اور دنیا کا سارا علم نچوڑ لیا تھا۔ تم بیس مہینوں میں تھک گئے ہو؟"

ابوبکر لاجواب ہو چکا تھا۔

"ٹیولپ تمہاری مدد کے لیے آیا ہے، لیکن سچ بتاؤ، کیا تم خود ٹیولپ سے بڑا جادو نہیں ہو؟ تمہاری ہمت اور حوصلہ بذات خود ٹیولپ نہیں ہے؟ اب تک کی انسانی تاریخ میں کتنے بڑے بڑے جادو ہوئے ہیں۔ کیوں اور کیسے؟ صرف اس لیے کہ انسان کے پاس ہر جادو سے بڑا ایک جادو ہوتا ہے۔ اس کی محنت کا جادو۔ اس کے جنون اور لگن کا جادو۔ خود کو مکمل سمجھنے اور کبھی ہار نہ ماننے کا جادو۔ اللہ نے ٹیولپ کو بھیجا لیکن کوشش کے لیے ہمیں ہی موجود رکھا۔ تم سے ملنے سے پہلے میں بہت مختلف تھی، لیکن اب میں بھی بہت بدل چکی ہوں ابوبکر۔ زندگی آسائشوں کو حاصل کر لینے کا نام نہیں ہے۔ کامیاب زندگی دولت اور شہرت، کے گرد نہیں گھومتی۔ کامیاب زندگی اور کامیاب انسان تو وہ ہے جو پہلے خود مضبوط انسان بنے، پھر دوسرے کمزور انسان کو مضبوط بننے میں مدد دے۔ یہ زندگی انسانیت کی خدمت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔"

ابوبکر چپ تھا۔ وہ رات تک چپ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کب اور کیسے وہ اتنا بدل گیا تھا۔ بچپن سے لے کر اس حادثے سے پہلے تک وہ بہت خوش اُمید رہا تھا۔ اس نے کبھی خود کو گونگا نہیں سمجھا تھا۔ اس کے بہت سے پلانز تھے، خواب تھے، جنہیں وہ پورا کرنا چاہتا تھا۔ پھر کیسے ہاتھوں کی معذروی کے بعد اس نے خود کو ادھورا سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ہنسنا اور قہقہے لگانا ترک کر دیا تھا۔ اپنے خوابوں کو محدود کر لیا تھا۔ وہ کیوں محسوس نہیں کر پایا تھا کہ اس پر مایوسی طاری ہوتی جارہی ہے۔ ہمت ہارنا شروع کر دی ہے۔ وہ خود کو صفر سمجھنے لگا ہے۔

☆☆☆

چند دنوں بعد وہ دوبارہ اس سے ملنے کے لیے گئی تو ابوبکر گھر پر نہیں تھا۔ آنٹی نے بتایا کہ وہ قریب گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلنے کے لیے گیا ہے۔

"جب وہ فٹ بال کھیلتا ہے تو اکثر منہ کے بل گر جاتا ہے، اٹھنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے، لیکن پھر بھی وہ چلا گیا۔" آنٹی کی آنکھیں نم تھیں لیکن چہرے پر خوشی تھی۔ وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ تکلیف

سے گزر کر ہی سہی لیکن ابوبکر خود کو زندگی میں شامل کرے۔ پھر انہوں نے اسے کچھ پیپرز دکھائے۔

"ساری ساری رات بیٹھ کر انہیں لکھتا رہتا ہے۔ پسینے سے بھیگ جاتا ہے۔ تکلیف سے چہرہ کھنچ جاتا ہے لیکن یہ پین کو انگلیوں میں پھنسا کر لکھتا ہی رہتا ہے۔ ٹائپ کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔"

اپنی گم شدہ ڈائری کو بھول کر وہ نئے سرے سے کچھ لکھنا شروع کر چکا تھا۔ ان پیپرز پر ٹیڑھی میڑھی چار پانچ سطریں لکھی ہوئی تھیں اور پہلی سطر تھی۔

"میں ایک مکمل انسان ہوں۔"

☆☆☆

"ایسا تو نہیں کہ وہ یہ دنیا ہی چھوڑ چکا ہو۔"

وہ خود سے محو کلام تھی۔ اپنے کھانے کے لیے کچھ بنا بھی رہی تھی۔

"تم کتنی آسانی سے موت کے بارے میں سوچ لیتی ہو۔ بہت بری بات ہے۔"

اچھی بات یہ تھی کہ پین میں ساس ڈالتے ہوئے اسے ایک آواز سنائی دی......

"میرے خیال سے میں بہرا نہیں ہوں، سن چکا ہوں کہ تمہیں نو بجے پک کرنا ہے۔ اگر تمہاری فلائٹ لیٹ ہوئی، تو مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ میں وہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا...... ٹھیک ہے...... بائے......"

وہ سمجھی ساتھ والے اپارٹمنٹ سے کسی کی آواز آرہی ہے۔ اس نے آواز پر توجہ نہ دی۔ جب وہ برتن دھو چکی، تو...... تو...... اسے یاد آیا کہ ساتھ والے اپارٹمنٹ میں کیا، پورے فلور میں کوئی لڑکا نہیں رہتا۔ تو یہ آواز آئی کہاں سے۔ کچن کاؤنٹر پر اس کا موبائل رکھا ہوا تھا۔ تو آواز ٹیولپ سے آئی تھی۔ اس نے جلدی سے ٹیولپ کو دیکھا لیکن وہ بلینک تھا۔ اس نے کوفت سے اسے پٹخ دیا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ اب یہ کون تھا جو ایرپورٹ جارہا تھا، یا جہاز سے آرہا تھا۔ وہی کرائے دار لڑکا یا یہ آواز ہی کسی اور کی تھی...... کون سے والے "نو" کا کہا تھا۔ صبح کے یا رات کے...... دن کون سا تھا...... اس ہفتے یا اگلے ہفتے۔ اف...... اس نے ٹیولب کو اپنے منہ کے سامنے رکھا اور ایک تھپڑ کھینچ کر مارا۔ اگر ٹیولپ انسان ہوتا تو وہ اسے جاب سے برخاست کر دیتی۔ بندہ دے تو پوری اور ٹھیک ٹھیک تفصیل دے۔ ورنہ نہ دے۔

وہ پریشان ہو چکی تھی۔ آج دن کے نو تو گزر چکے تھے۔ رات کے نو بجے سے پہلے وہ آٹھ بجے ہی ایئرپورٹ آچکی تھی اور وہ ادھر ادھر چل پھر کر لڑکے کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نو سے گیارہ بج گئے لیکن وہاں کوئی نہیں آیا۔

رات کو سونے سے پہلے اس نے صبح جلدی اٹھنے کے لیے الارم لگا دیا۔ صبح اتوار تھا اور وہ بارہ بجے تک سوتی تھی لیکن اب اسے سات بجے اٹھ کر نو بجے سے پہلے ایرپورٹ جانا تھا۔

وہ اگلے دن صبح ایئرپورٹ پہنچ گئی لیکن گیارہ بجے تک اسے وہاں کوئی نہیں ملا۔ اس کے پاس کرایے دار کی جو تصویر تھی، وہ اس تصویر کو اتنی بار دیکھ چکی تھی کہ اسے لگنے لگا تھا کہ اس کی اپنی شکل اس کرایے دار لڑکے جیسی ہو چکی ہے۔

وہ گھر واپس آئی اور رات کو پھر نو بجے سے پہلے، ایرپورٹ آگئی۔ اسے ہنسی بھی آرہی تھی اور رونا بھی۔ ہنسی اس لیے کہ اس کی زندگی کہاں سے کہاں آچکی ہے۔ رونا اس لیے کہ وہ منحوس آکر کیوں نہیں دے رہا، جو فون پر بات کر رہا تھا۔

وہ منحوس آچکا تھا۔ وہ پک کرنے کے لیے آیا تھا۔ بار بار ریسٹ واچ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نو بجنے میں ابھی پورے سات منٹ تھے کہ علیزہ نے اس کے بارہ بجا دیے۔

"تم جسے پک کرنے آئے ہو، اس کی فلائٹ

پورے تیس منٹ لیٹ ہے۔ میں تم سے ملنے کے لیے آئی ہوں (جمائی لیتے ہوئے) اور میں۔ میں تمہارا یہاں تین سال...... مطلب تین دن سے انتظار کررہی ہوں۔‘‘

وہ حیران ہو کر اس عجیب و غریب لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے شاید تین دن سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا، اسی لیے بے چاری بہک گئی تھی۔

’’تم مسز نوبیتا...... اوہ میرا مطلب مسز جارج کے گھر پے انگ گیسٹ رہ چکے ہو۔ وہاں تم نے ان سے کچھ بکس خریدی تھیں‘ جن میں ایک ڈائری بھی تھی۔ مجھے وہ ڈائری واپس چاہیے کیونکہ وہ کسی اور کی ملکیت ہے۔ اور دیکھو! کوئی ہوشیاری نہیں دکھانا۔ میرے دو آدمی تم پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔‘‘ چوتھی جمائی کو بمشکل روکتے ہوئے اس نے بمشکل ہی کہا۔

لڑکے نے گردن موڑ کر آس پاس دیکھا اور پھر قہقہہ لگایا۔ ’’کوئی پرانک کررہی ہو؟ کیمرہ کہاں چھپایا ہے۔‘‘

’’میں تھپڑ ماروں گی اور وہ تمہارے منہ پر چھپے گا۔‘‘ وہ یہ کہنا چاہتی تھی‘ لیکن کہہ نہیں سکی۔

بہر حال دس منٹ کی بحث و تکرار کے بعد وہ دونوں اگلے دن ایک جگہ مل بیٹھ کر بات کرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اگلے دن جب وہ وقت مقررہ پر اس کے ڈیپارٹمنٹ گئی تو وہ گھاس پر سینے کے بل لیٹ کر لیپ ٹاپ پر کام کررہا تھا۔

’’تم ڈائری لے آئے ہو۔‘‘ وہ گھاس پر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

’’میں نے کب کہا تھا کہ میں ڈائری لاؤں گا۔‘‘

’’تم نے کہا تھا، کل آنا اور لے جانا......‘‘ وہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

’’ہاں کہا تھا...... کل آنا اور ’’انکار‘‘ لے جانا...... میں ڈائری نہیں دوں گا۔ دے دیا ’’انکار‘‘ اب جاؤ۔‘‘

اس کا خون کھول کر رہ گیا۔ یہ تو بدتمیزی کی حد تھی۔ ’’دیکھو، کسی کی چیز پر پرایسے قبضہ نہیں کرتے۔‘‘

’’میں نے کسی کی چیز پر قبضہ نہیں کیا۔ میں نے اس گھر کی مالکن سے وہ ڈائری خریدی ہے۔ پیسے دیے ہیں اسے۔‘‘

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا‘ اس نے ڈائری چوری نہیں کی تھی۔ قبضہ بھی نہیں کیا تھا۔ جیسے نیلامی میں لوگ چیزیں خرید کر ان کے مالک بن جاتے ہیں‘ ویسے ہی وہ بن چکا تھا۔ اب اس سے کوئی بھی وہ ڈائری واپس نہیں لے سکتا تھا۔

’’وہ ڈائری تمہارے کسی کام کی نہیں ہے‘ لیکن وہ ابوبکر کے بہت کام کی ہے۔ وہ سرجری کروانا چاہتا ہے۔ زندگی میں آگے بڑھنا چاہتا ہے۔‘‘

’’تو تم یہاں میرے سر پر کھڑی کیا کررہی ہو۔ تم بھی آگے بڑھو...... شاباش......‘‘

غصے سے کھولتے ہوئے اس نے مٹھیاں بھینچ لیں اور بہت ضبط سے کہا۔ ’’تم اس ڈائری کے بدلے میں کیا لوگے؟‘‘

’’تم کیا دے سکتی ہو؟‘‘

’’کچھ بھی...... لیکن دیکھو، بے وقوفوں کی طرح پیسے نہ مانگ لینا۔ کوئی ایسا کام جو میں کرسکوں۔‘‘

وہ ٹھوڑی کھجانے لگا۔ شاید وہ سچویشن انجوائے کررہا تھا۔ ’’تم میری گرل فرینڈ سے میری بات کرواسکتی ہو؟؟‘‘

’’تم خود بات کرلو...... فون کرلو...... مریخ پر تو نہیں رہتی نا وہ......؟‘‘

’’اس زمین پر نہیں رہتی...... وہ مرچکی ہے......‘‘

’’تو تم بھی مرجاتے۔‘‘ اس نے سوچا لیکن کہا نہیں۔ کہا اس نے یہ۔

’’مجھے مردہ لوگوں سے بات چیت کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تم کچھ اور کہو شاید میں وہ کرسکوں۔‘‘

’’یہ کرسکتی ہو تو ٹھیک ہے...... ورنہ بائے بائے......‘‘ اس نے ہاتھ ہلایا۔

’’ہائے ہائے......‘‘ اس کا دل دہائی دینے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ شاید ٹیولپ اس سلسلے میں کچھ کرسکے۔

’’اچھا اپنی گرل فرینڈ کا نام وغیرہ بتاؤ۔ یا کوئی تصویر دے دو‘ میں کوشش کروں گی۔‘‘

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ ہاں کہہ دے گی۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ گیلری تک گیا۔ ایک تصویر نکالی اور اسے علیزہ کی آنکھوں کے سامنے کردیا۔

’’یہ ہے وہ......‘‘

اور آپ جانتے ہیں کہ ’’وہ‘‘ کون ہے۔ یہ وہی ’’وہ‘‘ ہے۔ جس کے کارڈز پڑھ کر علیزہ نے کہا تھا کہ وہ سائنس دان یا ڈاکٹر بنے گی۔ لیکن جو خودکشی کرکے ’’مردہ‘‘ بن چکی تھی......

اوہ......‘‘ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ تو اس کی اصل سزا یہ تھی۔ اس نے اپنی پیشانی کو ہاتھ سے ٹھونکا۔

☆☆☆

گھر آکر اس نے ٹیولپ پر لڑکی کا نام لکھا تھا۔ اس پر اس کی تصویر بھی رکھی تھی لیکن ٹیولپ نے کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک مردہ لڑکی سے بات کرنا چاہتا تھا اور ٹیولپ مردہ لڑکی سے بات نہیں کرواسکتا تھا۔ اب ڈائری کا اصلی مالک بھی وہی تھا۔ وہ جس شرط پر چاہے‘ اس شرط پر انہیں ڈائری واپس دے سکتا تھا۔ وہ دھونس سے اس سے ڈائری واپس نہیں لے سکتے تھے۔ نہ پولیس کے ذریعے نہ ہی عدالت کے ذریعے۔

وہ ابوبکر سے ملنے کے لیے گئی تو آنٹی ڈاکٹر سے فون پر بات کررہی تھیں۔ وہ بہت پرجوش تھیں۔ شاید ڈاکٹر نے انہیں کوئی اچھی خبر سنا دی تھی۔ ایک ماں کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اپنے بیٹے کو تندرست دیکھنے کی تھی۔ انتظار تھا تو بس پیسوں کا۔ اور بات صرف پیسوں کی بھی نہیں تھی۔ بات اس کامیابی کی تھی جس کی ابوبکر کو اب ضرورت تھی۔ اس یقین کی تھی‘ جو اس کے پاس موجود رہنا چاہیے تھا۔ اس کی اپنی چیز...... اس کا اپنا کام...... اس کی اپنی قابلیت......

کتنے ہی دن اور پھر ہفتے بھی گزر گئے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ نیویارک میں سردی بڑھ گئی۔ ایک دن برف باری کے دوران اچانک ابوبکر اس سے ملنے چلا آیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

’’اتنی ٹھنڈ میں تم گھر سے باہر کیوں نکلے......؟‘‘

’’ماما نے کہا، چلنا پھرنا اچھا ہوتا ہے......‘‘ اس کے پاس بولنے کے لیے ایک یہی جھوٹ‘ ایک یہی بہانا رہ گیا تھا۔

اس نے لب بھینچ لیے۔ ’’تو تم چلتے پھرتے میرے گھر تک ہی کیوں آتے ہو؟‘‘

’’اور کہاں جاؤں؟‘‘ اگر وہ منہ سے بول سکتا تو اس کی آواز میں معصومیت ہوتی‘ اور محبت بھی۔

اس نے ابوبکر کو لڑکی کی تصویر دکھائی۔ ’’یہ لڑکی مرچکی ہے اور ہیری اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ پھر ہی ڈائری دے گا۔‘‘

ابوبکر چونک گیا۔ ’’ابھی کل ہی تو ماما نے اس سے ویڈیو کال پر بات کی ہے۔ اس کے فادر میرا کیس دیکھ رہے ہیں۔ یہ اپنے فادر کے مریضوں کی کالز وغیرہ اٹینڈ کرتی ہے۔ ان کا ریکارڈ دیکھتی ہے اور میٹنگ ارینج کرواتی ہے۔‘‘

وہ حیران ابوبکر کی شکل دیکھ رہی تھی...... ’’وہ اس سے ملتی جلتی کوئی اور لڑکی ہوگی۔‘‘

’’ایسا ہوسکتا تھا‘ لیکن اس تصویر کو غور سے

دیکھو۔ اس لڑکی کے کان پر زخم کا نشان نمایاں نظر آرہا ہے۔ جو لڑکی ہم سے بات کرتی ہے اس کے کان پر بھی ایسا ہی نشان ہے۔‘‘

اسے یاد تھا کہ اس کے کان پر چوٹ کا نشان بہت نمایاں تھا۔ یہ کسی بچپن کی چوٹ کا نشان تھا۔ وہ حیران پریشان ابوبکر کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ابوبکر کا فون نکالا اور لڑکی کو اسی وقت ویڈیو کال کی۔ کال پک کرلی گئی اور......

’’ہیلو مسٹر ابوبکر! آپ کی اپائنٹمنٹ کل صبح دس بجے کی ہے۔ اس وقت آپ سے بات نہیں ہوسکتی۔‘‘

علیزہ نے ایک دم سے اپنا چہرہ فون کے سامنے کردیا۔ ’’میں تمہیں یاد ہوں...... علیزہ۔ میں شگا گو میں ہوتی تھی۔ تم اپنی فرینڈ کے ساتھ میرے پاس آئی تھیں۔ تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے کارڈ پڑھوں۔ میں نے کہا تھا کہ تم بہت بڑی ڈاکٹر بنوگی...... یاد ہے...... یاد کرو......‘‘

وہ ایک دم سے پریشان سی ہوگئی۔ ’’کون ہو تم......؟‘‘

’’زیادہ پرانی بات نہیں ہے...... میں بھی اسکول میں تھی اور تم بھی۔ تم میری پیش گوئی سن کر دل برداشتہ ہوگئی تھیں اور تم نے خودکشی کرلی تھی۔ تم مرگئی تھیں......‘‘

’’اوہ ہاں...... میں تو مرگئی تھی......‘‘

’’تو اب تم زندہ کیسے ہوگئی ہو؟‘‘

وہ زندہ ہی تھی۔ باپ پر پریشر ڈالنے کے لیے اس نے خودکشی کی تھی۔ لیکن باپ نے اسے بر وقت بچا لیا تھا۔ پھر وہ نیوزی لینڈ چلے گئے تھے۔ اپنی خودکشی کی خبر اس نے خود ہی بڑھا چڑھا کر پھیلا دی تھی۔ وہی ٹین ایجرز کی بے وقوفانہ حرکتیں۔ اس کے باپ نے اسے میوزک اسکول جانے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن میوزک کا بھوت چار چھ مہینے میں اتر گیا تھا۔ وہ باپ کی خواہش کے مطابق سائنس پڑھنے لگی تھی۔ وہ ڈاکٹر بن رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے ڈاکٹر باپ کے لیے کام بھی کررہی تھی۔

’’تمہارا ابوائے فرینڈ ہیری بھی کہہ رہا تھا کہ تم مرچکی ہو۔‘‘

’’اس سے جان چھڑانے کے لیے ایک خودکشی کا ڈرامہ میں نے اس کے ساتھ بھی کردیا تھا۔‘‘

اچھی ڈرامے باز لڑکی تھی وہ۔ جان پر کھیل کر جان چھڑا رہی تھی۔

’’اب میری بہن! ایک بار اور جان پر کھیل کر، میری جان بھی آزاد کروادو۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ تم اس سے بات کرلو اور ہمیں ہماری ڈائری دلوادو۔‘‘

معاملات طے ہوگئے......

آیئے آگے دیکھتے ہیں کیا ہوا......

☆☆☆

جیسے کانووکیشن تقریب کے لیے اسٹوڈنٹس تیار ہوکر، بن ٹھن کر جاتے ہیں۔ ایسے ہی وہ دونوں تیار شیار ہوکر ہیری کے پاس یونیورسٹی ڈائری لینے پہنچ گئے تھے۔ ابوبکر نے آج سرمئی رنگ کا نیا کوٹ پہنا تھا۔ اس نے بھی ایک عدد نئی جیکٹ پہنی تھی۔ پاپا نے اسے کچھ پیسے بھجوائے تھے، جس سے اس نے شاپنگ کرلی تھی۔ آج اسے یقین تھا کہ کام بن جائے گا۔

’’میں نے تمہاری مردہ گرل فرینڈ سے سارے معاملات طے کرلیے ہیں، اب تم جب چاہو، اس سے بات کرسکتے ہو۔‘‘

علیزہ کے انداز میں بڑی اتراہٹ تھی۔ جیسے وہ ڈائری لینے نہیں ’’گولڈ میڈل‘‘ لینے آئی ہو۔

’’اچھا...... کیا واقعی......؟‘‘ وہ برگر کھا رہا تھا۔ آرام سے کھاتا رہا۔

’’ہاں...... تم ڈائری لے آنا۔ مجھے چیک کروادینا۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ اصلی ہے یا نہیں۔ میں اسی وقت تمہاری اس سے بات کروادوں گی۔‘‘

وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ’’کیا واقعی......؟‘‘ (اسے ہنسی بھی آرہی تھی)

’’ہاں میرے باپ...... ہاں...... تمہارے لیے میں نے ایک مرے ہوئے انسان کو ڈسٹرب کیا۔ اسے بات کرنے پر آمادہ کیا۔ اب تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا۔‘‘ اس نے جھنجلا کر کہا۔

برگر چباتے چباتے وہ رک گیا۔ تھوڑا سا چونک گیا۔ ’’میں نے مذاق میں کہا تھا، تم نے واقعی شرلا سے رابطہ کرلیا ہے؟‘‘

’’وہ سب میں نہیں جانتی۔ میرا اس سے رابطہ ہوچکا ہے۔ تم ڈائری دو، اس سے بات کرو اور ہمیں آزاد کرو۔‘‘

’’میں نے تم دونوں کو قید ہی کب کیا ہے بھئی۔ اچھا کیا ابھی ایک گھنٹے میں میری اس سے بات ہوسکتی ہے۔ میں اپنے ہوسٹل سے ڈائری لے کر آتا ہوں۔‘‘

’’ہاں جاؤ...... ڈائری لے آؤ...... اور جلدی آنا۔‘‘

وہ ایک گھنٹے کے بجائے آدھے گھنٹے میں واپس آگیا تھا۔ تب تک وہ دونوں ایک ایک برگر کھا چکے تھے۔ ان کے چہروں پر بڑا اطمینان تھا۔ ابوبکر تو مسکرا بھی رہا تھا لیکن علیزہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ کوئی بھی چارسوبیسی ہوسکتی تھی۔

’’یہ رہی تمہاری ڈائری...... اب شرلا سے رابطہ کرو۔‘‘ اس نے دور سے ہی چلا کر کہا۔

’’ڈائری کو کھول کر دکھاؤ۔ پوری بھی ہے یا نہیں۔‘‘

وہ ڈائری کے صفحے کھول کھول کر لہرانے لگا۔ ابوبکر نے ہاں میں سر ہلایا تو علیزہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ جھکمہ دے کر اس کے ہاتھ سے ڈائری چھین لے...... لیکن......

’’اگر میری شرلا سے بات نہ ہوئی تو میں اسے ابھی جلادوں گا۔ سمجھیں۔ مجھے پاگل بنانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔‘‘ اس نے لائٹر نکال کر انہیں دکھایا۔

’’یہ کوئی فلم نہیں ہے، جہاں دھوکا دہی، جعل سازی وغیرہ ہوگی اور انجام میں سچ کی جیت ہوگی۔ میں تمہیں پہلے شرلا کی آواز سناؤں گی۔ پھر اسے دکھاؤں گی بھی، یعنی ویڈیو کال...... پھر تم یہ ڈائری دے دینا۔ پھر وہ میرے اشارے پر تم سے مزید بات کرے گی۔ او کے؟‘‘

’’او کے......‘‘ اس نے سر ہلایا۔

اس نے کال ملائی، شرلا آن لائن آئی۔ جو لڑکی مرنے کے اتنے ڈرامے کرچکی تھی، وہ مرنے کے بعد کے بھی کرسکتی تھی۔ اس نے سفید ڈریس پہن لیا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ پیچھے کا ماحول بڑا ہی دھواں دھواں، خواب ناک سا تھا۔ علیزہ نے بمشکل اپنی ہنسی چھپائی۔ پہلے اس نے بہت اخلاق کے ساتھ ’’روح‘‘ سے سلام دعا کی۔ پھر اس نے فون کو گھما کر ہیری کی طرف کیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں سکا۔

’’میں...... میں سمجھا، تم مجھے پاگل بنا رہی ہو بس۔ میں بھی انجوائے کرنے کے لیے تمہارے ڈرامے کا حصہ بن گیا۔ لیکن یہ تو سچ میں......‘‘ وہ ہکلانے لگا۔

علیزہ نے فون اس کے ہاتھ میں دیا اور ڈائری اس کے ہاتھ سے لے لی۔

’’یہ لو اور جتنا دل چاہتا ہے روح سے بات چیت کو انجوائے کرو۔ چاہو تو اسکرین میں ہاتھ ڈال کر اس کا گلا دبادو......‘‘

شرلا نے اپنے مرنے کا ڈرامہ اتنی شفافیت سے کھیلا تھا کہ اس کے زندہ ہونے کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ بے چارا ہکا بکا شرلا کو دیکھے جا رہا تھا۔

پانچ منٹ کی بات کے بعد ظاہر ہے کہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سچ جھوٹ کیا ہے۔ گلے شکوے شروع ہو گئے۔ دو بچھڑے ہوئے دوبارہ سے مل گئے تھے۔ علیزہ نے جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”میرا فون واپس کر دو اور اپنے فون سے اس ”روح“ سے باتیں کر لو۔ ہمیں اب اجازت دو‘ خدا حافظ......“

جس وقت وہ ہیری سے اپنا فون لے رہی تھی‘ اس وقت ابوبکر گھاس پر تیز تیز بھاگ رہا تھا۔ وہ ڈائری کو اس کی کوٹ کی جیب میں ڈال چکی تھی۔ وہ خوش تھا اور اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ یہ کامیابی معمولی تھی یا غیر معمولی‘ لیکن یہ اس کی زندگی میں تبدیلی لانے والی تھی۔

پھول بے رنگ ہی کیوں نہ ہو‘ وہ پھول ہوتا ہے۔ زندگی مشکل ہی کیوں نہ ہو، زندگی ہوتی ہے اور ہر مشکل کے بعد آسان ہو ہی جاتی ہے۔

☆☆☆

زندگی ایک دم سے نہیں بدل جاتی۔ یہ ٹریک سے اُترتی ہے تو اسے ٹریک پر آنے میں وقت لگتا ہے۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ ابوبکر کے گھر جایا کرتی تھی۔ وہ بولتا تھا اور وہ لکھتی تھی۔ اس کی کتاب ادھوری تھی۔ وہ اسے مکمل کر رہی تھی۔ غیر ضروری چیزیں نکال رہی تھی۔ اکثر لفظوں اور جملوں پر ان کی تکرار ہو جاتی تھی‘ لیکن کرتی وہ اپنی مرضی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کتاب پر اس کا بھی حق ہے۔ ابوبکر اس کے حق کو تسلیم کر لیتا تھا۔ وہ اسے بھی تسلیم کر چکا تھا اور اس بات کو بھی کہ وہ اس کے ساتھ موجود ہے......اور شاید ہمیشہ رہے......

کتاب مکمل ہو چکی تھی اب دوسرا مرحلہ اسے شائع کرانے کا تھا جو کافی دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا نا‘ زندگی میں ہر کام اتنا آسان نہیں ہوتا۔ قدم قدم پر پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ کہیں تاریک جنگلوں اور کہیں دلدلی راستوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

کتنے ہی پبلشرز اسے رد کر چکے تھے۔ اب وہ پریشان ہوتی تھی لیکن ابوبکر ہنس دیا کرتا تھا ظاہر ہے کہ وہ بدل چکا تھا۔ بات صرف ڈائری کے ملنے کی نہیں تھی، اس نے اس سے پہلے ہی خود کو بدل لیا تھا۔ ٹیڑھی میڑھی لکھائی سے اس نے ایک پیرا لکھ لیا تھا جس میں اس نے لکھا تھا۔

کہ ”یہ میری کتاب ہے، میں نے لکھی ہے، آپ اسے شائع کرنے میں دلچسپی لیں گے؟ ہاں اور ناں کا فیصلہ اسے ایک بار پڑھنے کے بعد کیجیے گا۔ اس سے پہلے اسے رد مت کیجیے گا، شکریہ۔“

وہ ایک سے دوسرے پبلشر کے پاس جا رہا تھا۔ اپنا مسودہ انہیں دے رہا تھا، ناکامی پر کچھ دیر کے لیے منہ بھی لٹکا لیتا تھا لیکن پھر اگلے دن گھر سے نکل جایا کرتا تھا۔ چند مہینوں کی جان توڑ کوشش کے بعد ایک این جی او نے ان کی تھوڑی سی مدد کی اور انہیں ایک پبلشر مہیا کر دیا۔

☆☆☆

کتاب آئی اور چھا گئی......

ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ ہفتوں اور مہینوں میں سست روی سے کامیاب ہوئی تھی۔ شروع میں ایک مقامی نیوز پیپر نے اس پر چھوٹا سا تبصرہ کیا تھا۔ اگلا تبصرہ پانچ مہینے بعد آیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ کامیاب ہونے لگی تھی۔

اس دوران ابوبکر کا سن بازو کچھ کچھ کام کرنے لگا تھا کیونکہ اس کا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ فزیو تھراپسٹ کا کہنا تھا کہ وہ جلد ہی نارمل لوگوں کے ہاتھ کی طرح حرکت کرنے لگے گا۔ آپریشن سے بہت پہلے تکلیف سے گزر کر ہی سہی لیکن ابوبکر نے بازو کو حرکت دینا شروع کر دیا تھا۔ ہر بار جب وہ بازو کو معمولی سی حرکت بھی دیتا تھا تو تکلیف سے اس کی رگیں کھنچ جاتی تھیں۔ اس کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں لیکن وہ اس تکلیف کو اپنی زندگی میں خوش آمدید کہہ چکا تھا۔

اس وقت تک اس کی کتاب کی شہرت بڑھنے لگی تھی۔ اسے لیکچرز کے لیے بلایا جاتا تھا۔ اس نے لٹریری فیسٹول میں شرکت بھی کی تھی۔ وہ پھر سے موبائل ایپ کے استعمال سے بولنے لگا تھا۔ وہ مائیک پر لیکچر بھی ایسے ہی دیتا تھا۔ وہ خوش تھا۔ وہ مطمئن تھا۔ جہاں نارمل اور مکمل لوگ ڈیپریشن کا شکار رہتے تھے‘ وہ ادھورا ہو کر بہت شاکر تھا۔

☆☆☆

”یہ کتاب لکھی اس نے ہے‘ لیکن اسے ڈھونڈا میں نے ہے۔ مکمل بھی کروایا ہے۔“

پاپا ابوبکر کا لیکچر سننے کے لیے آئے تھے۔ اس نے جھک کر ان کے کان میں کہا تھا۔ وہ دونوں پہلی رو میں بیٹھے تھے۔ پاپا ابوبکر سے بڑے متاثر تھے۔ کتنی ہی بار اس کی کتاب پڑھ چکے تھے۔

”بیٹا! اتنی لمبی نہیں چھوڑتے‘ مسافروں کی ٹرینیں چھوٹ جاتی ہیں۔“

”آپ کی کبھی چھوٹی......؟“ وہ چڑ گئی۔

اس کے سگے پاپا تک یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ اس کتاب کو حاصل کرنے میں اس کا بھی کوئی کمال ہو سکتا ہے۔

”تمہیں اپنا کمال ثابت کر کے کون سا ایوارڈ لینا ہے؟“ ٹیولپ پر لکھا تھا۔ اچھا تو ٹیولپ طنز بھی کر سکتا تھا۔

”کوئی کمال کر ہی دکھایا ہے تو شکر ادا کرو کہ اللہ نے کسی اچھے کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا۔ چپ رہو اور پھر بھول جاؤ......“

ٹیولپ اچھے سبق بھی دے سکتا ہے۔ وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔

☆☆☆

ماہنامہ کرن

مئی 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

”کرن کا دسترخوان“

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت حاصل کریں

- ”بیادِ محمود ریاض“
- ”ماں جیسی چاہت کہاں؟“ مدرز ڈے کے موقع پر مشہور شخصیات سے شاہین رشید کا سروے،
- فنکارہ ”سنیتا مارشل“ سے شاہین رشید کی ملاقات،
- فنکارہ ”ماہم عامر“ کہتی ہیں ”میری بھی سنیے“،
- اس ماہ ”ثانیہ مشعل اشرف“ کے ”مقابل ہے آئینہ“،
- ”شب نم کی سحر“ رخ چوہدری کا نیا سلسلہ وار ناول،
- ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- ”من عاجزم من بے کسم“ ام طیفور کے مکمل ناول کا دوسرا اور آخری حصہ،
- ”ایک نظر چاہیے“ صدف عمر کا مکمل ناول،
- ”دردِ آشنا“ شبانہ شوکت کا مکمل ناول،
- ”غم ہے یا خوشی ہے تو“ تنزیلہ ریاض کا ناولٹ،
- ”دستِ شفا“ نور احمد کا ناولٹ،
- میمونہ صدف، تمثیلہ زاہد، شمائلہ دلعباد اور رخسانہ آفتاب کاوش کے افسانے اور مستقل سلسلے،

''تم نے اپنے ان فرینڈز کا ذکر کیوں نہیں کیا' جنہوں نے تمہارے ساتھ فراڈ کیا تھا۔ تمہیں ساری دنیا کو بتانا چاہیے تھا کہ لوگ کتنے برے ہیں۔''

اس دن اس کا ٹی وی پر انٹرویو تھا اور اس نے بس اچھی اچھی باتیں ہی کی تھیں جبکہ وہ شکوہ کر رہی تھی۔

''میں بھی تو برا ہوں اور تم بھی۔ اگر انہوں نے میرے ساتھ فراڈ کیا تھا تو بدلے میں اللہ نے میرے لیے معجزہ بھی تو کیا۔ ''ٹیولپ'' کا۔ جب اللہ نے ہر طرح سے میری مدد کی تو میں ان چند لوگوں کی دھوکے بازی کا شکوہ کیوں کروں؟ پھر اگر میں سب کے چہروں سے نقاب اتارنے لگا تو یہ دنیا بہت بدصورت ہو جائے گی۔ کیونکہ ہم سب ہی کسی نہ کسی نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔''

اسی لیے اس کی کتاب اتنی زیادہ پسند کی جا رہی تھی کیونکہ وہ احساسات کی کہانی تھی۔ ''بے حسی'' کی نہیں۔

☆☆☆

اس کا اگلا آپریشن زبان کا تھا۔ وہ نیوزی لینڈ جا چکا تھا۔ ایگزامز کے بعد اسے بھی گھر واپس چلے جانا تھا لیکن......

اس کے واپس جانے سے کچھ دن پہلے......

ایک واقعہ ہوا......چھوٹا سا......

وہ روڈ کراس کر رہی تھی' بارش ہو رہی تھی۔ چھاتا اس کے ہاتھ میں تھا' اور کوئی بہت شدت سے' پوری قوت سے اس سے ٹکرایا تھا۔ وہ گھوم کر گر گئی تھی۔ چھاتا بھی دور جا گرا تھا......اور کسی کا دل اس کے قدموں میں......

''تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ مجھے تمہیں ایسے گرا کر کوئی خوشی تو نہیں ہوئی' لیکن کیا کروں' سوچا کچھ پرانی یادوں کو تازہ کر لینا چاہیے۔''

اس بار اسے اٹھنے میں مدد دینے کے لیے اس نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس کی آواز خوب صورت تھی۔ اسے بولنے میں دقت ہوئی تھی لیکن شاید وہ اس فقرے کی بہت زیادہ مشق کرتا رہا تھا۔ کراسنگ پر گرے گرے وہ یک ٹک اسے بولتے ہوئے سن رہی تھی۔ اس کے بھیگے بالوں سے بوندیں گرتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ وہ آج بھی چھاتا نہیں لایا تھا......کیوں......کیونکہ اپنے اکلوتے ہاتھ کو اسے علیزہ کی طرف بڑھانا تھا۔

''تم واپس کب آئے؟ تمہاری سرجری کامیاب رہی۔'' اس کا ہاتھ تھام کر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''ہاں......میں نے کہا تھا نا! میرے پاس دو ہی چیزیں تھیں جن پر مجھے یقین رکھنا تھا۔ ایک اپنی گویائی پر ایک اپنی کتاب پر۔ اللہ نے میرے دونوں یقین کامل کیے۔''

وہ بڑے دل سے مسکرائی۔ ابوبکر نے سر اٹھا کر بارش برساتے آسمان کی طرف دیکھا۔ اب وہ گنگنا سکتا تھا۔

''آج بادل بھی مجھ سے کوئی داستان کہنے آئے......آئے......آئے......''

علیزہ نے اپنی چھتری اوپر اٹھا کر اس پر سایہ کر دیا۔

میں نے کہا تھا نا۔ ''زندگی ساحر ہے اور ہم اس کا ''جادو''۔

علیزہ کی جیب میں رکھا ٹیولپ جگمگ جگمگ کرنے لگا تھا۔ اس کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ تو اب ''ٹیولپ'' کیا کرے گا؟ کہاں جائے گا؟

پریشان نہ ہوں۔ وہ جا رہا ہے......کسی اور علیزہ اور ابوبکر کے پاس......شاید آپ کے پاس......ورنہ یقیناً میرے پاس......

*

عفت سحر طاہر

دھنک کے رنگ

خواتین اور شعاع کے شمارے پڑھ پڑھ کر ہم نے بہت سی ڈشز پکائیں۔ کبھی داد تو کبھی گھوریاں وصول کیں اور میرو نے مجال ہے جو ایک بار بھی میری تعریف کی ہو۔ بندہ کبھی کن اکھیوں سے ہی دیکھ لیتا ہے مگر اس نے تو جانے کس رائٹر کے اکڑو ہیرو والے ناولز پڑھ رکھے ہیں۔ ہونہہ۔

میں جلی بھنی بیٹھی تھی جب فائقہ دھڑام سے میرے پاس گری۔

" کیا تکلیف ہے تمہیں۔ بندہ کچھ دیکھ کر گرتا ہے۔" میں دھاڑی۔

مگر وہ پرُجوش سی ہاتھ میں تھاما ایک چھپا ہوا اشتہاری کاغذ دکھا رہی تھی۔

"یہ دیکھو یار! ہمارے مسائل کا فوری حل"

"میرا تو سب سے بڑا مسئلہ ازمیر بٹ ہے۔" میں نے آہ بھری۔

"اور میرا عمران عباس۔" جواباً فائقہ نے مزید ٹھنڈی آہ بھری۔ پھر سر جھٹک کر جوشیلے انداز میں بولی۔

"یہی تو کہہ رہی ہوں کہ "مائی جھلی" آپ کے ہر مسئلے کا حل منٹوں میں نکال دیتی ہے۔ یہ پڑھو ذرا۔ ایک ہی وظیفے سے محبوب آپ کے قدموں میں۔"

"وہ نکڑ والی باجی شکیلہ کا میاں محبوب؟" مجھے شدید صدمہ ہوا تو فائقہ نے جھنجلا کر وہ پمفلٹ میرے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ کسی تعویذ دھاگے والی مائی جھلی کا کاروباری اشتہار تھا۔

"میری دوست کہہ رہی تھی کہ مائی بڑی پہنچ والی ہے۔ دو دنوں میں تمہارے منگیتر تمہارے دیوانے نہ ہو گئے تو پھر کہنا۔ مائی کو کچھ نہ بھی بتاؤ اسے پہلے ہی سب پتا چل جاتا ہے۔"

"اس میں ایسی کیا متاثر ہونے والی بات ہے۔ وہ الٹرا ساؤنڈ کروا لیتی ہو گی، اسی لیے پہلے پتا چل جاتا ہو گا۔" میں نے ہونق پن سے کہا تو اس نے ایک کرارا سا جھانپڑ میرے کندھے پر مارا۔

"دفع ہو جاؤ...... مجھے کوئی شوق نہیں میرو کو دیوانہ بنا کر اپنے قدموں میں لوٹنیاں لگاتے دیکھنے کا۔" مجھے سوچ کر ہی کراہیت آئی۔ "اور جو خود پہلے سے ہی جھلی ہے وہ دوسروں کو کیا ٹھیک کرے گی۔"

فائقہ مایوس سی ہو کر اٹھ گئی۔

★★★

" آج کل کی لڑکیوں میں تو ذرا سی بھی شرم و حیا نہیں۔ ہمارے وقتوں میں تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکی کا منہ لال ہو جاتا تھا۔" دادو اونچی آواز میں سب کو سنا رہی تھیں۔ زرینہ کو گدگدی سی ہوئی۔

"دادی جان! کیا آپ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں بتانا پسند کریں گی؟" اس نے پرُشوق انداز میں پوچھا اور دادو کی چھڑی تڑپ کر اس کے ہاتھ پر پڑی۔

"فٹے منہ تمہارا...... یہ نہیں کہ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہے، ہر بات کے آگے پھندنے لگانے ضروری ہیں کیا۔" زرینہ بے چاری منہ بناتی ہاتھ سہلاتی، اب احتیاطاً دادو سے پرے ہو کر بیٹھ گئی۔

"اے میں کہوں، یہ کونے والی زرینہ کو صبح کیا ہوا تھا۔ میں کمرے سے باہر آئی تو سُوجا ہوا بوتھا لیے بنا سلام کیے ہی نکل گئی۔" دادو نے اب کی بار چاول چنتی چچی جان کو مخاطب کیا۔ تو وہ ہاتھ روک کر تاسف سے بولیں۔

"ہاہ...... آپ کو تو بتایا ہی نہیں۔ زرینہ کے گھر اللہ معاف کرے، تیسری بار ڈکیتی ہوئی ہے۔ بس وہی بتا رہی تھی، اسی غم میں آپ کو دیکھا نہیں ہو گا۔"

"بس آج کل تو لوگوں کے دیدوں کا پانی مر گیا ہے بلکہ میں تو کہتی ہوں عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ اللہ کی رضا میں راضی رہنا بھول گیا ہے بندہ۔" دادو اپنا ہی کوئی راگ الاپنے لگیں۔

"لیں تو اب تیسری ڈکیتی پر بھی بندہ افسوس نہ کرے دادو!" ہم لڑکیوں کو دادو کی سنگ دلی پر سخت اعتراض ہوا اور میں تو ٹھہری بقول ازمیر بٹ باغی روح۔

"ہاں ہاں...... تم پیدا ہوئیں تو تمہارے ابا نے بھی خوشی کی جگہ افسوس ہی منایا تھا۔" دادو نے اپنی چھڑی بڑھا کر میرے بازو میں چبھوئی تو فائقہ اور مینا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ میں بازو سہلاتی پرے ہٹی۔

"لو بھلا...... اب خالہ زرینہ کی ڈکیتی اور میری پیدائش کا کیا جوڑ بنتا ہے؟" میری بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

" کل رویحا کے ساتھ جاؤں گی، میں اسے دلاسا دینے۔ یہ سب تو اللہ کے کام ہیں ان پر منہ بنانا اور آہ و زاری کرنا گناہ ہے۔" وہ سب پر اپنا ارادہ ظاہر کر کے لیٹ گئیں اور میں اچھل کر رہ گئی۔ میں بھلا، اس قدر رونے دھونے والے گھر میں کتنی دیر سیریس بیٹھ سکتی تھی؟

مگر ہک ہاہ...... ایک اکڑو بٹ کی دادا ابا والی تاریخی بندوق اور دوسری دادو کی چھڑی۔ ان کے سامنے کسی کو بھی دم مارنے کی مجال ہی کہاں تھی۔

☆☆☆

قارئین! اب بے شرم بن کر خود سے اپنے منگیتر سے تحفہ مانگنا ہے تو بری بات لیکن اگر منگیتر صاحب ہی بے شرم بن کر آپ کو تحفہ نہ دیں اور نہ ہی وش کریں تو پھر یہ آپ کا اخلاقی فریضہ بن جاتا ہے کہ آپ خود اسے مخاطب کریں اور اسے شرمندہ کریں جیسے میں ازمیر بٹ کو کر رہی ہوں۔

"میرو......"

وہ کان اور شانے کے بیچ موبائل دبائے سیڑھیاں اترتا، بات سنتے ہوئے کف لنکس بند کر رہا تھا جب اس کے دوبارہ "دستیاب" نہ ہونے کے ڈر سے میں نے اسے پکار ہی لیا۔ اب اس نے کہاں سوچا ہو گا، صبح صبح اتنی حسین منگیتر (بقلم خود) اسے لفٹ کروا سکتی ہے۔ وہ بے چارہ تو اتنا حیران ہوا کہ مشکوک نظروں سے مجھے دیکھتے مختصر بات کر کے کال ہی اینڈ کر دی۔

" کیا بات ہے؟" وہ مکمل طور پر میری طرف متوجہ تھا۔ سیاہ آنکھوں کی گہرائی اس سمے دریافت کی میں نے۔

افف...... کیا آپ میں سے کسی نے دل کو دیے کی نوک پر رکھے قطرہ قطرہ پگھلتا محسوس کیا ہے؟ بس کچھ ایسا ہی لگا مجھے —— تو میں گھبرا کر کھنکھاری۔

" آہم...... دراصل میرو! میرا برتھ ڈے تھا اور تم نے مجھے کوئی گفٹ نہیں دیا۔ بلکہ گفٹ تو دور کی بات مجھے وش تک نہیں کیا۔" میں نے جلدی سے شکوہ کر دیا اور پلکیں اٹھا کر دیکھا تو قسمے...... اتنا فدا ہو جانے والا نظارہ تھا۔ میرو کی آنکھوں کی الجھن پر ایک دم سے بے یقینی کا غلبہ۔ میں نے فوراً پلکیں جھکا لیں۔

"تو اس میں ایسی کون سی نئی بات ہے۔ پچھلے بائیس سالوں میں میں نے تمہیں کون سا گفٹ دیا ہے جو اب کی بار ریکارڈ توڑ دیتا۔" وہ از حد بے نیازی سے بولا تو میں احتجاجاً چلا اٹھی۔

"اکیس سال اور سولہ دن...... گفٹ نہیں دینا نہ دو۔ میری ''تاریخ'' تو غلط مت کرو اور تم...... ہونہہ۔ سولہ سال کی عمر میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر لیا تھا اور تم اکیس سالوں میں میرا دل فتح نہ کر سکے ہونہہ۔"

میں منہ پھلائے پاؤں پٹختی بولی تو اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا۔ حیرت اور بے یقینی کی زیادتی نے اسے کچھ کہنے لائق چھوڑا ہی کہاں تھا۔ میں غصے میں لال کمرے میں آئی۔

"تو پیا سے مل کر آئی ہے
بس آج سے نیند پرائی ہے
دیکھے گی سپنے بالم کے
تو لاکھ چلے ری
گوری تھم تھم کے
پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے"

میری شکل دیکھتے ہی یہ تان مینا نے لگائی تھی۔ ہونہہ۔ نند گلی کا گند۔ پھاپھے کٹنی۔ بے دل بھائی کی سنگ دل بہن۔

"پیا......؟ جلتا دیا کہو۔ جلتا دیا۔ جو بس اللہ نے میرا دل جلانے کے لیے پیدا کیا ہے اور دادو نے میرے پلو سے اپنا یہ ہیرا باندھ دیا۔ قسم سے کسی دن چاٹ کے مر جاؤں گی اسے۔" جذباتی تو میں بچپن ہی سے ہوں۔ قارئین! بولتے ہوئے بس

زبان ہی چلتی ہے دماغ نہیں۔

"آخ......" فائقہ کا دل متلایا تو مجھے ہوش آیا کہ غصے میں کچھ زیادہ ہی ہذیان بک دیا تھا میں نے۔

"قسم سے اگر میرو کی اکڑ ایسے ہی رہی تو میں نے ٹخنے پر رسی باندھ کر خودکشی کرلینی ہے۔" میں روہانسی ہوئی۔

"گلے میں......" ماہین نے اطمینان سے لقمہ دیا۔ تو میں لرز اٹھی۔

"ہا ہائے...... گلے میں رسی ڈال کر مروں؟ اس سے تو میرا سانس ہی بند ہو جائے گا۔"

"تو خودکشی سانس بند ہو جانے کا ہی نام ہے محترمہ...... گدگدی کرنے کا نہیں۔" ماہین نے بھرپور طنز کیا۔

"بہرحال، اسے مجھ پر فدا کرواؤ لڑکیو۔ ورنہ میں دادو کو کہہ دوں گی کہ میرا اور میرو کا رشتہ ختم کردیں کیونکہ میں اس رشتے پر بالکل بھی راضی نہیں اور جہاں میں چاہتی ہوں۔ وہاں میرا رشتہ طے کردیں۔"

میں نے نروٹھے انداز میں کہہ کر گویا ہاتھ جھاڑے لیکن زرینہ کو اچھل کر کھڑے ہوتے دیکھ کر میں جہاں کی تہاں رہ گئی۔ دروازے میں ازمیر بٹ کھڑا میری لن ترانیوں سے اچھی طرح مستفید ہو چکا تھا اور وہیں سے پلٹ بھی گیا۔ بنا کچھ بھی کہے۔ خاموشی سے۔

مگر اکثر طوفان آنے سے پہلے خاموشی ہی ہو جایا کرتی ہے قارئین......

میں دل تھام کر وہیں گرسی گئی۔

"لگتا ہے دادو نے میرو سے منگنی کروا کر تمہاری سڑی بُسی زندگی میں جو رونق داخل کی تھی اسے تم اپنی مرضی سے بے رونقی میں تبدیل کر چکی ہو۔"

یہ ظالمانہ تجزیہ فائقہ کا تھا اور میں چپ چاپ پڑی خلاؤں میں گھورتی یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میرو کی آمد کے وقت میں اپنے تخریب کارانہ بیان کی کون سی لائن پر تھی؟

اچانک زرینہ روتے ہوئے میرے پاس آ کر گری تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا...... دادو کو ہارٹ اٹیک تو نہیں ہو گیا؟"

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"خالہ زرینہ کے گھر چوتھی ڈکیتی..؟"

"نہ......"

"بریانی کا مسالا جلا دیا پھر سے؟"

"کوئی نہ۔"

"کعب عزیز (زرینہ کا کرش) نے شادی کرلی؟"

"اللہ نہ کرے کالی زبان والی۔"

"تو زرینہ کمینی! اب میرے تمام قیاس ختم ہو چکے ہیں۔ اس لیے خود ہی شرافت سے بتا دو ورنہ بیڈ سے گرا دوں گی لات مار کے۔" میں غرائی تو اس نے سسکی بھری۔

"وہ...... بھائی...... میرو بھائی......"

"ہائے اللہ......" میرے دل پر ہاتھ پڑا۔

(کہیں شادی سے انکار تو نہیں کر دیا اس نے)

"کیا ہوا مینا...... خیر تو ہے نا؟"

"وہ...... وہ کوئی اور پروپوزل لائے ہیں۔ اس دن تمہاری باتیں سن کر...... اور دادو بھی راضی ہیں لڑکے والوں کو گھر بلانے پر۔" میں ساکت رہ گئی۔

اور دوستو! ذہین تو میں بچپن سے ہوں اور حساب کتاب میں ماہر، منٹوں میں جوڑ توڑ کر لیا یعنی زرینہ کی ٹوٹی پھوٹی کہانی کا لب لباب یہ تھا کہ میری فضول گوئی سن کر میرو نے آخر کار یہ منگنی توڑنے کا فیصلہ کر لیا اور متبادل میرے لیے ایک پروپوزل پیش کر دیا جس پر دادو بھی راضی ہو گئی تھیں۔

"مگر میں راضی نہیں ہوں روی! کچھ کرو" وہ میرے گلے لگ کر رو رہی تھی تو میرا دل بھر آیا۔

ہائے...... میری بہت پیاری، ہوتے ہوتے رہ جانے والی نند...... ایک یہی میری سچی پرستار نکلی۔ میرو نے تو موقع پاتے ہی پنجرہ توڑنے والی بات کی تھی۔

"میں...... میں کیا کر سکتی ہوں اگر میرو ہی نہ مانے تو۔" میں بھی آزردہ سی سسک اٹھی۔

"تم سمجھاؤ گی تو مان لیں گے۔ غصے میں ہیں ابھی تمہاری باتیں سن کر۔"

وہ ملتجیانہ بولی۔ تو اس کے پیار پر مجھے پیار آ گیا اور اسی جوش میں میں ایک بار پھر اوکھلی میں سر دینے...... یعنی کہ میرو سے بات کرنے کا وعدہ کر بیٹھی۔ اتنا سوہنا منڈا بھلا مجھے کہیں ملنے والا تھا اس کے بعد؟ مجھے تو رونا آنے لگا۔

میرو کے آنے کا وقت ہوا تو میں پرانی فلموں کی اداس ہیروئن بن گئی۔ تھوڑے تھوڑے بال بکھرائے کار پورچ کے سامنے، برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اب وہ ہمدردی کرتا یا نہ کرتا لیکن کم از کم یہ تو ضرور پوچھتا کہ میں شام کے وقت یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہوں۔ لان سے اڑ کر آنے والے مچھروں نے کاٹ کاٹ کر پیر سُجا دیے مگر آج شاید میرو نے بھی قسم کھالی تھی کہ وہ رات سے پہلے گھر میں داخل نہیں ہو گا۔

اتنی دیر میں، میں ساری فلموں اور ڈراموں کی ہیروئنوں کے ڈائیلاگ دہرا دہرا کر یاد کرتی رہی جو کہ ایسی ہی سچویشن میں ہیروئن ہیرو کے ساتھ بولتی ہے۔

اللہ اللہ کر کے دو گھنٹے کی اس "بیٹھک" کے بعد اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو میں اچھل کر کھڑی ہوئی مگر پھر یاد آیا کہ میں تو سوگ میں بیٹھی ہوں، ایسے موقع پر دروازہ تو چوکیدار کو کھولنا چاہیے تو میں پھر سے سیڑھی پر بیٹھ گئی اور سر کو گھٹنوں میں دے لیا۔

گیٹ کھلا، گاڑی اندر آئی، اندر آ کر گاڑی کے دروازے کے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ میں اندازہ لگا رہی تھی کہ اب وہ گاڑی اندر لایا ہے، اب وہ گاڑی سے نیچے اُترا ہے اور بس اگلے چند سیکنڈز میں وہ مجھ تک پہنچنے والا تھا اس کے چلنے کی آواز آئی۔ وہ سیڑھیوں تک پہنچا تو میرا دل دھڑک دھڑک کر گویا پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو گیا مگر یہ کیا۔

سیڑھیوں پر اس کے چڑھنے کی آواز آئی اور اندر کا دروازہ کھول کر وہ یہ جا وہ جا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد میں نے آہستہ سے سر اٹھا کر ادھر دیکھا تو مغرب کے بعد نکلنے والی چڑیل کی طرح میں اکیلی ہی وہاں سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی قسمت پر رونا آیا۔ اللہ تعالیٰ نے نصیب میں منگیتر لکھا بھی تو سڑیل۔ میں اٹھ کر اندر آ گئی تو سب اشاروں میں مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کیا رزلٹ رہا اب میں کیا بتاتی کہ میری تو فل سپلی آ گئی ہے۔

"کیا ہوا......؟" زرینہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"جب میرو اور رویحا کی بات چیت ہوتی ہے تو اس کی شکل دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ اس کی کتنی عزت افزائی ہوئی ہے اور ابھی تو یہی لگ رہا ہے کہ اس نے اسے لفٹ نہیں کرائی۔"

فائزہ کمینی کا تجزیہ بڑا شان دار تھا میں دل ہی دل میں مان گئی مگر کینہ توز نظروں سے اسے دیکھ کر میں سر جھٹک کر کچن میں چلی آئی۔

"میرو سے بات کرنے کا اب ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اس کے لیے کھانا گرم کر کے لے جاتی مگر میرے کھانا گرم کرنے تک وہ خود ہی فریش ہو کر کچن میں آ گیا اور کاؤنٹر کے پاس پڑا اسٹول سنبھال لیا۔ لرزتے کپکپاتے ہاتھوں سے میں نے اس کے سامنے کھانا لگایا۔ کافی کا مگ بنا کر اس کے پاس رکھا اور وہیں اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے کھانا کھانا شروع کر دیا، دو تین نوالوں کے بعد اس نے ہاتھ روک لیا اور سر اٹھا کر مجھے گھورا۔ "تم کیا اب سارا وقت کھڑی میرے نوالے گنتی رہو گی۔"

میں جو واقعی اس سے بات کرنے کے چکر میں اس کے نوالے گننے میں مصروف تھی، گڑبڑا کر رہ گئی۔

"وہ...... نہیں۔ میں تو بس یوں ہی...... بات کرنا تھی تم سے۔" بالآخر میرے منہ سے سچ نکل ہی گیا۔ اس نے مشکوک نظروں سے پہلے مجھے دیکھا اور پھر پاس پڑے اسٹول کی طرف اشارہ کیا یعنی کہ مجھے وہاں بیٹھنے کی اجازت تھی۔

BOOKSPK

" تمہارے پاس اتنا ہی وقت ہے جتنی دیر میں، کھانا کھا رہا ہوں جو کہنا ہے کہہ دو۔ "

مجھے رونا آنے لگا یعنی کہ اس کی زندگی میں اب میرے لیے صرف اس کے کھانا کھانے تک کا وقت تھا۔ میں نے تھوک نگلا۔

''یا اللہ اب کون سے الفاظ ہوں جن سے میں میرو جیسے اکڑو اور سڑیل منگیتر کو بتا سکوں کہ اس کے ہونے سے لوگوں میں میری کتنی عزت بنی ہوئی ہے اور ان دوستوں میں جن کی ابھی منگنی تو کیا شادی کی بات تک نہیں چلی، میں خود کو کتنا معتبر محسوس کرتی ہوں۔

ہک ہاہ...... ان مردوں کو کیا پتا ہم لڑکیوں کی فیلنگز کا۔

" اب بول بھی چکو یا یوں ہی خاموش بیٹھی وظیفہ کرتی رہو گی۔'' اس نے تھوڑی دیر کے بعد طنزیہ کہا تو مجھے ہمت کرنا ہی پڑی۔

''وہ دادو بتا رہی تھیں کہ تم کوئی پروپوزل لائے ہو۔'' میں نے بہت احتیاط سے پوچھا۔

"ہاں تو......؟" اس نے تنک کر بھنویں اچکائیں۔

" مگر میں راضی نہیں ہوں۔"

" وہ تو تم مجھ سے منگنی پر بھی راضی نہیں تھیں۔" اس نے کڑا وار کیا۔ میرا تو دل ہی ٹوٹے ٹوٹے ہو گیا۔

" جھوٹ! تم سے کس نے کہا کہ میں تم سے منگنی پر راضی نہیں تھی۔ " چھ دن...... " میں نے اسے چھ انگلیاں دکھائیں۔ " پورے چھ دن تک میں نے جشن منایا تھا اپنی منگنی کا۔ "

کوئی اور وقت ہوتا تو میں مر کر بھی یہ اعتراف نہ کرتی لیکن ابھی تو مجھے کسی بھی طرح اس ٹوٹتی ہوئی منگنی کو بچانا تھا، چاہے اسے ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر اس پر دنیا جہان کی ایلفی لگ جاتی۔

"اچھا......!" اس نے بہت حیرت سے مجھے دیکھا۔

" ہاں تو اور کیا، تم جیسے منگیتر راستوں میں پڑے تھوڑی مل جاتے ہیں۔ میری دوستیں تو رشک کرتی ہیں میری قسمت پر، میں ان سے اتنی تعریفیں کرتی ہوں تمہاری۔''

میں نے خود کو دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی ثابت کرنے میں پورا زور لگا دیا۔

" کیا فضول باتیں ہیں اور کوئی موضوع نہیں تم لوگوں کے پاس۔ " وہ ناگواری سے بولا پھر مجھے ذرا سا گھور کر دیکھا۔

" اور تم کون سی ضروری بات کرنا چاہتی تھیں سیدھے سیدھے وہ بات کرو۔''

لو جی سنو جو میں نے سارے ڈائیلاگ اسے سنانے کے لیے یاد کیے تھے، وہ تو ابھی باقی تھے اور وہ سیدھے سبھاؤ اصل بات پر آنے کو کہہ رہا تھا' میں نے تھوک نگلا۔

" تم یہ پروپوزل کیوں لائے ہو میرو؟ میں مر جاؤں گی مگر نہ تو یہ منگنی ہونے دوں گی اور نہ شادی۔ "

" کب تک کا ارادہ ہے تمہارا؟" اس نے نوالہ چباتے ہوئے آرام سے پوچھا تو میں جو کھینچ تان کر ایک آدھ آنسو آنکھوں میں بھر لائی تھی، حیران ہو کر پوچھنے لگی.

" کون سا ارادہ؟"

وہ اطمینان سے بولا۔ " یہی جو تم نے مرنے کا پروگرام بنایا ہے پہلے بتا دو تاکہ بعد میں اطمینان سے منگنی اور شادی کے فنکشنز ارینج کیے جا سکیں۔ "

میرے تو دل کو ایسا دھکا لگا۔ اللہ جانے میں نے کون سا ایسا گناہ کیا تھا جس کی سزا کے طور پر مجھے ایسا ظالم منگیتر ملا تھا۔ دو تین منٹ یاد کرنے کے بعد بھی مجھے اپنی ایسی کوئی خطا یاد نہ آئی تو میں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

" کیا تم میرے مرنے کے بعد بھی یہ فنکشنز ارینج کراؤ گے؟"

"ہاں تو اور کیا۔ کسی کے مرنے سے دنیا کے کام تھوڑی رک جاتے ہیں۔ " وہ بے پروائی سے بولا۔

میری آنکھ میں سے آنسو لڑھک کر رخسار پر آ گیا تو وہ اب کی بار حیران و پریشان ہو گیا۔

" تمہیں کیا ہوا ہے، تمہارا اس سارے معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

" روؤں کیوں نہیں؟ منگنی میری، شادی میری اور میں روؤں بھی نہ...... مگر سن لو میرو! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو اتنی آسانی سے ہار مان لیتی ہیں۔ میرے دل پر پہلا نام تمہارا لکھا گیا ہے زبردستی ہی سہی مگر میں اب دل سے تمہیں اپنا منگیتر مان چکی ہوں اور اب تم میرے لیے دوسرا پروپوزل لے کر آ گئے ہو لیکن میں مر جاؤں گی مگر تمہیں کسی دوسری کے لیے نہیں چھوڑوں گی۔ تمہاری شادی ہو گی تو صرف مجھ سے، میں بھی تو دل پر پتھر رکھ کر تم سے شادی کر رہی ہوں تو کیا تم زہر کا یہ پیالہ نہیں پی سکتے؟"

یہ تقریر میں پرسوں سے یاد کر رہی تھی اور اب تو مجھے اچھی طرح رٹ چکی تھی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی کہ یہ سب سن کر میرو سکتے میں آ گیا یعنی کہ اس کے دل پر اچھا خاصا اثر ہوا تھا۔

اس نے نوالہ رکھ دیا اور پورے دھیان کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوا، میں نے اپنے بے ترتیبی سے دھڑکتے دل کو بمشکل سنبھالا۔ جانے وہ کیا کہنے والا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا رویحا گل! جانے اللہ نے تمہیں کس مٹی سے بنایا ہے اور جب عقل تقسیم کی جا رہی تھی تو تم کہاں تھیں؟" وہ بڑی بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہیں......؟" میں نے تحیّر سے اسے دیکھا۔

" عقل کی پوری! پہلے یہ بات تو سمجھ لیتیں کہ کس کی منگنی ہو رہی ہے اور کس کے پروپوزل کی بات ہو رہی ہے اور رہی بات میری تو جس طرح تم دل پر پتھر رکھ رہی ہو، اسی طرح یہ زہر کا پیالہ پینا میری مجبوری ہے اور ایک ہی پروپوزل آیا ہے وہ بھی تمہارے لیے نہیں بلکہ زرینہ کے لیے آیا ہے ڈفر۔ "

"ہیں......؟" میں حیران پریشان بے یقینی کے عالم میں منہ کھولے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے دوبارہ کھانا کھانا شروع کر دیا تو میں نے ہکلا کر پوچھا۔

" تو یہ پروپوزل زرینہ کے لیے آیا ہے؟ یعنی تمہیں پکا یقین ہے کہ یہ زرینہ ہی کا پروپوزل ہے؟"

" میرے خیال میں تو اتنی ہی یقین دہانی کافی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر تمہیں یقین نہ آیا تو مجھے دادا جان کی بندوق لانا پڑے گی اور اس سے بھی کام نہ بنا تو یہ گرما گرم کافی کا مگ مجھے تمہارے سر پر انڈیلتے ہوئے بہت دکھ ہوگا۔''

وہ دانت پیس کر بولا تو میں جھرجھری لے کر ہوش میں آئی، پوری بات ذہن میں دہرائی تو میری بتیسی باہر نکل آئی۔

" اچھا تو یہ زرینہ کے پروپوزل کی بات ہو رہی تھی اور میں سمجھی کہ غصے میں آ کر تم اپنی اور میری منگنی توڑ رہے ہو۔ "

" ہک ہا...... " اس نے گہری سانس بھری۔

" میرے ایسے روشن نصیب کہاں۔ " اب پتا نہیں اس نے یہ میری تعریف کی تھی یا طنز کیا تھا مگر میرے لیے تو خوشی کی یہی بہت بڑی بات تھی کہ میں ابھی بھی منگنی شدہ تھی اور مستقبل میں رہنے والی تھی۔

میرو نے کھانا ختم کر کے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے اور میری طرف متوجہ ہوا۔

" ہاں تو وہ تم کیا کہہ رہی تھیں وہ دل پر پتھر رکھ کر منگنی کرنا اور زہر کا پیالہ پینا؟" اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔

" میرے خیال میں، میں دادو سے بات کر رہی لوں خواہ مخواہ تمہاری زندگی برباد کر رہا ہوں۔ "

میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں بدک کر کھڑی ہوئی۔

" نہیں نہیں، میں تو مذاق کر رہی تھی۔ وہ تم کم کم ہنستے ہو نا اور ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہو، اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں تھوڑا سا ہنسا دوں۔ "

وہ ایک دم سے کرسی سرکا کر کھڑا ہوا اور میرے مقابل آ گیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو

BOOKSPK

دل دھک سے رہ گیا، وہ گہری سیاہ زیرک آنکھیں مجھ پر جمائے جیسے میری بات کی سچائی کا اندازہ لگا رہا تھا اور شاید اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر تھی اور پھر وہ ایک دم سے ہلکا سا ہنس دیا۔

اف قارئین...... اگر میں اپنے کمرے میں ہوتی تو پرانی فلموں کی ہیروئن کی طرح دل پر ہاتھ رکھ کر بستر پر ضرور گر جاتی۔

"رویحا گل! تمہیں پتا ہے کہ تم کتنی اسپیشل ہو، تم جیسا پیس کوئی کوئی ہی ہوتا ہے اور کسی کسی کی قسمت میں آتا ہے۔"

وہ مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا اور میں گنگ سی کھڑی سُن رہی تھی اور جب حواس میں لوٹی تو میرو جا چکا تھا پھر یک لخت مجھے احساس ہوا کہ میرو نے میرے سامنے کیا اعتراف کیا ہے تو میں سب کو سنانے کے لیے بھاگی۔ زرینہ نے تو سنتے ہی غبارے میں سے ہوا نکال دی۔

"اردو میڈیم! پتا بھی ہے اسپیشل پرسن کا کیا مطلب ہے؟ اپاہج اور معذور لوگوں کو کہتے ہیں یعنی بھائی نے صاف صاف تمہیں ذہنی معذور کہا ہے۔"

میں نے بے یقینی سے ماہین کی طرف دیکھا۔ ہم سب میں وہ پڑھاکو ہی زیادہ ذہین تھی تو اس نے ترس کھاتی نظروں سے مجھے دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ قسمے دل کے ٹوٹنے کی آواز نہیں ہوتی ورنہ اس روز دھماکا ہوتا بٹ ہاوس میں...... ہونہہ...... وڈا آیا بٹ۔

☆☆☆

دادو مجھے زبردستی باجی زرینہ کے گھر لے گئیں۔ شائدان کے ہاں ہونے والی تیسری ڈکیتی کا پرسہ دینا تھا یا شاید ان کو صبر کی تلقین کرنا تھی۔ میرا تو دل ہی اس دنیا سے اتنا اچاٹ ہوا پڑا تھا کہ میں کسی بھی بات پر غور کیے بنا روبوٹ بنی بس ان کے ساتھ چلی آئی۔ باجی زرینہ دادو کے گلے لگ کر ہٹیں تو چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

"ائے ہئے...... زرینہ اب بس بھی کر دو۔ اللہ کی جو رضا تھی وہی ہونا تھا نا۔ تم تو دل پر ہی لے کر بیٹھ گئیں۔" دادو نے بیٹھتے ہی ان کو گھر کا تو وہ آنکھیں پھیلا کر دادو کو دیکھنے لگیں۔ پھر شکوہ کناں انداز میں بولیں۔

"آپ کو کیا پتا خالی دامن ہونے کا دکھ۔"

"اے لو...... یہ بھی خوب کہی تم نے...... خالی دامن کیا؟ پہلی بات تو یہ کہ اس عمر میں ایسی غلطی کی ہی کیوں تم نے اور چلو کر بھی لی تو اب اس پر پچھتانا کیسا۔ بس اللہ کی رضا میں راضی ہو جاؤ۔"

دادو کی باتیں سن کر میں تو مارے کوفت کے پہلو بدل ہی رہی تھی خالہ زرینہ بھی یقیناً دانت کچکچا رہی ہوں گی۔

"لو بھلا میری کیا غلطی اس میں...... اللہ کی مرضی ہے۔"

"ہاں......" دادو زور سے بولیں اور اتنا ہی ٹکا کر ایک جھانپڑ زرینہ خالہ کی ران پر مارا تو وہ بے چاری تکلیف سے دہری ہوئی اپنی ران سہلاتی اٹھ کر سامنے کرسی پر جا بیٹھیں۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اللہ کی رضا ہے تو پھر رونا کیسا۔ ہم تو کبھی نہ روئے، پوری پانچ ہوئیں ہمارے گھر اور ہر ایک کی بار مٹھائی بانٹی ہم نے اور ادھر تیسری بار پر ہی تمہارا رونا نکل آیا۔ حد ہوتی ہے ناشکری کی۔"

دادو نے مزید کہا تو خالہ زرینہ تو کیا میں بھی منہ پھاڑ کر دادو کو دیکھنے لگی۔ (کس کو غلط فہمی ہو رہی ہے؟) میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔

"ہیں؟ رویحا پتر! تمہارے گھر پانچ ڈکیتیاں ہوئی ہیں، کبھی ذکر نہیں کیا کسی نے؟"

خالہ زرینہ حیرت زدہ کافی اونچی آواز سے بولیں اور اس سے پہلے کہ میں ان کو یہ بتا کر ان کی غلط فہمی دور کرتی کہ ہمارے ہاں پانچ بیٹیاں ہوئی ہیں زمانہ بعید میں، ڈکیتیاں نہیں۔

"ان کے گھر دادو...... پرسہ دینے آئی ہیں آپ۔" میں نے دانت کچکچا کر آنکھ سے اشارہ بھی کیا مگر دادو کا پوپلا منہ تو مارے حیرت و بے یقینی کے کھل گیا۔

"دراصل دادو کی یادداشت کمزور ہو گئی ہے خالہ! آپ مائنڈ مت کیجیے گا۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں خالہ زرینہ سے کہا تو دادو کی چھڑی زور سے میرے ہاتھ پر آ کر لگی۔

"سس......" میں ہاتھ سہلاتی اچھل پڑی۔

"دفع دور...... میں تو پہلی بلیک اینڈ وائٹ بننے والی فلم کے ڈائیلاگ بھی سنا سکتی ہوں تمہیں۔ بڑی آئی میری یادداشت خراب کرنے والی۔" دادو نے دبنگ لہجے میں کہا اور پھر خالہ زرینہ کی طرف متوجہ ہو کر اٹل انداز میں بولیں۔

"دیکھو زرینہ! اب زمانہ تمہیں لاکھ پُرسے دیتا رہے اور تم بھی سب کے سامنے یہ جلی سڑی بوتھی لے کر مظلوم بنتی رہو۔۔۔ مگر میں تو مبارک باد دینے آئی تھی اور وہی دوں گی۔"

خالہ زرینہ تو کیا خود میری آنکھوں کے سامنے بھی دنیا گول گول گھوم گئی۔ مجھے تو رونا آنے لگا۔ امید واثق تھی کہ آج ہم دادی پوتی خالہ زرینہ سے مار کھا کر ہی جانے والی ہیں، سو جلدی سے میں نے کھینچ کھانچ کر ایک آدھ ننھا منا سا آنسو نکال ہی لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"دیکھ لیں خالہ! اتنا صدمہ لیا ہے دادو جان نے، ڈکیتی آپ کے ہاں ہوئی اور دماغ ان کا متاثر ہو گیا۔" خالہ بے چاری پھر سے دادو کو۔ "صدمہ شدہ" جان کر متاثر ہو گئیں جب کہ اس بار دادو کے کان کھڑے ہوئے۔

"ڈکیتی......؟ کون سی ڈکیتی...... کہاں ہوئی ہے ڈکیتی؟" وہ پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

"دادو......" میں نے جھینپ کر انہیں ٹوک دیا۔ (اس کے بعد تو میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دینا تھا یقیناً۔)

"خالہ زرینہ کے گھر ڈکیتی ہوئی ہے۔"

"ہاہ...... اور وہ تمہاری ماں بے وقوف۔ مجھے کہہ رہی تھی کہ زرینہ کے ہاں تیسری بار بیٹی ہوئی ہے اس لیے رو رہی تھی اور میں اسی کی مبارک باد دینے چلی آئی۔" دادو پوپلے منہ سے ہنستے ہوئے بولیں تو میں کیا اچھلتی یہ سب سن کر جو خالہ زرینہ اچھلیں۔

"کوئی خیال ہے آپ کو اماں جی!" خالہ ناراضی سے بولیں (اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ "خیال" کی جگہ وہ حیا کہنا چاہ رہی ہوں گی)۔

اور بعد میں دادو نے معذرت کرتے ہوئے ان کے ساتھ ہونے والے حادثے پر دو آنسو بہا کر ڈاکوؤں کو کوس بھی لیا مگر خالہ زرینہ کی آنکھوں کا کینہ نہ گیا۔ اور ایک طرح سے اچھا بھی ہوا۔ دادو جلدی اٹھ گئیں اور میری بھی جان چھوٹی۔

گھر آ کر سارا نزلہ چچی جان پر گرایا گیا کہ ان کے آہستہ بولنے کی بری عادت کی وجہ سے وہ آج ڈکیتی کے پرسے کے بجائے بیٹی کی مبارک باد دینے کی گناہ گار بن گئی تھیں مگر کان کا آلہ لگوانے کو وہ پھر بھی تیار نہ ہوئیں اور میں شام تک سب کو نمک مرچ لگا لگا کر دادو کا کارنامہ سناتی رہی اور سب کبھی قہقہے لگاتے اور کبھی کانوں کو ہاتھ۔

نمرہ احمد

حالم

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے اگلے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔

مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمٰن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو سچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ، فاتح اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اور اس نے تالیہ کے بابا کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنا دے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پگھل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم ایگنیس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر محل کا اسکیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبدہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آیا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسکیچ بنواتی ہے۔ تو وہ غلط اسکیچ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔

تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس فیملی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو ”ابوالخیر“ نامی آدمی کے کارندے ایک پنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملاکہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کرا لیتی ہے۔ مگر فاتح کو آزاد کرانے سے پہلے اغوا کاروں کو خبر ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں فاتح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاتح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک ”البینو“ قیدی کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جل دے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ پہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بنداہارا کی بیٹی ہے۔ بنداہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایڈم، وان فاتح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاتح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بنداہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاتح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ نیلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاتح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کارنامے انجام دیے تھے مگر فاتح نہیں بتاتا۔ ایڈم ”بنگارایاملایو“ کے رائٹر کا تھیلا چرا لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو ”وانگ لی“ کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔ وان فاتح، سن پاؤ کے وانگ لی سے متاثر ہے دعوت میں سن پاؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاتح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاتح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

فاتح، وانگ لی سے بے حد متاثر ہے اور اسے خزانچی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ابوالخیر کو خزانچی بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ فاتح کو یہ بات ناگوار گزریت ہے، تالیہ، ایڈم کو شاہی مؤرخ تعینات کرتی ہے۔ فاتح تمام غلاموں میں آزادی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پر بادشاہ کو قائل کر کے اپنے آدمی تعینات کر دیتا ہے اور ہر ادارے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شاہی مؤرخ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھواتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ راجہ خفیہ طور پر کمائی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر پیسہ حاصل کرنے کے لیے ابوالخیر سے ساز باز کر لیتی ہے۔ فاتح کو پتا چل جاتا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے اور نیلامی میں وانگ لی کا غلام بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ فاتح مستقبل کی باتیں بتا کر وانگ لی کو متاثر کرتا ہے۔

یان سوفو کے والد کو بادشاہ مرسل کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستعمل غسل کا پانی

چاہتی ہے مگر شاہی طبیب آنا کانی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ملکہ، تالیہ کی جاسوسی کرواتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔

تیرہویں قسط

''اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے' آپ کا ہر واقعہ اتنا بڑھا چڑھا کے لکھنا پڑتا ہے کہ بس! اور شاہی مورخ کے طور پہ مجھے ہر جمعے کے روز یہ صفحات دربار میں سنانے ہوتے ہیں' اور پھر ان کو شہر کے تمام کتب خانوں میں پہنچانا ہوتا ہے تاکہ ان کو محفوظ کیا جائے اور ملک بھر میں ان کی نقول لکھ لکھ کے بھیجی جائیں۔ یہ کتاب ایک قسط وار ناول کی طرح ہے' جس کو ہر ہفتے پڑھا جاتا ہے۔ اور یہ ہم اس ہفتے سے چین اور پرتگال بھی بھیجیں گے جہاں....'' لکھتے لکھتے اسے احساس ہوا کہ وہ خاموش ہے تو سر اٹھایا۔

تالیہ گردن موڑے اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں کھڑکی سی بنی تھی اور اندر باورچی تھا۔ ایک آدمی سامنے کھڑا اس کو بارعب انداز میں کہہ رہا تھا۔

''مجھے وزیر خزانہ ابوالخیر نے بھیجا ہے۔ اس ماہ کا محصول ادا کرو۔'' ساتھ ہی ایک کاغذ اس کے سامنے کیا۔

''یہ تو محمود مرنی ہے۔'' ایڈم نے سرگوشی کی۔ تالیہ خاموشی سے اس کو دیکھے گئی۔

''محصول میں دُگنا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کیا سلطان کو ہم پہ ترس نہیں آتا؟'' باورچی احتجاجاً دبا دبا سا بولا۔ محمود مرنی آگے ہوا اور کہنیاں کھڑکی پہ رکھ کے جھکا۔

''میں ظاہر کروں گا کہ تمہاری یہ گستاخی میں نے سنی ہی نہیں۔ اس لیے...... محصول دو!'' غرا کے ہتھیلی پھیلائی۔ باورچی کے کندھے ڈھلک گئے۔ وہ چپ چاپ اندر گیا اور پھر واپس آ کے ایک بھاری تھیلی اس کے ہاتھ پہ رکھی۔ محمود نے تھیلی لی اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

تالیہ فوراً اٹھی اور بظاہر عام سے انداز میں چلتی اس کے تعاقب میں ہولی۔ وہ اب دوسری دکان کی طرف جا رہا تھا۔ وہ چغے کی ٹوپی میں چہرہ چھپائے، سینے پہ بازو لپیٹے، ایک دکان کے چھپر تلے کھڑی اس کو دیکھے گئی۔ چائے کی قیمت کی ادائیگی کر کے ایڈم بھی ساتھ آ کھڑا ہوا۔

''یہ محمود مرنی کس چیز کے پیسے لے رہا ہے دکان داروں سے، بچے تالیہ؟''

''محصول کے۔'' تالیہ کی سوچتی آنکھیں دکانوں پہ جمی تھیں۔

''محصول کیا ہوتا ہے؟''

''ٹیکس۔ گورنمنٹ ٹیکس۔ ملک کے ہر شخص سے یہ ٹیکس وصول کر کے ایک جگہ بھرا جاتا ہے۔ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اور اس کو کہتے ہیں' قومی خزانہ۔''

(محمود اب دوسرے دکان دار سے رعب سے محصول مانگ رہا تھا۔)

''ہاں...... یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ہمارے ٹیکس قومی خزانے میں ہی جاتے ہیں۔''

(محمود مرنی بڑے سے تھیلے میں ہر دکان سے چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بھر کے اگلی دکان کی طرف بڑھ جاتا تھا۔)

''ہمارے ٹیکس قومی خزانے میں نہیں جاتے بلکہ قومی خزانے میں ہوتے ہی ہمارے ٹیکس ہیں۔''

(گلی کے آخر میں ایک بگھی کھڑی تھی۔ محمود تھیلا لیے اس تک آیا۔ سپاہیوں نے اندر رکھا صندوق کھولا۔ اس نے ساری تھیلیاں اس میں الٹ دیں۔)

''مگر حکمران وغیرہ کہتے ہیں کہ قومی خزانہ خالی ہونے والا ہے۔ وہ سب کیا ہوتا ہے؟''

(کچھ دیر بعد بگھی ایک عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ وہاں صندوق نکالے گئے اور ایک بڑے کمرے میں لے جا کے رکھے گئے۔ جہاں ایسے کئی صندوق رکھے تھے۔ یہ وزارتِ خزانہ کا ایک کمرہ تھا۔)

''حکمران بادشاہ لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا جھوٹ بولنے سے کیا جاتا ہے؟''

(صندوقوں کے کمرے میں اب چند افراد کھڑے ہر صندوق کا حساب کاغذوں پہ تحریر کر کے ان کو تالے لگا رہے تھے۔)

''تو یہ محصول قومی خزانے میں بھرنے کے بعد کہاں جاتا ہے؟''

(ایک عہدیدار اب وزیرِ خزانہ کی مہر والے حکم نامے دکھا کے چند صندوقوں کو مختلف گاڑیوں میں لاد رہا تھا۔)

''اس سے حکومت کے اداروں میں تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ پولیس، فوج، عدلیہ وغیرہ کے دفتر کا خرچ اور تنخواہیں۔ اسی لیے سرکاری ملازم عوام کے ملازم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی تنخواہ عوام کے ٹیکسوں سے ادا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس محصول سے سڑکیں' پل اور دوسرے ترقیاتی کام کیے جاتے ہیں۔ کیا تم نے اپنی کتابوں میں یہ سب نہیں پڑھا؟''

(صندوقوں سے بھری ایک گاڑی ابوالخیر کی حویلی پہنچ چکی تھی۔ محمود مرنی نے صندوق اُتروائے اور انہیں بڑے کمرے میں پہنچا دیا۔)

''مگر یہ تو آئیڈیل منظر نامے میں ہوتا ہے۔ ہمارے جیسے ملکوں میں کیا ہوتا ہے بچے تالیہ؟''

(صندوقوں کے اوپر 'تالیہ بنتِ مراد کی مسجد' کا نام درج تھا۔ ابوالخیر نے چار صندوقوں میں سے ایک کو الگ کیا' اس سے مسجد کی بنیادیں کھدوانے کا حکم دیا اور اس کو روانہ کر دیا۔)

''تیسری دنیا کے ملکوں میں اس محصول کا تھوڑا سا حصہ ملک اور ملکی اداروں پہ خرچ کیا جاتا ہے۔ باقی سب مل کے کھاتے ہیں۔ ہر عہدے دار اس کے اندر سے اپنا حصہ الگ کرتا جاتا ہے۔ اسی کو کرپشن کہتے ہیں۔ جیسے جتنا مال ابوالخیر مسجد کے نام پہ نکلوائے گا' اس میں تھوڑا سا تعمیر کے لیے بھیجے گا اور باقی خود رکھے گا۔''

(باقی تین صندوقوں سے اس نے اشرفیاں نکلوا کے لکڑی کے تین خاص صندوقوں میں بھریں۔ ایک خود رکھا اور دو صندوقوں کو گاڑی میں لاد دیا۔)

''یعنی ان غریب محنت کش لوگوں نے اعتماد کر کے ابوالخیر اور سلطان کو جو محصول دیا ہے' یہ حکمران اسی محصول سے اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں؟''

(اب وہ گاڑی بان کو رات کی تنہائی میں حکم دے رہا تھا کہ یہ صندوق شہزادی تاشہ کے محل میں خاموشی سے پہنچا دیے جائیں۔)

''ہاں' ایڈم۔ اسی لیے ملک کے حکمران ایمان

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
ایک تھی مثال
رخسانہ نگار عدنان
مکمل ناول کتابی شکل
میں شائع ہو گیا ہے
قیمت -/500 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہِ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

دار ہونے چاہئیں تاکہ وہ اس محصول کی امانت کو نبھا سکیں۔ ابوالخیر کی طرح اپنی اور اپنے دوستوں کی دولت میں اضافہ نہ کریں۔"

(رات کی تاریکی میں وہ صندوق تاشہ کے محل میں لائے گئے اور خاموشی سے اس کی خواب گاہ میں رکھ دیے گئے۔)

"اچھا میں بچپن سے سمجھتا تھا کہ حکمران جو قومی خزانہ لوٹتے ہیں، یعنی جو کرپشن کرتے ہیں، وہ دراصل "ملک" کا پیسہ ہوتا ہے۔ جیسے...... جیسے ملک میں کوئی خزانے کے کنویں ہوں جو بھرے ہوں اور بس اس کو وہ لوٹ رہے ہوں اور میں سوچتا تھا کہ خیر ہے' اگر تھوڑی بہت کرپشن یہ لوگ کر بھی لیں تو چلو' ملک پہ خرچ بھی تو کر رہے ہیں ناوہ۔"

(ابوالخیر اب اپنے دفتر میں بیٹھا کاغذوں پہ حساب کتاب تحریر کر رہا تھا۔ بنیادیں ڈلوانے کا خرچا اس نے تین گنا بڑھا کے لکھا۔ جو کام ایک اشرفیوں سے بھرے صندوق سے ہو جانا تھا' اس نے اس کی قیمت تین گنا تحریر کی' اور دستخط کر دیے۔)

"ملک کا کوئی خزانے کا کنواں نہیں ہوتا' قومی خزانہ صرف محصول پہ مبنی ہوتا ہے۔ ملک کے لوگ اس کو بھرتے ہیں' اور بھرتے جاتے ہیں۔"

(اگلی صبح کاغذات کو تصدیق کے لیے بنداہارا کو بھیج دیا گیا۔ راجہ مراد نے مسکرا کے تفصیلات پڑھیں اور مہر لگا دی۔)

"یعنی جب حکمران کرپشن کرتے ہیں' تو دراصل وہ ہر غریب آدمی کی تنخواہ کا ایک حصہ چوری کر رہے ہوتے ہیں! یعنی ابوالخیر جو صندوق راجہ مراد کو بھیجتا ہے وہ اسی طرح مختلف فنڈز سے نکالا گیا حصہ ہوتا ہے۔"

(مسجد کی بنیادوں کے لیے دیا گیا فنڈ کاغذوں میں پورے کا پورا ایمان داری سے استعمال ہونا لکھا گیا اور کاغذ الماری کی زینت بن گئے۔)

"بالکل اور تم مجھ جیسے چوروں کو ناپسند کرتے ہو جو صرف امیروں کی چیزیں چراتے ہیں؟ اصل چور تو یہ حکمران ہیں جو غریبوں کو لوٹتے ہیں۔"

ایڈم نے آنکھیں چھوٹی کر کے تالیہ کا چہرہ دیکھا۔ "اس بات پہ میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گا۔"

وہ ابھی تک ان دکان داروں کو دیکھ رہی تھی جو اپنی بقایا جمع پونجی گن رہے تھے۔

(وہ خالی میدان جہاں مسجد کی تختی لگی تھی....وہ خالی تھا۔ وہاں تھوڑی سی کھدائی کی گئی تھی۔ مگر ان کھوکھلی جڑوں پہ کوئی عمارت کھڑی نہیں کی جانی تھی۔)

☆☆☆

سن باؤ کے خوب صورت گھر پہ دوپہر اتری تھی۔ صحن میں لگے کنویں کی منڈیر پہ جھکا فاتح رسی سے ڈول باہر کھینچ رہا تھا۔ کرتے کی آستینیں اوپر چڑھائے، وہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا مگر چہرہ سنجیدہ اور پُرسکون تھا۔ ماتھے کی سبز پٹی بھی گیلی ہو چکی تھی۔

گاہے بگاہے وہ کنویں کی اندرونی دیوار کا جائزہ بھی لیتا تھا۔ تالیہ نے دیوار سے وہ پتھر کیسے نکالا تھا جس کو کنویں کے پانی میں ڈالنے سے صحن کے اندر سے سیڑھیاں نکلی تھیں' وہ قطعاً واقف نہ تھا لیکن خیر......بغیر چابی کے وہ اس دروازے کو کھول بھی نہیں سکتے تھے۔ چابی...انہیں چابی چاہیے تھی۔

پانی کا ڈول اوپر آیا تو اس نے اسے گھڑے میں انڈیلا۔ تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی۔ فاتح نے انگوٹھے سے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور گھڑا رکھ کے دروازے کی طرف آیا۔

باہر محمود مرنی کھڑا تھا۔ سرکاری یونیفارم پہنے' وہ سنجیدہ لگتا تھا۔ فاتح نے ایک نظر اس کے پیچھے ڈالی جہاں فاصلے پہ بگھی اور سرکاری سپاہی کھڑے نظر آتے تھے۔

"سن باؤ وانگ لی سے خراج وصول کرنے آیا ہوں۔" اس نے سادہ انداز میں کہا۔

"مالک گھر پر نہیں ہیں۔ مگر خراج کی تھیلی وہ رکھوا گئے تھے۔ میں لاتا ہوں' بلکہ تم اندر آ جاؤ۔" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں محمود مرنی کو اشارہ کیا۔ محمود نے پیچھے دیکھا اور سپاہیوں کو وہیں رکنے کا کہا۔ پھر فاتح کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔

دروازہ بند ہوتے ہی محمود کے چہرے پہ بے چینی پھیل گئی۔ وہ تیزی سے گھوم کے اس کے سامنے آیا اور پریشانی سے فاتح کو دیکھا۔

"تم نے کہا تھا تم ہمارے لیے کچھ کرو گے۔ اب بتاؤ، کیا تم ہمیں آزاد کروا سکتے ہو۔" سارا رعب، سارا تنتنا ختم ہو گیا تھا اور وہ اس وقت وہ فاتح کے سامنے ڈھلکے کندھوں والا ایک غلام لگ رہا تھا جو ابوالخیر کے آگے بے بس تھا۔

فاتح نے تپائی پہ دھری تھیلی اٹھائی اور اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"محمود بن مرنی.....تم ان چند غلاموں میں سے ہو جن پہ ابوالخیر بھروسہ کرتا ہے اور ان کو باہر جانے کی اجازت ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم بھی آزاد ہونا چاہتے ہو۔"

"میں نے مالک کے ساتھ کبھی دغا نہیں کی مگر مجھے نفرت ہے مالک سے۔ وہ مجھے خرید کے نہیں، میرے گاؤں سے اغوا کر کے لایا تھا۔ اس کے آدھے سے زیادہ غلام ناجائز غلام ہیں۔ مجھے بتاؤ، فاتح...... ہم کیسے آزاد ہوں گے۔"

فاتح نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"وانگ لی تمہیں اس قید سے نجات دلائے گا۔ وہ ابھی آنے والا ہے۔ تم اس سے بات کرو' اور اپنی کہانی اس کے سامنے رکھو۔ وہ تمہارا کیس لے کر قاضی وقت کے پاس جائے گا اور قاضی، ابوالخیر کو حکم جاری کرے گا کہ تمام ناجائز غلام آزاد کیے جائیں۔ یوں وانگ لی کی کوششوں سے مرسل شاہ کے دور میں نیا قانون پاس ہو گا جس کے مطابق تمام ناجائز غلام آزاد ہو جائیں گے۔"

محمود مرنی نے الجھن سے اسے دیکھا۔ "تم تو یوں بتا رہے ہو جیسے تم نے ہماری قسمت پڑھ رکھی ہو۔"

فاتح دھیما سا مسکرایا۔ "وانگ لی ایک عظیم انسان ہے' اور میں اس بات سے واقف ہوں کہ وہی تم لوگوں کو نجات دلائے گا۔ یہ بات تاریخ کی کتابوں میں لکھی جائے گی۔"

باہر گھوڑے کی آواز آئی تو محمود مرنی چونکا۔ فاتح نے گہری سانس لی۔ "تم اندر بیٹھو۔ میں قہوہ بنا کے لاتا ہوں۔ تمہیں صرف ایک دفعہ وانگ لی سے بات کرنی ہے، وہ فوراً راضی ہو جائے گا۔"

محمود مرنی پھیکا سا مسکرایا۔ اس کی بے بس آنکھوں میں امید جاگی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

کچھ دیر بعد وان فاتح باورچی خانے سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں طشت تھا جس میں ننھی چینی پیالیاں اور چائے دان رکھا تھا۔ ساتھ میں شہد کی بوتل تھی۔

اس نے طشت برآمدے کی میز پہ رکھا اور چینک سے پیالیوں میں قہوہ انڈیلنے لگا۔

سامنے آرام کرسی پہ وانگ لی بیٹھا مقابل براجمان محمود مرنی کو سن رہا تھا جو پریشانی سے اسے اپنی داستان سنا رہا تھا۔

"سب جانتے ہیں سن باؤ' کہ ملاکہ کے قانون میں غلام دو طرح سے بنائے جا سکتے ہیں۔ یا تو وہ جنگ کے قیدی ہوں' یا پھر منڈی میں باقاعدہ معاہدہ کر کے ان کو خریدا گیا ہو۔ مگر ابوالخیر لوگوں کو اغوا کر کے لاتا ہے اور جبری غلام بنا لیتا ہے۔ اس کو راجہ کی سرپرستی حاصل ہے۔ یوں اس کو مفت میں غلام مل جاتے ہیں۔ ہم سب آزاد ہونا چاہتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ہماری مدد کریں گے۔"

فاتح نے جھک کے طشت سن باؤ کے سامنے کیا۔ اس نے آرام سے پیالی اٹھائی اور لبوں سے لگائی۔ فاتح طشت لیے محمود مرنی کے پاس گیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا کے اسے حوصلہ دیا۔ محمود نے پُرامید سا مسکراتے ہوئے قہوہ اٹھایا اور سن باؤ کو ذرا اعتماد سے مخاطب کیا۔

"سن باؤ......آپ ہمیں سمجھائیں کہ ہمارا پہلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ ہم کیسے ابوالخیر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔"

فاتح اب طشت لیے پیچھے کونے میں جا کھڑا ہوا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے وہ منتظر سا سن باؤ کو دیکھنے لگا۔

”محمود مرنی...... تم جانتے ہو میں بھی ایک غلام تھا۔ تائی ژان۔“

”جی، اسی لیے ہمیں لگا کہ آپ ہمارا درد....“

”اور مجھے بھی جبری طور پہ غلام بنایا گیا تھا۔ میں شاہ چین کے پاس کم عمری میں آیا تھا اور مجھ پہ بہت ظلم بھی ڈھائے گئے‘ مگر میں ڈٹا رہا۔ میں نے اپنے آقا کے دل میں جگہ بنائی۔ میں نے محنت کی اور مجھے ان کا قرب حاصل ہوا۔ مجھے بڑے بڑے عہدے ملے اور میں آج آزاد ہوں، ملکوں ملکوں گھومتا ہوں، جہاں چاہے رہتا ہوں‘ مگر ہر دن کے اختتام پہ اپنے آقا کو خط لکھ کے ساری صورتحال سے آگاہی دیتا ہوں۔ میں آج بھی شاہ چین کا غلام ہوں اور....“ سن باؤ نے پیالی رکھی اور آگے کو جھک کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”مجھے....اس غلامی پہ....فخر ہے۔“

پیچھے کھڑے وان فاتح کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”میں نے آج تک شاہ چین کے خلاف دوسروں سے مدد نہیں مانگی۔ میں نے اپنے آقا سے محبت کی اور وفاداری نبھائی۔ ہر غلام کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ سوچنا بھی مت کہ میں کسی غلام کو اس کے آقا کے خلاف بغاوت کا مشورہ دوں گا۔ آج تو تم آ گئے ہو اور میں نے معاف کر دیا لیکن اگر دوبارہ آئے تو میں ابوالخیر کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اس لیے گھر جاؤ اور اپنے آقا کی خدمت کرو۔

غلام ہر طرح سے بنائے جاتے ہیں، اور یہ ان کی قسمت ہوتی ہے کہ انہیں اپنے مالک کی خدمت کرنا ہوتی ہے۔ تم بھی میرے جیسا مقام حاصل کر سکتے ہو اپنی وفا اور محنت سے۔ اور یاد رکھنا ملاکہ کا کوئی رئیس، کوئی قاضی تمہارے ساتھ کھڑا نہیں ہوگا کیونکہ سب کے گھروں میں جائز اور ناجائز غلام موجود ہیں۔“

محمود مرنی خاموشی سے اٹھا‘ تھیلی اٹھائی اور فاتح پہ ایک دکھ بھری جتاتی نظر ڈال کے مڑ گیا۔ دروازہ کھل کے بند ہونے کی آواز آئی مگر فاتح اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔

وانگ لی اب پیالی سے گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ہلکا سا ملال تھا۔

”مجھے ان غلاموں سے ہمدردی ہے‘ فاتح۔ مگر میں اس اجنبی دیس میں اجنبی ہوں۔ میں کبھی بھی ان غلاموں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر تمہیں میری پیشانی کی لکیروں میں کوئی ایسی تحریر نظر آئی ہے تو یقین کرو تم نے غلط پڑھا ہے۔“ وانگ لی نے پیالی رکھ دی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ تھکا ہوا لگتا تھا۔

اور فاتح بالکل سن کھڑا تھا۔
پتھر کا کوئی بت ہو جیسے۔
ٹوٹا ہوا کوئی خواب ہو جیسے۔

☆☆☆

بنداہارا کے محل کی عقبی کھڑکیوں سے دور نیچے ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ تالیہ کی خواب گاہ میں دو صندوق کب کے لا کے رکھے گئے تھے اور وہ ان کو کھولے بیٹھی تھی۔ اوپر چاولوں کی تہہ لگی تھی۔ تلاشی کے وقت ابوالخیر کے ملازم نے یہی بتایا تھا کہ یہ دم کیے گئے چاول ہیں جو شہزادی کے لیے بھجوائے گئے ہیں۔ تہہ ہٹاؤ تو اندر ریشمی کپڑے میں سکے بھرے تھے۔

”یقیناً یہ کرپشن کے سکے راجہ مراد کو بھی چاولوں اور دالوں کے نیچے چھپا کے بھجوائے جاتے ہوں گے۔ صاف شفاف کرپشن جس کا کوئی سراغ نہیں لگا سکتا۔ خیر.....“ اس نے صندوق بند کیا اور کھڑکی میں رکھی گھڑی کی ریت دیکھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ راجہ اس وقت حکومتی امور میں مصروف رہتا تھا۔ ابھی کمرے میں نہیں آیا ہوگا۔ ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا۔

کچھ دیر بعد وہ اشرفیوں کی تھیلی لیے راجہ کی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

”راجہ اندر نہیں ہیں۔“ پہرے داروں نے ادب سے اطلاع دی۔

”میں ان کے لیے خاص تحفہ لائی ہوں۔ انتظار کر لوں گی۔“ وہ بظاہر خوشی بھرے جوش سے بتاتی اندر چلی آئی۔

وہ اسے روک بھی نہ سکے۔

اندر آتے ہی اس نے تھیلی میز پہ رکھی اور جلدی سے الماری کی طرف بڑھی۔ اسے کھولا۔ ہر خانہ کھنگالا۔ بستر صفائی سے الٹ پلٹ کیا۔ چابی تو درکنار وہاں کچھ بھی ایسا نہ تھا جو قابلِ توجہ ہو۔ صرف کپڑے۔ کچھ اشرفیاں، کاغذ، مہر، کتابیں۔ وہ آخری صندوق بند کرنے لگی تو ٹھٹکی، اندر ایک بوتل رکھی تھی۔ خالی بوتل۔

بوتل دیکھ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ ایک خواب سا ذہن کے پردے پہ چلنے لگا.....

وہ الماری کھولتی ہے.... بوتل نکالتی ہے.... اس کے اندر مائع سا بھرا ہے اور پیندے میں سکہ اور چابی تیر رہی ہے۔ وہ بوتل سے مشروب پی لیتی ہے اور چابی نکال کے جوڑ دیتی ہے۔ وہ لمحہ امر ہو جاتا ہے۔

تاریک راستہ.... اوپر تاروں بھرا آسمان.... اور وہ ایک ستارے کو دیکھتی چلتی جا رہی ہے.... چلتی جا رہی ہے.... جیسے خواب میں اسے کوئی راستہ دکھا رہا ہے۔

کوئی روشنی سی اس کی راہبر ہے.... وہ چلتی جا رہی ہے.... چلتی جا رہی ہے۔

یہاں تک کہ اسے وہ سیڑھیاں نظر آتی ہیں.... وہ نیچے اترتی جاتی ہے.... آگے وہ قدیم دروازہ ہے.... وہ زنجیروں سے لپٹے اس کے تالے میں چابی گھساتی ہے اور زیرِ لب بڑبڑاتی ہے۔

”بابا اگر الور سونگائی کے لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے تو کیا ہوا.... میں خود جاؤں گی اور خزانہ ڈھونڈ کے لاؤں گی۔“

وہ زیرِ زمین راہداریوں میں چلتی جا رہی ہے.... اوپر بارش برس رہی ہے.... نیچے دو دریا ہیں پھر سیڑھیاں، جن کو عبور کر کے وہ اوپر آتی ہے اور ڈھکن ہٹا کے زمین پہ اوپر نکل آتی ہے۔ پھر ڈھکن

ماہنامہ
حنا
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور

مئی 2018 کا شمارہ شائع ہوگیا ہے
مئی 2018 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ ”اے وقت گواہی دے“ ثنا کنول کا مکمل ناول،
☆ ”ڈھل گیا ہجر کا دن“ ندا علی عباس کا مکمل ناول،
☆ ”اسیر ذات“ شبانہ شوکت کا ناولٹ،
☆ ”می رقصم“ بشریٰ سیال کا ناولٹ،
☆ ”شہر دل کے راستے“ تحسین اختر کا ناولٹ،
☆ ”دل گزیدہ“ ام مریم کا سلسلے وار ناول،
☆ ”پربت کے اس پار کہیں“ نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول،
☆ ندا اسحاق، اسما بدر، اعمار املا، حنا اصغر، اور کنول ریاض کے افسانے،

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،
تمام مستقل سلسلوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں

مئی 2018 کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

برابر کر کے سیدھی ہوتی ہے اور ادھر ادھر دیکھتی ہے۔

وہ ایک چرچ میں کھڑی ہے۔ لکڑی کے ڈیسک قطار در قطار لگے ہیں۔ صلیب جگمگا رہی ہے۔ موم بتیاں بجھی ہیں اور وہ چرچ کے وسط میں حیران پریشان کھڑی ہے.....

آوازوں نے ارتکاز توڑا تو تالیہ نے چونک کے آنکھیں کھولیں۔ وہ راجہ مراد کی خواب گاہ میں خالی بوتل ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ یہ وہی بوتل تھی جو کم سن تالیہ نے پی کے پھینک دی تھی۔

اس نے جلدی سے بوتل اندر واپس رکھی اور چیزیں درست کرتی ہوئی خواب گاہ کے وسط میں آ کھڑی ہوئی۔ بالوں میں انگلیاں چلاتے، وہ اب یوں کھڑی تھی جیسے کافی دیر سے بابا کی منتظر ہو۔

راجہ کسی سے تیز تیز بات کرتا ہوا آ رہا تھا۔ بند دروازوں کے باوجود اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ اپنے کسی خاص خادم کو مصروف انداز میں ہدایات دے رہا تھا۔

”اگر کشتی میں سوراخ ہو گئے ہیں تو نئی کشتی لے لو۔ مگر میں نہ سنوں کہ کشتی نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی دیر سویر ہوئی ہے۔“ دروازہ کھلا اور وہ بولتا ہوا اندر داخل ہوا۔ پھر کمرے کے وسط میں کھڑی تالیہ کو دیکھ کے رکا۔ ہاتھ سے خادم کو جانے کا اشارہ کیا۔

”تم.... یہاں؟“ ساتھ ہی اس نے فوراً اپنی الماری کو دیکھا جس کے اندر بوتل چھپا رکھی تھی۔

”جی۔ میں تحفہ لائی تھی۔“ وہ مسکرا کے بولی اور میز پہ رکھی تھیلی کی طرف اشارہ کیا۔

مراد آگے آیا اور تھیلی اٹھا کے انگلیوں کے پوروں سے ٹٹولی، جیسے اشرفیاں محسوس کی ہوں۔

”ہوں۔ ابو الخیر کے تحفوں میں سے ایک نذرانہ.... اچھا لگا مجھے۔“ ہلکا سا مسکرایا۔ اور اسے واپس رکھ دیا۔ پھر اپنی قبا کندھوں سے جھٹک کے برابر کی اور تالیہ کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ شاہی قبا میں ملبوس، ماتھے پہ سرخ پٹی باندھے، کندھے تک آتے بالوں والا مراد اب اپنی عقابی نظریں اس پہ جمائے ہوئے تھا۔

”تم اس دنیا سے مانوس ہوتی جا رہی ہو۔“

”ہونا بھی چاہیے۔ آخر مجھے یہیں رہنا ہے۔“ وہ مصنوعی سا مسکرائی رہی۔

”تو پھر تم میرے کمرے کی تلاشی کیوں لے رہی تھیں؟“ وہ تیار تھی۔ اسی طرح مسکرا کے بولی۔

”جانتے ہیں، اس دوسری دنیا میں، میں کیا تھی؟“

”کیا؟“

تالیہ آگے بڑھی، اور چہرہ راجہ کے کان کے قریب کر کے سرگوشی کی۔

”میں وہ تھی جو بنا چاپ گھروں کے اندر گھس جاتی تھی، دیواروں پہ رینگ کے اوپر چڑھ جاتی تھی، الماریوں اور صندوقوں کے اندر داخل ہو جاتی تھی۔“

”جیسے ناگن ہو کوئی؟“ راجہ نے ابرو اٹھایا۔

”جیسے بلی ہو کوئی!“

وہ سرگوشی میں بولی اور پھر کندھوں سے اپنا ریشمی لباس ذرا جھٹکا، اور مسکرا کے ہٹ گئی۔

راجہ پُرسوچ نظروں سے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

راہداری میں تیز تیز آگے بڑھتی ہوئی تالیہ کی پیشانی پہ پسینے کی چند بوندیں تھیں جن کو اس نے ہتھیلی کی پشت سے رگڑ کے صاف کر دیا تھا۔ راجہ سے ایک دفعہ پھر اسے ہلکا ہلکا سا خوف آنے لگا تھا۔

☆☆☆

قدیم ملاکہ کے بازار میں ایک جگہ ایک خوب صورت سا چائے خانہ بنا تھا۔ عام سرائے اور قہوہ خانوں کے برعکس یہ قدرے الگ تھلگ تھا اور چاروں طرف سے سبز گھاس سے مزین باغیچے سے گھرا تھا۔

عمارت کے اندر نیم تاریک سا طویل ہال تھا جہاں میزیں کرسیاں لگی تھیں۔ ہر جگہ سرخ پردے اور سرخ کاغذی غبارے نظر آتے تھے۔ وہ چینی چائے خانہ تھا، اور وہاں صرف چینی افراد کام کرتے تھے۔ تقریباً سب وہی تھے جو ملکہ یان سوفو کے چینی وفد میں آئے تھے اور یہاں آ کے مقامی عورتوں سے شادی کر کے یہیں بس گئے تھے۔

اس چینی چائے خانے کا نام ”جیا“ تھا۔ جیا قدیم چینی زبان میں ”چائے“ کو کہتے تھے۔ یہ لفظ پھر ”جیا“ سے ”چا“ بنا جس سے ”چائے“ اخذ کیا گیا۔ ”جیا“ اس زمانے میں بھی ایک پرانی اور کلاسیکل اصطلاح تھی اور چائے خانے کا نام اس پہ رکھنا کسی اعلا اور ادبی ذوق کے حامل شخص کا کام تھا، اور وہ شخص کوئی اور نہیں، تین نگینوں والا غلام، وانگ لی تھا۔

”جیا“ وانگ لی کا ذاتی قہوہ خانہ تھا جہاں وہ اکثر اپنی شامیں گزارتا تھا۔ یہاں شہر کے امراء اور رؤسا آیا کرتے تھے اور سیاست و سیاحت پہ لمبی بحثیں ہوتی تھیں۔

اس شام بھی سن باؤ وانگ لی ”جیا“ کے اندر ایک میز پہ براجمان خوش گوار انداز میں محوِ گفتگو تھا۔ سامنے شاہانہ لباس میں چند اعلا عہدیدار بیٹھے اس کو سن رہے تھے۔ فاتح اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا، جھک کے چینک سے پیالی میں دھار کی صورت چائے انڈیل رہا تھا۔ وہ کرتے کی آستینیں پیچھے چڑھائے، سنجیدہ اور خاموش نظر آتا تھا۔

سامنے بیٹھے شخص نے پیالی اٹھاتے ہوئے ایک نظر اس کو دیکھا۔ ”اس کو پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں، وانگ لی! یہ کون ہے؟“

سن باؤ نے مسکرا کے اسے دیکھا جواب سنجیدہ سا کھڑا تھا۔ ”یہ میرا نیا غلام ہے۔ میں نے ابو الخیر سے اسے خریدا ہے۔“

”اچھا... تو یہ ہے وہ غلام جس کے اوپر لمبی لمبی بولیاں لگائی گئی تھیں۔“ دوسرے شخص نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ لمبے بالوں اور داڑھی والا درمیانی عمر کا آدمی تھا۔

فاتح نے ادب سے سر کو خم دیا، ایسے کہ نظریں اس پہ جمائے رکھیں۔ جھکائیں نہیں۔

”کہاں سے آئے ہو تم؟“ داڑھی والے نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”ابو الخیر کی حویلی سے....“ اس نے دوسری پیالی میز پہ رکھی اور سر جھکائے چینک سے قہوہ — انڈیلا۔

”دیکھنے میں اعلا حسب نسب کے لگتے ہو۔ پیچھے سے کہاں کے ہو؟“ داڑھی والے نے اسی دلچسپی سے پیالی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”قاضی صاحب کا مطلب ہے کہ ابو الخیر کے پاس کس علاقے سے آئے تھے۔“ وانگ لی نے وضاحت کی۔ فاتح نے بس خاموش نظریں گھما کے وانگ لی کو دیکھا اور پھر ایک سپاٹ نظر قاضی پہ ڈالی۔

”ابو الخیر کے پاس لوگ آتے نہیں ہیں۔ لائے جاتے ہیں۔“ چبا چبا کے بولا تو میز پہ سناٹا چھا گیا۔ قاضی نے پیچھے کو ٹیک لگائی اور کھوجتی نظروں سے اس غلام کو دیکھا جو چینک اٹھائے بات کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

”تم ابو الخیر پہ الزام لگا رہے ہو۔ وہ وزیرِ خزانہ ہے اور ہمارا دوست۔“ دوسرے آدمی نے پیچھے سے ناگواری سے تنبیہہ کی۔ وانگ لی بھی ہلکا سا کھنکھارا۔

”فاتح کا الزام ضروری نہیں ہے کہ غلط ہو مگر.... (سفارت کارانہ انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے۔) یہ درست ہے کہ ایسے آدمی پہ الزام لگانے سے ڈرنا چاہیے جس کے ماشاء اللہ اتنے رئیس اور امراء دوست ہوں۔“ خوش مزاجی سے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ جو آگے چلتا جا رہا تھا، ایک دم رکا۔ نہایت ضبط سے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

(تو ثابت ہوا کہ سفارت کار آخر کار سفارت کار ہی ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اصل سے نہیں بھاگ سکتا۔ نہ وانگ لی، جو ان اعلا عہدیداروں کے ساتھ سفارتی تعلقات نہیں خراب کر سکتا تھا اور....) وہ دھیرے سے پلٹا تو اس کی آنکھوں میں تپش تھی۔ (اور نہ وہ خود اپنے اصل روپ کو زیادہ دیر تک مصلحتوں کے پردے میں چھپا سکتا تھا۔)

اس کے اندر کوئی جوار بھاٹا سا اٹھنے لگا تھا۔

طشت قریبی میز پہ رکھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا واپس ان کے سامنے آیا۔ پھر میز کے دونوں کناروں پہ ہاتھ رکھے اور ان کی طرف جھکا، یوں کہ

چہرہ ان تینوں کے سامنے تھا۔

”میرا نام فاتح بن رامزل ہے۔ مجھے اللہ نے ہر طبقے میں سے گزار کے اس مقام تک پہنچایا ہے۔ میں نے رئیسوں کی دوستی بھی دیکھی ہے اور شاہوں کے محلوں میں ان کے ساتھ بھی بیٹھا ہوں۔ میں اعلا سواریوں میں بھی گھوما ہوں اور میں نے ملک ملک کی سیر بھی کی ہے۔ میں کسی کی امارت یا طاقت کے رعب میں نہیں آیا کرتا، نہ میں طاقتوروں کی دوستی کے چھن جانے سے خوف زدہ رہتا ہوں۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے قبریں کھودی ہوئی ہیں، مالک۔ مجھے ان چیزوں سے مت ڈراؤ جن سے فاتح نہیں ڈر سکتا۔ بھلے سامنے قاضی وقت ہو یا وزیر خزانہ، میں ملاکہ کے ان بے بس غلاموں کے حقوق کے لیے آخری سانس تک لڑتا رہوں گا۔“

پھر سیدھا ہوا، ایک نظر ان تینوں کے دم سادھے چہروں پہ ڈالی اور مڑ گیا۔ پھر اندر جانے کے بجائے تیز تیز باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

وہ پیچھے کیا کہہ رہے تھے، اسے پرواہ نہ تھی۔ باہر آ کے گھاس پہ وہ رکا اور گہرے گہرے سانس لیے۔

دن ڈھل رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ چند گھوڑے باہر گھاس کے اس پار کھڑے تھے۔ کچھ لوگ ٹہل رہے تھے۔ ایسے میں وہ آسمان کا نارنجی پن دیکھنے لگا اور تب ہی.... نگاہ ہٹائی تو سامنے.... ایک سنگی بینچ پہ... قہوہ خانے کے دروازے کے ساتھ.... ایڈم بیٹھا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں دستہ تھا وہ قلم دوات میں ڈبو ڈبو کے اس پہ کچھ لکھ رہا تھا۔

فاتح کو اپنی طرف دیکھتا پا کے ایڈم نے صرف ایک دفعہ نگاہ اٹھائی اور واپس اپنا کام کرنے لگا، جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔ وہ یقیناً فاتح سے ملنے آیا تھا مگر ماحول ایسا تھا کہ وہ مل نہیں سکتا تھا۔ اس لیے نظر انداز کیے بیٹھا رہا مگر وان فاتح کے ذہن میں ایک دم جھکڑ سے چلنے لگے یادوں کا جھماکا سا ہوا اور کچھ یاد آیا.....

دو ڈھائی سال پہلے.... وہ کار میں بیٹھا، لمبے سفر پہ جا رہا تھا.... ڈرائیور کار چلا رہا تھا اور وہ پچھلی نشست پہ بیٹھا، عینک لگائے، کتاب پڑھ رہا تھا جس کے سرورق کے اوپری حصے پہ ”بنگا رایا ملایو“ (ملایا کا پھول) اور نیچے ”آدم بن محمد“ لکھا تھا۔

صفحے پہ لکھی تحریر پڑھ کے وہ مسکرا رہا تھا....

”اور یہ اسی ماہ کی بات ہے جب وانگ لی کے چائے خانے ”جیا“ میں..... ہوئی ایک شام گرم بحثوں کی نذر....
ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا رئیسوں اور قاضی کے خلاف...
اور کرنے لگا غلاموں کی حمایت
جن کو قید کرتے تھے بااثر لوگ اغوا کر کے
اور بولا وہ بھری محفل میں آواز بلند کر کے
نہیں ڈرتا میں رئیسوں کی دوستی کے چھن جانے سے.....
کیونکہ اللہ نے بے نیاز کر رکھا ہے میرا نفس شاہوں کی دوستی سے.....
گھوما ہوں میں اعلا سواریوں میں، رہا ہوں میں اونچے محلوں میں.....
پھرا ہوں میں ملک ملک، اپنے ہاتھوں سے کھودی ہیں میں نے قبریں.....
تو نہ ڈراؤ مجھے ان چیزوں سے، جو مجھے خوف زدہ نہیں کرتیں۔
لڑتا رہوں گا بے کس غلاموں کی آزادی کے لیے آخر دم تک۔
کیونکہ میں وانگ لی ہوں۔ ین باؤ تائی ژان۔
شاہ چین کا سب سے وفادار غلام!“

جیا کے باہر گھاس پہ کھڑے فاتح کو وہ الفاظ حرف بہ حرف یاد تھے۔

چند لمحے کے لیے وہ شاک میں چلا گیا۔ وانگ لی؟ یہ الفاظ کہنے والے کا نام کتاب میں وانگ لی کیوں تھا؟

یہ الفاظ وانگ لی نے تو نہیں کہے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ایڈم کے سر پہ آیا اور اس کے کاغذوں پہ نظر ڈالی۔ وہ تاریخ کی کتاب کو خوبصورت آزاد نظم کی صورت لکھ رہا تھا۔ وہی الفاظ۔ وہی کلمات۔

”پھرا ہوں میں ملک ملک، اپنے ہاتھوں سے کھودی ہیں میں نے قبریں.....
تو نہ ڈراؤ مجھے ان چیزوں سے، جو مجھے خوف زدہ نہیں کرتیں۔
لڑتا رہوں گا بے کس غلاموں کی آزادی کے لیے آخر دم تک۔
کیونکہ میں فاتح بن رامزل ہوں۔
ایک آزاد انسان!“

ایڈم نے آخری الفاظ تحریر کیے تو وہ ایک دم اس پہ جھپٹا اور اسے گریبان سے پکڑ کے دیوار سے لگایا۔ صفحات بکھر گئے۔ دوات الٹ گئی۔

ایڈم بوکھلا گیا۔

”یہ کیا لکھ رہے ہو تم؟“ اسے دیوار سے لگائے وہ غرایا۔ ”کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟“

”میں.... میں اپنی کتاب لکھ رہا ہوں۔“ گردن دبوچے جانے کے باعث ایڈم کی آواز پھنسی پھنسی سی نکلی۔ ”ایمان داری.... اور..... اور سچائی کے ساتھ۔“

”جھوٹ.... تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیونکہ یہ نہیں لکھا تھا تم نے اس کتاب میں۔“ ایک جھٹکے سے اس نے گریبان چھوڑا اور صدمے بھری نظروں سے اسے دیکھتا ہوا پیچھے ہٹا۔ ”میں نے یہ کتاب پڑھی ہے۔ میں نے اتنے سال یہ کتاب پڑھی ہے۔ جو باتیں تم وانگ لی سے منسوب کرتے رہے ہو، وہ اس نے نہیں کہی تھیں۔“

ایڈم نے گریبان درست کیا۔ اردگرد متوجہ ہوتے لوگوں کو مسکرا کے ”سب ٹھیک ہے“ کا اشارہ کیا اور جھک کے کاغذ سمیٹے۔ پھر سیدھا ہوا اور گہری سانس لے کر فاتح کو دیکھا جس کا چہرہ صدمے اور غصے سے بے رنگ ہو رہا تھا۔

”میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔ میں اسے اب لکھ رہا ہوں۔ مگر میں اس میں کبھی بھی آپ کے الفاظ کو وانگ لی سے منسوب نہیں کر سکتا، سر!“ دبی آواز میں وہ بولا تھا۔ ”میں اس کتاب کو پوری ایمان داری سے لکھوں گا اور اگر بعد میں اسے کوئی تبدیل کر دے تو وہ الگ بات ہے مگر میں.... ایسا.... نہیں کروں گا۔“

مگر فاتح کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ دکھ اور ملال میں گھرا کھڑا تھا۔ اس کا ہر ایک پر سے اعتبار اٹھ سا رہا تھا۔

”آپ کو لگتا تھا کہ وانگ لی ان غلاموں کو آزاد کرائے گا؟ ہرگز نہیں۔“ اس نے تلخی سے کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”محل میں رہ کے یہ تو جان ہی گیا ہوں، سر... کہ اس سفارت کار کے اپنے ذاتی کارنامے جتنے بھی ہوں، وہ صرف شاہ چین کا وفادار ہے۔ بنگا رایا ملایو میں اگر اس کی کسی جدوجہد کا ذکر ملتا ہے تو ہو سکتا ہے کتاب غلط کہتی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ جدوجہد در اصل کسی اور کی ہو۔“

”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”وانگ لی ایک تحریک چلائے گا۔ وہ ان غلاموں کو آزاد کروائے گا۔ مجھے تفصیلات نہیں معلوم مگر.... وانگ لی... اسے ہی چلانی تھی تحریک...“

”شاید وہ سب وانگ لی نے نہ کیا ہو۔ شاید وہ سب آپ نے کیا ہو۔ مجھے نہیں معلوم وانگ لی کا نام کتاب میں کیوں ہے مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ وانگ لی وہ ”ہیرو“ نہیں ہے جو آپ اسے سمجھتے ہیں۔ آپ اس کے فین ہیں اور اب آپ اس سے مایوس نظر آتے ہیں مگر سر.... فین ازم تو صرف ایک بلبلہ ہے۔ ست رنگا بلبلہ۔ لوگ اس بلبلے کی قید میں اڑتے جاتے ہیں اور جب یہ پھٹتا ہے تو وہ نیچے آ گرتے ہیں اور.... ٹوٹ جاتے ہیں.... مگر....“

وہ ٹھہرا اور اداسی سے مسکرایا۔ ”میں سوچتا ہوں، سر.... کیا ٹوٹنا ضروری ہے؟ کیا مایوس ہونا لازم ہے؟ ان کے لیے ہمارا پیار تو خالص تھا نا۔ کیا ہوا جو وہ اتنے عظیم نہ تھے جتنا ہم ان کو سمجھتے تھے۔ ہم تو اپنی وفا میں سچے تھے نا۔“

فاتح کی آنکھوں میں کرچیاں سی چبھنے لگیں۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے ہو کے پہلو میں آ گرے۔

’’کبھی کبھی ہم پرستار ان شخصیات سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ اس لیے الوژن کے ٹوٹنے پہ ہمیں خود نہیں ٹوٹنا چاہیے۔‘‘

جیا سے کچھ لوگ باہر نکل رہے تھے۔ ایڈم کے لیے مزید رکنا محال تھا۔ وہ جلدی سے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اٹھا اور سر جھکائے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وان فاتح اسے ملال سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

’’وہ سب وانگ لی نے نہیں کیا تھا‘ ڈیڈ۔‘‘ آریانہ ایک دم کہیں سے آئی تو اس نے دکھی نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ سفید فراک میں ملبوس وہ سائے جیسی بچی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

’’آپ نے عرصے بعد اپنے اوپر بھروسہ چھوڑ کے کسی دوسرے پہ بھروسہ کرنا شروع کیا۔ غلط کیا۔ آپ کو خود سے امید لگانی تھی۔ چاہے تاریخ کی کتابوں میں جو بھی لکھا ہو۔‘‘

اس نے سر جھکا کے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ کیا یہ ہاتھ ان غلاموں کو نجات دلانے جا رہے تھے؟

کوئی اپنے اصل سے نہیں بھاگ سکتا۔ پھر کیا ضرورت ہے بھاگنے کی؟

اس نے چہرہ اٹھایا اور ’’جیا‘‘ کی عمارت کو دیکھا۔

ایک بات طے تھی۔ وہ سب ’’جیا‘‘ سے شروع ہوا تھا۔ اسی چائے خانے سے۔ مگر کیسے؟ تفصیلات اس کتاب میں درج نہ تھیں۔ اسے خود ہی کچھ سوچنا تھا۔

اس کی آنکھیں عمارت پہ جمی تھیں۔ اور ذہن دھندلکوں میں پھنسا تھا۔

☆☆☆

سلطنت محل کے حرم میں خوشگوار سی صبح دھوپ سینک رہی تھی۔ پائیں باغ میں گھاس کی ننھی پہاڑی تھی جس پہ کینوپی بنی تھی۔ کینوپی کی چھتری تلے میز کرسیاں لگی تھیں۔ وہاں ملکہ یان سوفو ٹیک لگائے گرم چائے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔ سنہری تاج سر پہ رکھا تھا اور بالوں کا جوڑا بندھا تھا۔ وہ نوجوان اور خوبصورت تھی مگر عہدے کا رعب اب شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔

دفعتاً وہ پیالی رکھ کے مسکراتی ہوئی سیدھی ہوئی۔ نیچے نشیب سے کنیزوں کی معیت میں تالیہ چلی آ رہی تھی۔ اوپر آکے اس نے جھک کے تعظیم پیش کی۔

’’ملکہ!‘‘

یان سوفو نے مسکرا کے سر کو خم دیا۔ ’’آیئے شہزادی! بیٹھیے۔‘‘

تالیہ مسکرا کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھی۔ نارنجی ریشمی میکسی میں ملبوس‘ ہیروں سے مرصع تاج پہنے وہ بالوں کو گھونگھریالا کیے نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔

’’شہزادی تاشہ کی طرف سے تحفہ قبول کیجیے۔‘‘ اس نے اشارہ کیا تو دو کنیزیں آگے آئیں اور ایک چوکور شے سامنے کی جس پہ کپڑا گرا تھا۔ کپڑا ہٹایا تو نیچے ایک تین فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی پینٹنگ تھی۔ تصویر دیکھتے ہی یان سوفو کے لب کھل گئے۔

وہ یان سوفو کا پورٹریٹ تھا۔ طرح دار سی، مسکراتی ہوئی ملکہ۔

ہو بہو اصل کا عکس۔

یان سوفو کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔ اس نے بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا جس نے سر کو پورا جھکا کے اٹھایا۔

’’یہ میں نے بنایا ہے‘ ملکہ! آقا دیکھیں گے تو ان کو اچھا لگے گا۔ اس کو آقا کی خواب گاہ میں ہونا چاہیے۔‘‘

’’میں بہت متاثر ہوئی ہوں‘ تاشہ۔‘‘ پھر کنیزوں کو اشارہ کیا۔ ’’اس کو آقا کی طرف بھجوا دو۔‘‘

وہ رخصت ہوئیں تو متاثر اور ممنون سی یان سوفو نے تالیہ کو دیکھا۔

’’آپ کے اس فن سے نا آشنا تھی میں۔ یہ کہاں سے سیکھا آپ نے؟‘‘

’’جب میں یتیموں کی طرح ایک دور افتادہ قلعے میں بڑی ہوئی تب وہاں یہ کام سیکھا تھا۔ آپ کو اچھا لگا، میری محنت وصول ہوگئی۔ اور یہ پہلی دفعہ نہیں ہے کہ میں نے کسی حکمران کی بیوی کی تصویر بنائی ہے۔ دوبارہ وہی کام کرنا اچھا لگا مجھے۔‘‘ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

چند لمحے دونوں کے بیچ خاموشی حائل ہوگئی۔ پھر

یان سوفو کھنکھاری۔

’’چین سے آج صبح اچھی خبر آئی ہے۔ گزشتہ ہفتے سے میرے بابا روبہ صحت ہیں۔ نظرِ بد کے توڑ کے پانی نے اپنا اثر کیا ہے۔ میں اس کے لیے آپ کی ممنون ہوں‘ شہزادی!‘‘

’’آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں‘ ملکہ۔ والد کا رشتہ کسی بیٹی کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی کمزوری بن سکتا ہے۔‘‘

یان سوفو غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی جس پہ اداسی پھیل گئی تھی۔

’’آپ کی اپنے والد سے ناچاقی کس بات پہ ہے؟‘‘

تالیہ نے پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا اور مسکرائی۔

’’وہ مجھے واپس نہیں بھیجنا چاہتے اور میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔‘‘

پھر گردن موڑی تو دیکھا‘ نیچے سبزہ زار پہ ہرنوں کی جوڑی ٹہل رہی تھی۔ یوں ہی اسے اشعر کے قلعے کا لان یاد آیا اور وہ ہرن.... اس نے سر جھٹکا۔ یان سوفو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بغور دیکھ رہی تھی۔

’’کچھ یاد آ گیا آپ کو‘ شہزادی؟‘‘

’’میرا شہر.... میرا گھر.... جہاں بہت سے لوگ ہیں جن سے میں دوبارہ ملنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’تو مل آیئے نا۔ اس میں ایسا مسئلہ کیا ہے۔‘‘

اس نے گہری سانس لے کر یان سوفو کو دیکھا۔ ’’آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ اگر ایک دفعہ وہاں چلی گئی تو واپس نہیں آسکوں گی، اسی لیے بابا مجھے جانے نہیں دے رہے۔‘‘

’’واپس تو صرف ایک جگہ سے نہیں آیا جاتا‘ پتری تاشہ‘ (شہزادی تاشہ) اور وہ ہے تین چاند والا آسیب زدہ جزیرہ۔ اس کے علاوہ ہر جگہ سے واپسی ممکن ہے۔‘‘ ملکہ نے مسکرا کے ناک سے مکھی اڑائی۔

’’تین چاند والا جزیرہ؟‘‘ وہ چونکی۔

’’ہاں۔ ملایا کا وہ آسیب زدہ جزیرہ جس میں ساری کشتیاں اور جہاز ڈوب کے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اب وہاں کوئی نہیں جاتا۔‘‘

تالیہ ہلکے سے ہنس دی۔ ’’نہیں‘ ادھر نہیں۔ مجھے جہاں جانا ہے‘ وہ جگہ اتنی پُر آسیب نہیں ہے جتنے پُراسرار وہاں کے لوگ ہیں۔ ٹھنڈے اور معاف نہ کرنے والے۔‘‘ اس کا چہرہ پھر سے بجھ گیا۔ ملکہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

’’کیا وہ بھی ایسا ہے؟‘‘ اس کے سوال نے خوشگوار صبح میں اداس نغمے گھول دیے۔ تالیہ گردن موڑ کے درختوں کو دیکھنے لگی۔

’’وہی تو ایسا ہے۔ ایک چھوٹی سی غلطی پہ منہ موڑ لینے والا۔ معاف نہ کرنے والا۔ میں تو اسے ہر سرد مہری اور بے رخی کے لیے معاف کر دیتی تھی، ملکہ! پھر مجھے ندامت میں ڈال کے وہ میرے سارے اچھے کاموں پہ پانی کیوں پھیر دیتا ہے؟‘‘

’’ندامت میں یا شرمساری میں ڈال کے؟‘‘

تالیہ نے اداس نگاہیں اس کی طرف موڑیں۔ ’’دونوں میں کیا فرق ہے؟‘‘

’’بہت فرق ہے۔ ندامت کہتی ہے کہ میں نے غلطی کی ہے اور مجھے آئندہ نہیں کرنی۔ جبکہ شرمساری کہتی ہے کہ میں خود ایک غلطی ہوں، ایک ناکامی، ایک بربادی۔ ندامت اچھی چیز ہے، پتری تاشہ۔ مگر شرمساری تو جان لے لیتی ہے۔‘‘

وہ بس ملکہ کا چہرہ دیکھے گئی۔ وہ کم عمر تھی، مگر جب نخوت اور بغض کے پردے دونوں کے درمیان سے چھٹے تو اندر سے ایک مخلص عورت نکل کے سامنے آئی تھی۔

’’میں اپنی غلطی پہ نادم ہوں، یا شرمسار، مجھے کیسے علم ہوگا؟‘‘

’’اگر تم اپنے آپ کو ناپسند کرنے لگی ہو تو تم شرمسار ہو اور یہ مہلک رویّہ ہے۔ میں شاہ چین کی دختر ہوں‘ میں نے اعلا پائے کے اساتذہ سے تربیت حاصل کی ہے۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ سکھایا ہے کہ اپنی غلطیوں پہ ندامت اچھی چیز ہے‘ مگر شرمساری اور خود سے مایوسی انسان کو اس کی اپنی نظروں میں گرا دیتی ہے۔ اگر تم اپنی عزت نہیں کرو گی تو کبھی پُراعتماد اور

آزاد انسان نہیں بن سکتیں۔“

”میں نے کسی کا اعتبار توڑا ہے۔ اب میں اپنی عزت کیسے کروں؟“

”ہوں۔“ ملکہ نے لمحے بھر کو سوچا۔ ”اپنی غلطی کو چھوٹا نہ سمجھو مگر پھر یہ بھی تو دیکھو کہ تم اس کو درست کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہو۔ یہ کام بے حد صبر اور عزم و ہمت والا ہے۔ تمہیں اس جدو جہد پہ اپنی عزت کرنی چاہیے۔“

تالیہ جبراً مسکرائی اور سر اثبات میں ہلایا۔ ”میں کوشش کروں گی۔“

”کیا تم محبت کرتی ہو اس سے؟“ وہ نرمی سے سوال کر رہی تھی۔

”محبت؟“ وہ زخمی سا مسکرائی۔ ”پتا نہیں مگر یوں لگتا ہے جیسے ہم نے کئی زمانوں کا سفر ایک ساتھ کیا ہے۔ اس کے لیے جان دے بھی سکتی ہوں‘ اور لے بھی سکتی ہوں۔ میں اس سے ناراض ہوں مگر اس کے ساتھ وفادار ہوں۔ سچ پوچھیں تو دل سے صرف اسی کو ”توانکو“ بولتی ہوں۔ سلطان مرسل کو بھی اس دل سے ”آقا“ نہیں کہتی۔ یہ محبت تو نہیں ہوتی شاید۔“

ملکہ ہنس دی پھر محظوظ انداز میں اسے دیکھا۔

”یہ محبت نہیں ہوتی تو اور کیا ہوتی ہے؟“

”شاید پرستار ہونا اسی کو کہتے ہیں۔“

”یہ پرستار کیا ہوتا ہے؟“ ملکہ کے لیے یہ لفظ نیا تھا‘ یا شاید اصطلاح۔

”آپ نہیں سمجھیں گی۔ یہ ہمارے شہر کے روگ ہیں۔ ہمارے زمانے والوں کو لگتے ہیں۔“ اور دل میں دہرایا۔ (تالیہ دی فین گرل۔)

”تم اچھی باتیں کرتی ہو تاشہ! میرا نہیں خیال کہ تمہارے یہ شہر چھوڑ جانے سے میں خوش ہوں گی۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ اتنی جلدی میں اور تم اتنے قریب کیسے آ گئے۔“

تالیہ ہنس دی۔ کھلکھلا کے۔ بہت دل سے۔

”دنیا میں کوئی تعلق اتنا مخلص اور گہرا نہیں ہوتا جتنا ان دو عورتوں کا ہوتا ہے جن کا دشمن ایک ہی مرد ہو۔“

ملکہ بھی ہنس دی اور دلچسپی سے آگے ہوئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”میں تمہاری واپس جانے میں مدد کروں گی۔ تم میرے شوہر کو بنداہارا کے تسلط سے نکالنے کے لیے کیا کر سکتی ہو؟“

”ہمیں سلطان کا دل راجہ کی طرف سے کھٹا کرنا ہو گا۔ سلطان کا جس دن راجہ پر سے اعتبار ٹوٹا‘ اس دن راجہ کمزور ہو جائے گا۔ دوسرا....“ وہ آگے ہوئی اور آواز دھیمی کی۔ ”ہمیں راجہ کی دولت کا سراغ لگانا ہو گا۔ میری اطلاع کے مطابق راجہ اپنی دولت کہیں بھیج رہا ہے۔ اگر ہم اس دولت کو حاصل کر لیں تو راجہ کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ وہ میری اور آپ کی ہر بات ماننے پہ مجبور ہو گا۔ راجہ کی تیسری طاقت اس کے رئیس دوست ہیں۔ ہمیں ان رئیسوں کو خوش کرنا اور اعتماد میں لے کر اپنے ساتھ ملانا ہو گا۔ ہمارے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ ایسا ہونا چاہیے جو راجہ کے پاس بھی نہ ہو۔ وہ ہمارے ساتھ آ ملیں تو راجہ تنہا رہ جائے گا۔“

”تم نفرت کرتی ہو راجہ سے؟“

”نہیں۔ میں ان کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کرتی، ملکہ! نہ وہ میری کمزوری ہیں‘ نہ طاقت۔ اور یہی میری سب سے بڑی طاقت ہے۔“ وہ رسان سے مسکرا کے بولی تو ملکہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

دنیا میں واقعی ایسا دوسرا کوئی تعلق نہ تھا۔

دو عورتیں ایک ہی مرد کے خلاف۔

الامان۔

☆☆☆

”جیا“ کے نیم تاریک ہال میں موم بتیوں نے زرد پرفسوں روشنی پھیلا رکھی تھی۔ مہمان مختلف کرسیوں پہ بیٹھے خوش گپیوں کے دوران چائے پی رہے تھے۔ وہاں صرف چائے نہیں بلکہ کھانا بھی دیا جاتا تھا جو خالص چینی ذائقے اور چیزوں پہ مبنی ہوتا تھا۔

فاتح سست روی سے قہوے سے بھری چینک اٹھائے ایک میز تک آیا جہاں دو اور —— نوجوان بیٹھے تھے۔ ایک سن رہا تھا اور دوسرا نم آنکھیں پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اور اس دن وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی۔ میرے خط واپس آنے لگے۔ ایک ہندوستانی تاجر اس کے گھر کے چکر لگانے لگا اور پھر....“ وہ اشکبار سا اپنے ناکام عشق کی داستان سنا رہا تھا۔ فاتح نے سپاٹ انداز میں چائے اس کی پیالی میں انڈیلی اور چینک میز پہ رکھی۔

”اتنی چائے نہیں منگوائی ہم نے۔ صرف ایک پیالی منگوائی تھی۔“ غم سننے والا ساتھی بگڑ کے بولا تو فاتح چونکا۔ لبالب بھری چینک کو دیکھا اور گہری سانس لی۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔ میرا دھیان کہیں اور تھا۔ غلطی سے پوری کیتلی بنا دی۔“ ناکام عاشق رومال سے ناک پونچھ رہا تھا جبکہ اس کا دوست خفگی سے فاتح کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ یہ چائے پی لیں۔ ہم اس کے پیسے نہیں لیں گے۔ یہ لیجیے، آپ بھی پی لیجیے۔“ اس نے ایک خالی پیالی دوست کے سامنے رکھی۔ دوست نے حیرت سے ابرو اٹھائے۔

”واقعی؟ یہ مفت ہے؟“

”جی، یہ جن خاص پھولوں کی چائے ہے، اس کی طلب ”جیا“ کے کسی دوسرے مہمان کو نہیں۔ اس لیے یہ کوئی اور نہیں پیے گا۔ آپ پی لیجیے۔“ متانت سے کہتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے لڑکے نے جلدی سے چائے پیالی میں انڈیلی اور پھر گھونٹ گھونٹ بھرتے ہوئے دلچسپی سے اپنے دوست کی داستان سننے لگا۔

”وہ گئی ہے تو لگتا ہے جسم کا کوئی حصہ کاٹ دیا گیا ہے۔ میں بے کار ہو گیا ہوں۔ دل چاہتا ہے ساری ساری رات اسی قہوہ خانے میں بیٹھا اسے یاد کرتا رہوں۔ اس کے بارے میں نظمیں لکھتا رہوں۔“ فاتح واپس جا رہا تھا تب ناکام عاشق کی آواز کانوں میں پڑی۔ لمحے بھر کو وہ ٹھٹکا، پھر آگے بڑھ گیا۔

آستینیں پیچھے چڑھاتے ہوئے وہ باورچی خانے میں آیا تو نگران باورچی نے بگڑ کے اسے دیکھا۔

”تمہارا دھیان کہاں ہوتا ہے‘ فاتح؟ تم نے پوری چینک ضائع کر دی۔“

”چند پتے اور زیادہ پانی ہی تو لگا ہے۔ ویسے بھی جیا کا کاروبار مندا جا رہا ہے۔ روز کھانا بچ جاتا ہے اور ضائع کرنا پڑتا ہے۔ اچھا ہے وہ پی لیں گے۔ دل بڑا رکھا کرو۔“ بے نیازی سے کہہ کے وہ دوسرا طشت اٹھائے باہر آ گیا۔ پیچھے دونوں باورچی اس کے بارے میں کچھ بول رہے تھے۔ اس نے پرواہ نہیں کی۔

وہ دونوں کنوارے ابھی تک بیٹھے تھے۔ عاشق داستانِ غم سنائے جا رہا تھا اور دوست تسلی سے سن رہا تھا۔ چینک آدھی ہو چکی تھی۔ پیالیاں بار بار بھری جا رہی تھیں۔ چینی کی چینک، اور قہوہ کی دھار انڈیلنے کی آواز......وہ کھڑا اس سارے منظر نامے کو دیکھ رہا تھا اور ایک اچھوتا خیال اس کے ذہن میں جڑ پکڑنے لگا تھا۔

”وہ ہر کھڑکی، ہر دروازے میں نظر آتی ہے۔ آسمان کے ہر تارے میں اس کا عکس ہے۔ ہر پھول میں اس کی خوشبو ہے۔“ رومال سے آنکھیں رگڑتا عاشق اب رک کے پیالی سے گھونٹ بھرنے لگا تھا۔

وان فاتح ہلکا سا مسکرایا۔

☆☆☆

سلطان مرسل شاہ کا دربار اس شام تنہا اور ویران پڑا تھا۔ عصر ڈوبنے لگی تو ساری موم بتیاں‘ مشعلیں اور دیے جلا دیے گئے۔ طویل دربار روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ مرسل شاہ اپنے تخت پہ بیٹھا‘ سامنے میز پہ رکھی پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔ ابرو ستائش سے اٹھے تھے‘ اور بار بار وہ ’واہ‘ واہ‘ کہہ اٹھتا۔

دربان نے دروازہ کھولا اور تالیہ اندر داخل ہوئی تو دروازہ بند کر دیا گیا۔ دور سیدھ میں اونچے تخت پہ بیٹھے سلطان نے سر اٹھایا اور مسکرا کے اسے دیکھا۔

”آئیے‘ پتری تاشہ!“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تالیہ نے ادب سے سر جھکا کے ”آقا“ کہا اور ریشمی لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے قدم قدم آگے آئی۔ چبوتر کے زینے چڑھی اور تخت کے ساتھ ایک مخملیں اسٹول پہ بیٹھی۔ پھر گھونگھریالی لٹیں انگلی سے کندھے کے پیچھے کیں اور سادگی سے مسکرا کے سلطان کا چہرہ دیکھا۔

''کیا آقا کو میرا کام پسند آیا؟''

''کام؟ یہ تو کوئی معجزہ ہے جیسے۔'' وہ سر دھن رہا تھا۔ سر پہ ہیرے، جواہرات سے مرصع ٹوپی پہنے' اور کندھوں پہ زرتار سنہری قبا اوڑھے' وہ اپنا انگوٹھیوں والا ہاتھ تعریفی انداز میں بلند کیے ہوئے تھا۔

''یوں لگتا ہے جیسے ملکہ کو اس تصویر میں قید کر دیا گیا ہو۔''

''ملکہ کا یہ مقام نہیں کہ ان کو قید کیا جائے۔ ہم تو صرف ان کے عکس کو قید کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔''

مرسل نے گردن موڑ کے مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا۔ ''یہ فن کہاں سے سیکھا آپ نے؟''

''یہ آزاد انسان کی ہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ پنچھی کی طرح ہر ملک کی فضا میں اڑتا پھرتا ہے۔ اور بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔ مجھے فضائیں پسند ہیں آقا۔ محل کے اونچے گنبد نہیں' جو قید کر لیتے ہیں۔''

مرسل نے گال تلے تین انگلیاں رکھیں اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

''تو کیا ہم سب قید ہیں؟''

''اتنے آزاد بھی نہیں ہیں۔ مگر آپ کی بھی مجبوری ہے۔'' وہ سرخ آنسو والی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتے ہوئے سادگی سے بولی۔ ''بنداہارا کی ہر بات آپ کو ماننی پڑتی ہے۔''

''راجہ مراد کے احسان ہیں مجھ پہ۔ اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔''

''تو کیا وہ سب احسان میں کیا تھا انہوں نے؟'' تالیہ کی آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھیلیں۔ ''میں تو سمجھی..... آقا کی محبت اور وفاداری میں کیا تھا۔''

مرسل یکدم گم صم ہو گیا۔ جیسے چونک گیا ہو۔ پھر تالیہ نے کندھے اچکائے۔

''مگر میں ٹھہری آقا کی ایک ادنیٰ کنیز..... مجھے ان باتوں کی کیا سمجھ یقیناً آقا بہتر جانتے ہوں گے۔''

وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا۔ کسی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا آیا۔ دربار کی موم بتیوں کے شعلے ہلکے سے پھڑ پھڑائے۔

''میں آپ کو اپنے حرم میں داخل کرنے جا رہا ہوں، پتری تاشہ!''

وہ جو اپنی دانست میں دانائی سے چوٹ کر کے اٹھنے لگی تھی' لمحے بھر کو پتھر ہو گئی۔ چونک کے اسے دیکھا۔

''جی؟''

''درجہ اول کی ''خاتون'' بنا کر میں آپ کو.... اپنے حرم میں.... شامل کرنے جا رہا ہوں' شہزادی۔'' وہ خوش گوار انداز میں بتا رہا تھا اور اس کی رنگت پیلی پڑنے لگی تھی۔

''ویسے بھی سلطان کی بیوی اور خاتون اول کا انتظام اور شادی کے معاملات طے کرنے کا اختیار ایک شخص کو ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے ملاکہ سلطنت کا بنداہارا اور مجھے یقین ہے راجہ مراد کو اس بندھن پہ اعتراض نہیں ہوگا۔''

وہ بہت اطمینان اور خوشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ ''آپ کو میرے حرم میں ہونا چاہیے۔ میرے ساتھ۔ میرے ہر فیصلے میں۔ میں ایک طاقتور اور آزاد سلطان بننا چاہتا ہوں شہزادی' مجھے یقین ہے آپ میری مدد کریں گی۔''

سلطان پُراعتماد تھا۔ تخت پہ بیٹھ کے، تاج پہن کے مرد پُراعتماد ہو ہی جاتے ہیں۔ انکار کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔

تالیہ پھیکا سا مسکرائی پھر ذرا کھنکھاری۔ ''میری طبیعت آج کچھ ناساز ہے۔ ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے آقا۔ پھر حاضر ہوں گی۔'' اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سر جھکا کے تعظیم پیش کی۔ مسکراہٹ برقرار تھی۔

مرسل نے سر کو خم دیا اور اسے اجازت دی۔

وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتی گئی' اور پھر مڑی۔ جیسے ہی پلٹی' تاثرات بدلے۔ چہرے پہ غصہ در آیا۔ کان سرخ ہوئے۔ وہ طویل دربار میں تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ تنفس مارے جذبات کے تیز ہوتا جا رہا تھا۔

''واہ.... آفرین.....'' مرسل اب پھر سے بے حد دلچسپی سے اس پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

فجر کی اذان قدیم ملاکہ کی کسی مسجد سے گونجتی گرد و نواح میں پھیل رہی تھی۔ سن باؤ کے صحن میں تاروں بھرا آسمان نظر آ رہا تھا۔ برآمدے میں آرام کرسی پہ وہ سو رہا تھا۔ اوپر کمبل تھا جیسے کسی نے بعد میں ڈالا ہو۔ میز پہ رکھا دیا بجھا ہوا تھا اور ایک کتاب آدھی کھلی پڑی تھی۔

اذان کی آواز پہ وانگ لی کی آنکھ کھلی۔ ذرا سا کسمسایا اور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ پھر چونک کے اپنے اوپر پڑا کمبل دیکھا۔ ادھر ادھر گردن گھمائی۔

''فاتح۔'' آواز دی۔

وہ صحن کے کونے میں گھڑے کے پانی سے جھک کے وضو کر رہا تھا۔ چہرہ اور بازو گیلے تھے۔ پاؤں اب دھو رہا تھا۔ آواز پہ آخری دفعہ پانی بہایا اور ''جی مالک'' کہتا ہوا گھڑا رکھ کے اس طرف گھوما۔ پھر قدم قدم چلتا برآمدے تک آیا۔ تاریک برآمدے میں تاروں بھرے آسمان تلے کھڑا غلام جس کے ہاتھ منہ گیلے تھے' بہت سادگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وانگ لی نے گہری سانس لی۔

''تم کیا مجھ سے خفا ہو' فاتح۔''

وہ ہلکا سا مسکرایا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''میں زیادہ دیر خفا نہیں رہتا مالک اور آپ کی کوئی غلطی نہیں۔ میری توقعات غلط تھیں۔''

پھولے گالوں والے وانگ لی کے معصوم صورت چہرے پہ اداسی گھل گئی۔ ''شاید میں اتنا عظیم نہ تھا جتنا تم مجھے سمجھتے تھے۔''

اس کی آواز کی اداسی صحن کی سرخ اینٹوں سے ٹکرا کے درختوں کے شاخوں سے لپٹنے لگی۔

''نہیں' مالک۔ آپ صرف مختلف تھے۔ ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر کوئی خاص ہوتا ہے۔ ہم جب خود کو نہیں بدل سکتے تو دوسروں کو کیسے بدل سکتے ہیں۔ ہمیں صرف دوسروں کو قبول کرنا ہوتا ہے۔''

''تو تم نے مجھے قبول کر لیا ہے؟''

''قبول کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کو آپ کی خامیوں کا احساس نہ دلاؤں۔ اصلاح کی ضرورت ہر انسان کو ہر وقت ہوتی ہے۔'' وہ اب گیلی آستینیں واپس موڑ رہا تھا۔ سینے پہ کمبل ڈالے بیٹھے وانگ لی نے تکان سے گہری سانس لی۔

''میں جانتا ہوں۔ تمہارے نزدیک میری خامی یہ ہے کہ میں غلاموں کے حقوق کے لیے نہیں لڑتا۔''

''نہیں۔ آپ کی خامی یہ ہے کہ آپ فضول خرچ ہیں۔''

وانگ لی کو اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''غلاموں کو بھول جائیے۔ اپنی فکر کیجیے۔ آپ نے ایک غلام کی ہزاروں دینار میں بولی لگائی۔ کیا ضرورت تھی اس کی جب کہ آپ اتنے امیر نہیں ہیں۔ 'جیا' مسلسل نقصان میں جا رہا ہے۔ آپ کو اپنے کاروبار کو واپس اس کے پیروں پہ کھڑا کرنا ہوگا۔''

''میرے بہت سے کاروبار ہیں مگر ہاں.... میں جیا کے لیے فکر مند رہتا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے ہولے ہولے کرسی پہ جھولنے لگا۔ رات کی مقدس خاموشی میں ہلکی ہلکی آواز پیدا ہوئی۔

''میرے پاس ایک طریقہ ہے جیا کو اپنے قدموں پہ کھڑا کرنے کا۔ اگر آپ کو مجھ پہ ذرا سا بھی بھروسہ ہے تو اس پہ عمل کر کے دیکھیے۔'' وہ آگے آیا اور احتیاط سے وانگ لی کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کے قدموں کے قریب بیٹھا۔ جیسے غلام بیٹھتے ہیں مگر گردن اور نگاہیں اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں نہیں جھکاتا تھا۔

''کیا؟''

''ہم منادی کرا دیتے ہیں کہ جیا میں کنوارے مردوں کو کھانا اور چائے مفت ملے گی۔''

''ایں؟'' وانگ لی ہڑبڑا کے سیدھا ہوا۔ ''ہم کیوں کسی کو مفت کھانا دیں؟''

''روز اتنا کھانا ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ لوگ دوسرے دونوں چائے خانوں کا رخ کر لیتے ہیں۔ جیا سنسان ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ دوسری دکانوں میں اس لیے جاتے ہیں کیونکہ وہ بھری ہوتی ہیں۔ انسان بھیڑ چال کا رسیا ہے۔ وہ دوسروں کی پیروی کرتا ہے۔

دکان میں ہجوم دیکھ کے سب کو اشتیاق ہوتا ہے کہ وہاں جانا چاہیے۔ ہم بھی ایسا ہجوم اکٹھا کر سکتے ہیں۔’’

‘‘مفت کھانے کے لالچ میں تو سارے شہر کے مرد آجائیں گے‘ فاتح۔ یہ تو سراسر نقصان ہے۔’’ وہ متذبذب تھا۔

‘‘مگر ہجوم تو لگے گا نا اور ان کی دیکھا دیکھی شادی شدہ مرد، عورتیں سب آئیں گے اور پیسے دیں گے۔ ویسے بھی کنوارے زیادہ تر ناکام عاشق ہوتے ہیں۔ چائے پہ خوش ہوتے ہیں۔ گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ اتنا زیادہ نہیں کھا سکتے وہ۔’’ وہ اس کے گھٹنوں کے پاس بیٹھا آہستہ آہستہ بتا رہا تھا۔

وانگ لی توجہ سے سن رہا تھا۔ اسے یہ خیال بھلا معلوم ہونے لگا تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ سب سے زیادہ کنوارے مرد جس ایک طبقے میں ہوتے ہیں‘ وہ غلاموں کا طبقہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

دوپہر چمکیلی تھی اور آسمان بالکل صاف تھا۔

‘‘جیا’’ چائے خانے کے اندر ہجوم تھا۔ باہر سبزے پہ کچھ لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اندر میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ایسے میں دو چغہ پوش چوکھٹ سے اندر داخل ہوئے تو مرکزی ہال میں کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور خوش گپیوں کی آوازیں مل کر شور کی صورت بلند ہو رہی تھیں۔ غرض ’جیا‘ میں رونق لگی تھی۔

ایک چغہ پوش نے دوسرے سے سرگوشی کی۔

‘‘یہاں اتنا رش کیوں ہے‘ ایڈم؟’’

دوسرا قریب کھسکا اور بولا۔ ‘‘کیونکہ اس چائے خانے کے مالک نے تمام کنوارے مردوں کے لیے کھانا اور چائے مفت کر دی ہے، چے تالیہ۔ تین دن میں اس چائے خانے کی رونق بحال ہو گئی ہے۔’’

‘‘تو ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟’’

‘‘کیونکہ میں کنوارہ ہوں اور آپ کی مہربانی سے جو میری شادی ہونے والی تھی، وہ وقت کی قید کے باعث نہیں ہو پائے گی۔ اس لیے مجھے اب یہاں سے مفت دال روٹی توڑنے دیجیے، شہزادی۔’’

‘‘ارے واہ۔ میں نے کیا کیا تھا؟ تمہیں ہی شوق تھا میرے خزانے کے ایڈونچر کو خراب کرنے کا۔’’ وہ اس کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہوئی کہے جا رہی تھی۔ گول زینے اوپر جاتے تھے اور وہاں ایک چھوٹا ہال بنا تھا۔ ‘‘تمہیں اور مجھے وہ خزانہ ڈھونڈنا تھا‘ اور تم نے کیا کیا‘ ہاں؟’’

‘‘میں نے کیا کیا؟’’ وہ اوپر آئے اور آگے پیچھے ایک میز کی طرف بڑھے۔

‘‘تم نے جا کر چابی اور سکہ وان فاتح کو دے دیا اور انہوں نے وہ دروازہ کھول دیا۔ تم اپنی وجہ سے کنوارے ہو‘ اچھا۔’’ اس نے ایک کرسی کھینچی اور اسے دبی آواز میں جھڑکتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ‘‘تمہارا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ جو بات میرے اور تمہارے درمیان تھی‘ تم اس میں وان فاتح کو لے آئے۔ تم ہر دفعہ ان کو بیچ میں لے آتے ہو۔’’

میز پہ ہلکا سا ہاتھ مارا اور بات مکمل کر کے چہرہ موڑا تو.... میز کے اس طرف کرسی پہ وہ بیٹھا تھا۔

تالیہ کا سانس تھم گیا۔

سفید کرتے پاجامے میں ملبوس‘ ٹیک لگائے‘ گہری سپاٹ نظروں سے تالیہ کو دیکھتا ہوا۔

تالیہ نے فوراً ایڈم کو دیکھا جو تیسری کرسی کھینچ کے بیٹھ رہا تھا۔

‘‘یہ یہاں کیسے؟ یہ تو سن باؤ کے گھر....’’ پھر چونک کے اطراف میں دیکھا۔ دیواروں پہ سرخ رنگ کی سجاوٹ.... چینی زبان میں لکھے بینرز۔ اس نے گہری سانس کھینچی اور خفگی سے ایڈم کو دیکھا۔

‘‘تو یہ چائے خانہ سن باؤ کا ہے۔’’ ساتھ ہی خفگی سے رخ ذرا موڑ لیا۔ ٹوپی سر پہ تھی مگر اس کے ہالے میں دمکتا چہرہ اور تمتماتے گلابی ہوتے گال صاف دکھائی دے رہے تھے۔

‘‘میں چاہتا تھا ہم تینوں مل کے، بیٹھ کے باتیں کر لیں اور مستقبل کا....’’ ایڈم نے قدرے نرمی سے بات سنبھالنی چاہی مگر....

‘‘اسے میں نے کہا تھا تمہیں یہاں بلانے کو۔’’ وہ سنجیدگی سے ہاتھ میز پہ رکھتے سامنے کو جھکا۔ تالیہ نے خفا خفا سا چہرہ اس کی طرف موڑا۔

‘‘اور آپ ایک بددیانت‘ جھوٹی لڑکی سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ اس سچے‘ اور عظیم نئے دوست کے پاس کیوں نہیں بیٹھتے جس کے لیے آپ نے ہمیں چھوڑا تھا۔’’

‘‘میں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ تم نے ایک غلطی کی، اور تم اس کو جسٹی فائی نہیں کر سکتیں۔ جہاں تک وانگ لی کا تعلق ہے تو میں اس سے جن کاموں کی توقع کر رہا تھا‘ وہ اس کے بس کی بات نہیں۔ اب اگر تم ہماری ذاتی رنجشوں کو پسِ پشت ڈال دو تو ہم کام کی بات کر لیں۔’’ وہ غصے میں نہیں تھا۔ وہ بس دوٹوک‘ بے تاثر سا کہہ رہا تھا۔ تالیہ نے رک کے اسے دیکھا۔

اس کے بال چھوٹے تھے۔ قلموں سے کچھ سفید بھی تھے۔ شیو تازہ بنا رکھی تھی اور چہرہ پہلے سے تروتازہ لگتا تھا۔ بالآخر اسے ملاکہ کا پانی راس آ گیا تھا البتہ اس کی آنکھوں کی سنجیدگی اور فکرمندی پہلے سے مختلف تھی۔ نہ جانے کیوں وہ نرم پڑنے لگی۔

‘‘کہیے‘ تو ان کو۔ میں سن رہی ہوں۔’’ خفگی ختم نہیں کی‘ مگر کم کر دی۔ ایڈم نے سکون کا سانس لیا۔ تالیہ اور فاتح آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ایڈم ان کے ایک طرف۔ تکون صورت وہ میز پہ جھکے تھے۔ اردگرد میزوں پہ چند لوگ کھانے اور خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ کوئی ان کی طرف خاص متوجہ نہ تھا۔

‘‘ہمیں جلد از جلد وہ چابی ڈھونڈ کے اس جگہ سے نکلنا ہے تاکہ آپ لوگ اپنے اپنے کام کریں اور میری شادی ہو سکے۔’’ وہ عرصے بعد اتنا مغموم اور بے چین نظر آ رہا تھا۔ جیا کے سارے کنوارے مردوں کو دیکھ کے اس کے پرانے زخم جاگ گئے تھے۔

‘‘ایڈم کا کہنا ہے کہ راجہ مراد اپنی دولت کو کہیں منتقل کر رہا ہے۔’’ فاتح نے سنجیدگی سے تالیہ کو مخاطب کیا۔

‘‘لگتا تو یہی ہے مگر کہاں، ہم نہیں جانتے۔’’ اس کا انداز ہنوز لیا دیا سا تھا۔

‘‘اور یہ دولت آ کہاں سے رہی ہے؟ راجہ کا کوئی کاروبار‘ کوئی جائیداد نہیں ہے۔ جب اس کو محل سے نکالا گیا تھا پچھلے سلطان کے عہد میں تو وہ کنگال تھا۔ تب ہی تو الور سونگائی کے ایک خستہ حال مکان میں جا بسا تھا۔ مجھے یہ سب وانگ لی نے بتایا ہے۔’’

‘‘یہ دولت ان کو ابوالخیر کی طرف سے ملتی ہے۔ مگر وہ اسے کہیں اور منتقل کیوں کر رہے ہیں، یہ میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔’’

فاتح نے کہنیاں میز پہ ٹکائیں اور اس کو غور سے دیکھا۔ ‘‘تم ہی تو کہتی ہو کہ فضا میں شامل Cesium (سیسم) کے علاوہ کوئی شے مختلف نہیں ہے ہماری اور ان کی دنیا میں۔’’

‘‘تو؟’’ (ایڈم احتجاج کرنے لگا مگر کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ ‘‘یہ میری لائن تھی۔’’)

‘‘تو ہماری دنیا میں بھی تو یہ کام ہوتے ہیں۔ اس کو منی لانڈرنگ کہتے ہیں۔’’

‘‘منی لانڈرنگ! اوہ۔’’ اس نے کراہ کے آنکھیں بند کیں۔

‘‘چے تالیہ تو ماشاءاللہ لوٹنے اور چوری چکاری کی فیلڈ سے تعلق رکھتی ہیں‘ اس لیے ان کا علم لامحدود ہو گا مگر سچی بات ہے کہ میں ابھی تک ٹھیک سے نہیں جانتا کہ منی لانڈرنگ کیا ہوتی ہے۔’’

‘‘کیوں؟ تم نے کبھی اس موضوع پہ کوئی کتاب نہیں پڑھی کیا؟’’ وہ چمک کے بولی۔ جواب میں ایڈم نے منہ بنایا تھا۔

‘‘پیسے کو ملک سے چوری چھپے نکال کے آف شور میں محفوظ کرنا منی لانڈرنگ ہوتا ہے۔’’

‘‘دیٹس اِٹ۔ آف شور!’’ تالیہ نے ایک دم میز پہ ہاتھ مارا تو وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔

‘‘آف شور کا کیا مطلب ہے بھلا؟’’ وہ دبی آواز میں چمکتی آنکھوں سے گویا ہوئی۔ ‘‘ساحل سے دور.... سمندر کی طرف کسی شے کو رکھنا۔ سمندر کے اندر جزیروں میں چھپانا۔’’

’’ہاں تو؟‘‘

’’تو ہوسکتا ہے اس قدیم زمانے میں بھی ایسے ہی کیا جاتا ہو۔ خزانوں کو صندوقوں میں بھر کے کسی ایسے جزیرے پہ لے جایا جاتا ہو جہاں کوئی اس دولت کے بارے میں سوال نہیں کرسکتا۔ اس چھوٹے خالی صندوق میں ریت کے ذرے پھنسے تھے۔ اسے ساحل پہ گھسیٹا گیا تھا۔ وہ نم تھا۔ اسے کشتی میں لاد کے لے جایا گیا تھا۔ راجہ مراد اس دن کشتی تیار کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ دیٹس اِٹ۔‘‘ وہ ناراضی بھلائے جوش سے کہہ رہی تھی۔ ’’راجہ وہ سب ایک جزیرے پہ بھیجتا ہے۔‘‘

’’مگر ملایا میں سینکڑوں جزیرے ہیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ وہ کون سا جزیرہ ہے، چے تالیہ۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے۔‘‘ وہ چہکی۔ ’’ملکہ یان سوفو نے ایک Haunted (آسیبی) جزیرے کا ذکر کیا ہے جہاں سے کوئی پلٹ کے نہیں آتا۔ تین چاند والا جزیرہ۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ یقیناً وہیں کچھ چھپا ہے۔‘‘

’’جہاں ملتے ہیں تین چاند۔‘‘ ایڈم بڑبڑایا۔ ’’میں نے کتب خانے کی کتابوں میں اس کے بارے میں پڑھا ہے۔ وہ آسیب زدہ ہے اور وہاں سارے جہاز ڈوب جاتے ہیں اس لیے وہاں کوئی نہیں جاتا۔‘‘

’’شاید یہ صرف باتیں ہوں۔ عام لوگوں کو اس سے دور رکھنے کے لیے۔‘‘ وہ پُرجوش سی باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھتی، کہہ رہی تھی۔ ’’مجھے معلوم ہے اب مجھے کیا کرنا ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘ فاتح نے ٹیک لگالی اور غور سے اسے دیکھا۔ تالیہ نے جواب میں بے نیازی سے نظریں اس کی طرف موڑیں۔

’’میں یہ بتانے کی پابند نہیں ہوں، تو انکو۔‘‘

’’اور وہ کیوں؟‘‘ اس کے ماتھے پہ بل پڑے۔

وہ اٹھی، میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کے جھکی، اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ’’کیونکہ میرا الوژن ٹوٹ چکا ہے کیونکہ میں اب.... کسی کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جب انسان اپنے آپ کو عزت دینے لگ جائے تو اسے کسی اپروول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں آزاد ہوچکی ہوں۔ میں نے خود سے وعدہ کیا ہے کہ اب اچھے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولوں گی، دھوکا نہیں دوں گی، اور میں اس وعدے کے لیے صرف اپنے آپ کو جواب دہ ہوں، کسی دوسرے انسان کو نہیں۔ ’’تالیہ دی فین گرل‘‘ کے ایل میں رہ گئی ہے، تو انکو.... اور جو یہاں ہے، وہ آپ کی عزت کرتی ہے، مگر وہ ’ذہنی غلام‘ نہیں ہے۔ کسی کے فین ہونے کا مطلب اپنی رائے کو اس کی رائے کا غلام بنا دینا نہیں ہے۔ بعض اوقات ہم پرستار اپنی محبوب شخصیات سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔‘‘

اس نے جھٹکا، سیدھی ہوئی اور ایک جتاتی نظر اس پہ ڈالتی مڑ گئی۔ آخری بات پہ فاتح نے چونک کے ایڈم کو دیکھا جس نے خجالت سے سر کھجایا تھا۔

’’مجھے ہر بات شہزادی کو بتانی پڑتی ہے، ورنہ وہ میرا دایاں ہاتھ کٹوا سکتی ہیں۔ دایاں!‘‘

تالیہ اب دھپ دھپ زینے اتر رہی تھی۔ فاتح نے جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے پیچھے ہو کے بیٹھا۔

’’چلو اچھا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اب وہ جھوٹ نہیں بولے گی۔‘‘ اس نے تالیہ کی بات کا اثر زائل کرنا چاہا۔

’’انہوں نے کہا ہے کہ اچھے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولیں گی۔ اب یہ تو چے تالیہ ہی بتا سکتی ہیں کہ اچھے لوگوں میں ہم شامل ہیں یا نہیں۔ ان کا ویسے بھی کچھ نہیں پتا۔ کل کو کہہ دیں ساری دنیا میں کوئی اچھا نہیں ہے۔‘‘

فاتح نے گردن موڑ کے کام کرتے بیروں کو دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’تم اپنا کام کرو اور چوکنے رہو۔ کل ملتے ہیں۔ باورچی اوپر آنے والا ہوگا۔‘‘ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

’’سر!‘‘ وہ کھڑا ہوا اور قدرے سنجیدگی سے پکارا۔ وہ جاتے جاتے رکا اور پلٹ کے اسے دیکھا۔

’’کوئی بات ہے؟‘‘

’’چے تالیہ نے مجھے بتایا ہے کہ سلطان مرسل.... ان کو.... (تھوک نگلا) اپنے حرم میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جلد ہی وہ راجہ سے بات کرنے والے ہیں۔‘‘ اس نے نظریں جھکا لیں۔ ’’میں چاہتا تھا کہ آپ کو علم ہو کہ آگے کیا ہونے جا رہا ہے۔ انہوں نے مجھے آپ کو بتانے سے منع کیا تھا۔‘‘

فاتح بن رامزل کے کان سرخ پڑے۔ پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

’’ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ سنا تم نے؟ اپنی شہزادی سے کہو، سلطان سے دور رہے۔‘‘ وہ ایک دم اتنے غصے سے بولا کہ خود بھی ٹھٹک گیا۔ ایڈم نے نظر اٹھا کے خاموشی سے اسے دیکھا اور سر کو خم دیا۔

’’وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔ وہ ملاکہ کی شہزادی ہیں۔ میں یا آپ یہ بات ان سے کس حیثیت سے کہہ سکتے ہیں، سر؟‘‘ یہ سوال نہیں تھا۔ تبصرہ تھا۔ کہہ کے وہ رکا نہیں۔ چغے کی ٹوپی درست کی اور مڑ گیا۔

فاتح مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا۔ اسے کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔ سخت ناگوار۔ بے بسی کا عجیب احساس۔

☆☆☆

راجہ مراد کی خواب گاہ کے اندر قندیلیں جل رہی تھیں۔ سارے میں زرد روشنی پھیلی تھی۔ راجہ میز پہ جھکا بیٹھا ایک ننھے ہتھوڑے سے لکڑی کے ٹکڑوں میں میخیں ٹھونک رہا تھا۔ ماتھے پہ سرخ پٹی بندھی تھی اور بال پونی میں جکڑے تھے۔ جسم پہ سیاہ کرتا پاجامہ تھا۔ یہ اس کے آرام کا وقت تھا۔

آہٹ ہوئی تو اس نے سر اٹھایا پھر مسکرایا۔ سامنے تالیہ کھڑی تھی۔ شہزادیوں والے لباس میں، تاج اور زیور پہنے، وہ سنگھار کیے مسکرا رہی تھی۔

’’آؤ تالیہ۔ بہت دیر لگائی آنے میں۔ سنا ہے آج کل تم شہر کی سیر کو نکلی رہتی ہو۔‘‘

’’مجھے بھیس بدل کے لوگوں کے حالات معلوم کرنا اچھا لگتا ہے۔‘‘ وہ مسکرا کے کہتی ہوئی قریب آئی اور میز کے کنارے رکی۔ راجہ کے ہاتھوں پہ نظر ڈالی تو ٹھٹکی۔ اس نے ننھی لکڑی کی کشتی پکڑ رکھی تھی۔ جس کو وہ مہارت سے جوڑ رہا تھا۔ چند اوزار اور لکڑی کے ٹکڑے سامنے پھیلے تھے۔

’’یہ شوق بھی رکھتے ہیں آپ؟‘‘

’’شکاربازوں کے شوق وسیع ہوتے ہیں۔ بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔‘‘

تالیہ ذرا سی چونکی مگر پھر سنبھل کے بیٹھ گئی۔ ذہن فوراً مرسل کی باتوں کی طرف گیا تھا۔ (کیا اس نے بابا سے بات کرلی؟ اوہ نو۔ اب وہ کیا کرے گی۔)

’’کہیے۔ کیا بات تھی؟‘‘ دھڑکتے دل سے پوچھا۔ کھوجتی نظریں راجہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔ وہ جھکا اور دراز سے کچھ نکال کے میز پہ رکھا۔ تالیہ دھک سے رہ گئی۔

وہ خالی بوتل تھی۔

راجہ نے کشتی میز پہ رکھی اور پیچھے ہو کے بیٹھا۔ ’’اس بوتل میں جو مشروب تھا، وہ تم نے پیا تھا...... تب جب تم نے چابی نکالی تھی، یاد ہے۔‘‘

’’جی، راجہ!‘‘ اس نے پھیکا سا مسکراتے سر کو خم دیا۔ ’’مجھے کیسے بھول سکتا ہے۔‘‘

’’یہی تو ساری بات ہے، تالیہ! تمہیں بھولنا بھی نہیں چاہیے تھا۔‘‘ وہ بھی مسکرایا۔ اس کی عقابی آنکھوں کی چمک اور اندر تک اترتی نظریں۔ تالیہ کا دل بری طرح دھڑکا۔

’’مطلب؟‘‘

’’وقت میں سفر کے لیے ایک قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس مشروب کو پینا پڑتا ہے۔ یہ چابی کو جوڑنے کے لمحے سے پہلے کی ساری یادداشت بھلا دیتا ہے۔ دروازہ کھولنے کے بعد جیسے ہی چابی ٹوٹے گی، تمہیں سب بھول جانا چاہیے تھا۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم بھول گئی ہوگی۔‘‘

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ کمرے کی خوابناک فضا میں کچھ غلط تھا، وہ محسوس کرسکتی تھی۔

’’مگر جس لمحے...... برسوں بعد تم نے چابی جوڑی...... تمہیں سب کچھ یاد آجانا چاہیے تھا۔ دروازہ کھول کے ’’واپس‘‘ آتے ہی تمہیں سب یاد آجانا

چاہیے تھا مگر تمہیں نہیں یاد آیا۔ سوائے چند بے ربط مناظر کے تمہیں کچھ یاد نہیں۔ تمہاری ماں تمہاری پیدائش کے وقت مرگئی تھی مگر تمہیں یہ بھی یاد نہیں۔‘‘ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

تالیہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ حلق سوکھ رہا تھا۔

’’میں اتنے دن سوچتا رہا کہ میرے جادو میں کوئی کمی رہ گئی تھی کیا؟ تالیہ کو ماضی کیوں یاد نہیں آیا اور پھر مجھے ایک خیال آیا۔‘‘ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو وہ بھی میکانکی انداز میں کھڑی ہوگئی۔ کسی معمول کی طرح۔

’’مجھے خیال آیا کہ ایسا تب ہوتا جب......‘‘ وہ آگے آیا، وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھ رہی تھی۔ مراد نے اس کو دونوں کہنیوں سے سختی سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ تالیہ کی آنکھیں بس اس پہ جمی تھیں۔

’’ایسا صرف تب ہوسکتا تھا...... جب یہ چابی ’تم‘ جوڑتیں۔ تم نے یہ چابی نہیں جوڑی۔ چابی کا چکر خراب ہوگیا ہے کیونکہ اسے کسی اور نے جوڑا ہے۔ تم اکیلی نہیں آئیں، ہے نا۔‘‘

وہ پتھر کی مورت بن گئی جس کو راجہ نے کہنیوں سے دبوچ رکھا تھا۔ اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب لا کے وہ دھیرے سے سرد آواز میں بولا۔

’’مجھے بتاؤ تالیہ بنتِ مراد! تم اپنے ساتھ اپنی دنیا سے کس کو لے کر آئی ہو؟‘‘ اس کی آواز بے رحم غراہٹ میں بدل گئی۔ ’’میں پوچھ رہا ہوں کہ تم میری دنیا میں کس اجنبی کو لے آئی ہو؟‘‘

☆☆☆

اس نے خواب میں دیکھا......

ایک ہال میں قطاروں کی صورت آفس کیبن بنے ہیں۔ کی بورڈز کے کھڑکنے کی آوازیں......فون کی گھنٹیوں کا شور...... ہر طرف لوگ فائلوں اور لیپ ٹاپ میں سر دیے بیٹھے ہیں۔

تالیہ ہال کے سرے پہ کھڑی ہے، اس نے سفید منی کوٹ پہن رکھا ہے اور سنہری بالوں کے ہالے میں دمکتے چہرے پہ غصہ نمایاں ہے۔

وہ سیدھ میں دیکھ رہی ہے، ہال کے آخری سرے کی طرف جہاں کیبن ختم ہوتے ہیں۔

آخری کیبن میں ایک لڑکی سر جھکائے کام کرتی نظر آرہی ہے۔ اس لڑکی کو نگاہوں میں رکھے تالیہ قدم قدم چلنے لگتی ہے۔ فائلیں اٹھائے آگے پیچھے جاتے لوگ ہٹ ہٹ کے اس کو راستہ دے رہے ہیں۔

وہ ماتھے پہ بل ڈالے تیز تیز چلتی، اس لڑکی کے سر پہ آرکتی ہے۔

کیبن کی دیوار چھوٹی ہے۔ اندر بیٹھی لڑکی چونک کے اسے دیکھتی ہے۔

وہ جیب سے ایک لفافہ نکالتی ہے اور اسے بے نیازی سے لڑکی کی طرف ڈال دیتی ہے۔ لفافہ میز سے پھسلتا ہوا نیچے جا گرتا ہے۔

’’میں تمہیں نوکری سے فارغ کرتی ہوں۔ ایک باکس میں اپنا سامان ڈالو اور رخصت ہو جاؤ۔ اور یہ...... یہ تمہارا ٹرمینیشن لیٹر ہے۔‘‘

وہ جس انگلی سے لفافے کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس میں آنسو شکل کی سرخ یاقوت جڑی انگوٹھی دمکتی دکھائی دے رہی ہے۔

☆☆☆

’’مجھے بتاؤ تالیہ! تم کس کو لائی ہو اپنی دنیا سے؟‘‘ راجہ مراد اس کو دونوں کہنیوں سے تھامے، اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھ رہا تھا۔

تالیہ کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا مگر پھر گزر گیا۔ لمحے بھر کو بھی نہیں ٹھہرا۔

’’تو یہ رائے ہے آپ کی میری بارے میں؟‘‘ وہ جبراً مسکرائی۔ ’’اتنی کمزور ہے تالیہ کہ وقت کا دروازہ اکیلے پار کرنے سے ڈرتی ہے؟‘‘ استہزائیہ سا انداز تھا اس کا۔

مراد نے جھٹکے سے اس کی کہنیاں چھوڑیں اور برہمی سے اسے دیکھا۔

’’میرے ساتھ کھیل نہ کھیلو، لڑکی۔ جو پوچھا ہے، وہ بتاؤ۔‘‘

’’کوئی نہیں آیا میرے ساتھ، بابا! میں اکیلی

ہوں...... مگر مجھے اکیلا دیکھ کے ادھورا مت سمجھیے گا۔ میرے زمانے کی لڑکیوں کو اپنی تکمیل کے لیے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے سارے محل کو اکیلی ہی کافی ہوں اور آخری بات......‘‘ شانوں سے لباس جھٹک کے درست کیا گویا مراد کے سخت لمس کو تحقیر سے جھٹکا ہو۔

’’آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں سب کچھ بھول چکی ہوں؟ ہوسکتا ہے، میں آپ کی سوچ سے زیادہ ماضی سے واقف ہوں اور شاید مستقبل سے بھی۔‘‘ ایک نگاہ غلط باپ پہ ڈال کے اس نے ادب سے سر جھکایا۔ ’’بابا!‘‘ کہہ کے الٹے قدموں پیچھے ہٹتی گئی۔

راجہ مراد کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ کمرہ اب خالی رہ گیا تھا، چند ثانیے بیتے اور دستک ہوئی پھر ایک ادھیڑ عمر مرد اندر داخل ہوا۔ یہ راجہ کا خاص خادم تھا جس کو اس روز وہ نئی کشتی بنانے کا حکم دے رہا تھا۔

’’عارف۔‘‘ مراد نے اسے سوچتی نگاہوں سے دیکھا۔ ’’میں درست تھا۔ وہ کسی کو ساتھ لے کر آئی ہے۔‘‘

’’مگر راجہ......‘‘ عارف کو اچنبھا ہوا۔ ’’کیا انہوں نے خود اقرار کیا ہے؟‘‘

’’اس نے مجھے بابا کہہ کے پکارا۔ وہ عرصہ ہوا مجھے راجہ کہتی ہے۔ بابا کہنے کا مطلب ہے وہ دیانت داری سے کام نہیں لے رہی۔‘‘ پھر وہ میز کی طرف آیا اور دراز سے ایک کاغذ نکال کے عارف کی طرف بڑھایا۔

عارف نے کاغذ تھاما اور تہہ کھولی۔ سیاہ روشنائی سے بنا خاکہ دیکھ کے وہ چونکا۔

’’یہ تو وقت کی مہر ہے۔‘‘

’’تم میرے واحد پمبورو (شکار باز) ساتھی ہو جس کو میں بچا کے محل تک لایا ہوں۔ تم وقت کی مہر سے واقف ہو۔ مگر تمہارے سپاہی نہیں جانتے ہوں گے۔ تم یہ خاکہ ان کو دو اور کہو کہ وہ سارے ملاکہ میں پھیل جائیں اور جس مرد کی گردن کی پشت پہ یہ نشان دیکھیں، اس کو گرفتار کر کے میرے پاس لے آئیں۔‘‘

’’اس کے ساتھ آنے والی کوئی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اوڑھنی سے سر ڈھکے رہے تو ہم اس کو کیسے ڈھونڈیں گے، راجہ؟‘‘

مراد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ’’میں نے اپنی بیٹی سے ابھی تفتیش کیوں کی، عارف؟ اس لیے تاکہ وہ کوئی غلطی کردے اور اس نے کردی۔ اس نے کہا کہ اسے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی واپس آنے کے لیے۔ اس نے ’’انسان‘‘ نہیں کہا۔ اس لیے جاؤ اور ایسا مرد ڈھونڈو جس کی گردن پہ یہ مہر ہو۔‘‘

عارف کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ سمجھ گیا۔

’’جو حکم، راجہ!‘‘ پھر اسے خیال آیا۔ ’’اور...... وہ کشتی...... وہ اگلے ہفتے تک تیار ہو جائے گی۔ پھر میں اس مہینے کا بقایا سونا جزیرے پہ پہنچا دوں گا۔‘‘

’’ہاں، یہ کام جلدی کرنا۔ مال زیادہ ہے اور یہاں محفوظ نہیں ہے۔ مگر احتیاط سے۔ تمہاری کمی کسی کو محسوس نہیں ہونی چاہیے۔‘‘

’’جو حکم، راجہ۔‘‘

وہ چلا گیا تو راجہ واپس کرسی کھینچ کے بیٹھا اور لکڑی کی ننھی کشتی اٹھالی۔ اب اسے اس کشتی کا بادبان بنانا تھا۔ اس نے سفید کپڑا اٹھایا اور قینچی سے اسے کاٹنے لگا۔ جھکے چہرے پہ چھائی سختی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

شہزادی تاشہ کی خواب گاہ کے سامنے بنی بالکونی میں تالیہ بے چینی سے دائیں بائیں ٹہل رہی تھی اور سامنے مسہری پہ بیٹھے ایڈم کی نظریں اس کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ اسے گمان گزرا کہ وہ مرسل شاہ کے رشتے کی وجہ سے پریشان ہے۔

’’نہیں، نہیں...... اور جائیں آپ سلطان مرسل کے پاس اتنی بن سنور کے اور کریں آپ ان کو متاثر کرنے کی کوشش۔ یہ تو ہونا تھا۔‘‘

وہ رکی اور اسے گھور کے دیکھا۔ ’’میں اس وقت مراد راجہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔ ان کو شک ہوگیا ہے کہ میں اپنی دنیا سے کسی کو ساتھ لائی ہوں۔‘‘

''اوہ!'' ایڈم کے لب سکڑے۔ ''مگران کو کیسے علم ہوا؟''

''کیونکہ پہلی دفعہ چابی سے دروازہ کھولنے پہ جب چابی ٹوٹتی ہے تو یادداشت چلی جاتی ہے۔ اسی چابی سے دوبارہ دروازہ کھولنے پہ چابی تحلیل ہوتی ہے اور چکر مکمل ہو جاتا ہے تو یادداشت واپس آجاتی ہے لیکن راجہ نے بھانپ لیا ہے کہ میری یادداشت واپس نہیں آئی۔ کیونکہ ہم نے چابی کے چکر کو خراب کر دیا ہے..... پہلی دفعہ دروازہ میں نے کھولا تھا' میری یادداشت چلی گئی۔ دوسری دفعہ وان فاتح نے کھولا، اس لیے میری یادداشت واپس نہیں آسکی۔''

''تو وان فاتح کی یادداشت کیوں نہیں گئی؟''

''کیونکہ یادداشت پہلے چکر پہ جاتی ہے' جب چابی ٹوٹتی ہے۔''

''بڑا ہی کوئی سائنس دان باپ ہے آپ کا۔''

تالیہ نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ ''اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم چابی وان فاتح کے پاس نہ لے کر جاتے اور وہ اس کو نہ جوڑتے' تو میں خود دروازہ کھولتی اور راجہ کو ہرگز شک نہ ہوتا۔''

''ہاں بس گھوم پھر کے میرے اوپر آ جایا کریں۔''

وہ خفا ہوا۔ پھر دیکھا کہ وہ دوبارہ بے چینی سے ٹہلنے لگی ہے تو گہری سانس لی اور تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

''اچھا اتنی پریشان نہ ہوں۔ راجہ کو کیا معلوم کہ کون آیا ہے وہاں سے۔ میں تو ایک مؤرخ ہوں جس کو آپ نے گرفتار کر کے ماشاء اللہ اتنے ظلم ڈھائے ہیں کہ میرے اوپر شک.....''

''تمہاری فکر کون کر رہا ہے، ایڈم؟ مجھے وان فاتح کی فکر ہے۔''

ایڈم نے خفگی سے ابرو اکٹھے کیے۔ ''یعنی میرے اندر واقعی سیل ڈلتے ہیں؟''

''نہیں ڈفر! کیونکہ تمہاری گردن پہ وقت کی مہر نہیں ہے۔ وان فاتح کی گردن پہ ہے۔ تمہاری طرف سے کوئی مشکوک نہیں ہوگا۔''

''ہیں؟'' ایڈم نے بے اختیار اپنی گردن کو چھوا۔ ''میری گردن پہ کیوں نہیں ہے مہر؟ میں نے بھی تو وقت کا دروازہ پار کیا تھا۔''

''کیونکہ مہر صرف چابی سے دروازہ کھولنے والے کی گردن پہ ہوتی ہے۔ یہ چابی ایک شخص کے لیے بنائی گئی تھی۔ شکار بازوں کو کیا معلوم تھا کہ ہم تین افراد اس سے چوکھٹ پار کریں گے۔''

''یعنی میں بس سپلی میں ساتھ آ گیا ہوں۔ ہونہہ۔'' منہ میں بڑبڑایا مگر تالیہ نے نہیں سنا۔ وہ تھک کے سامنے والی مسہری پہ آ کے بیٹھی اور چہرہ ہاتھوں میں گرا لیا۔ سنہری بال چہرے کے دائیں بائیں گرتے چلے گئے۔

''پہلے مسئلے کم تھے کیا جو اب یہ نیا مسئلہ آ گیا ہے۔'' وہ سخت کبیدہ خاطر لگ رہی تھی۔

''آپ کا مطلب ہے' آپ کی سلطان کو متاثر کرنے کی کوشش سے جنم لینے والا مسئلہ۔'' اس کی زبان پہ کھجلی ہوئی۔

تالیہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور برہمی سے اسے گھورا۔ ''بننا سنورنا شہزادیوں کی مجبوری ہوتی ہے۔ اور میں سلطان کے پاس 'کام' کے لیے جاتی تھی۔ وہ باس ہیں اور میں ان کی ایڈوائزر۔ ایسے میں ان کی طرف سے ذاتی ایڈوانسز ''ہراس منٹ'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ اگر میں ملائیشیا میں ہوتی تو ان کو sue (مقدمہ) کر دیتی۔''

ایڈم جواب میں ہنس پڑا۔ ''آپ اس وقت وہ این جی اوز والی فے مینسٹ آنٹی لگ رہی ہیں' چے تالیہ۔''

مگر وہ جواب میں نہیں ہنسی۔ سنجیدگی سے اسے دیکھتی رہی' تو ایڈم کو چہرے پہ سنجیدگی لانی پڑی۔

''یعنی تم بھی عام مردوں کی طرح ہو؟ Victim-Shaming کرنے والے؟ (مظلوم کو الزام دینے والے)؟ سنو ایڈم! اپنا رویہ تبدیل کرو۔ اگر آفس میں عورت ہراس ہوتی ہے تو یہ مت کہا کرو کہ وہ باس کے ساتھ بات کیوں کر رہی تھی۔ سڑک پہ ہراس ہوتی ہے تو یہ مت کہا کرو کہ وہ باہر کیوں نکلی۔ قتل ہونے والے وکٹم کے بارے میں تو کوئی نہیں کہتا کہ وہ قاتل کے پاس گیا ہی کیوں کہ قتل ہو گیا؟ مگر ہراس منٹ کا شکار ہونے والی عورت کے بارے میں ہمیشہ تم لوگ پہلے وکٹم کو الزام دیتے ہو۔''

''سلطان مرسل کا غصہ مجھ پہ کیوں نکال رہی ہیں آپ؟''

''مجھے سلطان پہ غصہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے ''باس'' پہ غصہ ہے۔ ایک باس ہو کے انہیں اپنی ایمپلائی کو یوں ہراس نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' پھر اس کی شکل دیکھ کے وہ ذرا حیران ہوئی۔ ''مگر نہیں... تم جانتے ہی نہیں ہو کہ ہراس منٹ کیا ہوتی ہے۔''

''آ آ.....'' ایڈم نے ادھر ادھر دیکھا پھر سر کھجایا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ کسی کو تنگ کرنا' دست درازی وغیرہ وغیرہ مگر خیر، اب اتنا کوئی ظلم بھی نہیں ہوا آپ کے ساتھ' چے تالیہ! ایک رشتہ ہی تو بھیجا ہے آقا نے۔''

''آقا نے یہ رشتہ ''دربار'' میں بھیجا ہے۔ دربار ایک ''آفس'' ہے اور میں آقا کی ایڈوائزر ہوں۔ وہ ہماری ورک پلیس تھی، ایڈم! ورک پلیس پہ کام سے ہٹ کے ذاتی تعلق کا صرف اشارہ دینا بھی ہراس منٹ شمار ہوتا ہے اور اس نے تو اتنی بڑی بات کہہ دی۔''

''اگر آپ کا باس سلطان مرسل جیسا نکما آدمی نہ ہوتا تو آپ تب بھی برا مانتیں؟''

''ماننا چاہیے کیونکہ کام کی جگہ پہ تعلقات قائم کرنے والے لوگ ہر مہذب معاشرے میں برے سمجھے جاتے ہیں۔ اب تم ٹھہرے بھگوڑے فوجی' تم کہاں گھومے پھرے ہو گے مغربی ممالک میں... اس لیے تمہارے علم میں اضافہ کرتی چلوں (ایڈم نے دانت کچکچائے) یہ مغربی ممالک جن کو تم لوگ برائی کا گڑھ سمجھتے ہو' وہاں بھی کام کی جگہ پہ تعلقات قائم کرنا بہت برا سمجھا جاتا ہے اور ہراس منٹ کے قوانین وہاں بہت سخت ہیں۔''

''میرے جاب لیس (بے روزگار) ہونے پہ چوٹ کرنے کا شکریہ۔ ذرا میرے علم میں مزید اضافہ کریں۔ گوروں کو اس سب سے کیا مسئلہ ہے؟ انہوں نے کون سا اللہ کو منہ دکھانا ہوتا ہے؟''

''کیونکہ ایسے تعلقات کبھی بھی برابری کی بنیاد پہ نہیں ہوتے۔ ان سے کام متاثر ہوتا ہے۔ باس سیکرٹری سے' ٹیچر اسٹوڈنٹ سے' ڈاکٹر مریض سے' فلم ڈائریکٹر کسی اداکارہ سے افیئر چلانا تو درکنار، اسے اگر غلط ٹیکسٹ بھی بھیجتا ہے تو یہ جرم ہے۔ پوچھو کیوں؟''

''جیسے میں پوچھوں گا نہیں تو آپ بتائیں گی بھی نہیں۔''

''وہ اس لیے، عقل مند! کیونکہ ایسے تعلقات میں ایک فریق کمزور ہوتا ہے اور دوسرے پہ انحصار کرتا ہے' اپنی جاب یا گریڈز کے لیے..... جیسے سیکرٹری یا اسٹوڈنٹ، اس کا پلڑا نیچے ہوتا ہے۔'' (ہاتھ سے نیچے کا اشارہ کیا) ''اور دوسرا فریق 'پوزیشن آف پاور' پہ ہوتا ہے۔ جیسے استاد یا باس۔ (اوپر ہاتھ کر کے اشارہ کیا) اس لیے یہ تعلق Predatory تعلق بن جاتا ہے۔ طاقتور کمزور کو ناجائز باتوں کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ اسی لیے مغربی ممالک میں بھی ایسے تعلقات برے سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے اتنے روپ دھار کے اتنی نوکریاں کی ہیں ایڈم کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے مگر ہر جگہ میں نے یہی دیکھا ہے کہ لڑکیاں نوکری کرنے تو آ جاتی ہیں مگر ان کو کوئی یہ نہیں سمجھاتا کہ انہیں باس کی بات کا جواب مسکرا کے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن خیر... یہ نوکری کرنے والی بات تم کہاں سمجھ سکتے ہو۔''

''بالکل۔ میں کہاں سمجھ سکتا ہوں۔ میں ٹھہرا بھگوڑا فوجی۔ خیر آپ سلطان مرسل پر مقدمہ کرنے کے منصوبے بنائیں۔ میں چلتا ہوں اور یہ بنگارا ملایو کا اگلا باب لایا تھا' اسے پڑھ کے کل دربار میں بھجوا دیجیے گا، مجھے یہ پڑھ کے سنانا ہوگا۔'' وہ گلابی غلاف میں لپٹے کاغذوں کو میز پہ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اور ہاں.....'' ماتھے کو چھوا۔ ''وان فاتح نے کہا تھا کہ آپ..... سلطان مرسل سے..... دور رہیں۔''

BOOKSPK

وہ یک دم تھم سی گئی۔ ''انہوں نے...... یہ کہا؟''

''جی بے تالیہ! انہوں نے یہ کہا اور میں یہ کہتا ہوں کہ ایک دوسری دنیا میں...... وہ آپ کے ساتھ برابری کی سطح پہ موجود نہیں ہیں۔'' آخری فقرہ نظریں جھکا کے ادا کیا اور باہر نکال گیا۔

وہ گم صم سی بیٹھی رہی۔ اس کی بات سنی ہی نہیں۔

(فاتح نے ایسا کیوں کہا؟ کیا ان کو میری پرواہ ہے؟)

ایڈم باہر نکلا تو باہر دربان کے ہمراہ شریفہ کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگا جب وہ لپک کے اس کے پیچھے آئی۔

''سنو...... آدم!'' کمر پر ہاتھ باندھے وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

''سناؤ، شریفہ بنتِ آدم!''

وہ ٹھٹکی۔ ''میرے بابا کا نام تو جابر ہے۔''

''یقیناً کوئی جابر ہی ہوگا جو تمہارا باپ ہوگا۔ میں تو آدم علیہ السلام کی بات کر رہا تھا جو ہم سب کے بابا ہیں۔'' پھر وہ ٹھہرا۔ ''تمہارا نام شریفہ بنت جابر ہے؟ تمہارا نام سنا سنا کیوں لگتا ہے مجھے؟''

غور کیا مگر یاد نہ آیا۔ شاید اس نام کی کوئی کلاس فیلو تھی اس کی کوئی۔ خیر، آگے بڑھ گیا۔ شریفہ نے تنک کے تیز رفتار کر کے اس سے ملنے کی کوشش کی۔

''اوہو۔ بات تو سنو۔''

''میں کانوں سے سنتا ہوں اور الحمد للہ میرے دونوں کان کھلے، روشن اور ہوادار ہیں۔''

''تمہاری کتاب کا پہلا باب سنا تھا میں نے اس دن دربار میں۔ شہزادی کی بہت تعریفیں لکھی تھیں تم نے۔''

''تم نہیں سمجھو گی، بی بی!'' اس نے چلتے چلتے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھا۔

''میں سمجھتی ہوں سب اچھی طرح، اسی لیے تمہیں نصیحت کرنے رک گئی۔''

ایڈم کے قدم رکے۔ اس نے ٹھٹھک کے گردن موڑی۔ ابرو اکٹھے ہوئے۔ ''کیا مطلب؟''

شریفہ نے آنکھیں گھمائیں۔ ''ایسی تعریف مؤرخ بن کے لکھی تھی، اسی لیے سلطان نے تمہیں انعام و اکرام سے نوازا' مگر ایسی تعریف 'آدم' بن کے مت لکھنا۔ محل سے باہر پھینک دیے جاؤ گے۔''

وہ بالکل سُن ہو گیا۔ دم سادھے۔ پلک تک نہ جھپک سکا۔

وہ قریب آئی اور دھیرے سے بولی۔ ''محبت بھرے نامے لکھنے کا تجربہ مجھے بھی ہے' آدم۔ مگر تم شہزادی کے برابر کے نہیں ہو۔ تم ایک مؤرخ ہو' ایک غلام' ایک قیدی اور وہ شہزادی ہے۔ شہزادیاں محبت کے معاملے میں اپنے سے اوپر دیکھتی ہیں' نیچے نہیں۔ تمہارے لکھے الفاظ...... وہ صرف خوشامد کے نہیں تھے۔ وہ دل سے لکھے گئے تھے، اتنا دل سے نہ لکھا کرو ورنہ مار دیے جاؤ گے۔''

وہ ہمدردی اور افسوس سے کہہ رہی تھی۔ جب وہ خاموش ہوئی تو وہ ہلکا سا ہنسا۔

''جن لوگوں کے پاس کرنے کے لیے بڑے بڑے کام ہوتے ہیں' وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں نہیں الجھتے۔ جاؤ شریفہ خاتون! جا کر محل کے جالے صاف کرو اور اپنے دماغ کے بھی۔''

پھر ہنستے ہوئے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ پیر پٹخ کے ہونہہ کر کے رہ گئی۔

☆☆☆

جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔

گویا کرنٹ کھا کے وہ سیدھی اٹھ بیٹھی۔

کمرہ اندھیر تھا۔ کھڑکی کے پردے ہٹے تھے اور مدھم چاندنی اندر جھانک رہی تھی۔ تالیہ نے کسی قسم کی روشنی نہیں جلائی۔ بس دم سادھے بیٹھی رہی۔

اس کا خواب خوف ناک ہرگز نہ تھا۔ اس نے ایک آفس دیکھا تھا جس میں وہ آگے چلتی جاتی ہے اور ایک لڑکی کا ٹرمینیشن لیٹر اس کے منہ پہ مار کے آتی ہے۔ عام سا خواب تھا وہ...... مگر...... وہ نئے زمانے کا خواب تھا۔ آفس' کمپیوٹرز' اکیسویں صدی کا ملائیشیا......

وہ دنگ بیٹھی تھی۔

پہلے اسے لگا کہ ایڈم سے آج آفس جاب کے بارے میں بات کرنے کا اثر تھا کہ ذہن نے اسے ماضی میں کی گئی کوئی آفس جاب خواب کی صورت دکھا دی ہے۔ مگر نہیں۔

خواب میں اس کے سنہری بال....اور..... ہاتھ کی سرخ انگوٹھی....وہ سب بتا رہا تھا کہ یہ منظر مستقبل کا تھا۔ یہ ابھی 'واقع' ہونا تھا۔

اس کا مطلب تھا...... وہ واپس جائے گی۔ وہ ایک دفعہ پھر اپنی اصل دنیا میں واپس ضرور جائے گی۔

وہ دل پہ ہاتھ رکھے بے یقین سی بیٹھی تھی۔ دنگ، متحیر۔ پھر اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔ دل خوشی سے بھرنے لگا۔

وہ واپس جائے گی۔ اسے وقت کی قید سے بالآخر نجات مل جائے گی۔

وہ اٹھی اور بال جوڑے میں لپیٹے پھر دیا سلائی رگڑی تو شعلہ چمکا۔ اس نے چراغ روشن کیا اور پھر...... ریشمی رومال میں لپٹا دستہ اٹھا لیا۔

اندر خوب صورت لکھائی میں تحریر کردہ کاغذ سلیقے سے رکھے تھے۔ تالیہ نے آنکھیں رگڑیں اور زرد روشنی میں انہیں پڑھنا شروع کیا۔

(دیکھوں تو سہی میرے بارے میں کیا کیا لکھا ہے اس نقلی فوجی نے۔ اللہ کی قسم ایک بھی غلط لفظ ہوا تو......) مگر سوچیں منتشر ہو گئیں۔ پھر جیسے جیسے پڑھتی گئی' لب مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے۔

''قصے ہم تم کو کیا سنائیں
بنداہارا کی بیٹی کی رحم دلی کے
اِک دن جو سوار ہوا مؤرخ شاہی بگھی میں
اور شہزادی کے قافلے کے ساتھ جا اُترا، ملاکہ کے بازار میں......
تو دیکھتا ہے کہ وہ سادہ لباس میں' چغہ پہنے' چہرہ ڈھکے
پھر رہی ہے عام لوگوں کی طرح......
اِک اِک کا حال پوچھتی......
غریبوں کے دروازوں پہ نشان لگاتی......
تا کہ شاہی سپاہی رات کو رکھ جائیں وہاں اشرفیوں کی تھیلیاں......
اور ایسے میں بنداہارا کی بیٹی کا چہرہ دیکھو تو وہ
معصوم خوشی سے دمک رہا ہوتا تھا......اور......''

وہ پڑھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ اس کی سخاوت کے ایک ڈیڑھ واقعے کو ایڈم نے بڑھا چڑھا کر رقم کیا۔ خیر سچ ہی تھا وہ۔

مسکرا کے اس نے ورق پلٹا۔

اگلے صفحے پہ لکھے الفاظ پڑھ کے اس کی مسکراہٹ ایک دم سے غائب ہوئی۔

☆☆☆

سن باؤ کی سرخ حویلی پہ فجر قضا ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ زمانۂ جدید میں اس گھر کے باہر بازار تھا اور آس پاس مکانات۔ مگر اس قدیم دور میں اس کے سامنے سبزہ زار تھا اور طویل قطار میں درخت لگے تھے جن کے ساتھ چند گھوڑے بندھے تھے۔

فاتح صبح صبح گھوڑوں کے ساتھ کھڑا مصروف دکھائی دیتا تھا۔ سرمئی کرتے پاجامے میں ملبوس، بال استرے سے تازہ چھوٹے کر رکھے تھے اور چہرے پہ سنجیدگی طاری کیے وہ جھک کے ایک گھوڑے کی لگام کھول رہا تھا۔

''مارننگ واک پہ جا رہے ہیں کیا؟'' آواز پہ لگام کھولتے اس کے ہاتھ تھمے۔ جھکے جھکے چہرہ موڑا تو دیکھا...... سامنے ہشاش بشاش سا ایڈم کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''تم؟'' فاتح کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ لگام کھول کے سیدھا ہوا اور بازو سے سبزہ زار کی طرف اشارہ کیا، گویا اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دے رہا ہو۔

''محل سے وقت بے وقت نکلنا آسان ہوتا ہے تمہارے لیے؟''

وہ دونوں اب درختوں کی قطار کے ساتھ چل رہے تھے۔ گھوڑے کی لگام فاتح نے تھام رکھی تھی۔ وہ وانگ لی کا محبوب گھوڑا تھا اور روز صبح اس کو چرانے

لے کر جانا غلام کے فرائض میں شامل تھا۔

''شہزادی نے مجھے مؤرخ مقرر کیا ہے' جناب!'' مؤرخ نے فرضی کالر جھاڑے۔ چھوٹے کرتے کے اوپر بنا آستین کے جیکٹ سی پہنے' نیچے پاجامہ اور سر پہ ٹوپی جمائے' وہ واقعی کوئی شاہی عہدے دار لگتا تھا۔ ''اور مؤرخ کے اوپر کوئی روک ٹوک نہیں کرسکتا۔''

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ مؤرخ رائٹر ہوتا ہے اور رائٹرز سے سب کو ڈرنا چاہیے۔ ان کو آپ اچھے لگیں گے تو آپ کا ذکر اپنی تحریر میں ایک بار کریں گے۔ برے لگیں گے تو بار بار کریں گے۔''

فاتح ہنس دیا۔ ''تم لکھنا انجوائے کر رہے ہو؟''

''بہت زیادہ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اندر اللہ نے لکھنے کے لیے اتنی تڑپ رکھی ہے۔ مجھے لکھ کے سکون ملتا ہے۔ جیسے میں خود اپنا کتھارسس کر رہا ہوں۔'' وہ گھاس پہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔

''کس وقت لکھتے ہو؟''

''جس وقت سارے بڑے رائٹرز لکھتے ہیں۔''

''اور وہ وقت کون سا ہوتا ہے؟''

''جب موڈ اچھا ہو۔'' اس نے ہنس کے شانے اُچکا دیے۔

وہ دونوں اب درختوں کے پار سبزہ زار پہ نکل آئے تھے۔ فاتح نے گھوڑے کی لگام چھوڑ دی تو وہ سر جھکائے گھاس میں منہ مارتا آگے بڑھتا گیا۔

''اپنی شہزادی کو میرا پیغام دیا تھا؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگا تو ایڈم نے گہری سانس لی۔

''بے فکر رہیں۔ وہ آقا سے دور ہی رہیں گی۔ وہ خود بھی اس بات سے خوش نہیں ہیں۔''

''اس لیے اس کو چاہیے کہ جلد از جلد وہ چابی تلاش کرے تاکہ ہم واپس جا سکیں۔'' وہ اس بات سے بہت ناخوش لگتا تھا۔

''راجہ مراد کو شک ہو گیا ہے کہ کوئی چے تالیہ کے ساتھ آیا ہے۔ وہ آپ کی گردن کے نشان کی مدد سے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ چے تالیہ نے یہ غازہ بھیجا ہے (اس نے ایک کپڑے کی پوٹلی سی لباس سے نکال کے فاتح کی طرف بڑھائی۔) آپ روز یہ تھوڑا سا غازہ (پاؤڈر) پانی میں گھول کے اس نشان پہ لیپ کرلیا کریں۔ وہ چھپ جائے گا۔''

''ہوں۔'' اس نے پوٹلی الٹ پلٹ کر کے دیکھی اور جیب میں رکھ لی۔ پھر گردن موڑ کے گھوڑے کو دیکھنے لگا جو گھاس میں سر دیے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ گھوڑے پہ نظریں جمائے فاتح نے دوبارہ بات کا آغاز کیا۔ ''آج وانگ لی کے ساتھ مجھے سلطنت محل جانا ہے۔''

''معلوم ہے۔ وانگ لی نے آپ کا نام مہمانوں کی فہرست میں ڈالا ہے۔ دربار کی کارروائی کے بعد آج بنگارایا ملایو کا نیا باب بھی پڑھ کے سنایا جائے گا۔ اس میں آپ کا ذکر بھی ہے۔''

''مگر جو بنگارایا ملایو میں نے پڑھی تھی اس میں میرا ذکر نہیں تھا۔''

''کیونکہ آنے والی صدی میں پرتگالی جب ملاکہ پہ حملہ کریں گے تو محلات اور کتب خانے جلا ڈالیں گے۔ یقیناً انہوں نے ہی اس کتاب کو جلا ڈالا ہوگا اور بعد میں یہ لوگوں کی یادداشت کی مدد سے دوبارہ لکھی گئی ہوگی، اس لیے غلطی سے آپ کی جگہ وانگ لی کا نام لکھا گیا ہوگا۔''

وان فاتح نے جواب نہیں دیا۔ بس اس کے ساتھ گھاس پہ چلنے لگا۔

''اور تم ٹھیک ہو' ایڈم؟ گزارا کیسا ہو رہا ہے تمہارا محل میں؟''

ایڈم کے چہرے پہ زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''سر...... اگر میں کسی انسان سے اس حد تک متاثر ہونے لگوں کہ مجھے اس کی ہر بات اچھی لگے اور اس کا رعب ہر وقت میرے اوپر چھانے لگے اور مجھے مسلسل اس کی توجہ حاصل کرنے کی خواہش ہونے لگے تو آپ کے خیال میں' میں کس جذبے کا شکار ہوں گا؟''

Anfords
Values Life
WITH FLUORIDE
DoctorFast
WORKS FASTER
☑ Reduces Sensitivity
☑ Strengthens Painful Teeth
Doctor®
TOOTHPASTE
☑ Stops Gum Bleeding
☑ Relieves Toothache
Doctor with fluoride
Email: info@anfords.com | Web: anfords.com.pk | FB: /Anfords/

”لو سیلف اسٹیم کا۔“

وہ جو ”محبت“ کی طرح کے کسی جواب کی توقع کر رہا تھا‘ ایک دم بھونچکا رہ گیا۔

”جی؟“

”میری کلاس میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔ یہ تب کی بات ہے جب میں اسکول میں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے حد محبت کرنے والا سمجھتی تھی۔ کوئی نیا ٹیچر ہو یا نیا کلاس فیلو‘ لڑکی ہو یا لڑکا‘ وہ اس سے فوراً دوستی کی خواہش کرنے لگ جاتی اور پھر اس نئے شخص کی توجہ پانے اور اسے خوش کرنے کے لیے ہر حد تک چلی جاتی تھی۔ آخر میں لوگ اس سے بےزار آ کے اسے چھوڑ جاتے تھے اور وہ کراہتی رہتی تھی کہ لوگوں نے اس کے محبت کرنے والے دل کے ساتھ۔ بُرا سلوک کیا۔ مگر وہ لڑکی محبت سے مغلوب نہیں تھی۔ وہ صرف ’لو سیلف اسٹیم‘ کا شکار تھی۔“

”کیا مطلب‘ سر؟“

”تمہارا اور تالیہ کا ایک ہی مسئلہ ہے۔“ وہ افسوس سے سر جھٹکتے ہوئے آگے چلتا گیا اور گھوڑے کے قریب جا رکا۔ ”تم دونوں لو سیلف اسٹیم کا شکار ہو۔“ گھوڑے کی لگام کھینچ کے اس کا منہ گھاس سے نکالا اور اسے زبردستی آگے لے جانے لگا۔

”اور یہ سیلف اسٹیم ہوتی کیا ہے؟ ہر کوئی اس کا ذکر بہت کرتا ہے، آج تک میں اس کے اصل معنی نہیں جان سکا۔“ ایڈم خفا خفا سا لگتا تھا۔

”سیلف اسٹیم...... اپنی نظر میں اپنی عزت کو کہتے ہیں۔ خود کو کچھ سمجھنا۔ اپنی عزت کرنا۔ اپنی قدر کرنا۔ اپنے آپ کو پہچاننا۔ ذاتی وقار۔ جن لوگوں میں یہ زیادہ ہوتی ہے، ان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادھورے نہیں ہیں۔ ان کو ”اچھا“ لگنے کے لیے کسی دوسرے انسان یا چیز کو خود سے جوڑ لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ میں کافی ہیں۔“

گھوڑے کو وہ کھینچ کے زبردستی درختوں کی طرف لے جانے لگا۔ گھوڑا مزاحمت کرتے ہوئے گردن اِدھر اُدھر مار رہا تھا۔

”اور مجھ میں اس کی کمی ہے؟“

”بالکل ہے اور تالیہ میں بھی ہے اور جو لوگ اپنی نظروں میں معزز نہیں ہوتے‘ وہ دراصل خود سے مطمئن نہیں ہوتے۔ انہیں لگتا ہے کہ لوگ ان کے ’اصل‘ کو قبول نہیں کریں گے۔ ایسے میں یا وہ تالیہ کی طرح بن جاتے ہیں... وہ مختلف روپ دھار کے لوگوں سے ’وہ‘ بن کے ملتے ہیں جو وہ ہوتے نہیں ہیں۔ بات بات پہ جھوٹ بولنا۔ کہانیاں گھڑنا۔ جانتے ہو وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ کیونکہ اس کو اپنے اصل ’سیلف‘ پہ اعتماد نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو ویسا بنا لیتی ہے جیسا روپ لوگوں کے نزدیک معزز ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں۔ ورنہ لوگوں کے نزدیک کوئی پیمانہ حتمی نہیں ہوتا۔

انسان کو اپنے اصل انداز میں رہنا چاہیے۔ دنیا خود بخود آپ کے مطابق ڈھل جائے گی۔ اور دوسری قسم کے لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں۔“

گھوڑے کو درخت کے قریب لے جا کر اس نے اس کا رخ جبراً پتوں کی طرف موڑا۔ پہلے تو گھوڑے نے مزاحمت کی‘ پھر پتوں کو سونگھا تو ڈھیلا پڑا اور ذرا سا پتہ دانتوں سے توڑا۔

”تمہارے اندر چونکہ اپنی عزت نہیں تو ایک خلا بن گیا ہے۔ تم اس خلا کو پُر کرنے کے لیے تالیہ کی طرح اپنے اوپر ملمع نہیں چڑھاتے۔ تم بس خود کو ادھورا تسلیم کر لیتے ہو۔ نامکمل اور اس ادھورے پن کو دوسرے انسانوں سے بھرنے کی کوشش کرتے ہو۔ میری کلاس فیلو کی طرح تم بہت جلد لوگوں سے متاثر ہو جاتے ہو۔

تم نے صوفیہ رحمٰن کو ووٹ دیا تھا۔ مجھے نہیں۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میرے پاس ایک چیز تھی۔ سچائی اور ایمان داری۔ تمہیں اس خوبی نے کبھی اٹریکٹ نہیں کیا کیونکہ وہ تمہارے پاس بھی ہے۔ تم سچے انسان ہو مگر صوفیہ کے پاس سحر انگیز شخصیت اور مجمع کو اپنی تقریر سے مسحور کر دینے کا فن تھا۔ وہ تمہارے پاس نہیں تھا۔ وہ ایک اوور کانفیڈینٹ خاتون ہے اور تم میں اعتماد کی شدید کمی ہے۔ اس لیے تم اس سے متاثر ہو گئے۔“

”یعنی میں ان لوگوں سے متاثر ہوتا ہوں جن کے پاس وہ ہوتا ہے جو مجھے پسند ہے مگر وہ میرے پاس نہیں ہے؟“ اسے یہ سب کہتے ہوئے برا لگ رہا تھا۔ اپنی ذات کا کسی دوسرے سے بے رحمی سے تجزیہ کروانا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔

”بالکل۔ تم اب بھی اگر مسلسل کسی سے متاثر ہو رہے ہو تو تم اپنی کمی کو کسی دوسرے میں تلاش کر رہے ہو۔ تمہارے جیسے لوگوں کو لگتا ہے کہ دوسرے ان کو ان کے ’اصل حال‘ میں قبول نہیں کریں گے‘ اس لیے وہ خود کو کسی متاثر کن انسان یا چیزوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو اپنے اصل سے زیادہ بڑا دکھائی دینے کا ایک ہی طریقہ نظر آتا ہے کہ وہ کسی طرح خود کو کسی ’بڑے‘ انسان کے ساتھ نتھی کر لیں۔ تم صرف ایک بت تراش رہے ہو‘ اور پروانے کی طرح اس کے گرد چکر کاٹ کے اپنی وقعت دنیا کی نظر میں بڑھانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”تو اس بت کو کیسے توڑا جاتا ہے؟ کیسے میں انسانوں سے متاثر ہونے سے بچ سکتا ہوں؟“ وہ سخت اداس نظر آنے لگا تھا۔

”اپنے آپ کو پہچانو۔ اپنے اندر کی خوبیوں کو نکھارو۔ کسی سے کوئی لالچ نہ رکھو۔ دوسرے لوگوں کی رائے سے بے نیاز ہو کے اپنا کام کرو۔ تمہاری عزت بڑھے گی اور تم لوگوں سے خواہ مخواہ متاثر نہیں ہو گے‘ کیونکہ تم یہ جان جاؤ گے کہ تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔“

گھوڑا اب سکون سے درخت کی ٹہنیوں سے چر رہا تھا‘ اور فاتح اس کے سر پہ کھڑا محتاط سا اس کو دیکھ رہا تھا۔ ایڈم اداس سا پیچھے کھڑا تھا۔

”تو میں صرف بت تراشتا ہوں اور ان کی پرستش کرتا ہوں پھر جب وہ لوگ مجھے چھوڑ جاتے ہیں تو میرا شیشے کا بت ٹوٹ جاتا ہے۔ اسکول میں مجھے ہر دوسرے ٹیچر سے محبت تھی۔ سیاستدانوں میں مجھے صوفیہ رحمٰن اچھی لگتی تھی۔ رشتے داروں میں مجھے وہی خاندان کے بڑے پسند تھے جو سب سے زیادہ پُراعتماد اور بے نیاز تھے۔ اگر یہ سب میری خود اعتمادی کی کمی کی وجہ سے تھا تو محبت.... محبت کیا ہوتی ہے‘ سر؟“

قدیم ملاکہ کے اس سبزہ زار میں اس روشن صبح ایڈم نے ایک عام سا سوال پوچھا تھا۔

وان فاتح نے گردن موڑ کے اسے دیکھا‘ اور مسکرایا۔ ”محبت صرف فیری ٹیلز (پریوں کی کہانی) میں ہوتی ہے‘ ایڈم۔ اس کو اصل زندگی میں نہیں ڈھونڈتے۔“

پھر اس نے گھوڑے کی گردن کو تھپکا تو وہ گھاس سے منہ ہٹا کے گردن اِدھر اُدھر گھمانے لگا۔ فاتح نے اس کی لگام تھام لی اور سامنے کو چل دیا۔ کہنیوں تک آستینیں موڑے‘ ایک ہاتھ سے لگام تھامے‘ دوسرے سے ماتھے پہ چھجا بنائے‘ وہ ابھرتے سورج کو دیکھتا اب آگے بڑھ رہا تھا۔ سبزہ زار کے اس پار ندی تھی جہاں سے اس نے گھوڑے کو پانی پلانا تھا۔

ایڈم خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ہیجان ہی ہیجان تھا۔

☆☆☆

سلطنت محل میں اپنی خواب گاہ سے ملحقہ کمرے میں سلطان مخملیں صوفے پہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ انگوروں سے بھرا طشت سامنے رکھا تھا اور وہ کھڑکی سے باہر نظریں جمائے وقفے وقفے سے انگور منہ میں ڈالتا تھا۔ سنہری اور سبز زرتار پوشاک پہنے‘ سر پہ ریشمی پگڑی نما ٹوپی جمائے‘ جس کے اوپر قیمتی ہیرے اور زمرد جڑے تھے‘ وہ گہری سوچ میں گم لگتا تھا جب دروازہ دستک کے بعد کھلا۔

مرسل نے چونک کے چوکھٹ کو دیکھا۔ راجہ مراد اندر داخل ہو رہا تھا۔

”صبح بخیر آقا۔“ مراد آگے آیا اور ہاتھ باندھے جھک کے سلام کیا۔

مرسل نے دو انگلیوں سے قریب آنے کا اشارہ کیا تو وہ قدم قدم چلتا اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

”آقا کی طبیعت ٹھیک ہے؟ دربار میں آپ کا

انتظار کیا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا، خود حاضر ہو کے خیریت معلوم کرلوں۔'' انداز میں تشویش تھی مگر آنکھیں چھوٹی کر کے وہ غور سے مرسل شاہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''ہاں ہاں۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔'' اس نے دو انگلیوں سے کنپٹی مسلی پھر مراد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مراد محتاط نظروں سے اسے دیکھتا ہوا سامنے بیٹھا۔

''کہیے آقا! غلام کس طرح آپ کی پریشانی دور کرسکتا ہے؟''

''تم ہمارے بنداہارا (وزیرِ اعظم) ہو' مراد۔ اور ملاکہ سلطنت کا بنداہارا سلاطین کی شادیوں اور ان کے بچوں کی پیدائش کے انتظامات کا نگہبان ہوتا ہے۔''

''میں اپنے فرائض سے بخوبی واقف ہوں' آقا۔ آپ کی اور ملکہ یان سوفو کی شادی میری نگرانی میں ہوئی تھی اور میں نے کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''میں تم سے بہت خوش ہوں اور اب......'' مرسل نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے شانے جھٹکے۔ ''اب میں شہزادی تاشہ کو اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہوں لیکن ملکہ اس بات پہ بہت جزع وفزع کریں گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بذات خود اس تقریب کا انتظام کرو اور ملکہ کے کسی بھی ممکنہ ردعمل سے نمٹنے کی حکمتِ عملی تیار کرو۔ یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔'' وہ عام سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اسے اگر فکر تھی تو صرف ملکہ کے ردعمل کی۔

مراد بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔

''آقا' آپ شہزادی کو صرف خاتون کا درجہ دینا چاہتے ہیں یا ان سے نکاح بھی کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں پہلے صرف شہزادی کو خاتون بنانا چاہتا تھا لیکن اب میرا ارادہ بدل چکا ہے۔ میں ان کو ملکہ کا مقام دینا چاہتا ہوں۔ تم تیاری کرلو۔'' سادہ سے انداز میں حکم جاری کیا اور پوشاک جھٹکتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سپاٹ چہرہ لیے مراد بھی فوراً کھڑا ہوا۔

''جو حکم' آقا۔''

مرسل نے محض سر کو خم دیا اور آگے بڑھ گیا۔ مراد بے تاثر چہرے کے ساتھ پیچھے کو لپکا۔

باہر دروازے سے کان لگائے کھڑی کنیز فوراً اوٹ میں ہوگئی۔ دربان خاموشی سے اس کو دیکھتے رہے مگر کوئی روک ٹوک نہ کی۔ مرسل شاہ اور راجہ مراد آگے بڑھ گئے تو کنیز اوٹ سے نکلی اور دوسری راہداری میں بھاگی۔ اس کا رخ ملکہ یان سوفو کے حرم کی طرف تھا۔

☆☆☆

دربار میں تقریباً تمام افراد اب بیٹھ چکے تھے اور مسلسل سلطان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ دربار کے بند دروازوں کے باہر برآمدہ بنا تھا جس سے چوڑی طویل سیڑھیاں نیچے محل کے صحن میں اترتی تھیں۔ سیڑھیوں کے دہانے پہ کنیزوں اور خادموں کی معیت میں تالیہ کھڑی تھی۔

سر پہ تاج سجائے' پیروں تک آتا سرخ کامدار لباس پہنے' وہ مسکرا کے نیچے دیکھ رہی تھی جہاں سے وانگ لی اوپر چڑھتا آتا دکھائی دے رہا تھا۔ پیچھے دو غلام بھی تھے۔ ایک تو خوشگوار انداز میں نظریں اطراف میں گھما رہا تھا' اور دوسرا......دوسرا غلام پُرسکون چہرے اور پُراعتماد چال کے ساتھ وانگ لی کے پیچھے چل رہا تھا۔ ہاتھ بندھے تھے مگر گردن اور نگاہیں دونوں اٹھی ہوئی تھیں۔

تالیہ اس کو نظر انداز کیے وانگ لی پہ نظریں جمائے کھڑی مسکراتی رہی۔ وہ اوپر آیا اور ہاتھ جوڑ کے سلام کیا۔

''صبح بخیر' شہزادی!''

''اچھا لگا آپ کا آنا' سن باؤ۔ میرا بہت جی چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کا۔''

وانگ لی کا پھولے گالوں والا چینی چہرہ کھل اٹھا۔ ادب سے دوبارہ جھک کے سیدھا ہوا۔ ''آپ کا جب جی چاہے' آپ بلوا لیا کریں مجھے' شہزادی۔ غلام کو شہزادی کی خدمت کر کے خوشی ہوگی......''

''بلواتی کیوں' سن باؤ؟ مجھے تو آپ سے ملنے سے زیادہ آپ کا گھر دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ بہت قصے سن رکھے ہیں اس سرخ لکڑی والے گھر کے۔''

وہ وانگ لی کو دیکھ کے سادگی سے کہہ رہی تھی اور پیچھے کھڑے وان فاتح کی نظریں اس پہ جمی تھیں۔ وہ زیرِ لب مسکرایا تھا۔

''میرے غریب خانے کے قصے کہاں سے سن لیے آپ نے؟'' وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

''آپ سے پہلے جو اس گھر کا مالک تھا' وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا۔'' ایک نظر فاتح پہ ڈالی۔

''ہاں' وہ میرا ایک جرنیل تھا' چند سال پہلے اسی نے یہ گھر بنوا کے دیا تھا مجھے' مگر وہ اس میں زیادہ عرصہ رہا نہیں۔''

''مگر یہ گھر اس کو بہت عزیز تھا' سن باؤ۔ اس کو اس میں ایک بھی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ یا شاید وہ مغرور تھا کافی۔ جو پسند آ گیا اس کی خامیاں نہیں دکھتی تھیں' اور جو پسند نہیں آیا، اس کی خوبیاں بھول جاتا تھا۔'' وہ اب بھی وانگ لی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

فاتح نے بے اختیار ابرو اٹھائے۔ (سیریسلی)

مگر وہ اس طرف متوجہ نہ تھی۔

''وہ احمق تھا۔'' وانگ لی بے اختیار ہنس دیا پھر جھک کے سلام کیا اور اجازت لے کر دربار کی طرف چلا گیا۔

تالیہ مڑی تو دیکھا' عقب سے ملکہ یان سوفو چلی آ رہی ہے۔ اس کے پیچھے کنیزوں اور خادموں کا انبوہ تھا۔ ملکہ اس کے قریب رکی تو تالیہ نے جھک کے سلام کیا۔ ''ملکہ!''

''میں نے اس مسئلے کا ایک حل ڈھونڈ لیا ہے۔'' اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

''کون سا مسئلہ' ملکہ؟''

پھر اسے یاد آیا۔ ''قومی خزانہ مسلسل کم ہونے والا مسئلہ؟''

اسے آخری ملاقات میں زیر بحث آیا مسئلہ یاد آیا۔ ''اس مسئلے کا حل تو واقعی ضروری ہے' ملکہ۔ اخراجات بڑھتے ہی جا رہے ہیں اور (آواز دھیمی کی) ابوالخیر اور راجہ مراد کی مسلسل محصول (ٹیکس) کے پیسے چرانے کے باعث خزانہ کم ہوتا جا رہا ہے۔''

''مگر اس کا حل ڈھونڈ لیا ہے میں نے۔'' مسکرا کے کہتی ملکہ آگے بڑھ گئی۔ تالیہ نے بس مسکرا کے سر کو خم دیا البتہ سوچتی نظروں سے گردن موڑے ملکہ کو دیکھنے لگی۔ (کیسا حل؟)

دفعتاً ایک کنیز دور سے بھاگتی آتی دکھائی دی۔ دربار کے دروازے پہ ابھی ملکہ پہنچی ہی تھی کہ کنیز نے اسے روکا اور کان میں کچھ کہا۔ تالیہ یہاں سے ملکہ کا نیم رخ دیکھ سکتی تھی۔

کنیز کی سرگوشی سن کے یان سوفو کے گال گلابی پڑے اور اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ آنکھیں زور سے میچیں۔

چند لمحے ضبط کی اس کیفیت میں کھڑی رہی پھر آنکھیں کھولیں اور برداشت سے مسکرائی' ایک گہری نظر پلٹ کے تالیہ پہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

کچھ عجیب تھا اس کے انداز میں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

- اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت -/120 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور منی آرڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں -/300 روپے تین بوتلیں -/400 روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

دستی خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

ناولٹ

رابعہ افتخار شیخ

میں تمہارا راستہ ہوں

طویل مسافت کے بعد ایک ہاتھ میں سفری بیگ اٹھائے دوسرے ہاتھ سے احمد کا ہاتھ تھامے وہ کچی پکی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ خشک گہرے سانولے پاؤں جن میں دو پٹی کی پرانی سی جوتی تھی۔ بدرنگ عبایا اور ہونٹوں پر جمی پپڑی...... آتے جاتے لوگوں نے دیکھا اور انجان، مہمان سمجھ کر اپنا راستہ ناپا......

''اماں! کہاں ہے نانی کا گھر......؟'' احمد نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سر اٹھا کر ماں کی سمت دیکھا۔

''بس یہ جو کھوکھا (لکڑی کی دکان) نظر آ رہا ہے ناں......اس سے آگے پہلی گلی میں ہے تیری نانی کا گھر'' اس کے چہرے پر تھکی ماندی مسکراہٹ ابھرنے سے پہلے ہی معدوم ہوئی تھی۔

''اب اور نہیں چلا جاتا اماں۔'' احمد رک گیا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھالیا۔ چار سال کا کمزور سا بچہ بھی اس وقت اسے بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر وہ سبز رنگ و روغن والے دروازے کے سامنے کھڑی کنڈی بجا رہی تھی۔

''کون ہے؟؟؟ کون ہے باہر......؟'' اندر سے جو آواز آئی تھی اس نے اسے ایک نئی زندگی بخشی تھی۔

''تیری نانی زندہ ہے احمد...... تیری نانی۔'' وہ بڑبڑائی تھی۔

''میں پچھیا کون ہے؟'' اندر سے خفگی سے پوچھا گیا تھا۔

''میں ہوں اماں ...... عطو......عطیہ۔'' وہ دروازے سے منہ ٹکا کر بولی تھی۔ صدیوں کی تھکن تھی۔ اس آواز میں، دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا۔

''عطو......میری عطو......'' بوڑھی بانہوں نے اسے گرنے سے پہلے سنبھال لیا تھا۔

''عطیہ ......میری بچی......میری عطو۔'' اماں اس کے چہرے کے گمشدہ نقش کھوجنے لگی تھی۔ ''یہ ...... یہ بچہ۔'' اماں نے اسے سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا تھا۔ ان کی گوری چٹی عطو...... کہیں رل گئی تھی۔

''تو......زندہ ہے عطو......تو......'' اماں ایک بار پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر رونے لگی۔

''وے زین ......جلدی سے پانی کا کٹورا لے کر آ......میری عطو آئی ہے......'' اماں نے کسی کو آواز دی تھی۔ وہ احمد کو گود میں بٹھائے گھر کا جائزہ لینے لگی......وہی کچا صحن ......وہی دیواریں......وہی برآمدہ......بھینس بھی بندھی تھی پر یہ اس کی ''رانی'' نہیں تھی۔

''اماں ...... گھر تو ذرا بھی نہیں بدلا ...... پانچ سال آئے میرے اور اس گھر کے بیچ۔'' اس نے ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ رانی کی کھرلی والی دیوار اب بھی تین فٹ کی ہی تھی۔ ایک ہوک سی دل میں اٹھی۔

''یہ تیرا بچہ ہے عطو۔'' اماں نے لرزتے ہاتھوں سے احمد کو گود میں بٹھا کر پانی کا پیالہ اس کے خشک ہونٹوں سے لگایا تھا۔

''ہاں اماں! میرا ہی ہے...... چار سال کا ہے۔'' وہ عبایا اتار کر ماں کے پاس چارپائی پر بیٹھ

ی۔ زیبن اماں کے اشارے پر رسوئی (باورچی خانہ) میں چلی گئی۔

''تجھے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا ہم نے عطو۔''

اماں نے بے اختیار ہی احمد کو خود سے لپٹا لیا تھا۔

''میں تو خود کو بھی تین سال پہلے ہی ملی تھی اماں...... جب احمد آیا تھا گود میں...... پھر پاؤں میں بیڑی (زنجیر) ڈل گئی۔ یہ راستے...... یہ گلیاں...... یہ سب یاد تھا...... پر اس دروازے کو کھڑ کانے کے لیے ایک دروازے کے بند ہونے کا انتظار کر رہی تھی اماں۔''

وہ سر جھکائے بولی تھی۔ زیبن گرما گرم روٹیاں اور دال لے آئی۔ دونوں ہی بھوکے تھے، اماں بوڑھے ہاتھوں سے باری باری دونوں کے منہ میں نوالے ڈالنے لگی۔ عطو کو لگا وہ پچیس سال کی نہیں بلکہ وہی پرانی...... بیس سال کی عطو ہے جو ماں کے ہاتھ سے نوالے کھاتے ہوئے شرارت سے کھرلی والی دیوار کی اور دیکھتی ہے جیسے دلاور کو جتانا چاہ رہی ہو۔

''اٹھائے گا میرے اتنے نخرے؟؟؟'' بے اختیار ہی نگاہ اس دیوار کی طرف اٹھی تھی۔

''دلاور کیسا ہے اماں......؟'' یہ پوچھتے ہوئے نگاہ بے اختیار ہی جھک گئی تھی۔

''اس پنڈ میں تیرے جانے کے بعد ہم دو جانوں پر وقت رک گیا تھا عطو...... وہ بھی وہیں کھڑا ہے...... اسی جگہ...... بس حلیہ تھوڑا بدل گیا ہے۔'' اماں کے لہجے میں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

''تو دلاور کی ہی بات کر رہی ہے نا اماں؟ تیری اور اس کی بنتی ہی کب تھی؟'' حیرت سوا تھی، اماں جھرّیوں زدہ چہرے سے مسکرائی تھی۔

''تیرے جانے کے بعد وہ میرا پتر بن گیا عطو۔'' اماں کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

''ویاہ کر لیا تو نے دلاور......؟'' وہ زیبن کو اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''اور ویاہ...... ویاہ کر لیا تھا دلاور نے؟''

''ویاہ...... بھی نہ ہووے تے...... تو اسے ابھی وی (بھی) (نہیں) نئی سمجھی عطو...... تیرے جانے کے بعد وہ ویاہ کس سے کرتا...... ووہٹی کے بغیر ویاہ کیسے ہوتا ہے بھلا؟'' اور اماں کی اس بات پر وہ سر نیہواڑے بیٹھی رہی۔ زیبن چائے لے آئی۔ تازہ دودھ کی دودھ پتی...... احمد نانی کی گود میں بیٹھا بے حد خوش تھا۔ پیٹ بھر کھانا اور الائچی کی خوشبو اڑاتی چائے سفر کی تھکان کو دھیرے دھیرے ختم کر رہی تھی۔

☆☆☆

کتے بھونک رہے تھے، آسمان ستاروں سے بھرا تھا۔ کمرے میں تین نفوس تھے۔ اماں، عطو اور احمد...... زیبن تو بس اماں کی بھینس اور رسوئی کے کاموں کے لیے آتی تھی۔ گلابی رنگ کے پھولوں والے تکیے پر سر رکھے وہ گھرر گھرر کرکے چلتے پنکھے کو دیکھ رہی تھی۔ آواز زیادہ اور ہوا کم تھی۔ احمد کب کا سو چکا تھا۔

''عطو......! تجھے یاد ہے تو جب گئی تھی...... تو اس روز کتنی سوہنی لگ رہی تھی۔ تو نے گلابی اور کالا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ گلابی چوڑیاں، گلابی پراندہ...... تیرے جھمکے...... مجھے ہر چیز یاد ہے...... تو کہاں چلی گئی تھی عطو...... اس بدرو کے ساتھ......؟'' اماں نے شاید پانچ سال اسی بدگمانی میں گزارے تھے۔

''بدرو...... بدرو کون اماں؟؟ وہ جو چھت کے پنکھے کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ وہ اس گھر کے ایک ایک کونے کو جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔

''بدرو...... وہ کرائے داروں کا لڑکا...... جس نے تجھے چٹھی لکھی تھی۔'' اماں اٹھ کر بیٹھ گئی...... ماتھا ٹھنکا...... ''تو عطو اپنی مرضی سے بدرو کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ عطو...... کہاں گئی تھی؟ اسے تو وہ بدرو یاد بھی نہیں تھا۔

''میں اغوا ہوئی تھی اماں...... میں اس روز کوثر کی شادی سے واپسی پر اغوا ہوئی تھی...... مجھے باراتیوں میں شامل ایک بندے نے اغوا کیا تھا...... بڑی چالاکی سے۔'' وہ بھی اٹھ بیٹھی، تکیے کو دیوار سے ٹکایا اور پشت ٹکا کر ماں کو دیکھنے لگی۔ آنسو آنکھ سے لڑھک کر کہیں چہرے کی کھردری جلد میں ہی جذب ہوا تھا۔

''تو یہ احمد...... یہ بدرو کا بچہ نہیں ہے۔'' اماں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''نہیں اماں...... بڑی لمبی کہانی ہے۔ پانچ سال تیرے بغیر گزارے ہیں...... انجان لوگوں میں...... انجان شہر میں...... تجھے اور ابا کو یاد کرتے...... روتے...... تجھے پتا ہی نہیں اماں، تیری عطو کے ساتھ کیا کیا ہوا؟'' اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔ ''ان ہاتھوں میں پانچ سال سے نہ مہندی لگی نہ چوڑی کھنکی...... دو سال زنجیروں میں باندھ کر رکھا ان لوگوں نے...... ہاتھوں اور پاؤں میں موٹی موٹی سنگل (زنجیر)''۔

''کون تھا وہ عطو......؟'' اماں تڑپی۔

''تو چھوڑ اماں...... ابا کب مرا...... ابا...... کہاں ہے اماں؟'' وہ کسی خیال کے تحت سیدھی ہو بیٹھی۔

''جھلی نہ ہو تو...... تیرے جانے کے پانچ سال تک جی سکا تیرا ابا...... ایک سال تو بالکل منجھی (چارپائی) سے لگ کے رہا...... دلاور نے بڑی خدمت کی...... بس تب ہی دلاور میرا پتر بن گیا۔ تو صبح جانا اپنے ابا سے ملنے...... گاؤں کے قبرستان میں ہی ہے قبر...... بس تو مجھے یہ بتا دے عفو...... تیرا ویاہ ہوا تھا یا......'' اماں نے ہول کر احمد کی سمت دیکھا۔

''بڑی لمبی کہانی ہے اماں، کہاں سے سنے گی۔'' اس نے دیوار سے سر ٹکا لیا۔

☆☆☆

عطیہ...... عطو...... اپنے اماں ابا کی اکلوتی اولاد، لاڈلی، نازو پلی، ابا سارا دن کھیتی باڑی کرتا اور رات کو آتے اپنی لاڈلی کے لیے جلیبیاں، سموسے، خطائیاں، املی کی چاٹ اور اس کی ہر پسندیدہ چیز لے کر آتا...... اماں تانگے پر بیٹھ کر شہر جاتی تو اس کے لیے لان کا جوڑا، پراندہ، چوڑیاں، سرمہ، سرخی اور جھمکے لے کر آتی...... سردیوں میں گلی میں ریشمی کپڑوں والا آتا تو اماں اکٹھے تین چار جوڑے لے لیتی، دھوپ میں سلائی مشین رکھ کر اخبار سے ڈیزائن دیکھتی اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر عارفہ صدیقی کی تصویریں نکالتی...... اماں یہ والا جوڑا......

اس کے ہمسائے میں دلاور رہتا تھا...... اس کی طرح وہ بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ باپ مر چکا تھا بس ماں تھی۔ دلاور بھی اپنے ابا کی زمینوں میں ہل چلاتا تھا۔ دلاور آتے جاتے اس کو چور نظروں سے دیکھتا تھا مگر سر جھکائے گزر جاتا۔ کبھی کھرلی والی دیوار سے وہ نظر آتی تو زیرلب مسکرا کر سر جھکا لیتا...... اس کی محبت میں عطو کی عزّت پہلے تھی اور اس کی چاہ بعد میں۔ عطو جانتی تھی کہ دلاور کے دل میں اس کے لیے کیا ہے' پر وہ اسے سنانے کے لیے اماں سے اونچی آواز میں کہتی تھی۔

''اماں خبردار، اب تو نے کوئی رشتہ دیکھا، میرے لیے تو شہر سے کوئی شہزادہ آئے گا۔'' اور اس کی بات کے جواب میں اماں اسے چپل مارتیں اور دلاور دیوار کے پار مسکرا دیتا...... وہ اٹھارہ یا انیس سال کی تھی جب دلاور کی ماں رشتہ لے کر آ گئی۔ ایک کلو کا مٹھائی کا ڈبہ اور دو سو روپیہ لے کر وہ بڑے مان سے آئی تھی۔ اماں نے خوب بے عزّتی کی...... خوب باتیں سنائیں۔

''عطو کا ابا کنالوں زمین کا مالک ہے اور تیرا لڑکا...... جتنی زمین باپ چھوڑ کر مرا اتنی زمین پر ہی فصل لگاتا ہے...... نہ شہر کا رخ کرتا ہے کسی کام کے لیے' نہ گھر کی حالت سیدھی کرتا ہے...... تجھے تو سکھ دے نہیں سکا، بیوی کو کیسے پالے گا؟؟ میری عطو کا رشتہ مانگنے سے پہلے ایک بار تو سوچنا تھا۔ اٹھا یہ حلوائی کی دکان اور چلتی بن......''

اماں کی اتنی بے عزتی کے باوجود دلاور کی اماں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔

''معاف کرنا بہن...... غلطی ہو گئی...... اللہ تیری عطو کے نصیب اچھے کرے، اللہ اسے اچھا سا بر دے۔'' وہ دعائیں دیتی چلی گئی۔

اس شام کھرلی میں رانی کا چارہ ڈالتے ہوئے اس سے آنکھیں ٹکرائیں' بھیگی اور ضبط سے لال ہوتی آنکھیں دلاور کے دل میں چلتی توڑ پھوڑ کی غمازی کررہی تھیں۔

☆☆☆

اس کی واحد سہیلی کوثر کی شادی تھی، ان ہی دنوں محلے میں شہر سے ایک گھرانہ کرائے کے مکان میں آیا تھا۔ فلمی ہیرو جیسا بدرو شادی والے گھر کے آس پاس ہی چکراتا رہتا...... اس کی ماں اور بہنوں کے حلیے بھی کوئی شریف گھرانوں والے نہیں تھے۔ اس رات وہ کوثر کی ڈھولک سے واپس آرہی تھی جب بدرو نے اس کے قدموں میں کاغذ پھینکا، اس سے پہلے عفت نے اٹھالیا۔ بدرو کے فلمی ڈائیلاگ اونچی آواز میں ساری سہیلیوں کو سنائے...... وہ عطو کا دیوانہ تھا...... پیچھے گاؤں کی بوڑھیوں کی ٹولی میں چلتے دلاور نے لکڑی کا ڈنڈا زور سے زمین پر مارا تھا عطو نے مڑ کر دیکھا...... اس کی نگاہوں میں غصہ تھا...... غضب تھا۔

''تو آگیا تیرے لیے شہری بابو؟'' رات وہ کھرلی کی دیوار سے جھانکا تھا۔

''تجھے اس سے مطلب؟'' وہ نہ جانے کس رو میں کہہ گئی۔

کوثر کی شادی میں دھوم مچ گئی...... عطو کے لیے بھی شہری بابو آگیا...... کہاں سائیکل کے پیڈل مارنے والا دلاور...... اور کہاں اسکوٹر چلانے والا بدرو...... وہ بھی سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ کو ہلکا لیتی رہی۔ بارات والے دن بات ابا اماں تک پہنچی تو وہ سر نیہوڑائے کھڑے رہی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے ابا......! بدتمیزی بدرو نے کی ہے...... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا...... عفت نے بات بڑھادی۔'' دیوار کے پار کھڑے دلاور کے دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی۔

ولیمے والے روز جب گاؤں کے لوگ ویگن میں ٹھنس ٹھنسا کر کوثر کے سسرالی گاؤں جارہے تھے تب ہی پاس سے سامان سے لدی ٹرالی گزری تھی اور پھر موٹرسائیکل پر بدرو...... اس نے بڑے لوفرانہ انداز میں ویگن کی کھڑکی سے باہر دیکھتی عطو کو خدا حافظ کا اشارہ کیا تھا۔ پیچھے ہی تانگے میں اس کی ماں اور بہنیں بھی تھیں۔

''عطو کے ابا نے بدرو کی اماں سے کہا تھا کہ اپنے لڑکے سے کہو یا تو سدھر جائے یا پھر جدھر سے آئے ہو وہاں خاموشی اور عزت سے چلے جاؤ ورنہ اتنی جوتیاں پڑیں گی کہ چمڑی اتر جائے گی اور بدرو کی ماں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔

''میں خود بیٹیوں والی ہوں...... لوگ مجھے برا سمجھتے ہیں مگر بیٹی کی عزت کیا چیز ہوتی ہے' میں اچھی طرح سمجھتی ہوں...... کل رات سے پہلے ہم چلے جائیں گے اور بدرو، عطو کیا...... کتنی ہی لڑکیوں کو خط لکھ چکا ہے ایک جیسا...... مجھے اور بھی شکایتیں آئی ہیں۔''

''اور دیکھ لے چلے گئے۔'' ویگن میں کسی نے سرگوشی کی۔ کوثر کے ولیمے سے واپسی پر عفت نے اسے روک لیا۔

''چلے جائیں گے ہم دونوں...... جانے دے سب کو ویگن میں...... ہم دونوں مکلاوے والی گاڑی میں جائیں گے کوثر کے ساتھ۔'' عفت کے کہنے پر وہ رک گئی۔ اماں سے بھی کہہ دیا شام کی اذان ہوتے ہی عفت اس کا ہاتھ تھامے ایک گاڑی میں آبیٹھی۔

''لو جی...... آج تو نواب زادیوں کی طرح جائیں گی ہم...... دولہا دلہن کا ارادہ بدل گیا۔ وہ تو سرگی (صبح صادق) آئیں گے پنڈ۔'' عفت نے کھڑاک سے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔

''ہائے اللہ اندھیرا ہو رہا ہے عفت...... ہم دونوں اکیلی۔'' دل میں عجیب سا خوف ابھرا۔

''کچھ نہیں ہوتا...... دیکھ اپنے پنڈ (گاؤں) کا ہی راستہ ہے ناں؟؟؟'' عفت نے اس کا ہاتھ دبایا...... گاڑی دس سے پندرہ منٹ چلی اور پھر ایک جھٹکے سے رک گئی۔

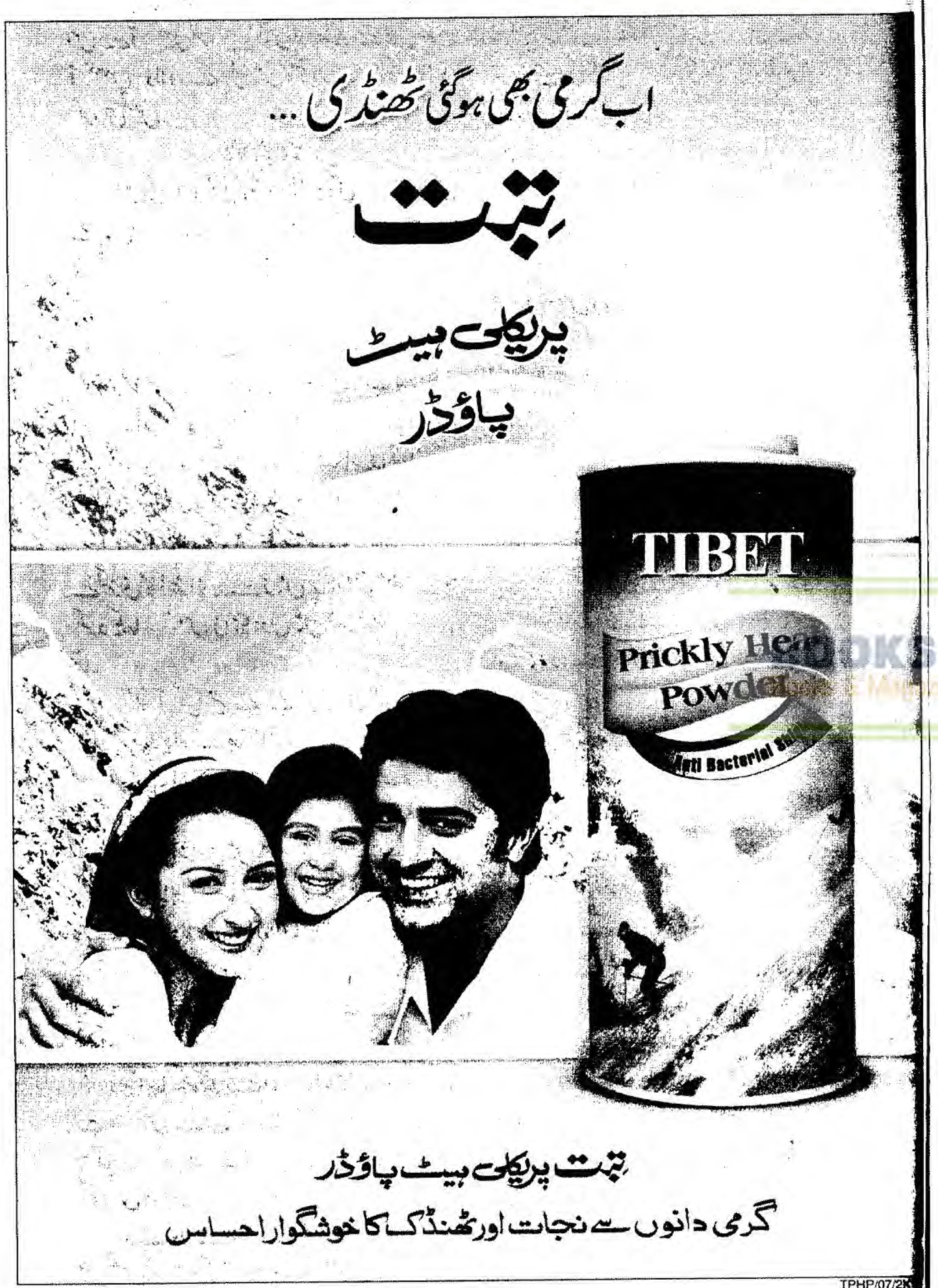

اب گرمی بھی ہوگئی ٹھنڈی...

تبت

پریکلی ہیٹ

پاؤڈر

TIBET

Prickly Heat Powder

Anti Bacterial

تبت پریکلی ہیٹ پاؤڈر

گرمی دانوں سے نجات اور ٹھنڈک کا خوشگوار احساس

TPHP/07/2K

''اتر...... اتر...... جا بھاگ — لے۔'' ڈرائیور نے مڑ کر عفت کو گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا اور عطو کے ماتھے پر پستول رکھ دی۔

''کون ہے تو؟......'' عفت کی آواز حلق میں پھنس گئی...... عطو کے حلق میں بھی سانس اٹک گئی۔

''نکل...... بھاگ جا زندگی پیاری ہے تو۔'' اور عفت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی تھی۔ گاڑی دھول اڑاتی شہر کے راستے کی طرف مڑ گئی تھی۔

☆☆☆

''عطو بھاگ گئی خالہ...... عطو نے مجھے بیچ راستے میں گاڑی سے اُتروا دیا...... عطو بھاگ گئی خالہ۔'' عفت' عطو کے اماں ابا کے صحن میں کھڑی رو رہی تھی۔ دروازے میں کھڑا دلاور الٹے قدموں جائے وقوعہ پر گیا تھا...... کھرا مل گیا تھا۔ عفت سچ کہہ رہی تھی۔ عفت کے پیروں کے نشان جو پنڈ تک آ رہے تھے اور گاڑی کے ٹائروں کے نشان جو شہر کی طرف مڑ رہے تھے۔

''وہ بدرو...... وہ کتنا ہنستا مسکراتا پنڈ چھوڑ کر گیا ہے وہی تھا عطو کا شہزادہ...... عطو نے اس کے ساتھ مل کر چال چلی ہے...... دھول جھونکی ہے سب کی آنکھوں میں۔'' عفت کے سچ میں کتنا جھوٹ تھا، کسی نے سوچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

''میں رپورٹ لکھواؤں گا اس بدرو کے خلاف۔''

''نہیں عطو کے ابا......! لڑکی کا معاملہ ہے خود ڈھونڈ عطو کو...... مرضی سے گئی ہے تو اس کی خوشی اور مرضی میں خوش ہو جا بدنامی ہوگی۔'' اماں نے کچھ اس طرح کہا کہ عطو کا ابا ڈھے سا گیا۔

دھیرے دھیرے ابا چارپائی سے لگتا گیا۔ عفت دلاور کے آگے پیچھے پھرنے لگی' اس نے زہر کھا کر مرنے کی دھمکی دی۔ دلاور کو سرا مل گیا...... وہ عطو کو ڈھونڈتا رہا...... عفت کی دھمکی نے دلاور کو بھی دھمکانے پر مجبور کر دیا۔

''کرلوں گا تجھ سے شادی پر پہلے یہ بتا کہ عطو کو کس کے ساتھ بھیجا...... ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں میں۔''

''مجھے کچھ نہیں پتا دلاور...... مجھے تو میری سہیلی کی شادی میں اس ڈرائیور نے دھمکی دی تھی۔'' اس نے بات بنائی، دلاور نے منہ پھیرا...... وہ سمجھ گئی جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

''ہاں عطو کو میں نے باتوں میں لگا کر اس کار میں بٹھایا تھا...... وہ کون تھا مجھے نہیں پتا مگر اس نے ولیمے کے دوران جب مجھے اور عطو کو ساتھ ساتھ دیکھا تو سمجھ گیا کہ ہم سہیلیاں ہیں، اس نے کھانے کے دوران مجھے لال رنگ کی گاڑی میں بیٹھنے کا کہا...... اس نے عطو کو اغوا کیا ہے دلاور...... مجھے جان بھی پیاری تھی اور اس بات کی خوشی بھی تھی کہ میرے راستے کا پتھر تو خود ہی ہٹ رہا ہے۔'' وہ رونے لگی۔

''تو ابھی بھی جھوٹ بول رہی ہے عفت...... تو نے خود اس کار ڈرائیور کے ساتھ مل کر سارا پروگرام بنایا...... عطو کو باتوں میں لگا کر اس کار میں بٹھایا...... پروگرام کے مطابق ڈرائیور نے آدھے راستے میں تجھے اتر جانے کو کہا تاکہ تجھے عطو کی نظروں میں مشکوک نہ کر دے...... اب وہ بندہ کون تھا تو نے اسے کیا قیمت دی یہ تو ہی بتا سکتی ہے۔'' دلاور نے اپنے آہنی ہاتھ میں اس کا چہرہ یوں دبوچا تھا کہ اس کی انگلیاں دانتوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔

''وہ کوثر کے میاں کا کوئی رشتہ دار تھا، اسے عطو پسند آ گئی تھی، بارات والے دن مجھے شک ہوا تھا، مجھے پتا چلا کہ وہ کوئی اچھا انسان نہیں ہے...... یہ سچ ہے کہ اس نے مجھے اور عطو دونوں کو لال رنگ کی گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تھا۔ مگر باقی کا پروگرام میرا تھا۔ میں نے اسے قیمت چکائی...... عطو کو اغوا کرنے کے لیے اماں کا کنٹھا (سونے کا بھاری ہار) چوری کیا اور اسے دے دیا۔'' عفت رونے لگی دلاور کے قدموں میں گر گیا اس کا دل جیسے دلاور نے نفرت سے پاؤں کے نیچے کچل دیا۔

''اور تو نے آ کر الزام لگا دیا کہ عطو بھاگ گئی بدرو کے ساتھ، تجھے پتا ہے اس بدرو کو ڈھونڈ کر میں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا مگر عطو اس کے پاس ہوتی تو مجھے ملتی ناں۔''

''مجھے معاف کر دے دلاور!''

''تُو نے اچھا نہیں کیا عفت...... تُو نے بہت بڑا جرم کیا ہے، گناہ کیا ہے مجھے حلیہ بتا اس کا...... میں کوثر کے میاں سے ملوں گا...... مل جائے گی عطو۔'' وہ قدرے نرم ہوا۔ ''پھر تو کرے گا مجھ سے شادی؟ وہ مل جائے گی تو میں کہاں نظر آؤں گی تجھے۔'' وہ سسکی۔

''میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا تو مجھے حلیہ بتا۔'' دلاور نے نرمی سے وعدہ کیا۔

☆☆☆

نہ عفت کی ماں کا کنٹھا ملا نہ عطو کا کوئی سراغ...... وہ لال کار والے تک تو پہنچ گیا پر اس نے بتایا کہ اس کی کار اس روز ڈرائیور لے کر اپنے کسی عزیز کی شادی میں گیا تھا، پھر شادی سے واپسی پر کار اس کے حوالے کر کے وہ نوکری چھوڑ گیا، ڈرائیور کا حلیہ جب کوثر کے میاں کو بتایا تو اس نے بتایا کہ وہ تو بس ایک انجان ڈرائیور تھا جسے کسی نے فون کر کے دولہا دلہن کو مکلاوہ لے جانے کے لیے بلایا تھا۔ اسے بہت ڈھونڈا...... پھر ایک بار عفت کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''تُو کتنے جھوٹ بولے گی عفت...... نہ وہ کوثر کا سسرالی رشتہ دار تھا نہ وہ لال رنگ کی کار اس کی تھی، دیکھ میں پولیس میں رپورٹ نہیں لکھوا رہا...... دو لڑکیوں کی عزت کا سوال ہے۔''

''تو سمجھتا کیوں نہیں...... وہ بھاگ گئی اپنی مرضی سے، اس ڈرائیور کے ساتھ...... ہو سکتا ہے اسے بدرو نے ہی کہا ہو...... تو بس بھول جا اسے۔'' وہ رونے لگی۔

''اب میں بتاتا ہوں تجھے...... تو نے بدرو کے نام کا سہارا لیا...... تو نے یہ پروگرام کب سے بنا رکھا تھا۔ اس بدقماش شخص سے تو نے رابطہ کیا...... ماں کا کنٹھا دے کر اپنی سہیلی کی عزت بھی داؤ پر لگا دی بس۔ اس لیے کہ میرے تک آنے والا راستہ صاف ہو جائے...... اتنا اوکھا نہیں تھا مجھ تک آنا کہ تو نے گناہ کا راستہ چنا...... عطو کی ماں تو ویسے ہی انکار کر چکی تھی مجھے...... وہ کسی اچھے رشتے کے آتے ہی ہاں کر دیتے، بیاہ دیتے وہ اسے کسی اچھی جگہ پھر شاید اسے اپنے گھر خوش دیکھ کر میں تجھے اپنے گھر لے آتا...... پر اب...... اب رتی بھر بھی شرم ہو ناں تجھ میں تو پنکھے سے لٹک جا یا گاؤں کے کنویں میں چھلانگ لگا دے...... میں تجھ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ اتنی سی عمر میں تو نے اتنا گھناؤنا منصوبہ کیسے بنا لیا، ہاں! اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ میں عطو کے ماں باپ کو کبھی نہیں بتاؤں گا۔'' وہ بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

''مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں کا تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس نے عطو کو کہاں دیکھا تھا...... بس یہ منصوبہ ضرور بنایا میں نے اس کے ساتھ مل کر۔''

''ڈھونڈ تو میں اسے لوں گا عفت...... پر تُو روز مرے گی روز......'' وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عفت پنکھے سے لٹکی، نہ زہر کھایا، قسمت نے اسے کیے کی سزا دے دی۔ وہ چھت سے گری، اس کی ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف ہو گئی۔ وہ بستر سے جا لگی۔ زبان سے کچھ نہ کہتی بس آنسو بہاتی رہتی۔

''اسے معاف کر دے بیٹا، اس نے زیور بھی گنوایا، سہیلی بھی' صحت بھی اور تو بھی نہ مل سکا۔''

اس کی ماں دلاور کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی روتی رہی۔ اس دن کے بعد دلاور اس کے سامنے گیا نہ ہی کوئی سوال پوچھا۔ عطو کے ابا بیمار ہوئے تو اس نے جی جان سے خدمت کی، وہ اس کی اماں کا سہارا بن گیا۔ شہر میں کئی لوگوں کو عطو کی تصویر دکھائی۔ ٹیکسی ڈرائیوروں سے' رکشے والوں سے، ویگن والوں سے...... سب سے پوچھا نہ وہ ڈرائیور ملا نہ عطو...... کون تھا وہ؟ عفت سے کیا بات ہوئی اس کی۔ عفت جھوٹ بول رہی تھی یا پھر واقعی اس شخص

نے عطو اور عفت کی دوستی دیکھتے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ دن مہینوں اور مہینے سالوں کے قالب میں ڈھلتے رہے...... وہ سارا دن ہل چلاتا...... چارہ کاٹتا...... اماں کی بھینس کی راکھی کرتا...... دودھ دوہتا...... اماں چل بسی تو عطو کی اماں ہی سب کچھ بن گئی۔ باپ بھی ماں بھی...... بالوں میں چاندی اترنے لگی۔

”تو نے پولیس میں رپورٹ کروانے سے کیوں روکا اماں؟“ وہ ایک دن اماں سے شکوہ کناں ہوا۔

”دھی کا تن تھا دلاور...... کیا پتا خود بھاگ گئی ہو...... کچی عمر تھی...... شادی والا گھر تھا...... لڑکیاں بالیاں ایسے موقع پر کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوتی ہیں...... پولیس والے میری عطو کے حوالے سے کیسی کیسی باتیں کرتے...... کس کس کے ساتھ اس کا نام لگاتے...... بس چلی گئی چوکھٹ پار کر کے تو چلی گئی...... جہاں بھی رہے خوش رہے...... آباد رہے۔“ اماں کے آنسو بہتے تو وہ چپ ہو جاتا۔

☆☆☆

”دلاور...... اوہ دلاور۔“ اماں کی آواز پر اس نے کھرلی والی دیوار سے جھانکا تھا...... سامنے دیوار کے دوسری طرف...... اک خواب کی صورت گلابی رنگ کی چنی لیے وہ ”عطو“ ہی کھڑی تھی...... اس کی عطو۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ اس نے کندھے پر دھرا پرنا اٹھا کر آنکھیں رگڑی تھیں۔ اب وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کی ٹانگوں سے ایک کمزور سا بچہ بھی لپٹا تھا۔ اس بچے کی آنکھیں عطو کی آنکھیں تھیں۔ اس نے جس عطو کو پانچ سال پاگلوں کی طرح ڈھونڈا تھا وہ کھرلی کی دیوار کے اس طرف ایسے کھڑی تھی جیسے کبھی کہیں گئی ہی نہ ہو۔ دلاور نے ایک بار پھر آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ اب اس کے ساتھ اماں بھی کھڑی تھی۔ جھریوں زدہ چہرے پر مسکراتی آنکھیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ یہ خواب نہیں، حقیقت تھی۔ عطو واپس آ گئی تھی۔

☆☆☆

”تیرے اغوا میں عفت کا ہاتھ تھا۔ میں نے اسے بہت ٹٹولا بہت اگلوانے کی کوشش کی مگر جب انسان گناہ، سازش اور جھوٹ کے راستے پر قدم رکھ کر محبت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ناں تو اپنا مان اور اعتبار کھو دیتا ہے...... وہ بھی جھوٹ پر جھوٹ بولتی رہی۔ تجھے بدنام کرنے اور میرے تیرے درمیان آنے کے لیے اس نے کہاں اور کس سے رابطہ کیا...... ماں کا کنٹھا دے کر کس سے تیرے اغوا کا منصوبہ تیار کیا...... نہ اس نے پورا سچ بتایا نہ میں نے پوچھا...... اسے کیے کی سزا مل گئی۔ پچھلے چھ سال سے وہ معذوری کی زندگی گزار رہی ہے......“ دلاور چارپائی کے سامنے موڑھے پر بیٹھا تھا۔ احمد اور اماں رسوئی میں ہانڈی پکا رہے تھے۔ وہ چارپائی پر گود میں ہاتھ دھرے قسمت کی لکیروں کو کھوج رہی تھی۔

”عفت نے...... میرے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا وہ کملی مجھے ایسے ہی کہہ دیتی میں اپنی سہیلی کی خاطر تجھ سے...... دل میں سنبھال کر رکھی تیری محبت سے دست بردار ہو جاتی۔“ وہ یوں ہی سر جھکائے بولی، دلاور نے بے پناہ حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔

”تو بھی عطو...... پر تو نے کبھی بتایا نہیں؟“ اس نے شکوہ کیا۔

”کیا بتاتی اماں نے مجھ سے پوچھے بغیر انکار کر دیا...... اور خود مجھے بھی تیری چاہ ذرا...... ٹھہر کر ہی ہوئی مگر جب ہوئی تب تجھے بتا نہیں سکی۔“

”اور وہ جو تو کہتی تھی کہ تیرے لیے کوئی شہزادہ آئے گا وہ......؟؟؟“

”وہ تو اماں ابا کو رشتے دیکھنے سے روکنے کا اک بہانا تھا بس اور کچھ نہیں...... پر عفت نے...... اس نے اتنا بڑا کام اتنی چوری چھپے کیا، مجھے اغوا کرنے میں سچ میں عفت کا ہاتھ تھا دلاور......؟ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی وہاں ان آنکھوں میں بہت سالوں بعد روشنیاں سی جلی تھیں۔

”وہ تجھے کہاں لے گیا تھا عطو...... اور یہ احمد، یہ اس کا بچہ ہے؟ تو نے شادی کر لی اس سے۔“

”نہیں...... یہ احمد اس کا بچہ نہیں ہے...... یہ میرا بچہ ہے عنایت کا بچہ...... بہت کچھ ہوا ان بیس سالوں میں دلاور......“ وہ خشک آنسوؤں کو برداشت کرنے کی اذیت سے گزرنے لگی۔

☆☆☆

رات کے بارہ بجے تھے۔ لال رنگ کی گاڑی سے اتر کر اب وہ لوگ ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ ٹرین میں پہلے سے ایک بوڑھی عورت ان کی منتظر تھی۔

”یہ کون ہے سکندر؟“ اس بوڑھی عورت نے اس کی سمت دیکھ کر بیٹے کو گھورا تھا۔

”کچھ نہ پوچھ ماں...... میں تو وہاں پیسے والے لوگوں سے مدد مانگنے لگا تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر جاگیردار...... زمین دار دولہا دلہن کا صدقہ خیرات کر کے بہت کچھ دے دیتے ہیں پر اماں وہاں معاملہ ہی الٹ گیا۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ڈری سہمی عطو جو اب شور مچا مچا کر بھی نڈھال ہو چکی تھی بے ہوش ہو کر وہیں ٹرین کی سیٹ پر گر گئی۔

”کیا ہوا سکندر...... کچھ پھوٹ تو سہی...... دلاری کے آپریشن کے لیے انتظام ہوا کہ نہیں۔“ اماں بیٹی کے لیے فکر مند تھی۔

”ہاں اماں ہو گیا انتظام...... دلاری کا آپریشن بھی ہو جائے گا اور مکان کا پچھلا سارا کرایہ بھی چکتا کر دوں گا...... یہ دیکھ۔“ اس نے قمیص کی جیب سے سونے کا کنٹھا (ہار) نکال کر ماں کو لشکارا دکھایا۔

”یا اللہ...... یہ چوری کیا تو نے سکندر؟“

”نہیں ماں...... آج تو عجیب ہوئی میرے ساتھ میں دولہا کے باپ سے مدد مانگ رہا تھا جب ایک لڑکی نے آنکھ کے اشارے سے مجھے باہر بلایا وہ مجھے روتا ہوا اور مدد مانگتا ہوا دیکھ چکی تھی۔

”کون ہے تو؟ کہاں سے آیا ہے؟“

”شہر سے آیا ہوں...... مہمانوں کے لیے گاڑیاں منگوائی تھیں ناں فون کر کے تو گاڑی کا مالک دور دراز گاؤں میں خود نہیں جاتا مجھ جیسے ضرورت مند ڈرائیوروں کو بھیج دیتا ہے...... کوئی کام تھا چوہدرانی جی......؟؟“

”ہاں...... تجھے میرا ایک کام کرنا ہے بدلے میں، میں تجھے اتنا کچھ دوں گی کہ تو اپنی گاڑی خرید لے گا۔“ اس کی آنکھوں میں عیاری تھی۔

”کیسا کام چوہدرانی جی؟“

”وہ گلابی جوڑے والی لڑکی جو میرے ساتھ ساتھ نظر آئے گی۔ ہم دونوں واپسی پر تیری گاڑی میں بیٹھیں گی...... ادھے راستے میں تو مجھے گاڑی سے اتر جانے کا کہہ کر اس لڑکی کو لے جائے گا اور کہیں بھی جا کر چھوڑ دینا...... بے شک دھکا دے دینا کسی کھوہ میں......“

”یہ کیا کہہ رہی ہو چوہدرانی جی...... میری ضرورت بے شک بہت وڈی (بڑی) ہے پر اتنی وی نہیں (بھی نہیں) کہ میں اک معصوم کڑی کی عزت اور جان داؤ پر لگا دوں...... میں ایسا کروں گا تو میرے پیچھے پولیس لگ جائے گی میرے ساتھ ساتھ میرا مالک وی پھنس جائے گا۔“ وہ ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرنے لگا۔

”کچھ وی نہیں ہو گا...... میں وہاں گاؤں میں سب کے سامنے یہی کہوں گی کہ بھاگ گئی وہ کسی کے ساتھ...... اس کا ایک بوڑھے باپ کے علاوہ کوئی ایسا نہیں جو تھانے کچہریوں کے چکر کاٹے...... بدنامی کے ڈر سے نہیں جائے گا کوئی تھانے...... ویسے بھی اس کا چکر چل رہا ہے کہیں...... آج نہیں تو کل بھاگ ہی جائے گی...... اور فرض کر تیرے پیچھے کوئی آ بھی گیا تو تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا...... اغوا کرنے والے تاوان مانگتے ہیں، تجھے میں اغوا کرنے سے پہلے دے رہی ہوں...... یہ لے پھڑ (پکڑ)“ اس نے بات کے آخر میں ایک پوٹلی سکندر کے ہاتھ میں تھما دی۔

”ڈھائی تین لکھ کا ہے (ڈھائی تین لاکھ کا)۔

”میں اسے شہر کہیں بازار اتار دوں گا، وہ واپس آ گئی تو......؟“

”شہر نہیں...... کسی دور دراز شہر یا پنڈ...... اور

سے کوئی شادی نہیں کرے گا...... وہ بھی نہیں۔'' بات کے آخر میں وہ مسکرائی تھی اور پوٹلی کی طرف اشارہ کرتی اندر چلی گئی۔ سکندر کی سانس پھولی ہوئی تھی...... دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

''سکندر! کچھ کر...... ڈاکٹرنی نے آپریشن بتایا ہے...... میری دلاری وی مر جائے گی اور بچہ وی...... پورے چالیس ہزار خرچہ ہے...... وڈے مہنگے ہسپتال کا۔'' اماں کے آنسو...... دلاری کی پیلی پڑتی رنگت...... مالک کا صاف انکار...... اور یہ تو پورے ڈھائی لکھ......

زندگی ہی بدل سکتی تھی اور وہ کوئی گناہ تو نہیں کر رہا تھا...... یہ تو ایک سبیل بنی تھی...... ماتھے کا پسینہ صاف کر کے وہ مڑا تھا۔ شادی بیاہ والے گھروں کے آس پاس ٹھیلے والے...... چھابڑی والے اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس نے دس روپے کی نقلی پستول لے کر وکھی (جیب) میں ڈالی تھی۔

☆☆☆

''اماں...... کام سے آ گیا واپس تو اسٹیشن پہنچ...... دلاری کے آپریشن کا بندوبست بھی ہو گیا ہے...... میں سیدھا اسٹیشن ہی آتا ہوں۔'' وہ وہیں آیا...... وہ ایک کونے میں کھڑی سسک رہی تھی۔

''دیکھ میری بہن کا میاں ایک حادثے میں مر گیا...... اس کے آپریشن کا خرچا مجھے ہی کرنا تھا...... سرکاری ہسپتال والوں نے تو جواب دے دیا تھا۔ پرائیویٹ والوں نے امید کی کرن دکھائی تھی پر خرچا بہت تھا...... اب انتظام ہو گیا، میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے...... میرا تجھ سے وعدہ ہے میں تجھے واپس بھجوا دوں گا...... تیرے پنڈ جانے والی بس میں بٹھا دوں گا' پر فی الحال تو چپ کر کے میرے ساتھ چل۔'' وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''تو نے میرے ابا سے تاوان مانگا ہے۔'' وہ اتنا تو جانتی تھی۔

''تو جو بھی سمجھ...... بس چپ کر کے ساتھ چل۔ وہ اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔

''پر تو مجھے ہی کیوں؟ عفت بھی تو تھی گاڑی میں......'' وہ بڑبڑائی۔ اس نے مڑ کر اسے گھورا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ پیاس سے حلق خشک ہونے لگا۔ وہ اسے لے کر ایک ٹرین میں چڑھا تھا۔

☆☆☆

اس نے نوکری چھوڑ دی۔ دلاری کا آپریشن ہو گیا۔ لیکن اس کی بچّی نہ بچ سکی۔ دلاری بھی مرتے مرتے بچی تھی۔ لیکن اس کے ایسی خرابی ہو گئی تھی کہ وہ دوبارہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔

سکندر پشیمان تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ عطو کو واپس چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ عطو کو پنڈ والی بس میں بٹھانے جا رہا تھا، اماں نے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

''وہ لڑکی ہے...... گھر سے اتنے دن دور رہی...... وہاں سب اسے بھاگی ہوئی لڑکی سمجھ کر رو چکے ہیں...... واپس لے کر جائے گا تو مار دیں گے اسے...... تیرے ضمیر کا بوجھ اور بڑھ جائے گا۔ تیرا بھائی عنایت نشئی ہے اسے لڑکی کون دے گا۔ اس سے نکاح کر دیتے ہیں اور خبردار...... کبھی اپنی گاڑی کے مالک سے بھی رابطہ نہ کرنا۔''

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ جو صحن میں بیٹھی سب کے دھلے کپڑے تہ کر رہی تھی اٹھ کر اندر آ گئی۔

''آپ لوگ مجھے میرے پنڈ کیوں نہیں بھیج دیتے اماں جی؟'' وہ رونے لگی۔

''دھیے...... تو کیا کرے گی جا کر...... تیرے ماں باپ پہلے ہی دنیا والوں کی باتیں سن رہے ہوں گے، تو واپس جائے گی تو کون یقین کرے گا اور اگر سچ بولے گی تو یہ سکندر...... ہمارا اکیلا سہارا...... یہ چلا جائے گا سلاخوں کے پیچھے...... ہم عورتوں کی زندگی رل جائے گی اپنی اپنی جگہ۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''اسے کیا مل گیا مجھے اغوا کر کے...... اس نے مجھے اغوا کر کے تاوان لیا ہے ناں میرے گھر والوں سے...... اس کے تو سارے مسئلے حل ہو گئے...... پھر

تاوان کے بدلے مجھے واپس کیوں نہیں کرتا۔'' اس نے نفرت سے سکندر کی سمت دیکھا۔

''نہیں جھلیے...... اس نے کوئی تاوان نہیں لیا تیرے ابا سے...... کسی نے ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھایا...... کسی کو تو کھٹکتی تھی...... تجھے اغوا کسی اور نے کروایا میرے سکندر کو مہرہ بنا کر۔''

''کس نے......؟'' وہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''نفرت اور حسد اپنوں میں ہی ہوتا ہے جھلیے...... تو سیدھی سادی اسے پہچان ہی نہ سکی...... چل چھوڑ...... اب چھوڑ آئی وہ پنڈ...... واپس جا کر ماں پیو کا بوجھ بھی بڑھائے گی...... کون کرے گا گھر سے بھاگی کڑی سے ویاہ اور یہاں ہم سے ہمارا سہارا بھی چھن جائے گا۔''

''میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی، میں کسی کو سکندر کے بارے میں نہیں بتاؤں گی اماں جی...... مجھے جانے دیں...... مجھے اپنا ابا، اپنی اماں اپنا پنڈ بہت یاد آتا ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اماں نے اسے ایک بار پھر ساتھ لگا لیا۔

''چل نہیں بتائے گی...... کر لیں گے سب تیری بات کا یقین...... تیرے ماں باپ کب تک رہیں گے تیرے سر پر...... سب کہیں گے یہ تھی وہ جو گھر سے بھاگ گئی...... کون کرے گا تجھ سے بیاہ...... کوئی ہے وہاں پنڈ میں جو تجھ سے شادی کرے گا؟'' ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس...... دلاور کو تو اماں دھتکار چکی تھی۔

''ضروری ہے کہ بندہ ویاہ کرے۔'' وہ سسکی۔

''تو گھر سے اتنے دن دور رہی ہے کملیے...... ایسی لڑکی کو لوگ باپ کی جاگیر سمجھ کر جینا حرام کر دیتے ہیں...... اکیلی رہے گی تو اور مشکل...... تو جانا...... ایک دن ضرور جانا اپنے پنڈ...... پر ابھی نہیں۔'' اور وہ سمجھ گئی...... ہر طرح سے سوچ کر کبھی خیالوں میں ابا کو ہارٹ اٹیک سے مرتے دیکھا...... کبھی گلی کے لوگوں کو نفرت سے پتھر مارتے دیکھا...... کبھی اماں کو روتے اور دیواروں سے سر پٹکتے دیکھا اور کبھی دلاور کی آنکھوں میں نفرت دیکھی...... اور ان آنکھوں میں نفرت دیکھنے کا تصوّر ہی سوہان روح تھا...... وہ کب دل کی مسند پر براجمان ہوا...... جب خبر ہوئی تو زندگی نے راہیں ہی بدل لیں۔ کبھی جی چاہتا چپ کر کے بھاگ جائے...... کسی بس میں بیٹھ کر پنڈ چلی جائے پر آگے کی سوچ کر قدم جم جاتے۔

☆☆☆

اماں کے دو بیٹے تھے سکندر اور عنایت...... عنایت آوارہ تھا، نشہ کرتا تھا وہ لوگ اسے سرکاری ہسپتال سے گھر لے آئے۔ ہسپتال والے کہتے تھے اس نے جتنا ٹھیک ہونا تھا ہو گیا۔ وہ لوگ جب کراچی آ رہے تھے تب بھی وہ سکندر کے سہارے سے گاڑی میں اترا چڑھا تھا...... پھر آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہونے لگا...... اماں نے عطو کا نکاح عنایت سے پڑھا دیا۔ عنایت نشے میں گھر آتا تو اسے مارتا، کبھی بال کھینچتا...... کبھی کلائی مروڑتا...... وہ بھی پاگل ہونے لگی۔ کبھی گالیاں نکالتی...... کبھی برتن اٹھا کر مارتی۔

''یہ کیا ظلم کیا اماں تو نے...... تیرا عنایت تو ٹھیک نہ ہوا اس نے اس بے چاری کو بھی پاگل کر دیا...... اپنی بیٹی کی جان بچانے کے لیے ہم نے کسی کی دھی کے ساتھ اچھا نہیں کیا...... چھوڑ آتے اس کے پنڈ...... جو ہوتا کم از کم یہ اپنوں میں تو ہوتی۔'' سکندر کو اس پر ترس آ جاتا۔

اماں آنسو بہانے لگتی...... ایک روز اس نے دلاری کو نشانہ بنا ڈالا۔ سکندر اور اماں نے مل کر اسے کمرے میں بند کر دیا۔ اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ عنایت کو پہلے ہی ہوش کب تھا جواب ہوتا...... وہ پاگل بنا دی گئی۔ دو سال ایک کمرے میں زنجیروں میں بند گزار دیے۔

''اماں تو نے اس کی زندگی خراب کر دی، کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے اس کے پنڈ جاؤں، جا کے پوچھوں اس کنٹھے والی سے، کیا مل گیا اسے اس کی زندگی رول کے...... وہ وقت پھسل گیا اماں میرے

ہاتھ سے...... مجبوری کا سودا بہت مہنگا پڑا مجھے۔"

"توُ نے بھی تو غلطی کی...... تو کر لیتا۔ اس سے نکاح۔" اماں سسکتی۔

"ہاں قصوروار تو ہم سارے ہیں۔" وہ باہر نکل جاتا...... پھر وقت تھوڑا اور آگے سرکا۔ وہ بھولنے لگی وہ کون تھی؟ اس کا پنڈ کہاں تھا؟ اس کے اماں ابا کی شکلیں کیسی تھیں؟ کوئی دلاور بھی تھا...... سردی گرمی بہار خزاں آتے رہے جاتے رہے...... اماں مر گئی...... دلاری ایک کونے میں پڑی رہتی۔ سکندر کی شادی نوری سے ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔

اس کی گود میں احمد آ گیا۔ اسے لگا اس نے بھی ابھی ابھی جنم لیا ہو۔ وہ اب وہ پہلے والی عطو نہیں رہی تھی وہ بس احمد کی ماں تھی وہ گھنٹوں اس کو گود میں لیے اس کی خوشبو سونگھتی رہتی۔ کبھی اس کی آنکھیں ابا جیسی لگتیں کبھی عنایت کی اماں جیسی، کبھی اس کے لب اماں جیسے لگتے کبھی عنایت جیسے...... اس کی بیڑیاں بھی کھول دی گئی تھیں۔ اس نے زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

احمد تین سال سات مہینے کا تھا جب عنایت کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اپنوں کو رونے والی عطو...... اس کی موت پر احمد کو سینے سے لگا کر پھوٹ کر روئی۔ وہ منوں مٹی تلے چلا گیا۔ سکندر دوبئی چلا گیا اس نے جاتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھمائی تھی۔

"اس میں تین لاکھ ہیں...... اپنے پنڈ چلی جانا...... تیری سہیلی عفت کو ڈھونڈنا اور یہ تین لاکھ اس کے ہاتھ میں رکھ کر کہہ دینا...... سکندر نے مجبوری کے ہاتھوں جو سودا کیا اس سے کچھ نہیں پایا۔ عطو توُ ہمارے گھر کی عزت ہے اور رہے گی...... احمد کا تایا ہوں میں...... پر اب تو اپنے پنڈ چلی جا میری بہن...... ایک بار جا کر دیکھ تو لے...... کیا پتا کوئی ہو تیری راہ دیکھتا۔"

اس کے سر پر ہاتھ رکھتا وہ رو پڑا...... عطو عفت کے ذکر پر چونک گئی۔

"عفت...... تین لاکھ۔"

"تو سب سمجھ جائے گی...... بس تو عدت پوری ہوتے ہی چلی جانا...... تجھے اپنے پنڈ کی بس میں، میں خود بٹھا کر آؤں گا۔" سکندر اپنے آنسو صاف کرتا باہر نکل گیا اور وہ پوٹلی ہاتھ میں لیے نہ رو سکی نہ پنڈ جانے کی خوشی میں ہنس سکی۔

پانچ سال پہلے جو دروازہ کھلا تھا آج وہ اس کے لیے بند ہو گیا تھا...... وہ دوبارہ پنڈ اپنے گھر کی کنڈی کھڑکانے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"سمجھ تو گئی تھی کہ عفت کا کوئی ہاتھ تھا اس سارے معاملے میں، اس کی عمر کے پانچ سال تھے...... وہ دلاور اور اماں کے ساتھ ساتھ کھانا کھاتے ہوئے گود میں لیٹے احمد کے بالوں میں انگلیاں بھی چلا رہی تھی تاکہ وہ سو جائے۔

"تو چلے گا میرے ساتھ عفت کے گھر؟؟؟" وہ کھانا کھا کر احمد کو سلا کر ویہڑے (صحن) میں آئی تھی۔

"ہاں چل......" وہ کھیڑی پہنتے ہوئے باہر نکلا...... دس پندرہ منٹ بعد وہ عفت کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ وہیل چیئر پر تھی۔ اس کو سنبھالنے کے لیے کوئی رشتے دار عورت وہیں مقیم تھی۔

"توُ...... عطو...... تو زندہ ہے...... توُ۔" وہ سسکنے لگی اپنے گناہوں پر نادم ہاتھ جوڑے وہ عفت ہی تھی۔

"یہ سکندر ڈرائیور نے بھیجا ہے۔ پورا تین لاکھ، اس نے کہا تھا عفت سے کہنا سکندر نے مجبوری کے اس سودے میں صرف خسارہ پایا ہے۔" اس نے پوٹلی عفت کی گود میں پھینکی۔ وہ ساکت ہو گئی۔

"سکندر نے تجھے اس روز کہاں اتارا تھا...... تو اتنے عرصے کہاں رہی عطو؟؟" کئی لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"سکندر میرا جیٹھ ہے عفت...... میں اس کے

چھوٹے بھائی عنایت کی بیوہ...... میرے ساتھ کیا ہوا، میں اتنا عرصہ کہاں رہی۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں...... رب سوہنا گناہ گار کا ساتھ کبھی نہیں دیتا...... شکر خدا کا، میں شریفوں کے ہاتھ لگی...... میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا جیسا زیادہ تر گھر سے غائب ہونے والی یا اغوا ہونے والی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو ہوا میری قسمت میں لکھا تھا۔" وہ بات مکمل کر کے باہر نکل گئی۔

گہری سیاہ گھنگھور گھٹائیں...... ٹھنڈی ٹھار ہوا...... صحن میں لگے ٹاہلی کے درخت سے پتے گر گر ادھر ادھر چکرانے لگے۔

اماں پکوڑے تلنے لگی۔ زیبن شام کی چوائی (دودھ، جو شام کو دوہا جاتا ہے) کے تازہ دودھ سے دودھ پتی بنا رہی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھی آسمان پر بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ چہرہ آسمان کی طرف کیے ایک طویل مدت کے بعد وہ کسی الہڑ کم عمر لڑکی کی طرح ٹانگیں ہلاتی، یونہی خواہ مخواہ مسکرا رہی تھی۔ چند دنوں میں جھلسی رنگت بھی کھل اٹھی تھی، کمزور جسم بھی پھر سے بھر گیا تھا۔ سکون تھا، ایک طویل مسافت کی تھکن اترنے کا احساس تھا۔

"گرما گرم پکوڑے۔" دھواں اور خوشبو اڑاتی تھالی اس کے آگے لہراتے ہوئے دلاور سامنے والی چارپائی پر بیٹھا تھا۔

"مرچوں کے پکوڑے......" وہ بچوں کی طرح مسکراتی ہوئی پوری تھالی تھامنے لگی...... دلاور سے نظر ملی...... وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

"دس سال بعد، زندگی مسکرائی ہے عطو۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا تھا۔

"توُ نے میرا انتظار کیا مگر میں...... میں نے...... یہ احمد...... یہ بچہ...... میری زندگی کا مقصد بن گیا...... میری پہلی اور آخری محبت بن گیا۔" وہ تھالی گود میں رکھ کر سر اٹھائے ایک بار پھر مسکرانے لگی۔ عجیب سی مسکراہٹ...... زخموں اور دکھوں کو یاد کرتی...... چہرے پر بارش کا قطرہ گرا تھا۔

"محبت پہلی اور آخری نہیں ہوتی عطو...... محبت تو محبت ہوتی ہے، رنگ بدلتی ہے، چہرے بدلتی ہے...... وقت بدلتی ہے...... بچہ جب ماں کی محبت میں دن رات اس کا پلو تھامے چلتا ہے تو یہ نہیں جانتا کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ محبت عزت اور احترام میں بدل جائے گی...... ایک اور عورت کی محبت دل کے قریب آ جائے گی...... اور جب وہ اس دوسری عورت کے پیار میں ہوتا ہے تو نہیں جانتا کہ اسی عورت کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ...... کائنات کی ہر محبت سے بڑی محبت کا تحفہ لے کر آئے گا...... محبت صورتیں بدلتی ہے چھلیے...... تقسیم ہوتی ہے، ضرب کھاتی ہے...... جمع ہوتی ہے...... اس سارے چکر میں نہ ماں کی محبت ختم ہوتی ہے نہ اچھی بیوی کی محبت دم توڑتی ہے بس وقت کے ساتھ محبت کا انداز اور شکل بدل جاتی ہے...... آگے ہی آگے تقسیم ہوتی جاتی ہے۔" وہ کسی فلسفی کی طرح بول رہا تھا۔ عطو نے غور سے دیکھا۔ گہرے بھورے رنگ کے کھدر کے شلوار قمیص میں ملبوس پاؤں میں چپل پہنے وہ وہی پرانا دلاور لگ رہا تھا۔

"ہوں......" وہ مسکرانے لگی...... پھر پکوڑے کھانے لگی۔ آلو پیاز ہری مرچوں کے پکوڑے...... زیبن چائے لے آئی۔

"کتنے سالوں بعد اپنی عطو کو ہنستا مسکراتا دیکھ رہی ہوں، سوچتی تھی کہ عطو زندہ ہوتی تو اب تک اس کا کوئی رابطہ ہوتا، کسی کو تو نظر آتی۔" اماں نے اس کے مسکراتے چہرے کو آنکھوں میں محفوظ کیا تھا۔

"اور مجھے اس صحن میں عطو روز نظر آتی تھی۔" دلاور نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"اور اگر مر جاتی تو......؟" بارش کے قطرے آسمان سے زمین تک کا سفر تیزی سے کرنے لگے۔ اماں، زیبن اور احمد برآمدے میں بھاگے تھے۔ دلاور نے چارپائی اٹھائی تھی۔

"تجھے نہیں پتا عطو...... میں تجھے ڈھونڈ تو نہیں

کا پر تیری حفاظت میری دعاؤں نے ہی کی ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں کہتا سر پر منجھی (چارپائی) اٹھائے برآمدے کی طرف بھاگا تھا۔ بارش چھاجوں چھاج برسنے لگی...... جل تھل ہو گیا۔

"تجھے میں ویسی ہی نظر آتی ہوں دلاور...... میں کسی کی بیوی بنی...... ایک بچے کی ماں بنی...... کسی کی بیوہ بن کر عدت گزاری...... تجھے وہی پانچ سال پہلے والی عطو لگتی ہوں...... تیرے لیے وقت رک گیا...... مگر عطیہ ایک عمر گزار کر آئی ہے۔" برآمدے میں کھڑی چائے کی چسکیاں لیتے اس نے دلاور سے پوچھا تھا۔

"میں تیرا آئینہ ہوں عطو...... تو پانچ سال پہلے جو عکس چھوڑ کر گئی تھی، وہ ٹھہر گیا۔ اس آئینے میں کوئی دوسرا اپنا چہرہ دیکھ نہیں سکا...... وقت نے گرد آلود کر دیا یہ آئینہ...... ہاتھ بڑھا کر گرد صاف کر کے دیکھ ...... تجھے تیرا ہی عکس دکھائی دے گا۔" وہ جو کہہ رہا تھا اس کا لفظ لفظ حرف حرف سچ تھا...... اس کے جذبوں کی صداقت پر وہ ایمان لے آئی۔ برسوں بعد برستی بارش نے دل اور دماغ کو تازگی اور خوشی دی تھی۔

دور گندم کے کھیتوں میں احمد اور دلاور سائیکل کی ریس لگا رہے تھے۔ دو پگڈنڈیاں...... دو راستے...... اور ان دونوں کی نظریں سامنے کھڑی عطو کو دیکھ رہی تھیں...... وہ دونوں کی نگاہوں کا مرکز تھی...... وہ دونوں کی محبت تھی...... دونوں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔

"کون جیتا اماں؟" احمد نے دور سے ہانک لگائی تھی۔ اس کے عقب سے دلاور نے احمد کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔

"تو جیت گیا احمد......" وہ اسی زور سے چلائی تھی۔ وہ دونوں قریب آ گئے۔

"اماں نال گل ہو گئی میری عطو (بات ہو گئی)" دلاور سانس لینے رکا۔

"کون سی گل؟" اس کا ماتھا ٹھنکا...... مڑ کر احمد کو دیکھا وہ نانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"جو میں نے تجھ سے پانچ سال پہلے کرنی تھی...... جو نہیں کی پر تو نے سن لی...... تو اب تو ہاں کہہ دے عطو...... اماں تجھ سے میرا رشتہ مانگنے لگی...... پچھ سال پہلے عطو کی اماں نے تو ناں کر دی تھی آج وہ دلاور کی اماں بن کر تجھ سے تیرا ہاتھ مانگے گی تو ناں نہ کرنا عطو...... اب تو احمد بھی راضی ہے۔" وہ منت کرنے لگا۔ وہ سر جھکائے پیپل کے پیڑ سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ جو حیاتی میں دکھ ہوتے ہیں، کیوں ہوتے ہیں دلاور...... یہ ہجر...... یہ دوری...... یہ درد...... میں نے اپنے ابے (باپ) کا آخری وقت نہیں دیکھا...... یہ خیال دل میں دھڑکن روکنے لگتا ہے...... یہ سب کیوں ہوتا ہے؟"

"یہ سب سنگی اور دشمن کی پہچان کے لیے ہوتا ہے عطو...... ہاں...... کبھی کبھی ہم عمر کا ایک حصہ اسی دھوکے میں گزار دیتے ہیں کہ کون سنگی ہے اور کون دشمن۔" وہ اس کے سامنے آ رکا۔

"تو مجھ سے کبھی نہیں پوچھے گا۔ ان گزرے سالوں کی راتیں...... دن، سال، مہینے، کیسے گزرے؟؟؟ آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"تو جو سنائے گی سب سنوں گا...... پر اب آنسو پونچھ دے عطو...... اب رونے نہیں دوں گا۔" اس نے انگلی کی پوروں سے آنسو پونچھے تھے۔

جمعے کی نماز کے بعد نکاح ہوا تھا۔ دلاری اور سکندر بھی آئے تھے۔ وہ رخصت ہو کر کھرلی کی دیوار کے پار چلی گئی۔ اماں نے احمد کو سینے سے لگا لیا۔

"عطو کہیں نہیں گئی، عطو کے ابا...... یہیں ہے۔ میرے پاس، تیرے پاس، اسی پنڈ میں...... اسی ویہڑے میں۔" اور نکاح کے تین بول پڑھنے کے بعد عطو کو بھی یقین آ گیا۔ دلاور سچ میں اس کا آئینہ تھا۔ اس کا عکس ٹھہر گیا تھا اس آئینے میں...... عطو نے دیکھا وہ کملا...... زندگی اور وقت روکے کھڑا تھا اس کے لیے...... اس کی ہنسی پہ وہ مرتا تھا۔ وہ پچیس سال کی عورت اس پینتیس سال کے مرد کی یہ محبت دیکھ کر کسی الہڑ حسینہ کی طرح مغرور ہوئی تھی اور اسے مسکراتا دیکھ کر پورا پنڈ مسکراتا تھا۔

☆

تمثیلہ زاہد

آئینہ دل

عورت کی تذلیل کا حق مرد یوں ادا کرتا ہے جیسے یہ اس کے روزمرہ کے فرائض کا ایک حصہ ہے۔ جس کی ادائیگی اس کے اوپر واجب ہے۔ مرد عورت کے لیے بقایا جات رکھتا ہی نہیں، وہ اپنے تمام ہنر عورت کو نیچا دکھانے کے لیے آزماتا ہے اور عورت...... عورت مسکرا کر اس آزمائش سے گزر جاتی ہے اور مرد یہ سمجھتا ہے کہ یہ عورت ہی ڈھیٹ ہے۔ اپنے دل میں محبت کی تشنگی چھپائے عورت آواز اٹھا لے تو بدزبان کہلاتی ہے اور خاموش ہو جائے تو ڈھیٹ کا لیبل اس کے ماتھے پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

نہ جانے کیوں یہ مشہور ہے کہ عورت کسی حال میں خوش نہیں رہتی۔ یہ تو مرد ہے جو اسے خوش رکھنا نہیں چاہتا، شاید وہ یہ ہنر سیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ ایسے ہنر کو سیکھ لینے میں فائدہ بھی تو نہیں، سراسر نقصان ہے۔ ایک ایسا نقصان ہے جس میں مرد کو عورت کے آگے اپنی انا کی تسکین کو حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ یہ تسکین تو مرد کے لیے وہ امرت ہے جسے پی کر وہ خود کو تازہ دم اور مطمئن محسوس کرتا ہے۔

کچھ اسی اطمینان میں سرفراز بھی آج گھر سے کام کے لیے نکلے تھے اور کومل اپنا ٹوٹا دل لیے ناشتے کے برتن کچن کاؤنٹر پر رکھ کر جوس کے گلاس کے ٹکڑے فرش پر بکھرے دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بہت احتیاط سے گلاس کے ٹکڑے اٹھانے لگی جو اس کے ہاتھ سے گر کر زمین بوس ہوا تھا۔ بس یہ ہی نادانی اس کا وہ جرم تھا کہ سرفراز اسے غصے میں دو چار طنز مار کر ناشتا ادھورا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ تاسف سے اپنے ناکردہ جرم کو فرش پر دیکھ رہی تھی۔

"تم ایک احمق عورت ہو جس سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔"

وہ سسک اٹھی، کانچ کا ایک ننھا ٹکڑا اس کی بے خیالی کا فائدہ اٹھا کر بے دردی سے چبھا تھا۔ اس نے سسک کر دیکھا، انگلی کی دو پوروں پر لال قطروں کی بوند ابھری تھی۔ اس نے اپنے دل کی چبھن کو ٹٹولا جو کانچ کی چبھن سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھی۔ کومل اپنا فرسٹ ایڈ باکس نکال کر لائی اور روئی ڈیٹول میں ڈبو کر اپنا زخم صاف کرنے لگی۔

ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے گھڑی دیکھی جو صبح

کے نو بجا رہی تھی، یہ وقت نیلم کے آنے کا تھا۔ نیلم اس کی کام والی ماسی تھی اور وقت کی بے حد پابند تھی۔ صفائی ستھرائی میں جو سلیقہ نیلم کے ہاتھ میں تھا، وہ کم ہی کام کرنے والی ماسیوں میں ہوتا ہے۔

کومل نے دروازہ کھولا تو نیلم اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ گلابی پھولوں والی چادر اوڑھے اپنی روشن کاجل بھری آنکھیں جھکا کر سلام کرتی ہوئی اندر چلی آئی۔

''یہ کیا ہوا باجی؟''

نیلم کانچ کے ٹکڑوں کو زمین پر دیکھ کر جھٹ جھاڑو لے آئی۔ وہ پھرتی سے فرش صاف کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''میرے ہاتھ سے جوس کا گلاس پھسل کر ٹوٹ گیا تھا۔'' کومل کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔

نیلم نے اچھا کہہ کر کام شروع کر دیا۔ یہ اس کی ایک اور خوبی تھی' اسے بات کریدنے کی عادت نہ تھی۔ بولتی بھی کم تھی، کومل نے مسکرا کر ایک گہری نظر نیلم کے سپید چہرے کی طرف ڈالی جو چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر اب ڈرائنگ روم کی جھاڑو دے رہی تھی۔ بچوں کا پھیلایا سامان بھی اپنی جگہ پر رکھ رہی تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی، پانچ بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر اسے گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ یہاں تین چار فلیٹوں کا کام کر کے وہ کسی کے بنگلے پر شام کا کھانا پکانے کا کام کرنے بھی جاتی تھی۔

آج کپڑے دھونے کا دن تھا۔ وہ اب جھاڑو سے فارغ ہونے کے بعد مشین لگا رہی تھی۔ بچوں نے صبح جو کپڑے اتار کر اسٹینڈ پر رکھے تھے' وہ نیلم کو دے کر کومل نے چولہے پر رکھی چائے کپ میں نکالی۔ نیلم بستر سے چادر اور تکیے کے غلاف خود ہی اتارنے لگی۔ کومل نے مسکرا کر نیلم کی مستعدی کو دل ہی دل میں سراہا اور چائے کا کپ تھامے لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹی وی پر مارننگ شو آ رہا تھا معاً اس کی نظر چائے کے کپ پر ٹھہر سی گئی۔

''کتنی چائے پیتی ہو، چائے نہ ہوئی شربت کا گلاس ہو گیا۔''

کومل نے اپنے ہاتھ میں لیے چائے کے بڑے مگ کو تلخی سے دیکھا۔ ایک بار پھر وہ سرفراز کے کہے جملوں میں کھو گئی۔ سرفراز کے طنز ہوتے ہی ایسے تھے، ان جملوں کے تازیانے اس کے دماغ کی رگوں پر برستے رہتے اور وہ سکون سے عاری تشنہ دل لیے سارا دن یوں ہی سلگتی رہتی۔

☆☆☆

اس کے دونوں بچے بھی اب اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ پہلے شوہر' اب دونوں بچوں کی کسی نہ کسی بات پر تنقید و تضحیک کا نشانہ بنتی رہتی۔ کل ہی کی تو بات تھی' اس نے آلو گوشت بنایا تھا۔

''امی! کل آپ نے آلو قیمہ بنایا تھا، پرسوں آلو کی بھجیا اور آج پھر آلو......'' دس سالہ کاشف نے برا منہ بنا کر اپنے آگے سے پلیٹ کھسکا دی۔

''بیٹا اس میں گوشت بھی ہے۔''

''میں روز روز آلو نہیں کھاؤں گا۔ آپ حرا خالہ کی طرح پیزا، برگر کیوں نہیں بناتیں۔''

''بیٹا تمہاری ماں کو یہی کچھ آتا ہے، ہزار طرح کے کھانوں کی تراکیب اب ٹی وی چینل پر دکھائی جاتی ہیں مگر کہاں ......وہی روٹین کی دال سبزی۔''

''آپ ہر ویک اینڈ پر پاپا کے ساتھ پیزا برگر کھا تو لیتے ہو۔ سبزی، دال، گوشت، ہر چیز کی غذائیت جسم کو ملنی چاہیے۔ اب اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لو کھانا۔'' بیٹے کی ناشکری اور شوہر کے طنز پر دل کو لگی ٹھیس دل میں چھپائے وہ پیار محبت سے بیٹے کو پچکارنے لگی تھی۔

وہ یوں ہی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے چائے کا آخری گھونٹ حلق کے نیچے اتار چکی تھی، سرفراز جس دن گھر سے ناراض ہو کر نکلتے تھے، وہ یوں ہی کھوئی کھوئی سی رہتی۔ سرفراز اور بچوں کو خوش کرنے کے طریقے سوچتی رہتی۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے موبائل پر فیس بک آن کیا اور پیزا، رشین سلاد کی تراکیب نکال کر اجزاء نوٹ کرنے لگی۔ میٹھے میں ٹرائفل کا سوچ کر اس نے مطمئن ہونے کی سعی میں اپنے تشنہ دل کو تھپکی دی تھی۔

نیلم سے گھر کا کام کروانے کے بعد بچوں کی اسکول وین آنے سے پہلے وہ سپر اسٹور جو گھر کے قریب ہی تھا، سارا سامان لے آئے گی۔ کومل نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑی لسٹ کی طرف دیکھا۔ کہیں کوئی چیز لکھنا تو نہیں وہ بھول گئی۔

میدہ، چیز، میکرونی، کریم، پائن ایپل، فروٹ کاک ٹیل، مختلف ساسز وغیرہ ملا کر تقریباً سات ہزار کا سامان تھا۔ اس نے سوچا اتنی رقم میں تو گھر کی ایک دعوت نمٹائی جا سکتی ہے لیکن خیر چلو کوئی بات نہیں۔ شوہر اور بچے تو خوش ہو جائیں گے، کولڈ ڈرنک لکھنا وہ بھول گئی تھی اس نے وہ بھی لسٹ میں شامل کر دی۔ لسٹ اپنے پرس میں رکھ لینے کے بعد وہ دوبارہ نیلم کی طرف متوجہ ہو گئی، جو عام دنوں کے مقابلے میں آج کچھ سست دکھائی دے رہی تھی۔ شاید موسمی بخار کا اثر تھا جو پچھلے ایک ہفتے سے اسے پریشان کر رہا تھا۔ نیلم کو اس کے پاس کام کرتے ہوئے چار ماہ ہی ہوئے تھے۔

''نیلم! طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟'' کومل نے اس کا سفید چہرہ دیکھا جس میں زردی گھلی ہوئی تھی، وہ تار پر کپڑے پھیلاتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے باجی۔'' نیلم کے چہرے پر پھیکی ہنسی پھیل گئی۔

''بچے ٹھیک ہیں؟'' کومل نے پھر پوچھا۔

''جی۔'' اس نے اب نظریں چرائیں۔ کومل پلٹنے لگی تو وہ پھر بولی۔

''سنیں باجی۔'' اس کی آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔

''ہاں بولو، کیا بات ہے؟'' کومل نے پلٹ کر سوالیہ انداز میں اس کے کانپتے ہونٹوں کو دیکھا تھا۔

''باجی' دوائی اور ڈاکٹر کی فیس میں سارے پیسے ختم ہو گئے ہیں، اللہ کا شکر ہے چٹنی نمک مرچ سے روٹی کھا کر گزارہ ہو رہا تھا لیکن اب دال آٹا کے نام پر ایک دانہ گھر میں نہیں بچا۔ آپ اگلے ماہ کے پیسے ابھی دے دیں تو بچوں کے لیے آج دال چاول لے جاؤں گی۔'' وہ خودداری کی دیوار پھلانگتے ہوئے بولی۔

اس کے لہجے میں چھپے کرب کو محسوس کر کے کومل کا دل کٹ سا گیا۔ نیلم کا کام ختم ہو چکا تھا۔ کومل نے سوچا اس کا کام تو اب شروع ہوا ہے۔ ہم کیسے ناشکرے لوگ ہیں، رزق پر راضی رہنا' توکل کا یہ انداز کوئی ان سے سیکھے جو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنی روزمرہ میں ہونے والی معمولی معمولی باتوں کو دل سے لگا کر آس پاس والے لوگوں کے دکھوں کو نظر انداز کر بیٹھی تھی۔ پچھلے دنوں جب نیلم کی طبیعت خراب تھی اور وہ روز کام پر بھی آ رہی تھی، اسے اس بات کا خیال تک نہ آیا کہ وہ اس کی کچھ مدد کر دے۔ نیلم کی باتیں سن کر اسے اپنے تشنہ دل کی تشنگی کھوکھلی سی لگی۔ اپنی پریشانیوں اور مشکلات کے آگے سر اٹھا کر کیسے جیا جاتا ہے وہ آج سیکھ گئی تھی۔

کومل نے اپنے پرس میں رکھی لسٹ چیک کی اور نیلم کے ہمراہ قریبی سپر اسٹور چلی گئی۔ واپسی پر کومل کے ہاتھ میں اپنی لسٹ کے سامان کے ساتھ ساتھ نیلم کے لیے مہینے بھر کے راشن کا سامان موجود تھا۔ نیلم کو بڑے بڑے شاپر تھما کر کومل کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں اتری ساری تشنگیاں ختم ہو گئی ہیں۔

رائیگانی سی رائیگانی ہے
یا کوئی اور بھی کہانی ہے

یہ جو آتش کدہ ہے سینے میں
یہ کسی اور کی نشانی ہے

دھیان رکھنا ہے اُس چراغ کا بھی
آگ چولہے میں بھی جلانی ہے

بات اک دل دُکھا رہی ہے مرا
پر وہ تم کو نہیں بتانی ہے

دوسری تاج دار شہزادی
اس کہانی میں آگے آنی ہے

چشمِ گریہ ہزار بھید ترے
آگ نیلی ہے، لال پانی ہے

اب کے جانا ہے اُس طرف کامی
ساتھ زنجیر کھینچ لانی ہے

سید کامی شاہ

بس ذرا دیر جی کر ہی مر جائیں گے
ایک وعدہ کریں گے مکر جائیں گے

قافلہ راستے ہی میں لٹ جائے گا
قافلے کے کئی لوگ مر جائیں گے

ہم کہ زندانِ ہستی میں پابند ہیں
ایک دن لوٹ کر اپنے گھر جائیں گے

زندگی ایک پل کو ٹھہر جائے گی
اور ہم زندگی سے گزر جائیں گے

شام ہونے تو دیں، عمر ڈھلنے تو دیں
جتنے دریا ہیں، سارے اُتر جائیں گے

اُس طرف ایک غنچہ کھلے گا علیؔ
اِس طرف کتنے چہرے نکھر جائیں گے

علی کونینؔ

اس رات سے کہہ آہستہ چلے
ہم دو بچھڑے مل بیٹھے ہیں
کچھ درد پرانے کہتے ہیں
قصے ہیں بہت جو رہتے ہیں
اس رات سے کہہ، آہستہ گزر
پھر کون بھلا یوں ملتا ہے
کب یہ چاک دل کا سلتا ہے
کب پھول خزاں میں کھلتا ہے
اے رات ذرا آہستہ ڈھل
کچھ قرض دے، ہم کو لمحوں کا
کچھ مرہم دل کے زخموں کا
کوئی رنگ پرانے نغموں کا
اے دل ذرا سی دیر ٹھہر
اے رات! ذرا سی دیر ٹھہر
اے رات! ذرا سی دیر ٹھہر
اے رات! ہمیں یوں دور نہ کر

غزالہ نگار اورکزئی

کہیں چھت تھی، دیوار و در تھے کہیں، ملا مجھ کو گھر کا پتا دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے، مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

ہوا نہ کوئی کام معمول سے، گزارے شب و روز کچھ اس طرح
کبھی چاند چمکا غلط وقت پر، کبھی گھر میں سورج اُگا دیر سے

یہ سب اتفاقات کا کھیل ہے، یہی ہے جدائی، یہی میل ہے
میں مڑ مڑ کے دیکھتا گیا دور تک، بنی وہ خموشی صدا دیر سے

کہیں رک گئے راہ میں بے سبب، کہیں وقت سے پہلے گھر آگئی شب
ہوئے بند دروازے کھل کھل کے سب، جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

سجا دن بھی، روشن ہوئی رات بھی، بھرے جام، لہرائی برسات بھی
رہے ساتھ کچھ ایسے حالات بھی، جو ہونا تھا جلدی، ہوا دیر سے

بھٹکتی رہی یوں ہی ہر بندگی، ملی نہ کہیں سے کوئی روشنی
چھپا تھا کہیں بھیڑ میں آدمی، ہوا مجھ میں روشن خدا دیر سے

ندا فاضلی

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انسان کے بدن کے (تین سو ساٹھ جوڑوں میں سے) ہر جوڑ پر اس دن کا صدقہ واجب ہے، جس میں سورج طلوع ہوتا ہے۔ اور لوگوں کے درمیان انصاف کرنا بھی ایک صدقہ ہے۔"

تشریح:۔ یعنی جو صدقہ واجب ہے، وہ لوگوں کے درمیان عدل کرنے سے بھی ادا ہو جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ بھی ہے کہ لوگوں کے درمیان انصاف کیا جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا صدقہ ہی ہے جس کے نتائج بہت دور رس ہوتے ہیں۔ اسی لیے آپس میں میل ملاپ کرا دینے کو نفل نماز اور نفلی روزہ سے بھی زیادہ اہم عمل بتایا گیا ہے۔

صبرِ ایوبی،

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری جب بہت بڑھ گئی تو آپ کی بیوی نے کہا۔

"کیا آپ نے اللہ سے دعا نہیں کی تھی کہ وہ آپ کو شفا دے۔"

آپؑ نے فرمایا۔ "ہاں کی تھی۔"

وہ بی بی کہنے لگیں۔ "لیکن آپؑ کی بیماری تو پہلے کے مقابلے میں کچھ اور بڑھ گئی ہے۔"

حضرت ایوبؑ نے فرمایا۔ "نیک بخت! ہم برسہا برس تک آرام و آسائش، راحت و عافیت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر اگر ہم پر مصیبت آپڑی ہے تو اسے صبر و شکر سے برداشت نہ کریں۔"

حنا سلیم اعوان۔ اعوان باندی ہری پور

اللہ کے قریب،

اگر کہیں شک بھی ہو جائے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے قریب ہے تو اس کے قریب ہو جاؤ۔

(واصف علی واصف)

گل مینا خان، حسینہ علی۔ مانسہرہ

تشخیص،

ڈاکٹر نے اپنے ہونے والے داماد کو دیکھ کر اپنی بیٹی سے کہا۔

"روزی! کیا تم نے اس الو کے پٹھے کو بتا دیا ہے کہ میں اسے کیا سمجھتا ہوں۔"

"یس ڈیڈی!" روزی بولی۔ "وہ کہتے ہیں کہ حسبِ معمول آپ کی تشخیص غلط ہے۔"

اعتماد،

ایک انجینئرنگ کالج کے تمام اساتذہ کو سیر پر لے جانے کے لیے ایک جہاز میں بٹھایا گیا۔ جب تمام اساتذہ بیٹھ گئے تو پائلٹ نے خوشی اور جوش بھرے لہجے میں اعلان کیا۔

"آپ تمام محترم اساتذہ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ جس جہاز میں آپ بیٹھے ہیں، اسے آپ ہی کے کالج کے ذہین طالب علموں نے بنایا ہے۔"

بس پھر کیا تھا، اتنا سنتے ہی تمام اساتذہ اس خوف سے نیچے اتر گئے کہ کہیں جہاز حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔

لیکن پرنسپل صاحب بیٹھے رہے۔ یہ دیکھ کر پائلٹ ان کے پاس آیا اور دریافت کیا۔

"سر! کیا آپ کو ڈر نہیں لگتا ہے۔"

پرنسپل نے دل کو چھو لینے والا جواب دیا۔

"مجھے اپنے کالج کے اساتذہ سے بھی زیادہ اپنے طالب علموں پر اعتماد ہے۔ دیکھ لینا یہ اسٹارٹ ہی نہیں ہوگا۔"

عاشقِ صادق،

ایک بار مرزا مسکین کی محبوبہ نے مرزا سے کہا۔

"دوسرے عاشقوں کے برعکس جو محض اپنی محبوباؤں سے یہ کہتے ہیں کہ ہم آسمان سے تارے توڑ لائیں گے یا فرطِ جذبات میں آکر آسمان سے چاند اُتارنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

آپ میرے لیے کچھ ایسا کر سکتے ہیں جو حقیقی بھی ہو اور ان سے بڑھ کر بھی ہو؟"

اس پر مرزا صاحب بڑے اطمینان سے بولے۔

"میں تمہارے قدموں تلے جنت لا سکتا ہوں۔"

جوانی اور بڑھاپا،

میں ذرا قریب ہو گیا اور کہا کہ "جوانی اچھی ہوتی ہے یا بڑھاپا؟"

اس نے کہا۔ "جوانوں کے لیے بڑھاپا اور بوڑھوں کے لیے جوانی۔"

میں نے کہا۔ "وہ کیسے؟"

بولا۔ "بوڑھے اگر جوان ہو جائیں تو وہ اپنی پہلے والی غلطیاں شاید دوبارہ نہ دہرائیں اور اگر جوان بوڑھوں کو تجربے کے طور پر لیں تو ان کی جوانی بے داغ اور بے عیب گزرے۔"

(زاویہ سوئم پندرہ روپے کا نوٹ۔ اشفاق احمد)

نوال افضل گھمن۔ کراچی

فرمائش،

میری شام کو سنوار دو، میری رات کو قرار دو
مجھے یو پی ایس ادھار دو، یا جنریٹر ہی سے تار دو

اقوالِ زریں،

٭ جو خوب غور و فکر کرتا ہے وہ پیش گوئی کر سکتا ہے۔

٭ دوست کو اپنے حال سے اتنا ہی واقف کرو کہ اگر دشمن بھی ہو جائے تو نقصان نہ پہنچا سکے۔

٭ اگر غرور کوئی علم ہوتا تو اس کے سند یافتہ بہت ہوتے۔

٭ انسان کے پست ارادے اور ادنیٰ خیالات جس قدر کامیابی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اس قدر کوئی بیرونی مخالفت مزاحمت نہیں کرتی۔

٭ اپنے مخالف کو دلائل و براہین سے قائل کرو نہ کہ زور و شور سے۔

(ہربرٹ اسپنسر)

اقصیٰ ناصر، عذرا ناصر۔ گلستان جوہر

خواہش،

لڑکی:۔ لڑکے سے! "تمہیں کیسی لڑکی چاہیے؟"

لڑکا:۔ "ایک ایسی لڑکی جو پیار دے...

ایک ایسی لڑکی جو خدمت کرے...

ایک ایسی لڑکی جو کھانا ٹائم پر دے..."

لڑکی:۔ "اور...؟"

لڑکا:۔ "بس یہ تینوں مل جل کر رہیں۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

کرنیں،

٭۔ اہمیت دکھ کی نہیں، دکھ دینے والوں کی ہوتی ہے۔

٭۔ جذبے لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے، نہ ہی ہندسوں کی مدد سے ان کی سچائی اور گہرائی معلوم کی جا سکتی ہے۔

٭۔ اخلاق کا اچھا ہونا قربِ الٰہی کی دلیل ہے۔ جس میں دریا جیسی سخاوت، آسمان جیسی وسعت اور زمین جیسی تواضع ہو۔

٭۔ بددعا کبھی زبان سے نہیں دی جاتی۔ بلکہ دکھا ہوا دل خود ایک بڑی بددعا کی راہ گزر بن جاتا ہے۔

- جن سے ہم محبت کرتے ہیں، انہیں کبھی بھلا نہیں سکتے۔ اور جن سے نفرت کرتے ہیں وہ تو بالکل ناقابلِ فراموش ہوتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ،

- زندگی کا مفہوم سمجھ میں آتے آتے ساری زندگی بیت جاتی ہے۔
- جو لوگ خود سے ہم کلام رہتے ہیں، وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔
- جو لوگ ہنسنا بھول جاتے ہیں، وہ کھنڈر ہو جاتے ہیں۔

- دوست وہ ہے جو تمہارے مزاج کے ہر موسم کو ہنس کر سہہ جائے۔
- جو راستوں کے عشق میں گرفتار ہوتے ہیں، منزلیں ان سے دور ہو جایا کرتی ہیں۔
- کامیابی کے شہر میں شکست، مایوسی، محنت اور ہر قسم کے دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
- بڑا آدمی وہ ہے، جو ہر آدمی کے اندر بڑائی کا احساس پیدا کرے۔

سمجھ دار بیوی،

میاں جی اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جبکہ بیگم صاحبہ کینو کھا رہی تھیں اور فون پر ٹیکسٹ بھی کر رہی تھیں۔

میاں جی کے موبائل پر میسج ٹون سنائی دی۔ ان کا موبائل کچن میں چارجنگ پر لگا تھا۔ وہ بادل ناخواستہ اٹھ کر کچن میں میسج پڑھنے گئے۔ میسج بیگم کی طرف سے تھا۔ "واپسی پر نمک لیتے آیئے گا۔"

فرق،

ٹامسن ایک امریکی فوجی تھا۔ اس کی ڈیوٹی کیلی فورنیا کے صحرائے موجاوی میں تھی۔ اس کی بیوی اپنے شوہر کے پاس گئی۔ اور قریب کی بستی میں مکان لے کر رہنے لگی۔ گرمی، ریت اور آندھی کے ساتھ ساتھ اسے وہاں تنہائی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کے شوہر کا زیادہ وقت فوجی گشت میں گزرتا تھا۔ وہاں اس کے پڑوسی انگریزی بھی نہیں جانتے تھے۔ ان سے دوستی بھی نہ ہو سکی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گھر واپس چلی جائے۔ اس نے اپنے والد کو خط لکھا۔ اس کے باپ کا جواب تھا۔ بہت مختصر جواب۔ صرف دو سطریں تھیں۔

"دو آدمیوں نے قید خانے کے جنگلے سے باہر نظر ڈالی۔ ایک کو کیچڑ دکھائی دی۔ دوسرے کو ستارے۔"

ان دو سطروں نے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔

اس نے کیچڑ کے بجائے ستاروں کو دیکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ مقامی لوگوں کی زبان سیکھی۔ صحرا میں ڈوبتے ابھرتے سورج کے حسن کا مشاہدہ کیا اور دھیرے دھیرے وہ وہاں کے ماحول میں اتنی رچ بس گئی کہ جب اس کا شوہر ریٹائر ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ زندگی اسی مقام پر گزاریں گے۔

زیادہ اہم یہ نہیں ہے کہ ہمیں کن خرابیوں کا سامنا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان خرابیوں میں خوبیاں کس طرح تلاش کرتے ہیں۔

موتی،

- اگر ہم سے غلطی ہو جائے تو ابلیس کی طرح دلیر نہیں ہونا چاہیے بلکہ معافی مانگنا چاہیے۔ کیونکہ ہم ابنِ آدم ہیں، ابنِ ابلیس نہیں۔ (امام غزالیؒ)
- صرف ایک ہی شخص تمہیں کامیاب کر سکتا ہے اور وہ ہو تم خود۔ (بل گیٹس)

اقراء عزیز۔ گاؤں حدیا خان جلبانی

❋

میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

توقیر ہاشمی ______ منڈی بہاؤالدین

وہ گفتگو جو تھی ہم میں، وہ ناتمام رہی
جو عاشقی تھی ہماری یہاں تمام ہوئی
عجیب بات ہے، لیکن یہی ہوا تابش
مری کہانی ترے نام پر تمام ہوئی

خزیمہ ریاض ______ گاؤں سدوکی گجرات

کون سی بات ہے تم میں ایسی
اتنے اچھے کیوں لگتے ہو!
رات ہمیں کچھ یاد نہیں تھا
رات بہت تم یاد آتے ہو

اقصیٰ ہابیل ______ کمالیہ

کبھی جھکنے کی تمنا، کبھی سرکش لہجہ
اپنی الجھی ہوئی عادت پہ رونا آیا

رمشہ زاہد ______ مانانوالہ

سو میں نے بات بدل دی گلے لگا کے اسے
درست شخص، غلط بات پر اڑا ہوا تھا

نادیہ اشرف ______ رائے ونڈ

بس اک اسی پہ تو پوری طرح عیاں ہوں میں
وہ کہہ رہا ہے مجھے رائیگاں، تو ہاں ہوں میں
میں خود کو تجھ سے مٹاؤں گا احتیاط کے ساتھ
تو بس نشان لگا دے، جہاں جہاں ہوں میں

اقرا جبٹ ______ سنجن آباد

جلتے گھر کو دیکھنے والو، پھونس کا چھپر آپ کا ہے
آگے پیچھے تیز ہوا ہے، آگے مقدر آپ کا ہے
اس کے قتل پہ میں بھی چپ تھا، میرا نمبر اب آیا
میرے قتل پہ آپ بھی چپ ہیں، اگلا نمبر آپ کا ہے

سونیا یسین ______ خیرپور ٹامیوالی

تم سے پہلے جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

فائزہ بھٹی ______ پتوکی

مسافتوں میں کبھی یوں بھی معتبر ٹھہروں
کہ دو قدم ہی اس کا ہم سفر ٹھہروں
تم ہی بتاؤ صبا کس طرح یہ ممکن ہے
وہ میرے شہر میں آئے میں بے خبر ٹھہروں

عائشہ رباب ______ کراچی

اٹھانا خود ہی پڑتا ہے، تھکا ٹوٹا بدن اپنا!
کہ جب تک سانس چلتی ہے، کوئی کاندھا نہیں دیتا

ہما فاروق ______ گوجرانوالہ

زمیں پہ رہ کے ستارے شکار کرتے ہیں!!
مزاج اہلِ محبت کا آسمانی ہے

فرحانہ ناز ______ گوجرہ

ہم کریں بات دلیلوں سے تو رد ہوتی ہے
اُن کے ہونٹوں کی خموشی بھی سند ہوتی ہے

فائزہ بھٹی ______ پتوکی

مشکل کہاں تھے ترکِ تعلق کے سلسلے
مگر سوال اے دل تیری زندگی کا تھا

اقصیٰ ناصر ______ گلستان جوہر

کون اب روز روز یاد کرے
ہم اسے حفظ کر کے بیٹھے ہیں

طٰہٰ مصطفیٰ ______ فاروق آباد

آپ ہی کی عدالت، آپ ہی منصف بھی ہیں
یہ تو کہیے آپ کے عیب و ہنر دیکھے گا کون

تسنیم کوثر ______ کراچی

اس نے پھر یاد کیا ہے شاید
دل دھڑکنے کی صدا آئی ہے

❋

خواتین کی ڈائری

امت الصبور

حمدہ واجد خان کی ڈائری سے

موجودہ حالات کی عکاسی کرتی یہ نظم میں نے ٹی وی پر مصدق ملک سے سنی۔ قارئین کی نذر۔

کسی کو کوئی یہ کیسے بتلائے
ہوائیں اور لہریں کب کسی کا حکم سنتی ہیں
ہوائیں حاکموں کی مٹھیوں میں
ہتھکڑی میں، قید خانوں میں نہیں رکتیں
یہ لہریں روکی جاتی ہیں تو دریا جتنا بھی ہو پُرسکوں
بے تاب ہوتا ہے
اور اس بے تابی کا اگلا قدم
سیلاب ہوتا ہے
کسی کو یہ کوئی کیسے بتائے

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

کتابوں کی دُنیا بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ وہاں دوسروں کی زندگی ہوتی ہے۔ ان کے دُکھ، سُکھ، محبتیں، نفرتیں، رقابتیں اور انسان ان ہی میں کہیں اپنی کیفیات بھی محسوس کرتا ہے۔ محبوب خزاں کی اس غزل میں جمال آفرینی کے ساتھ فنکارانہ حسن بھی ہے۔

حسن جیسی سادگی اچھی لگی
ایک صورت تھی۔ بھلی اچھی لگی

سب کو ہوتی ہے خوشی اپنی عزیز
مجھ کو بھی اس کی خوشی اچھی لگی

سچ تو یہ ہے چار دن کے بعد بھی
چار دن کی چاندنی اچھی لگی!

زندگی بھر ہم کتابوں میں رہے
دوسروں کی زندگی اچھی لگی

تھی بڑی سوداگری چاروں طرف
اپنی کم مائیگی اچھی لگی

اس کو دیکھا کیا، اس کے ہو رہے
عمر بھر کی نوکری اچھی لگی

جس کو جس سے جو ملا اس کا نصیب
مجھ کو تو اس کی ہنسی اچھی لگی

شاعری جب چھوڑ دی میں نے خزاں
ان کو میری شاعری اچھی لگی

فرزانہ انصاری کی ڈائری سے

جون ایلیا کی شاعری میں زندگی کے سب دُکھ، سارے سلسلے، سب رویے دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کے کرب کو — انہوں نے جس شدت سے محسوس کیا، اس کا پوری سچائی کے ساتھ شاعری میں اظہار کر دیا ہے۔ ان کی یہ غزل قارئین کی نذر۔

لمحے لمحے کی نارسائی ہے
زندگی حالتِ جدائی ہے

مردِ میداں ہوں اپنی ذات کا میں
میں نے سب سے شکست کھائی ہے

جان پہ تیرے وصل کے ہنگام
تیری فرقت کہاں سے آئی ہے

اب یہ صورت ہے جانِ جاں کہ تجھے
بھولنے میں میری بھلائی ہے

خود کو بھولا ہوں، اس کو بھولتا ہوں
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

عذرا ناصر اقصیٰ کی ڈائری سے

حوادثِ زمانہ کی آندھی راستوں کو بدل دے تو دل بھی بدل جاتے ہیں۔ پہلا سا التفات نہ سہی، تھوڑی سی مروت بھی۔ دلوں کے لیے اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ فاطمہ حسن اس غزل میں یہی کہہ رہی ہیں۔

جاتا ہے جو گھروں کو وہ راستہ بدل دیا
آندھی نے میرے شہر کا نقشہ بدل دیا

جن سے شناخت تھی، وہ حوالے مٹا دیے
اس نے کتابِ ذات کا صفحہ بدل دیا

کتنا عجیب ہے وہ مصور کہ غور سے
دیکھا جو خدوخال تو چہرہ بدل دیا

آساں کب ہے اس کے لیے طرزِ التفات
یہ بھی بہت ہے اس نے رویہ بدل دیا

وہ کھیل تھا، مذاق تھا یا خوف تھا کوئی
اک چال چل کے اس نے خود مہرہ بدل دیا

کرتا رہا اسیری کے احساس کو شدید
زنجیر کھول دی، کبھی پہرہ بدل دیا

ریحانہ چوہدری کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر صابر ظفر کی یہ غزل قارئین کے لیے۔

آخری گفتگو الوداع
اب نہیں مجھ میں تو الوداع

کنجِ خلوت میں خوش آمدید
دہر کے روبرو الوداع

مجھ کو رفوگر سے مت چھین دل
ہو چکا جو رفو الوداع

ڈوب دیکھا تری موج میں
تو ہے خشک آبِ جو الوداع

میں ہوں زرخیز رُت کا نقیب
موجۂ بے نمو الوداع!

اے دوست آ رہا ہے قریب
اے فراق، اے عدو الوداع

آرزو بھی تو ہے اک خمار
توڑتا ہوں سبو الوداع

مرگ آثار سانسیں ظفر
اک صدا چار سو الوداع

✷

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------------- سونیا آصف
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ----------- موسیٰ رضا

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

مسرت الطاف احمد ...... کراچی

سالگرہ نمبر کے حوالے سے اس بار ناولٹ کچھ خاص متاثر نہ کر سکے البتہ سلسلے وار ناولز اور مکمل ناول زبردست لگے۔

"دشت جنوں" ہمارے شک کی تصدیق ہوگئی وسامہ کو مارنے میں آئے کت کا ہی ہاتھ ہے۔ آیو شمتی خود کون ہے، کیا ہے، یہ ابھی غور طلب ہے خیر وہ روح یا کوئی آسیب ہو ہی نہیں سکتی۔ "حالم" میں ایڈم اور تالیہ کی نوک جھونک اس پورے ناول کی جان ہے۔ "اعتبار کے رنگ" اسٹوری میں کوئی نیا پن نہیں تھا لیکن پڑھنے میں مزا آیا۔ "الجھے دھاگے" یہ تحریر کچھ خاص متاثر نہ کر سکی، تھیم سمجھ سے باہر تھا۔ "کاوش بے سود" فنٹاسٹک تحریر تھی، بہت ہی جان دار اسٹوری تھی۔ اس تحریر کے ہر رنگ کو میں نے بہت دل سے محسوس کیا، چاہے وہ ادب کا رنگ ہو یا حسد کا، محبت کا ہو یا نفرت کا۔ "اذنِ عشق" روایتی اسٹوری تھی لیکن طرز تحریر پسند آیا، اینڈ میں کچھ ویک پوائنٹس تھے۔

افسانوں میں "دل سے بھی" اے ون رہا، یونیک اسٹوری تھی۔ "بھیگی بلی" لاجواب تحریر تھی، مزا آ گیا۔ "پڑھو، سوچو اور لکھو" سمیرا احمید نے زبردست انداز میں لکھا ہے۔

❖ پیاری مسرت! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی تحریر شامل نہ کر سکے، اس کا ہمیں بھی افسوس ہے مگر کیا کریں، صفحات کی مجبوری آڑے آتی ہے۔

ناہید اسماعیل ...... کراچی

ہمارے بے حد محترم مدیر نے ہم قارئین سے رائے لے کر ہمیں جو اہمیت اور مان بخشا ہے اس پر دل تشکّر سے بھر گیا۔ قاری کا اتنا احساس و خیال، یہ وضع داری آپ ہی لوگوں کا خاصہ ہے دیگر رسائل کی قیمتیں تو کب کی بڑھ چکیں، ہماری رائے میں تو قیمت بڑھنی چاہیے۔ "حالم" ہمیشہ کی طرح زبردست، کہانی کی سطر سطر دلچسپی اور تجسس سے بھرپور ہے۔ "دشت جنون" بھی اختتامی موڑ پر لگ رہا ہے۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول "کاوش بے سود" بہترین تحریر تھی۔ بشریٰ احمد کی تحریر "اعتبار کے رنگ" بہت ہی پسند آئی۔ سالگرہ نمبر میں راشدہ رفعت کی کمی محسوس ہوئی۔ "ایک سودا کیا تھا" نازیہ رزاق نے بہت اچھا لکھا، ان کی تحریر میں سمیرا احمید کے انداز کا رنگ جھلکتا محسوس ہوا۔

افسانوں میں "دل سے بھی" اچھا لگا لیکن ایسی مائنڈ ریڈر صلاحیت پر تو مختصر افسانے کے بجائے ناول بنتا ہے جناب۔ "ایک تھی چھوٹی" مختصر سی تحریر پسند آئی۔ "الجھے دھاگے" پڑھتے ہوئے معلوم نہیں کیوں بے نام سی الجھن محسوس ہوتی رہی۔ "اذنِ عشق" کہانی ٹھیک ہی تھی جبکہ اندازِ تحریر اچھا ہے۔ "آخری نقش" بھی بہتر لگی، "بھیگی بلی" کا اختتام پڑھ کر مزا آ گیا۔ انیقہ امیر علی سے ملاقات کافی اچھی رہی۔ شاہین رشید کا انٹرویو...... ہمم...... وہ آپی! آپ ہم قارئین کے ذمے لگادیں، میں تو ابھی کے ابھی کچھ اہم سوال کر لیتی ہوں وہ یہ کہ......

1) آپ ہمیشہ انٹرویو لیتی ہیں، کبھی دینے کا بھی دل چاہا؟

1) کس قسم کی شخصیات کے انٹرویوز لینے میں مزا آتا ہے۔ شوبز، سیاسی شخصیات، کھیل، ڈاکٹرز، انجینئرز، سائنسدان، پروفیسرز یا رائٹرز؟

3) وہ کون سی شخصیت ہے جس سے ملنے کے بعد انٹرویو لینے کے بجائے آپ کا دل چاہا کہ اسے کوٹ کے رکھ دیں؟ (ہاہاہا)۔

سوال نمبر ۳ لازمی ہے، جواب نہ دیا تو باقی کے دو سوالوں کے نمبر بھی کٹ جائیں گے (ہاہاہا)۔ باقی مستقل سلسلے بھی اچھے رہے۔ سروے کے سوال و جواب دونوں اس بار بھی بہت دلچسپ تھے۔

❖ پیاری ناہید! شاہین رشید کے لیے آپ نے سوال تو بہت مزے دار لکھے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ شاہین تو انٹرویو دینا ہی نہیں چاہتیں۔ ہمارے اصرار کے باوجود وہ راضی نہیں ہوئیں۔

سالگرہ نمبر کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

اقراء اقبال + اقصیٰ اقبال ...... لاہور

کہنی سنی میں جو قارئین سے رائے مانگی گئی ہے تو ہماری رائے یہ ہے کہ کاغذ کی ہوش ربا گرانی و کمیابی کا مقابلہ آپ ڈائجسٹ کی قیمت بڑھا کر لیں۔ سروے (دیپ محبت کے جلتے رہیں) میں سب سے اچھے جوابات افشین نعیم کے لگے۔ آپ سے پوچھنا تھا کہ اس سروے میں اول کون آیا اور اسے کیا انعام ملا؟ ہمیں تو سروے میں شامل ہونے کا موقعہ نہیں مل سکا لیکن آپ نے جو سوال پوچھا تھا کہ ہیرو ہیروئن سے ہٹ کر کس کردار نے متاثر کیا تو ہمارا جواب ہے کہ (یارم) کا کردار "سائی" ناقابل فراموش اور اچھوتا کردار تھا۔

اکثر ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم اپنے مقابل کے ذہن کو پڑھ سکیں کہ ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے مگر سمیرا حمید کا "دل سے بھی" افسانہ پڑھ کر بے ساختہ رب کریم کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہی ہے کہ ہمیں اللہ نے اس صلاحیت سے محروم رکھا ہوا ہے وگرنہ تو ہم کڑھ کڑھ کر ہی ہلاک ہو جاتے۔ عفت سلطانہ کا "ماڈل" پڑھ کر ہم سوچ میں پڑ گئے کہ آخر اس کہانی کا مقصد کیا تھا؟ مہناز نعیم کی "بھیگی بلی" سینعہ عمیر کا "وقت کے الجھے دھاگے" ہلکی پھلکی سی تحریریں تھیں، پڑھ کر اچھا لگا۔ شبینہ گل کا "آخری نقش" ایک سنجیدہ اور سوچنے پر مجبور کر دینے والی کہانی تھی۔ نازیہ رزاق کا ناولٹ "ایک سودا کیا تھا" تلخ حقیقت پر مبنی تھا۔ نمرہ احمد، سائرہ رضا اور سمیرا احمید کے بعد نازیہ رزاق نے ہمیں بے حد متاثر کیا ہے۔ نعیمہ ناز کی "کاوش بے سود" بھی اچھی کاوش تھی۔ معذرت کے ساتھ "اعتبار کے رنگ" اور "اذنِ عشق" کچھ خاص متاثر نہ کر پائیں۔ نمرہ احمد "حالم" دیکھ کر تو آنکھیں ٹھنڈی اور دل کو قرار آ جاتا ہے۔ انہوں نے ہماری "موٹی مرغی" کو کیوں پیچھے چھوڑ دیا؟ وہ ساتھ ہوتی تو زیادہ مزا آتا۔

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں" پڑھا "زندگی سے مایوس بہن" کے بارے میں پڑھا، پڑھ کر دکھ نہیں ہوا بلکہ غصہ آیا۔ جس کو یہ پتا ہے کہ اپنے فون والے شوہر کو گھر والوں سے چھپا کر کیسے رکھنا ہے، اسے یہ نہیں معلوم کہ نکاح ایسے نہیں ہوتا، اتنی تم روٹی کو چوچی کہنے والی......

آج تک ہم نے کبھی بھی مزاحیہ قسط وار ناول نہیں پڑھا، ہماری آپ سے گزارش ہے کہ سمیرا احمید سے ایک مزاحیہ سا قسط وار ناول لکھوائیں۔ ہماری خالہ صفیہ جو حافظ آباد میں رہتی ہیں خواتین کی خاموش قاری ہیں۔

❖ پیاری اقراء اور اقصیٰ! ابھی تو بہت سارے سروے شائع ہونا باقی ہیں، تمام جوابات کو سامنے رکھ کر انعام کا فیصلہ کریں گے۔ آپ کا تبصرہ بڑا جان دار تھا، بہت اچھا لگا۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کریں گے، اپنی خالہ کو ہماری طرف سے سلام کہیے گا۔

فریدہ عبدالرحیم ...... کراچی

اسکول میں ہماری ایک دوست تھی، ہم دونوں نے خواتین ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا، تو آج تک پڑھ رہے ہیں اب تو میرے بچے ہیں۔ میں آپ کا باورچی خانہ

میں حصہ لینا چاہتی ہوں۔ کیا کروں؟

❖ پیاری فریدہ! ہر ماہ ”باورچی خانہ“ پڑھتی ہیں؟ بہنوں نے ان سوالوں کے جواب لکھے ہیں، آپ بھی ان سوالوں کا جواب لکھ کر اسی طرح بھیج دیں جس طرح یہ خط لکھا اور بھیجا ہے۔

ثناء ذوالفقار......نورے والی رحیم یار خان

اپریل کے شمارے کا ٹائٹل قابل تعریف تھا۔ ”دیپ محبت کے جلتے ہیں“ سروے میں سب نے اچھے جوابات دیے۔ ”دشت جنوں“ میں کہانی بہت دلچسپ موڑ پر آ گئی ہے، آئے کت تو بہت چالاک اور دھوکے باز نکلی، ویسے وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی۔

”دل سے بھی“ سمیرا حمید نے واقعی دل سے لکھی تھی، پڑھ کر مزا آیا۔ ”ایک تھی چھوٹی“ میں چھوٹی نے واقعی بہت بڑا کام کیا، پتھر دلوں کو موم کرنا کوئی آسان کام تھوڑی ہے۔

”ماڈل“ اور ”آخری نقش“ بھی اچھے افسانے تھے۔ ”ایک سودا کیا تھا“ نازیہ رزاق کا انداز تحریر مجھے بہت اچھا لگا۔ نازیہ رزاق نے بہت اچھے جملے لکھے، موضوع بھی بہت اچھا تھا۔ ”اذنِ عشق“ میں دادا جان کا کردار بہت پسند آیا۔

”الجھے دھاگے“ میں سمیعہ عمیر نے واقعی الجھا کے رکھ دیا، بالکل بھی مزا نہیں آیا پڑھنے میں۔

❖ پیاری ثناء! آپ کو آئے کت کیسی لگتی تھی؟ بتا دیتیں تاکہ کچھ اس کے دل کو بھی قرار آتا کہ اس بھری دنیا میں کسی نے تو اسے اچھا سمجھا۔ آپ کا انتخاب ان شاء اللہ ضرور کسی قریبی اشاعت میں شائع کریں گے۔

فائزہ بھٹی......چتوکی

ٹائٹل بہت اچھا لگا، سب کو ہی بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے سروے میں اپنا خط ڈھونڈا، مگر کون سا خط، کہاں کا خط، ڈاک والوں کو دو چار سنانے والی تھی کہ اپنا شعر نظر آ گیا، پھر عقدہ کھلا کہ خط تو پہنچ گیا ہے۔ آپ کو تو میں کھری کھری سنا نہیں سکتی۔ ”کہنی سنی“ اگر آپ کو قیمت بڑھانے میں حل نظر آتا ہے تو بڑھا لیں، پھر وہی بات آئے گی۔ یہ آپ سے محبت ہے کہ ہم آپ کو چھوڑیں گے نہیں۔ فہرست پر نظر دوڑائی، مکمل ناول ایک کیوں......؟ سب سے پہلے ”دشت جنوں“ پڑھا کہانی کافی دل چسپ ہو گئی ہے۔ ”حالم“ نمرہ احمد کیا کہنے تمہارے۔ باتوں باتوں کے درمیان بہت کام کی بات بتا جاتی ہو۔ ”اعتبار کے رنگ“ بشریٰ احمد شاید نئی ہیں۔ ”الجھے دھاگے“ یہ کہانی کچھ عجیب سی تھی۔ ”ایک سودا کیا تھا“ بہت اچھی کہانی، نازیہ رزاق پورب پچھم ابھی ہم بھولے نہیں ہیں۔ نازیہ ایک بات ماننی پڑے گی، گاؤں کی منظر کشی بڑی جذبات کے ساتھ کرتی ہو اور اچھی کرتی ہو۔ جیسے سمیرا حمید اور ایمل رضا کی کہانیاں جڑواں بہنیں لگتی ہیں۔ ایسے ہی نازیہ رزاق اور فرزانہ کھرل کی کہانیاں جڑواں بہنوں کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔

”اذنِ عشق“ فریدہ بتول بھی شاید نئی ہیں۔

”کاوش بے سود“ نعیمہ ناز کا پڑھ کر مجھے ہمیشہ ایک ہی خیال آتا ہے کہ ان کے قلم کی روانی بالکل نشیب میں بہتے پانی کے جیسی ہے۔ ایسے مجھے ہمیشہ آسیہ رزاقی کے لیے لگا ہے کہ وہ ہر رائٹر سے الگ دکھائی دیتی ہیں۔ پتا ہے کیوں...... کیونکہ ہر کہانی کو پڑھ کر لگتا ہے، رائٹر نے اس پر سوچا ہوگا مگر آسیہ رزاقی شاید وہ واحد ہیں، اگر قلم پکڑ لیں تو پھر لکھتی جاتی ہیں اور مزے کی بات ہے ان کی کہانی میں کسی چیز کی کمی بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ گھریلو کہانیوں کو بالکل سادہ و دلکش انداز میں بیان کرنے کا ہنر ان کے پاس ہے بس...... ”دل سے بھی“ سمیرا حمید بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ”دیپ محبت کے جلتے رہیں“ صرف چار لوگ شامل ہیں اور کسی انعام یافتہ کو بھی واضح نہیں کیا اور ویسے دیں گے کیا۔

❖ پیاری فائزہ! ہمیں آپ کی کوئی بات بری نہیں لگتی، بخدا اگر آپ ہمیں کھری کھری سنائیں گی تب بھی برا نہیں لگے گا۔ پرچے کی قیمت بڑھائے بغیر کوئی چارہ نہیں مگر آپ لوگوں کا خیال بھی دامن گیر ہے۔ اب دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے، باقی تبصرہ بہترین اور آپ کی لکھائی بھی کافی حد تک بہتر ہو گئی ہے۔

بشریٰ احمد کافی عرصہ سے لکھ رہی ہیں، جاب کی مصروفیت کی وجہ سے کم کم لکھ پاتی ہیں، فریدہ بتول البتہ نئی مصنفہ ہیں۔

مہک فاطمہ......صدر گوگیرہ

”حالم“ از دا بیسٹ ناول، نمرہ احمد از دا بیسٹ فیورٹ رائٹر۔ ”دشت جنوں“ میں آمنہ ریاض نے اس قدر سسپنس کری ایٹ کر دیا ہے کہ بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈائجسٹ خریدنے پر مجبور ہو جائے۔ افسانے سارے اچھے تھے مگر ”دل سے بھی“ سمیرا حمید نے ہمیں خوش کر دیا۔

”ایک تھی چھوٹی“ رائٹر نے بہت اچھا لکھا ہے۔ نازیہ رزاق کا ناولٹ ”ایک سودا کیا تھا“ بہت زیادہ پسند آیا۔ زہرہ کی بہادری نے سب لڑکیوں کی زندگی بدل دی۔ آج سے نازیہ رزاق بھی ہماری پسندیدہ رائٹر بن گئی ہیں۔ ”اذنِ عشق“ فریدہ بتول نے کمال کر دیا۔ رئیلی امیزنگ، باقی دونوں ناولٹ بھی اچھے تھے۔

انٹرویو میں اومی بٹ کو جان کر اچھا لگا، نفسیاتی مسائل پڑھ کر ہر بار دل بے اختیار سوال کر اٹھتا ہے۔ ”کیا یہ مسلمانوں کا معاشرہ ہے؟“

❖ پیاری مہک! کہانیاں ابھی پڑھی نہیں، ان شاء اللہ آپ کے اگلے تبصرے تک پڑھ لیں گے تو ضرور بتا دیں گے۔ لیکن اگر ابتدا میں آپ کی کوئی تحریر مسترد ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ حوصلہ ہار دیں، اس کا مطلب ہوتا ہے کہ نئے سرے سے محنت کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں، کوشش اور مطالعہ جاری رکھیں۔

نوشابہ زینت......باشنہ گجرات

مجھے خط کے نیچے دیے آپ کے جوابات بہت ہی اچھے لگتے ہیں، میٹھے سے۔ ہماری گندم پک چکی ہے، تھوڑی سی کاٹ بھی لی ہے لیکن ابر رحمت روز برس پڑتا ہے۔ دعا کریں کہ حالات سازگار ہوں اور ہم باقی گندم بھی کاٹ لیں خیر خیریت سے۔ میرے پیارے ابو کہتے ہیں کہ اللہ کی اللہ ہی جانتا ہے، ہو سکتا ہے وہ کھادوں وغیرہ کا زہر دھو رہا ہو، جب اس کی مرضی ہو گی تب ہو جائے گا۔ رمضان کی آمد بھی ہے ابھی تو کاٹنی ہے پھر ہم نے صاف کر کے ہی بھڑولے میں ڈالنی ہے ناں تو روزہ رکھ کے کیسے دانے صاف کریں گے۔ اس موسم میں ہم بہت مصروف ہوتی ہیں، گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ ہم لڑکیاں گندم بھی کاٹتی ہیں اور ساتھ ساتھ پڑھائی بھی ہوتی ہے۔ ڈائجسٹ کی بھی اور کورس کی بھی، ہماری ہمت ہے اگر آپ کے شہر کی کسی نازک حسینہ سے بولیں کہ پہلے روٹین کے کام کرے۔ بھینس کے نیچے جھاڑو لگائے پھر اُپلے تھاپے، اس کے بعد دن کا کھانا تیار کرے اور سارے ٹبر کے لیے لے کر باہر جائے، وہاں جا کر گندم کاٹے اور شام کو آ کر پھر کھانا تیار کرے اور رات کو پڑھائی کرے تو وہ تو سنتے ہی بے ہوش ہو جائے گی۔ اس کی اسکن جھلس جائے گی، ہاتھ پاؤں خراب ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ سوچ کر ہی۔ لیکن اللہ کا شکر ہے ہمیں بچپن سے ان سب کی عادت ہے تو مشکل نہیں لگتا۔ بیچ میں کپڑے بھی دھونے ہوتے ہیں عرصہ ہو گیا ہے۔ سمیرا حمید کسی نئے ناول کے ساتھ نہیں آئیں، ان کا ”راہ نوردِ شوق“ زبردست ناول تھا۔

❖ پیاری نوشابہ! آپ کی اتنی ٹف روٹین کا پڑھ کر ہی ہمیں تو غش آنے لگا۔ یقین جانیں ہمارے دل میں آپ لوگوں کی بہت قدر ہے، جو کھیتوں میں گندم کاٹتی ہیں، بھٹے پہ اینٹیں بناتی ہیں، مزدوری کرتی ہیں، ٹرک چلاتی ہیں، گھروں میں برتن مانجھتی ہیں، کپڑے سیتی ہیں، یہ خواتین ہیں باہمت خواتین، چاہے ان کا نام کسی فہرست میں آئے نہ آئے، ہم انہیں سلام کرتے ہیں۔ آپ کے حالات جان کر دکھ ہوا۔ ان کی ہمت کو سلام کرتے ہیں۔ پروردگار سے دعا ہے کہ وہ آپ کی تمام مشکلات کو دور کر دے اور آپ کی زندگی کو خوشی خوش حالی اور رشتوں سے بھر دے، آمین ثم آمین۔

سماء براق......لاہور

میں نے بہت عرصہ پہلے خواتین میں ایک کہانی پڑھی تھی، مجھے لگتا ہے 2011 یا پھر 2012ء کا کوئی رسالہ تھا۔ کہانی کچھ یوں شروع ہوئی تھی کہ ایک لڑکی

BOOKSPK

تانگے پر بیٹھی ہوتی ہے اور جب تانگے سے اترتی ہے تو تانگے والے کو کہتی ہے کہ میرا سامان اندر لے آؤ جبکہ تانگے والا کہتا ہے کہ باجی میں تانگے والا ہوں قلی نہیں

ہوں اور کہانی میں ایک کردار کا نام زین بھی ہوتا ہے، اگر کسی قاری کو یا پھر آپ کو یاد ہے تو لازمی بتادیں۔ اگر کسی کو پتا ہے تو رسالے کا مہینہ اور سال ضرور بتادیں، میں ایک اس کہانی کے بدلے بہت خوار ہوئی ہوں۔

"پیاری سماء! ایک کہانی کے پیچھے اتنی خواری؟ کیا سامان بہت قیمتی تھا؟ پیاری قارئین! اگر آپ میں سے کسی کو یاد ہے تو ان کی پریشانی دور کردیں۔

نائلہ، عائشہ، طیبہ نور...... ہڈالی

ڈائجسٹ ملتے ہی سب سے پہلے "ہمارے نام" میں چھلانگ لگائی اور اپنا خط دیکھ کر اف میری اور نائلہ کی تو چیخیں نکل گئیں۔ آپ کا جواب پڑھ کر ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی، مطلب آپ چراغ بالی کو بھی کھانے کی کوئی چیز یا مٹھائی کی قسم سمجھ رہی ہیں۔ چراغ بالی مشہور ڈاکو تھا، ہڈالی کا رابن ہڈ، ان پر تو بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور فلمز بھی بنی ہیں۔ غلطی میری ہے، میں نے چراغ بالی کے ساتھ "چیز" کا لفظ استعمال کیا تھا اور ڈھوڈا حلوہ کی ایک قسم ہے۔ ہمارے علاقے میں تو یہ بہت مشہور ہے، آپ بھی ہمارے گھر آیئے گا تو ہم آپ کو کھلائیں گے۔

خواتین ڈائجسٹ تو بیسٹ فار ایور ہوتا ہے، اس ماہ کا شمارہ بھی زبردست۔ "کاوش بے سود" نعیمہ ناز نے بہت اچھا لکھا، کاوش کو دنیا کی حقیقت پتا تو چل گئی مگر بہت دیر سے "اک سودا کیا تھا" نازیہ رزاق کیا کہانی لکھ دی یار۔ عورتوں کی بے بسی نے آنکھیں نم کردیں۔ افسانے سارے اچھے تھے خاص کر "میاؤں" اور "ایک تھی چھوٹی" بہت پسند آئے، اذن عشق بھی اچھا لگا۔

❖ "پیاری نائلہ، عائشہ، طیبہ نور! اب ڈھوڈا کھانے کے لیے ہڈالی تو آنا ہی پڑے گا۔ ویسے تو کراچی میں رہتے ہوئے ہمیں ڈاکوؤں کا اچھا خاصا تجربہ ہے لیکن پھر بھی احتیاطاً پوچھ رہے ہیں کہ ہڈالی آتے ہوئے راستے میں چراغ بالی سے تو ملاقات نہیں ہوجائے گی۔

سائرہ نورین...... چوک شاہ عباس، ملتان

85ء سے آپ کی مستقل خاموش قاری ہوں۔

آپ سے جو دلی تعلق ہے اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آٹھ یا نو کو شمارہ ملتا ہے، دو دن میں تمام پڑھ لیتی ہوں، تبصرہ اس لیے نہیں کرتی کیونکہ میں جو کہنا چاہتی ہوں وہی میری قارئین بہنیں کہہ دیتی ہیں۔ ہمارے نام کو بہت دل سے اور سکون سے پڑھتی ہوں، جتنی بھی پرانی قارئین ہیں، انہیں جانتی ہوں اور دل سے لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اگر میں ملتان کے بجائے کراچی میں ہوتی تو آپ سب سے ویسے ہی ملنے آجاتی۔

❖ پیاری سائرہ! آپ کے خط کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔ خط کے ذریعے آدھی ملاقات ہوجاتی ہے تو آج کے مصروف دور میں یہ بھی غنیمت ہے لیکن جب کبھی کراچی آنا ہو تو دفتر ضرور آیئے گا۔ ہمیں بھی آپ سے مل کر خوشی ہوگی، لکھائی آپ کی بہت اچھی ہے، خط پڑھنے میں لطف آیا۔

اقصیٰ ہابیل...... تحصیل سمندری

میں بوجہ تعلیم سمندری گاؤں سے شہر اپنے ننھیال کمالیہ میں رہتی ہوں، اپنی کزن کو دیکھ کر مجھے بھی رسالوں کو پڑھنے کا شوق ہوا، آپ کے رسالوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ میں جب بھی گاؤں جاتی ہوں، گھر والوں سے ملنے تو یہاں سے رسالوں کو لے کر جاتی ہوں، میں آخر میں آپ سے فرمائش ہے سارا خان کی بہن اداکارہ نور خان کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

☆ پیاری اقصیٰ! آپ کی فرمائش نوٹ کرلی ہے، آپ فی الحال مطالعہ پر توجہ دیں، پھر کہانیاں بھی لکھ لیجیے گا۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکر گزار ہیں۔

ہادیہ خاتون، حمنہ خاتون...... بہاول نگر

اپنا خط دیکھ کر جو خوشی ہوئی نام دیکھ کر کافور ہوگئی آپ نے ہمارا نام ہادیہ کے بجائے ماریہ لکھا ہوا تھا۔ اس ماہ مکمل ناولوں میں سے جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ ہے نعیمہ ناز کا "کاوش بے سود" ویل ڈن نعیمہ جی۔ ویسے یوں لگتا ہے نعیمہ جی نے کسی حقیقی کردار پر لکھا ہے۔ یہ جو آپ قارئین کا سروے شائع کرتے ہیں، کیا ہم اس میں حصہ لے سکتے ہیں؟ اور جو دوسرے سلسلے ہیں جیسے آپ کا باورچی خانہ، ان میں ہم کیسے حصہ لے سکتے ہیں؟ پلیز ضرور بتایئے گا۔

❖ پیاری ہادیہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا نام غلط شائع ہوگیا، آئندہ خیال رکھیں گے۔ سروے یا دیگر سلسلوں میں شمولیت کے لیے جس طرح یہ خط تحریر کیا ہے اور بھیجا ہے، اسی طرح ان سوالات کے جوابات لکھ کر ہمیں پوسٹ کردیں اور اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سلسلے شروع ہی آپ لوگوں کے لیے کیے ہیں، ہمیں آپ کے شامل ہونے سے خوشی ہوگی، ضرور بھیجیں۔

ردا...... لاڑکانہ

یہ کیا آپی میں نے دو مہینے کتنا انتظار کیا پر آپ نے میرا خط شائع نہیں کیا۔ اب میں دو کہانیاں بھیج رہی ہوں۔ ایک سوال ہے (قراقرم کا تاج محل) کی پریشے جہاں زیب، نمرہ احمد کی دوست تھی۔

❖ پیاری ردا! خطوط بہت تاخیر سے ملے تھے اور کہانیوں کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔ آپ فی الحال صرف اور صرف مطالعے پر توجہ دیں۔

پریشے جہاں زیب، نمرہ احمد کی دوست نہیں تھی، وہ ان کے ناول کا کردار تھی۔

امامہ ملک...... چنگی بانڈی ہری پور ہزارہ

سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پچھلے خط میں آپ نے میرے نام کی اسپلینگ (ہجوں) پر اعتراض کیا تھا (دسمبر 2017 کے خواتین میں)...... کہ Umama کو عمیمہ پڑھا جاتا ہے...... تو یارا جی...... ہمارے ہاں تو Umama کو امامہ ہی پڑھا جاتا ہے۔ خیر یہ تو ہمارا فرضی نام ہے جو بھی لکھیں اعتراض نہیں۔ اعتراض تو اصل میں جس بات پر تھا وہ یہ ہے آپ نے میرے گاؤں کا نام "جنگی بانڈی" لکھا...... بہت بار پڑھا تھا کہ نقطے کا ہیر پھیر بڑی بڑی قیامتیں ڈھاتا ہے، آج دیکھ لیا۔

ہمارے اچھے بھلے "چنگی بانڈی" (اچھی خوبصورت، بہترین بانڈی) کو آپ نے "جنگی بانڈی" (یعنی جنگ زدہ / جنگ کرنے والی یا جو بھی معنی ہوں) بنادیا...... آہ...... آپ نے خود سوچیں "چنگی اور جنگی" میں کتنا تضاد ہے جیسا "محرم اور مجرم" میں "جیسا خدا اور جدا" میں ہے...... ہائے ہمارے تو کلیجے کے پار ہوگیا یہ لفظ۔ ایشن نعیم کا سروے زبردست تھا...... آمنہ آپی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سمیرا آپی تو جو بھی لکھ دیں ہم ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ تو انہوں نے سپر کلاس افسانہ لکھا...... بہت بہترین...... زبردست کہانی تھی...... کاش ہم بھی ہیروئن کی طرح سوچیں پڑھ سکتے۔ "ماڈل" عفت سلطانہ نے اچھا تو لکھا مگر تحریر کا مقصد کوئی نظر نہیں آیا...... بشریٰ احمد نے بھی اچھا لکھا...... ویسے اس قسم کی بہت سی کہانیاں ہم پڑھ چکے ہیں...... مہناز نعیم ہلکا پھلکا لکھتی ہیں بہت اچھا لگتا ہے...... سعیدہ عمیر کی کہانی کا مقصد بھی سمجھ میں نہیں آیا...... شبینہ گل نے تو بہت ہی اچھا لکھا۔ نازیہ رزاق کا تو "پورب پچھم" بھی ہمیں بہت پسند آیا تھا اور یہ "ایک سودا کیا تھا" بھی بہت ہی زیادہ پسند آیا۔

"کاوش بے سود" بھی بہترین تھا۔ عثمان کی موت پر تو ہمارے بھی آنسو نکل آئے...... قرۃ العین" نے بھی اچھا لکھا۔ فریدہ بتول کا "اذان عشق" کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا۔ ہماری جان "حالم" کی تو کیا ہی بات ہے۔ مصنفہ کی کہانی پر گرفت خوب ہے...... ویسے نمرہ احمد کی عمر کے ساتھ یہ چیز ہضم نہیں ہوتی...... آپ نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ [illegible] رہ کی عمر بیس سے پچیس کے درمیان ہے...... اتنی سی عم[illegible] اس قدر پختہ تحریر؟؟؟؟ یقین ہرگز نہیں آتا۔ آپ [illegible] بتادیں کہ کیا کبھی سمیرا حمید سے ملاقات ہوسکتی ہے...... و[illegible] سمیرا آپی کہاں کی رہنے والی ہیں؟ ضرور بتائیں۔

امامہ! آپ نے پورا خط اردو میں لکھا اور اپنا نام انگریزی میں لکھا۔ سیدھا سیدھا اردو میں اپنا نام لکھ دیتیں تو نہ ہم کچھ کہتے نہ آپ کو وضاحت کرنا پڑتی۔ سمیرا حمید لاہور میں رہتی ہیں۔ ملاقات والی بات ان سے پوچھ کر بتائیں گے۔

ماریہ بشیر...... پنڈی حسنہ گجرات

حسن المآب کو پڑھ کے اپنے بھائی کی یاد آئی۔ جب میرے بھائی نے داڑھی رکھی تو پھپھو لوگوں نے شور مچادیا کہ داڑھی ہٹاؤ نہیں تو بیٹی کا رشتہ ختم سمجھو۔ بھائی کی منگنی پھپھو کے گھر ہوئی تھی لیکن بھائی نے کسی کی ایک نہ مانی' شادی کے دس ماہ بعد وہ شہید ہوگئے۔ وزیرستان آپریشن میں ان کی شہادت ہوگئی۔ پھر ناراضی کے باوجود شادی کردی گئی۔ اور اب ان کی شہادت کے بعد سب گُن گاتے ہیں آپ کے رسالے سب بہت اچھے ہیں۔ سب رائٹر بہت اچھا لکھتی ہیں اور نمرہ احمد اور سمیرا حمید، زبردست ۔سمیرا...... آپ کی کہانیاں پڑھ کے تو میں ایک سکتے میں چلی جاتی ہوں۔ کتنی دیر کے لیے۔ باقی سب بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ خط خاص طور پر حسن المآب پڑھ کے لکھا ہے کیونکہ جس دن سے پڑھا ہے بھائی پر پہلے سے زیادہ فخر محسوس ہورہا ہے۔ آخری بات ان کی دہرانا چاہوں گی۔ سب بہنوں سے کہتے تھے کہ دعا کیا کرو۔

''مجھے کوئی مسلمان نہ مارے اور میں کسی مسلمان کے ہاتھوں نہ مروں۔''

اور ہم رو دیا کرتے تھے کہ ایسی باتیں نہ کہا کریں۔ لیکن جب 30 دسمبر 2012 کو صبح فون آیا کہ آپ محمد صغیر کے گھر سے بات کررہی ہیں اپنے بھائی کو فون دیں تو دل دھڑک گیا پھر بڑی بہن نے چھین کر مجھے دیا تو وہ کہنے لگے۔

''الحمد اللہ ۔آپ کے بھائی شہید ہوگئے۔'' وہ کیفیت بیان نہیں کرسکتی اور نہ ہوسکے گی۔

❖ پیاری ماریہ! آپ کا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا اللہ تعالٰی آپ کے بھائی کے درجات بلند کرے اور آپ لوگوں کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین

پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رخ فاطمہ علی

پچھلے دو مہینے سے آپ کو خط بھیج رہی ہوں پہلی دفعہ میں نے ایک افسانہ بھی بھیجا تھا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے سوچا کہانیاں پڑھ پڑھ کر تو زندگی نہیں گزر سکتی نا تو کیوں نہ کہانی لکھنے کی بھی کوشش کروں۔

❖ پیاری رخ فاطمہ! آپ کو محنت کی شدید ضرورت ہے۔ فی الحال آپ صرف مطالعے پر توجہ مرکوز رکھیں۔

لائبہ اعوان...... لاہور

اس سے پہلے میں نے چند آرٹیکلز لکھے۔ شائع بھی ہوتے رہے، لائبہ خان کے نام سے اور ایک عدد اکلوتا افسانہ بھی شائع ہوا سالگرہ نمبر میں سب کی تحاریر اور آپ کا انتخاب اتنا زبردست تھا کہ سمجھ میں نہیں آرہا ذکر کس کا کریں اور کسے چھوڑیں۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول مکافات عمل کی کہانی تھی۔ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ ہو بہو سچ ثابت کردکھایا نعیمہ جی نے۔ فریدہ بتول کا اذنِ عشق بھی اچھی تحریر تھی۔ ارتضٰی کا وہ حال کہ خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ نازیہ رزاق کی تحریر نے دل اداس کیا تو سدیعہ عمیر نے اس اداسی کو ہلکی پھلکی ہنسی میں بدل ڈالا۔ افسانوں میں سمیرا حمید اور شبینہ گل ٹاپ آف والسٹ تھیں

❖ پیاری لائبہ! ہم ہر ماہ کی 5 تاریخ کو دن بھر فون کالز اٹینڈ کرتے ہیں ہمارا سب کے لیے مشورہ ہے کہ کوئی بھی تحریر بھیجنے کے بعد کم از کم دو ماہ ضرور انتظار کیا کیجئے کہ ہمارے پاس پڑھنے کے لیے بے شمار مواد ہوتا ہے۔ امید ہے خیال رکھیں گی۔ سالگرہ نمبر آپ کو پسند آیا۔ ہماری محنت وصول ہوگئی۔

❖

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما' ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

QUALITY SUFI GUARANTEED
سپیشل کوالٹی
صوفی سوپ
ہاتھوں کی حفاظت
اجلی دھلائی
صوفی سوپ کی کوالٹی کا مقابلہ، کوئی بھی ڈٹرجنٹ پاوڈر نہ کر پائے۔
کیونکہ اس میں ہیں کپڑوں کے رنگوں کی حفاظت
100 فیصد قدرتی اجزاء
صوفی سوپ تمام پاؤڈروں اور صابنوں سے بہتر
SPECIAL QUALITY SUFI SOAP
SPECIAL QUALITY SUFI SOAP VERMICELLI
Sufi Soap & Chemical Industries (Pvt)
U.A.N. 111-100-786 www.sufigroup

خبریں و بریں

واصفہ سہیل

آزادی

ہم آپ کو یہ تو بتا ہی چکے تھے کہ ایمان علی اپنی فلم کا اسکرپٹ خود لکھ رہی ہیں (آہم!) اب یہ بھی بتاتے چلیں کہ ایمان علی اس فلم میں مرکزی کردار اپنی چھوٹی بہن کو دے رہی ہیں (ہائیں تو خود......؟ بھئی کیا کریں گی) مگر ہیروئن وہ خود ہی ہوں گی (جب ہی ناں ہم بھی کہیں کہ بہن کو مرکزی کردار اور خود......؟) اب سننے میں آیا ہے کہ ایمان علی چاہتی ہیں کہ اس کی ہدایت کاری کے لیے شعیب منصور تیار ہو جائیں۔ (شعیب منصور کیوں؟ عابد علی بھی تو ہیں) ایمان علی اب تک دوسروں کے ساتھ کام کرتی رہی ہیں، جہاں وہ اپنی مرضی سے کام کرتی ہیں۔ اب جب وہ خود فلم بنا رہی ہیں تو لوگوں سے کس طرح سے کام لیں گی یا وہ آزادی دیں گی جو خود لیتی رہی ہیں۔

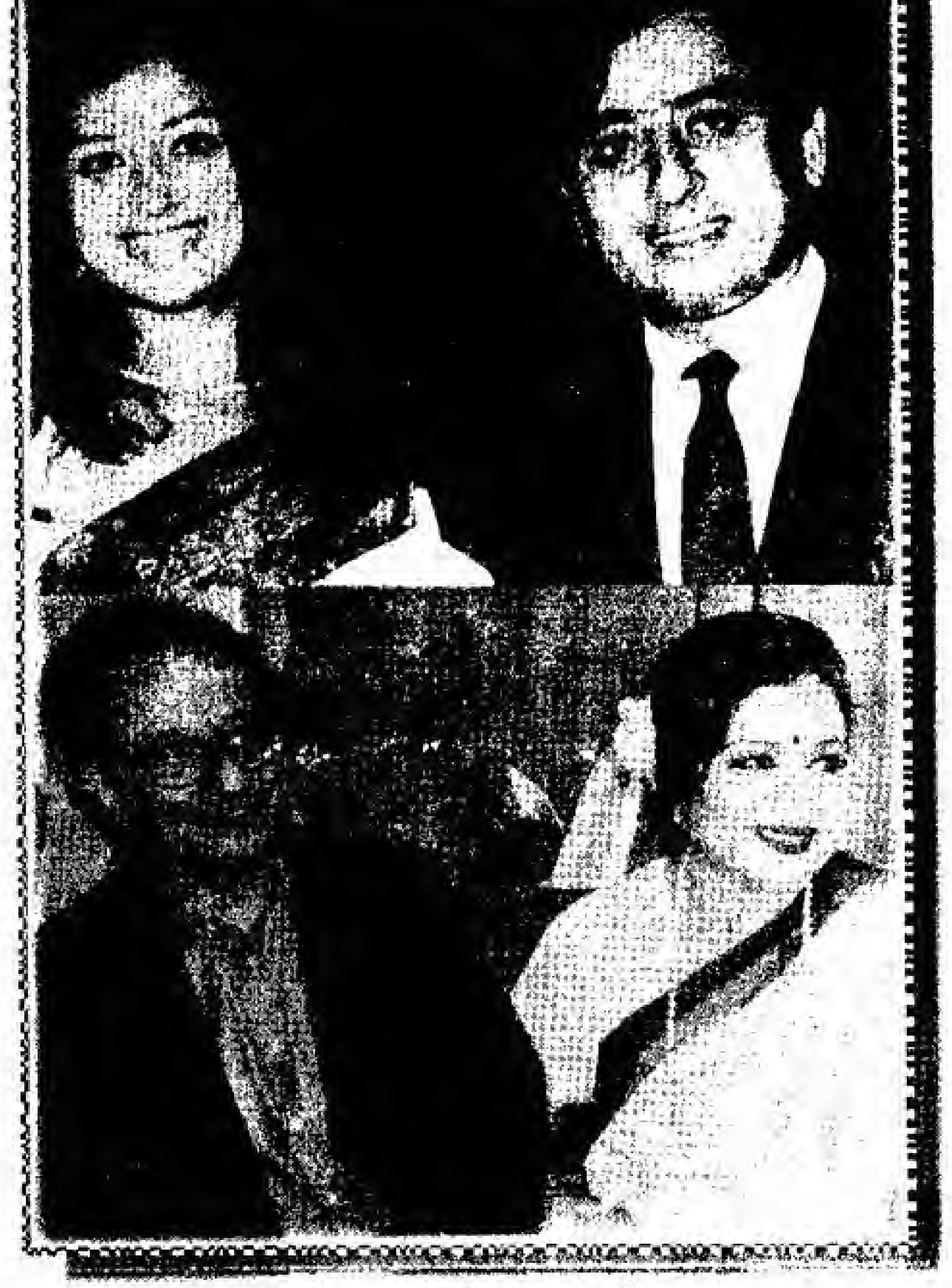

کل اور آج

وقت اور حالات کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں ہی عجب طرح سے انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسانی مزاج موسموں کی طرح بدلے نہ بدلے مگر اس کی شخصیت ضرور بدل جاتی ہے۔ وقت اچھا ہو یا برا وہ انسان کو کیسے بدل ڈالتا ہے اس کا اندازہ آپ کو ماضی کی معروف فنکار جوڑی ”شبنم اور ندیم“ کو دیکھ کر ہو گیا ہوگا۔ یہ تصویر ہمیں محمود حسن صاحب نے فراہم کی ہے۔

معروف اور کہنہ مشق صحافی محمود حسن صاحب کے پاس ماضی اور حال کے فن کاروں کے حوالے سے یادوں کا ایک تصویری خزانہ موجود ہے، ہم وقتاً فوقتاً اپنے قارئین کے لیے اس میں سے کچھ نہ کچھ پیش کرتے رہیں گے۔

new
Freedom®
Ultra thin sanitary napkins
اب مخصوص دن بھی گزاریں خوشگوار!!!
Ultra Thin
Extra Long
Freedom
OPEN
ULTRA THIN
7 EXTRA LONG
Ultra Thin
Long
Freedom
ULTRA THIN
8 LONG
A product of
H&P
Health and Hygiene products

تاثر

شوبز انڈسٹری میں اداکاری سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی جاتی ہے کہ کوئی کتنا مقبول ہے، خاص طور پر اداکارائیں۔ بھئی ہم بات کر رہے ہیں عروہ حسین کی، جو شاید اتنی مشہور ہوچکی ہیں (کیوں......؟) کہ فلم سازوں کے لیے ان کی اداکاری معنی نہیں رکھتی۔ ان کی تینوں فلموں نامعلوم افراد، نامعلوم افراد ٹو اور میں پنجاب نہیں جاؤں گی میں وہ مرکزی کردار میں نہیں تھیں (وجہ شاید......؟) لیکن فلم ”رنگریزا“ میں ان کا کردار مرکزی تھا مگر عروہ اس میں بھی اداکاری کے تاثرات دینے میں ناکام رہیں۔ انہوں نے ثابت کردیا کہ وہ بنا کوئی تاثر دیے ایک جیسی اداکاری میں سب کو مات دے سکتی ہیں۔

فیصلہ

اداکارہ ارمینا خان کا کہنا ہے کہ ”میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ فنکار کو ایک وقت میں ایک ہی پروجیکٹ میں کام کرنا چاہیے (اور اگر فنکار کو مل ہی ایک پروجیکٹ رہا ہو تو......؟) اسی لیے میں نے کسی نئی اور بہت اچھی آفر آنے تک مکمل آرام کا فیصلہ کیا ہے (یعنی کوئی آفر ہے ہی نہیں جب ہی تو...... بھئی نئی اور اچھی......؟)۔ ارمینا خان نے مزید کہا کہ ”میں پیسے کے لیے کام نہیں کرتی (تو اب آپ کام کرنے کے پیسے نہیں لیں گی ناں؟) اسی لیے میں نے منتخب اور کم کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ارمینا خان کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی تمام توانائیاں پاکستان میں کام کرتے ہوئے استعمال کیں۔ (وہ جو آپ نے کی ہیں وہ توانائیاں ہیں؟) کیوں کہ مجھے یہاں کام کرکے مزا آتا ہے۔ مگر اب میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اپنے گھر کے قریب رہ کر ہی کام کرنا چاہیے (یعنی لندن میں)۔

اِدھر اُدھر سے

★ بیٹی، بہن، بیوی اور ماں، عورت جس روپ میں بھی ہو زیادہ تر گھرانوں میں اس کی زندگی ایک مسلسل آہ ہے۔ جب تک فیوڈل نظام ختم نہیں ہوگا۔ علمائے کرام قرآن کا مطالعہ نہیں کرتے اور سیاسی جماعتیں عورت کو انسان نہیں تسلیم کرلیتیں آہوں کا دھواں اسی طرح اٹھتا رہے گا۔

(عبداللہ طارق سہیل ......ایکسپریس)

★ بہت عرصے پہلے سولینی کو علامہ اقبال نے ایک حدیث سنائی جس میں بڑے شہر بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ مسولینی یہ حدیث سن کر ششدر رہ گیا اور بولا کتنا بڑا تمدنی راز آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلیم) نے سینکڑوں سال پہلے بتا دیا تھا۔

(عبداللہ طارق سہیل ......ایکسپریس)

★ ہر دس برس بعد ہم منزل کا پتا بھول جاتے ہیں، نہ منزل ہے نہ منزل کا پتا ہے جسٹس منیر سے لے کر ارشاد حسن خان تک اپنے فیصلوں سے یہی باور کراتے آئے کہ بھولے بچو سیاست سے تائب ہوکر ہی بہتری لائی جاسکتی ہے۔

(سعود ساحر............دوٹوک)

بقیہ فیضان شیخ

☆ کسی کی تعریف میں کوئی دو جملے؟

o۔ دو جملے نہیں بولتا۔ تعریف کھل کر کرتا ہوں۔

☆ شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟

o۔ تعلقات۔

☆ کس فنکارہ کے ساتھ رومانٹک سین کروانا اچھا لگتا ہے؟

o۔ ابھی تک ایسا ہوا نہیں۔ بیگم کے ساتھ سین کروں گا تو شاید نیچرل ہوگا۔

☆ خواہش ہے کہ ایسی فلم میں کام کروں جو؟

o۔ جو کمرشل ہو/ کامیڈی ہو۔

☆ اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچاتے ہیں؟

o۔ تقریباً بیس فیصد۔

☆ ایک محبت جو بھول نہیں سکتے؟

o۔ گھر والوں کی۔

☆ کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

o۔ دبئی۔

☆ کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟

o۔ امی کو۔

☆ گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟

o۔ صرف اپنے کمرے میں۔

☆ کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟

o۔ اس سے دور ہو کے دیکھیں۔

☆ کبھی کرائسس میں وقت گزارا؟

o۔ بہت دفعہ گزارا اور بہت کچھ دیکھا بھی۔

☆ بی پی ہائی ہوجاتا ہے جب؟

o۔ غلط کھانا کھالوں جب۔

☆ آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟

o۔ پیسے، کارڈز، فیملی کی تصاویر۔

☆ نصیحت جو بری لگتی ہے؟

o۔ نہیں...... مجھے نصیحت بری نہیں لگتی۔

☆ کھانے کی میز پر کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟

o۔ روٹی سالن لازمی ہونا چاہیے۔

☆ کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر، اپنے بیڈ پر، چٹائی پر؟

o۔ چٹائی پر، دسترخوان بچھا کے۔

☆ انٹرنیٹ، فیس بک اور انسٹاگرام سے آپ کی دلچسپی؟

o۔ سوشل نیٹ ورک استعمال کرتا ہوں۔

☆ وقت کی پابندی کرتے ہیں؟

o۔ بالکل، باقاعدگی کے ساتھ، بہت زیادہ پنکچوئل ہوں۔

☆ ایک کھانا جو کئی دن تک کھاسکتے ہیں؟

o۔ بریانی۔

☆ کوئی ایسی ڈیٹ جو بھول نہیں سکتے؟

o۔ اپنی سالگرہ کی تاریخ، پانچ ستمبر۔

☆ دوسرے ملک جاکر کیا باتیں نوٹ کرتے ہیں؟

o۔ نظم وضبط، قانون کی پابندی، ایک دوسرے کی قدر کرتے ہیں۔

☆ اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟

o۔ اپنی گاڑی۔

☆ کوکنگ سے لگاؤ؟

o۔ چکن کڑاہی بنالیتا ہوں۔ بہت مزے کی۔

☆ ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟

o۔ ”بیٹ مین“ کا۔

☆ کوئی کردار جو کر کے پچھتائے؟

o۔ نہیں، ایسا کوئی کردار نہیں ہے۔

☆ آپ کی فیوچر پلاننگ؟

o۔ کام کام اور صرف کام۔

☆ عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟

o۔ دونوں۔

☆ ایک خواب جو بار بار دیکھتے ہیں؟

o۔ خوش حال پاکستان دیکھنا چاہتا ہوں۔

☆ پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟

o۔ لاہور کی فوڈ اسٹریٹ پسند ہے۔

☆ آئینہ دیکھ کر سوچتے ہیں؟

o۔ شکر الحمدللہ پڑھتا ہوں۔

☆ شادی میں پسندیدہ رسم / تحفہ یا کیش؟

o۔ آرسی مصحف کی رسم / اور کیش دینا چاہیے۔

☆ ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟

o۔ امی کے ہاتھ کا۔

☆ بدلہ لیتے ہیں؟

o۔ جی بالکل۔

☆ کب فریش ہوتے ہیں؟

o۔ صبح سویرے۔

☆ اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟

o۔ دوسروں کے تجربے سے سیکھتا ہوں۔

☆ دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ؟

o۔ بہن بھائی۔

☆ لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟

o۔ سیلفی کی فرمائش کرتے ہیں۔

☆ آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟

o۔ دنیا سے نفرت ختم ہو جائے۔

☆ فلم، ماڈلنگ کی آپ نے؟

o۔ فلم کر چکا ہوں۔

☆ بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی محفوظ ہے؟

o۔ کوئی نہیں۔

☆ آپ کو فوبیا ہے؟

o۔ فوبیا تو نہیں کہہ سکتے۔ مگر مجھے صفائی کی عادت بہت زیادہ ہے۔

☆ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟

o۔ ہاں کر لیتا ہوں۔

☆ کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟

o۔ جی بالکل اندھی ہوتی ہے۔

☆ دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟

o۔ دل کی سنتا ہوں۔

☆ غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟

o۔ او تیری...... خیر۔

☆ بستر پر لیٹتے ہی سو جاتے ہیں کیا؟

o۔ نہیں...... ٹائم لگتا ہے۔

☆ سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتے ہیں؟

o۔ الارم ضرور لگاتا ہوں۔

☆ محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟

o۔ محنت سے۔

☆ پسندیدہ تہوار؟

o۔ عید۔

☆ زندگی کب بری لگتی ہے؟

o۔ جب کوئی مقصد نہ ہو۔

☆ مارننگ شوز کیسے لگتے ہیں؟

o۔ کام کے ہوں تو اچھے لگتے ہیں، ورنہ نہیں۔

☆ کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟

o۔ سیل فون، والٹ اور پرفیوم۔

☆ پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟

o۔ امن، سلامتی اور ترقی۔

☆ آپ کی اچھی بری عادت؟

o۔ اچھا ہوں تو بہت اچھا ہوں اور برا ہوں تو بہت برا ہوں۔

☆ شوبز میں نہ ہوتے تو کہاں ہوتے؟

o۔ پھر ایک اچھا کرکٹر ہوتا۔

☆ ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟

o۔ اداکاری صحیح نہ ہونے کا وہم ہوتا ہے۔

☆ کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟

o۔ اداکاری میرا نشہ ہے۔

☆ شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟

o۔ کبھی نہیں...... شہرت مسئلہ نہیں بنتی۔

☆ کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟

o۔ پاکستان ہی ٹھیک ہے۔

☆ اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟

o۔ تو صبر اور پھر سے محنت کروں گا۔

☆

آپ کا باورچی خانہ

مدیحہ اقبال

خواتین ڈائجسٹ سب سے معیاری ڈائجسٹ ہے، کہانیوں اور افسانوں کے ساتھ ساتھ اس کے سلسلے بھی کافی دلچسپ ہوتے ہیں جیسے خبریں وبریں اور آپ کا باورچی خانہ مجھے بے حد پسند ہے۔

س: کھانا بناتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: کھانا بناتے وقت مجھے اس چیز کا خیال رہتا ہے کہ کھانوں میں یکسانیت نہ ہو یعنی مسلسل یا روز ایک ہی چیز نہ پکے۔ میرے گھر ہفتے میں شاید دو دن بیف اور چکن بنتا ہے اور سبزیاں اور دال بھی ہمارے میںیو میں شامل رہتی ہیں' اکثر تو آملیٹ بھی ہمارے ہاں ڈنر کے طور پر کھا لیا جاتا ہے۔

س: کھانے کا وقت ہے اور اچانک مہمان آجائیں؟

ج: میری فیملی زیادہ بڑی نہیں اور نہ میاں کی۔ چند بہن بھائی ہیں ان کے بھی اور میرے بھی اور وہ سب کے سب بہت دور دور رہتے ہیں اور میں اکثر گھر کے کام سے باہر نکلتی ہوں (کیوں کہ سب کاموں کی ذمہ داری مجھ پر ہے، میاں جی صرف نوکری کرتے ہیں) تو اچانک آنے کا رسک کوئی نہیں لیتا۔ میں ہمیشہ گھر میں شامی کباب بنا کے رکھتی ہوں، انڈے موجود ہوتے ہیں، مٹر کے موسم میں مٹر فریز کیے ہوتے ہیں، سفید چنے بھی بوائل کر کے فریز کرتی ہوں تو اچانک آمد پر مٹر پلاؤ، شامی کباب، رائتہ تو بن ہی جاتا ہے۔ نخریلے مہمان کے لیے ہوٹل سے بھی کچھ منگوا لیا جاتا ہے۔ ایک ڈش میں نے خود ایجاد کی ہے اس کی ترکیب بتا دیتی ہوں، یہ مہمانوں کے لیے تو نہیں اپنے لیے اکثر بنا لیتی ہوں۔

آلو کے قتلے کاٹ کر پتیلی میں ڈالیں اور ساتھ ہی نمک، لال مرچ آئل کے ساتھ، ہلکا سا پانی ڈال کر پکنے رکھ دیں جب آلو گل جائیں تو اوپر سے آلو کی مناسبت سے انڈے توڑ کر ڈالیں اور اچھی طرح مکس کریں، جب انڈے بھن جائیں تو ہرا دھنیا مرچیں کاٹ کر ڈالیں، تیار ہے۔ روٹی یا پراٹھے سے بہت اچھا لگتا ہے۔

س: مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتے ہیں؟

ج: مصروفیت یا طبیعت خرابی کے باعث تو مہینوں باہر نہیں جا پاتے لیکن خود کو فریش کرنے کے لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ ایک دو بار ضرور گھر سے نکلا جائے۔

س: صبح ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی ڈش جو آپ اچھی بناتی ہیں؟

ج: مجھے تو ناشتے میں حلوہ پوری پسند ہے لیکن وہ لانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ موسٹ فیورٹ پراٹھا چائے ہے، جب مجھے کہیں کام سے باہر نکلنا ہوتا ہے تو میں چائے پراٹھا کھاتی ہوں ورنہ گھر میں ڈبل روٹی، انڈا یا کارن فلیکس کھاتی ہوں۔ باقی افراد جو باہر جاتے ہیں یعنی میری بیٹی اور میاں تو وہ بھی سالن کے ساتھ روٹی یا پراٹھا اور چائے لیتے ہیں۔

س: کچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج: کچن کیا میں تو پورے گھر کی صفائی کا خیال رکھتی ہوں۔ رات کے برتن رات کو ہی دھو کر اور چولہے صاف کر دیتی ہوں۔ مسالوں کو، چاول اور

آٹے کی بالٹی کو دھوپ لگاتی رہتی ہوں۔ کیبنٹ اور چولہے کی دیوار بھی عموماً صاف کرتی رہتی ہوں۔ میری امی کہتی تھیں کہ عورت کا سلیقہ سب سے زیادہ کچن میں نظر آتا ہے، اس لیے میرا گھر عموماً اور کچن خصوصاً صاف ستھرے ہی رہتے ہیں۔

س: کھانا پکانے کے لیے موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: جی بالکل، گرمیوں میں تو عموماً — ہلکی چیزیں پکاتی ہوں، بیف اور چکن کم کردیتی ہوں۔ دوپہر کو دہی سے بھی کھالیتی ہوں کیونکہ دوپہر کو میں اکیلی ہی ہوتی ہوں۔ سردیوں میں کھانے میں مچھلی کا اضافہ ہوجاتا ہے، اکثر یخنی بناتی ہوں اور اس میں سبزیاں ملادیتی ہوں تو وہ پینے کے ساتھ کھانے کی چیز بھی بن جاتی ہے۔

س: اچھا کھانا بنانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج: محنت تو بہت ضروری ہے۔ کھانا صحت کے لیے لازمی ہے، بے مزا کھانا تو خود ہی نہیں کھایا جاتا۔ دوسرے کیا کھائیں گے، اس لیے جب بندہ اتنی محنت سے کماتا ہے، پیسے خرچ کرکے سامان لاتا ہے تو دل سے نہ پکایا جائے تو سب ضائع ہوجائے گا۔ یہ الگ گناہ ہے، اس لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ اچھا پکاؤں جو بھی پکاؤں۔

س: کچن کی کوئی آزمودہ ٹپ؟

ج: ٹپ تو کوئی خاص نہیں، بس وہ ہی امی کے طریقے‘ صفائی کے لیے یا پکانے کے لیے بتائے تھے‘ وہ ہی استعمال کرتی ہوں۔ البتہ زبیدہ آپا کا ٹوٹکا بند نالیاں کھولنے کا وہ آزمایا تھا، سوڈا ڈال کر تو وہ کام کرگیا تھا، باقی کوئی خاص نہیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹادو
نگہت عبداللہ
قیمت -/400 روپے

کسی راستے کی تلاش میں
میمونہ خورشید علی
قیمت -/350 روپے

اُجالوں کی بستی
فاخرہ جبیں
قیمت -/400 روپے

ایک میں اور ایک تم
تنزیلہ ریاض
قیمت -/350 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہِ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

آملیٹ پراٹھا

اجزا:۔

انڈہ	ایک عدد
پیاز (درمیانی)	ایک عدد
ہری مرچ	دو سے تین عدد
لال مرچ (کٹی ہوئی)	آدھا چمچہ
نمک	حسب پسند
گھی/تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

انڈے میں پیاز، ہری مرچ، کُٹی مرچ، نمک ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پراٹھا بیل کر توے پر ڈالیں، جب ایک طرف سے تھوڑا پک جائے تو دوسری طرف سے ہلکا سا سینک لیں۔ ہلکا ہلکا گھی یا تیل بھی ڈالتی جائیں، آنچ بہت دھیمی رکھیں۔ اب پراٹھے پر انڈا پھیلا کر ڈال دیں۔ جب ایک طرف سے پک جائے تو پراٹھا آہستگی اور احتیاط سے پلٹ دیں۔ سنہرا ہونے پر اتار لیں، سحری میں دہی یا چائے کے ساتھ پیش کریں۔ چاہیں تو اس میں مرغی کی بچی ہوئی بوٹیوں کے ریشے کرکے ڈال دیں یا قیمہ بھی ڈالا جاسکتا ہے۔

لذیذ پکوڑے

اجزا:۔

آلو	دو عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
ہری مرچ	دو سے تین عدد
لال مرچ (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
املی بھیگی ہوئی	حسب پسند
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ (بڑی)	چار سے پانچ عدد
بیسن	آدھا پاؤ
نمک	حسب پسند
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:۔

بیسن میں نمک، کٹی لال مرچ، زیرہ ڈال کر گھول لیں۔ آلو ابال کر چھیل لیں اور انہیں مسل کر اس میں نمک اور کُٹی لال مرچ ہرا دھنیا اور ہری مرچ باریک کاٹ کر ڈالیں اور املی بھی ملادیں۔ اب بڑی والی ہری مرچوں کو بیچ میں سے چاک کرکے اس میں آلو کا آمیزہ بھردیں اور گاڑھے بیسن میں ڈبو کو رکھ دیں۔ کڑاہی یا کسی برتن میں تیل گرم کرکے یہ مرچیں تل لیں۔ افطار میں کیچپ، دہی کی چٹنی یا ہری چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

چکن کے سموسے

اجزا:۔

مرغی کا قیمہ	ایک پاؤ
ہری پیاز	چار عدد
بند گوبھی	آدھا کپ
کالی مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سموسے کی پٹیاں	حسب ضرورت
انڈے	تین عدد
نمک	حسب پسند
لہسن ادرک (پسا ہوا)	ایک چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

دو انڈے سخت ابالیں اور مسل لیں۔ ایک برتن میں تیل گرم کرکے اس میں ایک چمچہ لہسن ادرک ڈالیں۔ اس کے بعد اس میں قیمہ، نمک، کالی مرچ پسی ہوئی ڈال کر درمیانی آنچ پر بھون لیں۔ پھر اس

میں ہری پیاز' بند گوبھی، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر بھونیں۔ آخر میں ابلے انڈے ڈال کر بھون لیں اور چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کرلیں۔ پھر اسے سموسے کی پٹیوں میں بھریں' ایک انڈے کو پھینٹ کر سموسے کی پٹیوں کے کناروں پر لگا کر بند کریں۔

ایک برتن میں تیل کر کے سنہری ہونے تک تلیں اور افطار کا لطف اٹھائیں۔ قیمہ چکن کے بجائے گائے کا بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

آلو چھولے کی بھجیا اور پوریاں

اجزا:۔

آلو (ابلے ہوئے)	ایک کلو
چھولے (ابلے ہوئے)	ایک پاؤ
ٹماٹر	دو عدد
ہری مرچ	چار عدد
زیرہ سفید	دو چمچے
کلونجی	ایک چمچہ
لال مرچ	ایک چمچہ
ہلدی	ایک چمچہ
املی کا رس	حسب پسند

ترکیب:۔

ایک برتن میں ابلے ہوئے آلو ڈال کر چمچے سے توڑ لیں۔ اس میں لال مرچ، کلونجی اور ہلدی شامل کردیں۔ پھر تھوڑا سا پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیں۔ ٹماٹر باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ چمچہ چلاتی رہیں، اب اس میں نمک، مرچ، پسا ہوا زیرہ اور املی بھی ڈال دیں۔ آلو چھولے کی بھجیا تیار ہے۔

پوری کے لیے

اجزا:۔

آٹا	تین پیالی
نمک	حسب ذائقہ
پانی یا دودھ	حسب ضرورت
گھی/تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

آٹا گوندھ کر چھوٹے چھوٹے پیڑے بنالیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور پوریاں تل لیں۔ گرم گرم پوری ۔۔ آلو چھولے کی بھجیا کے ساتھ پیش کریں۔

پارسی چکن

اجزاء:

مرغی کا گوشت	ڈیڑھ کلو
پیاز (درمیانی)	دو عدد
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
آلو	ڈیڑھ کلو
تیل	حسب ضرورت
ٹماٹر	دو عدد (چوپ کرلیں)
ہری مرچیں، ہرا دھنیا	حسب ضرورت
فریش کریم	تین کھانے کے چمچے

ترکیب:۔

آلو چھیل کر درمیانہ کدوکش کر کے گرم تیل میں ڈیپ فرائی کرلیں۔

ایک ساس پین میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر سنہری کریں۔ لہسن، ادرک پیسٹ ڈال کر چمچہ چلائیں۔ اب اس میں گوشت ڈال کر بھونیں، نمک، لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، ٹماٹر ڈال کر بھونیں اور ڈھانک کر اتنا پکائیں کہ گوشت گل جائے۔ آخر میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں ڈالیں۔ بڑی ڈش میں گوشت نکال کر اوپر سے فریش کریم ڈالیں اور ساتھ میں فرائی کیے ہوئے آلو سے سجا کر کیچپ وغیرہ کے ساتھ پیش کریں۔

* * *

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

الف.....لاہور

میرے شوہر کی روٹین میری پریشانی ہے۔ میں صبح چھ بجے اذان فجر کے وقت بیدار ہوتی ہوں۔ نماز کے بعد تلاوت سے فراغت کے بعد حسن کو اسکول چھوڑ کر آتی ہوں۔

آٹھ بجے سے گیارہ کے درمیان پڑھنا لکھنا، یا الماری وغیرہ کی صفائی میں لگی رہتی ہوں۔ گیارہ بجے سے کمرے کی صفائی، کچن کی صفائی میں لگ جاتی ہوں۔ بارہ بجے یہ اٹھتے ہیں ان کے کپڑے وغیرہ استری کرنا، چائے ناشتہ بنانے میں ایک گھنٹہ گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ پونے ایک بجے بیٹا آجاتا ہے، اس کو نہلانا، تیار کرنا کھانا کھلانے میں کافی ٹائم لگتا ہے (وہ چلبلا بہت ہے، باتیں بھی بہت کرتا ہے، ساڑھے پانچ سال کا ہے) یہ اس کو لے جاتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے۔ اتنے میں تفصیلی صفائی وغیرہ سے فارغ ہوجاتی ہوں۔ یہ پکانے کے لیے لاکر دیتے یا مجھے لانا ہوتا ہے، پکاتے پکاتے تین بج جاتے ہیں (بیچ میں ظہر کی نماز بھی ادا کرتی ہوں) انہیں کھانا کھاتے کھاتے چار بج جاتے ہیں۔ چار بجے حسن مدرسہ سے آجاتا ہے تو اس کو چائے ناشتہ کچھ کھلانا پڑتا ہے، پھر اس کا اسکول کا کام ٹیوشن بھیجتے بھیجتے چھ بج جاتے ہیں۔ چھ بجے یہ کام پر جاتے ہیں۔ ان دونوں کے جانے کے بعد پھیلاوا سمیٹنے، برتن دھونے، روٹی پکانے (رات کی) میں سات بج جاتے ہیں۔ سات بجے کے بعد ہماری لائٹ چلی جاتی ہے۔ دس بجے کے قریب آتی ہے۔ آٹھ بجے تک بیٹا آجاتا ہے پھر اس کو کھانا کھلا کر سلاتے سلاتے نو بج جاتے ہیں۔ نو بجے کے بعد میں بھی سوجاتی ہوں۔ دس بجے لائٹ آتی ہے تو اٹھ کر چارجنگ لائٹ وغیرہ بند کرتی ہوں دوبارہ نیند آتے آتے دس بج جاتے ہیں۔ دو بجے یہ کام پر سے آتے ہیں کھانا وغیرہ کھا کر ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں۔ چونکہ ایک ہی کمرہ ہے تو جب تک یہ نہیں سوجاتے مجھے بھی نیند نہیں آتی۔ پانچ بجے سوتی ہوں چھ بجے پھر اٹھ جاتی ہوں نیند کی کمی کی وجہ سے بلڈ پریشر بہت ہائی ہوتا ہے۔ یہ سمجھتے نہیں ہیں۔ دن میں سونے کا بالکل ٹائم نہیں ملتا۔ ان کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے حسن بہت بگڑ رہا ہے۔ کسی سے نہیں ڈرتا، ایک مرتبہ جو بات منہ سے نکال دے، اسے پوری کروا کر چھوڑتا ہے۔ پڑھائی میں بہت اچھا ہے۔ عدنان بھائی آپ مشورہ دیں اب میں کیا کروں۔ میری برداشت ختم ہوچکی ہے۔ دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ کر کسی دارالامان میں چلی جاؤں۔ وہاں کی باتیں سن کر ڈر لگتا ہے۔ ان کو ہزار مرتبہ سمجھا چکی ہوں۔ ان کا کہنا ہے میرے ساتھ رہنا ہے تو یہی روٹین رہے گی ورنہ جہاں دل چاہے جاؤ میں نہیں بدل سکتا اپنی روٹین۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔

میرے شوہر بالکل پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ دین سے بھی دور ہیں۔ صرف جمعہ کے دن زبردستی کر کے نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کسی دینی اجتماع میں شرکت کے لیے بھیجوں تو وہاں جانے پر بھی تیار نہیں ہوتے۔ ان کو یا تو انڈین چینل یا پھر انگلش چینل پسند ہیں جن سے مجھے انتہائی نفرت ہے۔

عدنان بھائی سوچتی ہوں، کوئی دوسرا ایک کمرے کا گھر کرائے پر لے لوں مگر یہی سوچ کر اکیلی کیسے رہوں

کی ہمت نہیں ہوتی۔ انہیں نہ کسی سے ملنا جلنا پسند ہے نہ آنا جانا، مجھے نہیں منع کرتے، بس گھر، ٹی وی اور دکان اس کے علاوہ کوئی دوسری مصروفیت نہیں ان کی، ان کا موٹاپا بھی بے حد بڑھ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے سو سال پہلے کے انداز میں جی رہے ہیں۔ کہیں شادی بیاہ وغیرہ میں جانا ہو تو صرف چھوڑنے کی ذمہ داری نبھاتے ہیں میں کیسے آؤں گی یہ میرا مسئلہ ہوتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کسی دن میرے دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی۔ میرے بہن بھائی سمجھانے کی کوشش کریں تو مجھ سے لڑتے ہیں کہ تم تو میری برائیاں کرتی ہو، مجھے بدنام کرتی ہو۔ ایک مرتبہ ان کے ماموں، ممانی، بہنوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو ایسا ہنگامہ کیا، محلّہ اکٹھا کرلیا۔ جب میں اپنے گھر جانے لگی تو جانے بھی نہیں دیا۔ معافی تلافی کرنے لگے۔ نہ مجھے چھوڑنے پر راضی نہ میری بات ماننے پر راضی، ایسا کب تک چلے گا عدنان بھائی، ہاں ایک خوبی ہے مجھے کبھی پڑھنے لکھنے سے منع نہیں کرتے بلکہ خود لا لا کر کتابیں دیتے ہیں۔ کل رات کو چھوٹی سی بات پر بدمزگی ہوگئی مجھے ڈانٹنے لگے میری حالت بگڑ گئی پھر اسپتال لے کر گئے، سارے ٹیسٹ وغیرہ کروائے، دل تو چاہ رہا ہے بہت ساری نیند کی گولیاں کھا کر سو رہوں۔

ج:- ایک طویل عرصہ سے جاری اس سلسلے میں اب تک سینکڑوں ہزاروں خطوط موصول ہو چکے ہیں کچھ خطوط تو اتنے دلدوز ہوتے ہیں کہ پڑھ کر دنوں دل دکھی رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کیا مشورہ دیا جائے۔ ہر راستہ بند نظر آتا ہے۔ یہ سب لکھنے کا مقصد آپ کو یہ احساس دلانا ہے کہ آپ کا مسئلہ نہ تو ایسا مشکل ہے کہ جس کا کوئی حل نہ ہو اور نہ ہی ایسا پریشان کن کہ آپ سوچتی ہیں کہ گولیاں کھا کر سو رہیں۔ جہاں تک آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے آپ باصلاحیت اور ذہین ہیں۔ آپ کے مایوس ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

مسئلہ آپ کے میاں کی روٹین کا ہے۔ جس سے آپ سمجھوتا نہیں کر پا رہی ہیں اور آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے میاں یہ روٹین بدلنا نہیں چاہتے۔ یہ بھی تو سوچیں کہ کیا وہ کہیں اور جاب کر سکتے ہیں؟ جاب ملنا آسان نہیں ہوتا۔ کیا ان کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ وہ کوئی کاروبار کرلیں؟ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صبح جلد نہ اٹھ سکتے ہوں۔ اس لیے آپ کو اپنی روٹین بدلنا ہوگی۔ آٹھ بجے بچے کو اسکول بھیج کر آپ اطمینان سے بارہ بجے تک سو سکتی ہیں۔ بارہ بجے اٹھ کر بچے اور میاں صاحب کو ایک ساتھ ناشتا بنا کردیں، وہ پکانے کے لیے جو لا کردیں اسے پکائیں۔ پکانے کے دوران صفائی وغیرہ کرسکتی ہیں کھانا ایک ہی ٹائم پکائیں۔ پکانے کھانے کے کام سے فارغ ہو کر بچے کو پڑھانے کا کام کریں۔ چھ بجے جب میاں صاحب چلے جاتے ہیں تو آپ کے پاس دو گھنٹے ہوتے ہیں۔ آٹھ بجے بیٹا آتا ہے۔ اس دوران آپ اپنے لکھنے پڑھنے کا کام کرسکتی ہیں۔ نو بجے سو جائیں۔ رات نو بجے سے دو بجے تک چھ گھنٹے کی نیند لے سکتی ہیں۔ تین چار گھنٹے کی نیند صبح اس طرح آپ کو آسانی سے آٹھ نو گھنٹے سونے کے لیے مل سکتے ہیں۔

شروع شروع میں یہ روٹین سیٹ کرنے میں آپ کو دشواری ہوگی پھر عادی ہو جائیں گی۔

گھر میں صرف ایک کمرہ ہے۔ ٹی وی چلنے سے آپ کی پریشانی بجا ہے لیکن اس کا حل اتنا مشکل نہیں ہے کرایہ کا گھر ہے تو آپ کوئی دو کمروں کا گھر لے لیں۔ اضافی کرایہ افورڈ کرنا مشکل ہو تو اس کے لیے آپ گھر میں بچوں کو ٹیوشن دے کر آمدنی میں اضافہ کرسکتی ہیں۔

شوہر کو نماز کی تلقین کر کے آپ نے اپنا فرض ادا کردیا۔ اب وہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ آپ کی زندگی میں ان تمام مشکلات کے ساتھ ایک روشن پہلو بھی تو ہے کہ وہ آپ کا خیال رکھتے ہیں۔ آپ کو کہیں جانا ہو تو چھوڑ کر آتے ہیں۔ آپ کی دوا، علاج میں دلچسپی لیتے ہیں۔

جلنا کڑھنا چھوڑ دیں۔ یہ ناشکری ہے یہ سوچیں بہت سی خواتین کے شوہر تو کام ہی نہیں کرتے۔ وہ بھی گزارہ کرتی ہیں۔ صحت بھی اچھی ہو جائے گی۔ وقت کے ساتھ تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں لیکن صحت لوٹ کر نہیں آتی۔ ایک امکان، امید یہ بھی ہے کہ آپ کے شوہر کو دوسری جاب مل جائے تو وہ یہ رات کی جاب چھوڑ دیں۔

الف......فیصل آباد

میری عمر اٹھارہ سال ہے میں تین چار سال کی تھی جب میری امی اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ میری ایک بہن کو میری خالہ لے گئیں اور میں اپنے پاپا اور دادی کے ساتھ رہنے لگی۔ نو دس سال کی ہوئی تو پاپا بھی فوت ہو گئے۔ میری چھوٹی بہن بھی ہمارے ساتھ رہنے لگی۔ نانا، نانی بھی اس جہاں میں نہیں تھے۔ میری دادی، میں اور میری بہن اپنے چاچو کے ہاں رہنے لگے پر وہ بھی زیادہ دیر تک ہمیں برداشت نہ کر پائے۔ انہوں نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم بہنیں دکان سے چوری کرتی ہیں اور ہمیں گھر سے نکال دیا۔ دادی ہم دونوں کو لے کر اپنے پرانے گھر میں رہنے لگی، گھر کا خرچا کیسے چلنا چاہیے۔ میری دادی کو یہ سوال بار بار پریشان کرتا۔ وہ بہت بوڑھی تھی۔ کام بھی نہ کوئی کرسکتی تھی۔

کچھ مہینوں بعد میرے تایا ابو ہمیں شہر لے آئے لیکن تائی بھی ہمیں بات بات پر ڈانٹتی۔ دوپہر کے وقت ہمیں گھر سے نکال دیتی جاؤ باہر کھیلو...... گرمی کی کڑی دھوپ میں ہم دونوں جھلس جھلس کر دوپہر کاٹتیں ایک دن میری تائی نے میرا گلا دبا کر مجھے مارنے کی کوشش کی پھر میری دادی ہمیں لے کر اسی گلی میں میرے چاچو کے ہاں آ گئی۔ وہ محکمہ پولیس میں ایک اول درجے پر فائز ہیں۔

کچھ سال بعد میری دادی کا انتقال ہو گیا لیکن ہم آج بھی اس چاچو کے گھر رہتی ہیں۔ میری چھوٹی بہن کے ساتھ جس گھر میں ہم رہتے ہیں ان چاچو کے بیٹے نے غلط حرکت کی جب اس نے چچی کو بتایا تو انہوں نے سارا قصور میری بہن کا نکال دیا اور چاچو آج تک میری بہن سے بولتے نہیں اور جس نے غلط حرکت کی اس کے ناز اٹھاتے ہیں۔ میں نے ایف اے کیا ہے سیکنڈ پارٹ کے امتحانات دینے ہیں اپنا ذاتی خرچ اٹھانے کے لیے میں گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی لیکن چچی ان بچوں سے بہت کام لیتی تھی۔ ان کے ماں باپ نے کہیں اور بچوں کو ڈال دیا میرے پاس پیسوں کی پھر قلت آ پڑی میری، چچی اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتی ہے سارا دن گھر کا کام ہم کرتی ہیں۔ چاچو بھی ہر وقت گھر میں گالم گلوچ کا ماحول بنائے رکھتے ہیں مجھے اللہ نے لکھنے کا ہنر دیا ہے۔ میری ایک کتاب مارکیٹ میں آ چکی ہے۔ میں ایک ڈائجسٹ میں لکھتی ہوں۔ وہ ڈائجسٹ والے مجھے ابھی پیسے تو نہیں دیتے کیونکہ ابھی دو سے تین ہی سٹوری آئی ہیں میری چچی اور چاچو نے لکھنے سے منع کردیا۔ پیسے تو دیتے نہیں لکھنے کا کیا فائدہ۔ میں نے کچھ پیسے جوڑے تھے۔ وہ چچی کو دے دیے کہ یہ ڈائجسٹ والوں نے بھیجے ہیں ان کو ہر ماہ پیسے چاہیے ہوتے ہیں تب جا کر وہ مجھے لکھنے کی اجازت دیتی ہیں اب تو ٹیوشن کی جاب بھی نہیں رہی۔ میرے پاس جو ہیں، ان میں سے پیسے دے دوں ان کو، پلیز عدنان بھائی مجھے بتائیں کہ میں ایسا کیا طریقہ کروں کہ وہ مجھے لکھنے دیں کہ میرا مستقبل بن جائے۔ مجھے ریڈیو سے آفر ہوئی لیکن منع کردیا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میرے خرچے یہ لوگ پورے بھی نہیں کرتے بیمار ہو جاؤں تو دوائی بہت مشکل سے لے کر دیتے ہیں۔

ج:- اچھی بہن! آپ کے حالات جان کر دل کانپ اٹھا ہے۔ یتیم کے سر پر صرف محبت و شفقت سے ہاتھ پھیرنے سے اتنی نیکیاں ملتی ہیں جتنے اس کے سر پر بال ہیں تو سوچنے کی بات ہے کہ یتیم کی کفالت کا کتنا ثواب ہوگا۔ افسوس کی بات ہے کہ آپ کے چچا کو ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ بہرحال آپ چچا سے جاب کی اجازت لیں اگر وہ نہ دیں تو آپ بچوں کو ان کے گھر جا کر بھی ٹیوشن دے سکتی ہیں اگر اس کی اجازت بھی نہیں ملتی تو پھر صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اتنا وقت گزر گیا ہے۔ آپ کی شادی ہو جائے گی تو آپ کو اپنا گھر مل جائے گا۔ اللہ سے دعا کرتی رہیں۔

* * *

بیوٹی بکس

امت الصبور

بدر منصور............گلشن

س: میری عمر پینتالیس سال ہے، میری بھنوؤں میں سفید بال آرہے ہیں، میں انہیں نوچ کر نکال دیتی ہوں۔ جس کی وجہ سے میری بھنویں بہت ہلکی ہوگئی ہیں، برائے مہربانی مجھے کوئی نسخہ بتادیں۔

ج: پیاری بہن! بھنوؤں کے لیے آپ یہ نسخہ استعمال کریں، ان شاءاللہ فائدہ ہوگا۔ زیتون کا تیل، کلونجی کا تیل، کیسٹر آئل، سرمہ ہم وزن ملالیں، جب استعمال کرنا ہو۔ تو ان چیزوں کو تازہ ایلوویرا جیل میں ملاکر لگائیں۔

نائمہ ریاض............اسلام آباد

س: میری بیٹی کی عمر سولہ سال ہے اس کے معدے میں تیزابیت رہتی ہے۔ تھکن اور کمزوری بھی بہت ہوتی ہے، اس کے مثانے میں بھی گرمی ہے؟

ج: پیاری بہن! اپنی بیٹی کو زیادہ سے زیادہ پانی پینے کی تلقین کریں۔ کولڈ ڈرنک بالکل استعمال نہ کرنے دیں۔ تلی ہوئی چیزیں کھانے سے گریز کریں، پنساری کے پاس سے ریونڈ چینی اور ثابت اسپغول لے لیں اور دونوں چیزیں آدھا آدھا چمچہ لیں اور اسے آدھا گلاس پانی میں رات کو بھگودیں۔ صبح یہ پانی اس کو نہار منہ پلادیں، ان شاءاللہ فائدہ ہوگا۔

عالیہ صبعت.........فیصل آباد

س: باجی! میری عمر کی میری دوستیں ماشاءاللہ اسکن کے لحاظ سے فٹ فاٹ نظر آتی ہیں، یعنی میری اسکن ٹائٹ نہیں ہے اور آنکھوں کے نیچے وقت سے پہلے ہی جھرّیاں پڑنا شروع ہوگئی ہیں۔ میری عمر پچیس سال ہے، پلیز کوئی دیسی اچھا سا ٹوٹکا بتائیں جس سے میری اسکن اچھی اور فریش نظر آئے، آپ کو دعائیں دوں گی؟

ج: شازیہ! اتنی کم عمر میں جھرّیاں پڑنا ٹھیک نہیں، آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ اس کے بعد کسی گھریلو نسخے پر عمل کیجیے۔

سدرہ آصف........کراچی

س: آپی! میرے بال بہت ٹوٹ رہے ہیں، اود میرے بال بہت بے رونق ہیں۔

ج: آپ متوازن غذا اور پھلوں کا استعمال کریں، بالوں کو ہر ماہ ترشوائیں۔ تیل کم لگانے کی وجہ سے بھی بال روکھے، بے رونق اور کمزور ہوجاتے ہیں۔ اس لیے باقاعدگی سے تیل کا مساج کریں۔ اس کے علاوہ سردھونے سے آدھا گھنٹہ قبل بالوں میں تیل کا مساج کریں اور گرم پانی میں تولیہ بھگو کر نچوڑ لیں اور اسے سر پر لپیٹ لیں۔ اس سے بالوں میں نرمی پیدا ہوگی۔ اور تیل بھی بالوں میں اچھی طرح جذب ہوجائے گا۔

سر دھونے کے لیے ہمیشہ معیاری شیمپو استعمال کریں۔ اس کے علاوہ آملے اور ریٹھے کا استعمال اور بنانے کا آسان سا طریقہ لکھ رہے ہیں۔ مٹھی بھر آملے، ریٹھے اور سیکا کائی کو ایک لیٹر پانی میں رات بھر کے لیے بھگودیں۔ دوسرے دن اس پانی کو اتنا پکائیں کہ وہ آدھا رہ جائے۔ ٹھنڈا ہونے پر اس کو چھان لیں اور اس آمیزے کو بالوں میں لگائیں پھر بال اچھی طرح دھولیں۔ اس کے مستقل استعمال سے نہ صرف بال کالے ہوجاتے ہیں۔ بلکہ نرم ملائم بھی ہوجاتے ہیں اور بالوں کی قدرتی چمک لوٹ آتی ہے۔

☆

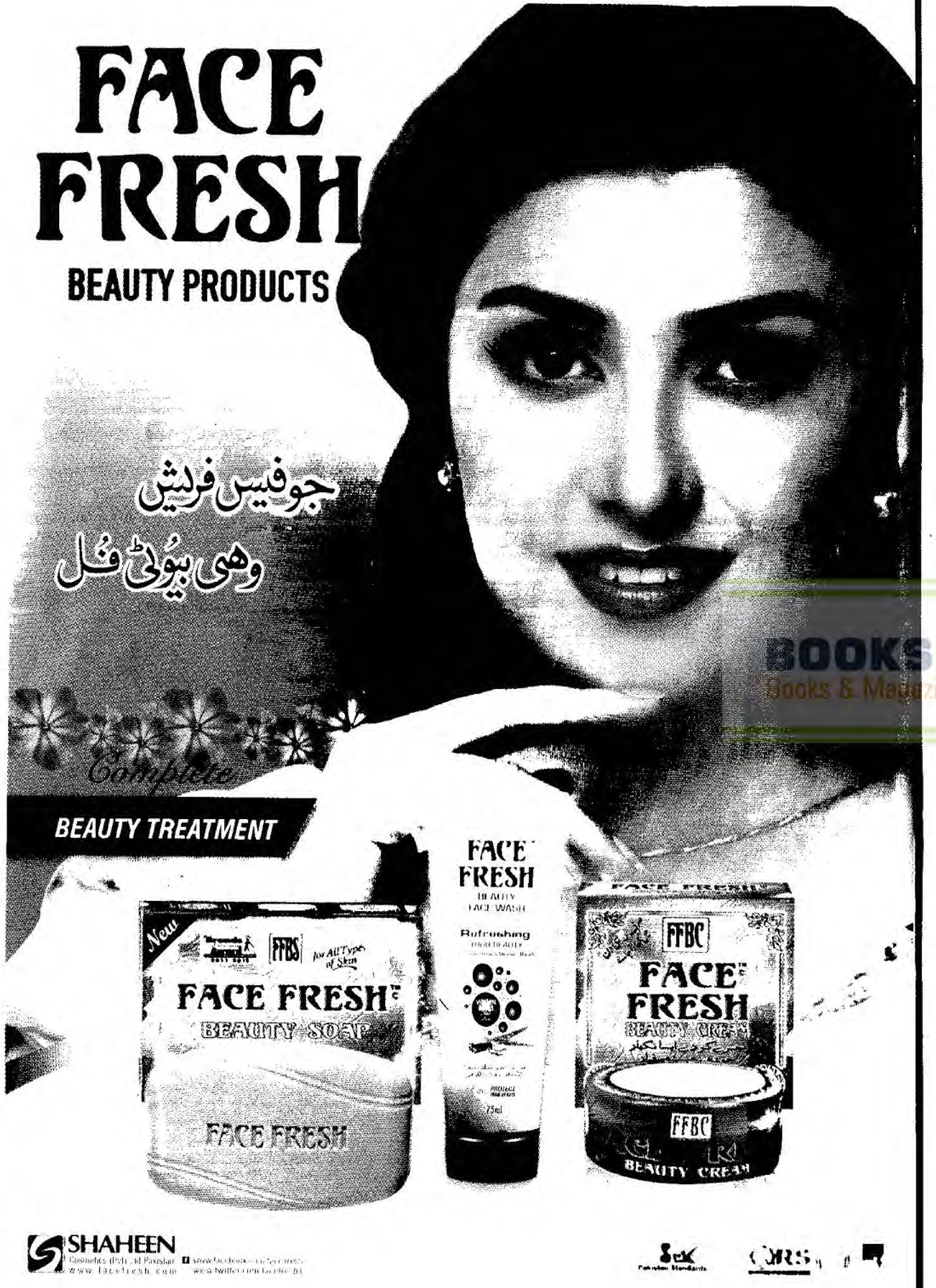
FACE FRESH
BEAUTY PRODUCTS
جو فیس فریش
وہی بیوٹی فل
Complete
BEAUTY TREATMENT
New
FFBS
for All Types of Skin
FACE FRESH
BEAUTY SOAP
FACE FRESH
FACE FRESH
BEAUTY FACE WASH
Refreshing
75ml
FFBC
FACE FRESH
BEAUTY CREAM
FFBC
BEAUTY CREAM
SHAHEEN
Cosmetics (Pvt) Ltd Pakistan
www.facefresh.com